شب خون
140

زبانی پن، خواندگی اور ناول

ابھی تک ہم لوگوں نے اس حقیقت کا پورا احساس نہیں کیا ہے کہ زمانۂ قدیم سے لے کر اٹھارویں صدی تک زیادہ تر ادبی متن، اگر وہ تحریری شکل میں تخلیق بھی کیے گئے تھے، تو بھی وہ مجمع عام میں پڑھ کر سنانے کے مقصد سے تصنیف کیے گئے تھے، اور پڑھ کر سنانے کا کام عام طور پر مصنف خود کرتا تھا۔ اپنے گھر والوں کو یا چھوٹے چھوٹے مجمعوں کو بآواز بلند کتاب پڑھ کر سنانے کا طریقہ تو بیسویں صدی کے اوائل تک عام تھا، جب تک کہ الکٹرانک ذرائع ترسیل یعنی ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے سننے والوں کے ایسے گروہوں کو اپنے کسی ایک فرد کے بجائے ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے گرد جمع ہونے کی رسم قائم کر دی ... قرون وسطیٰ کے غالباً زیادہ تر یورپی ادیب اپنی تصنیف کو خود پڑھ کر سنانے کی قدیم رسم پر کاربند تھے۔ اس رسم کا اثر بدیعیاتی اسلوب اور پلاٹ اور کردار نگاری کی نوعیت پر پڑنا لازمی تھا۔ یورپ میں رومانی تحریک اس قدیم بدیعیات کے اختتام کا آغاز ہے جو قدیم الایام سے زبانی پن پر مبنی تھی ... صدیوں کے اس دوران میں زبانی پن سے تحریر اور پھر طباعت اور الکٹرانک ذرائع ترسیل و تبلیغ لفظ کے گذران نے لفظ پر مبنی فنون پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ بلکہ بنیادی طور سے ان کے ارتقا کو متعین کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس تعین و اثر کا نتیجہ کردار نگاری اور پلاٹ کے یکے بعد دیگرے آنے والے طریقوں پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً مغرب میں رزمیہ بنیادی اور ناقابل تبدیلی حیثیت سے زبانی صنف سخن ہے۔ لکھے ہوئے اور طبع کیے ہوئے رزمیے، یعنی نام نہاد "فن کارانہ" رزمیے، کچھ اکھڑے اکھڑے سے اور زبانی قصہ سنانے کی [illegible] کی قدامت پرستانہ نقل معلوم ہوتے ہیں ... جیسے جیسے تحریر اور طباعت کے ساتھ ساتھ زبانی پن کم ہوتا جاتا ہے رزمیے کی شکل بدلتی جاتی ہے، چاہے مصنف اس کی اصل شکل کو قائم رکھنے کے لئے کتنی ہی کوشش اور ارادہ کیوں نہ کرے... اور آخر کار رزمیہ اپنی مفروضہ معتبری بھی کھو بیٹھتا ہے، کیوں کہ زبانی تمدن کے ضبط میں جو اس کی جڑیں ہیں، وہ سوکھ جاتی ہیں ... یہ بات بالکل صاف ہے کہ ناول ایک ایسی صنف ہے جو طباعت پر مبنی ہے، اس کا مزاج اور ماحول بہت گہری حد تک داخلانہ، غیر ہیروئی اور طنز کی طرف بہت زیادہ مائل ہوتا ہے۔ آج کے وہ بیانیے جن میں پلاٹ ہی نہیں ہوتا، وہ الکٹرانی عہد کا حصہ ہیں اور کمپیوٹر کی ہی طرح مشکل سے سمجھ میں آنے والے مرموز CODED وضع کے حامل ہوتے ہیں ... ناول کے شروع کے عہد میں عورت ناول نگاروں اور عورت مصنفوں نے غالباً اپنی تحریریں زبانی روایت کے دائرے سے باہر رہ کر صرف اس لئے لکھیں کہ ان کو اس زمانے میں لڑکوں کی طرح زبانی پن پر مبنی بدیعیات کی تعلیم نہیں ملتی تھی (کیوں کہ عورتیں باضابطہ اسکولوں میں نہیں پڑھائی جاتی تھیں۔) عورت مصنفوں کی تحریروں میں مردوں کے برخلاف ہیئت کے زبانی پن کے اثرات بہت کم تھے۔

والٹر آنگ

(WALTER ONG)

۱۹۸۲ء

دسمبر ۱۹۸۵ء، جنوری، فروری ۱۹۸۶ء

مدیر، مالک، ناشر، پبلشر: عقیلہ شاہین   ٹیلی فون: ۳۴۹۶، ۵۲۵۵۰   جلد: ۱۹   شمارہ: ۱۴۰
مطبع: تاج آفسٹ پریس الہ آباد   سرورق: نایاب   خطاط: فیاض احمد
بارہ شمارے: ۳۶ روپے   فی شمارہ: تین روپے ۵۰ پیسے   دفتر: ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد

ترتیب و تہذیب

شمس الرحمن فاروقی

زیب غوری کا سوگ

● زیب غوری کے مرنے کی خبر ۱۷ اگست کو بجلی بن کر ایسی گری کہ سارا وجود کو جلا گئی۔ کچھ سوچنے سمجھنے کی سکت ہی باقی نہ رہ گئی۔ اب کچھ سنبھلا ہوں تو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ خط کیا ہے تعزیت نامہ ہے۔ ایک پرسا ہے زیب کی موت کا جسے آپ تک پہنچا رہا ہوں۔

زیب کے بارے میں کیا لکھوں۔ ایک بات ہو تو بھلائی جائے۔ زیب کا غم میرے دل میں ایک ایسے زخم کی صورت اختیار کر چکا ہے جو آخری سانس تک مندمل نہیں ہو سکتا۔ زیب کی موت شعر و ادب کا بڑا نقصان سہی مگر میری تو زندگی ہی اپنی بنیادوں پر ہل گئی ہے۔ میرے دل میں خلا پیدا نہیں ہوا اب تو میں خود خلا میں ہوں۔ ایک شخصیت کے پرتو سے محرومی گوارا کی جا سکتی ہے۔ میرا باپ، میرا بھائی، میرا ہم سخن، میرا دوست، میرا محبوب بیک وقت سب مر گئے۔ میرے لئے حرف تسلی کا جواز ہی کہاں رہ گیا۔ زیب کا میرا ساتھ گذشتہ پچیس برسوں کا تھا۔ ادھر پاکستان اور بمبئی سے ان کی واپسی کے بعد یہ قرب اور بڑھ گیا تھا۔ ابھی پاکستان جانے سے چند روز قبل میں ان کے یہاں بیٹھا تھا۔ محبت کے موضوع پر گفتگو چل رہی تھی۔ زیب نے پوچھا "رمز تم سب سے زیادہ کسے چاہتے ہو؟" میں نے کہا "تمہیں۔" (یہ حقیقت بھی ہے) زیب نے مجھے لپٹا لیا اور بولے "بھئی تم گواہ رہنا۔" پھر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ یہ ایک واقعہ ہی میرے لئے ساری زندگی کا روگ بن چکا ہے۔ زیب کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے لیکن وہ مجھے سب سے بہتر سمجھتے تھے، سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ بحیثیت شاعر بھی اور بحیثیت انسان بھی۔ یہ بات میرے واسطے نہایت فخر کی ہے۔

زیب کے لئے میں نے دو غزلیں کہی ہیں۔ کہیں بھی مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔ زیب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو حقائق کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

کانپور — محمد احمد رمز

● یہ خبر میرے لئے ابھی تک ناقابل یقین ہے کہ زیب صاحب ہم سے بچھڑ گئے! کبھی یقین آتا بھی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ ہم خود بھی زندگی سے محروم ہو گئے۔ زیب صاحب کے انتقال کی خبر یوں تو ۱۶ اگست کو کانپور کے ایک مقامی ہفت روزہ کے ذریعہ پھیل چکی تھی لیکن چونکہ میں کئی دنوں سے گھر سے باہر نہیں نکلا تھا اس لئے مجھے یہ الم ناک خبر ۱۷ اگست کو مغرب کے وقت ایک دوست کے ذریعہ گھر پر ملی۔ خبر سنتے ہی میرے بدن میں تھرتھری ہونے لگی۔ میں زمین پر ہی بیٹھ گیا۔ سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ کسی طرح خود کو سنبھالا اور مغرب کی نماز ادا کر کے ادارہ "ہم قلم" کے دفتر پہنچ گیا۔ زیب صاحب اس ادارہ کے سرپرست تھے۔ میں اس کا سکریٹری ہوں۔ اسی دن تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا جس کے درمیان لوگوں نے زیب صاحب کی شخصیت اور شاعری پر اظہار خیال کیا اور مغفرت کی دعا کی۔ دوستوں کا تو کہنا ہی کیا ایسے لوگ بھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے جن کا میرے خیال میں زیب صاحب سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ایسا زبردست تعزیتی جلسہ کانپور میں کبھی نہیں ہوا۔ ہم سبھی دوستوں کا یہ حال رہا کہ ان کا خیال آتے ہی آنسو نکل آتے تھے۔

یہاں ابوالمجد کشفی آئے ہوئے تھے۔ کل ہی پاکستان واپس گئے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ جیسے زیب صاحب کو اپنی موت کا یقین تین چار دن پہلے ہی ہو چلا تھا۔ وہ بجو بھابھی سے بار بار کہہ رہے تھے کہ "بیگم اب مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ تم بیوہ ہونے والی ہو۔" بھابھی انہیں "چپ رہئے، بلاوجہ کی باتیں نہ کیجئے" کہہ کر خاموش کر دیتی تھیں لیکن ہونی ہو کر رہی۔ اللہ تعالیٰ بچوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

ہم لوگوں کو زیب صاحب کی شفقت کا ہمیشہ احساس رہا ہے۔ ان کے احترام میں کبھی ہم لوگوں نے کوئی بات نہیں آنے دی۔ ہمیشہ زبردست قلبی لگاؤ کا احساس رہا ہے۔ وہ ہمارے بزرگ دوست ہی نہیں سرپرست

زیب غوری کا سوگ

گئی تھے۔ چونکہ ہر وقت کا ساتھ تھا۔ ہر موضوع پر گفتگو رہتی تھی۔
اس لئے بعض باتوں پر اختلافات بھی ہو جاتے تھے۔ یہی صورت حال
ان کے پاکستان جانے سے پہلے پیدا ہوئی جس کا مجھے بے حد ملال ہے۔
پاکستان جانے کے لئے جب وہ لکھنؤ گئے تو انھوں نے ایک خط ابوالبرکات
کے نام تحریر کیا تھا کہ اب میرے دل میں کوئی بات نہیں ہے تم لوگ بھی اپنا
دل صاف کرلو۔

بلا شبہ وہ عظیم انسان تھے۔ اسی عظیم شاعر اور انسان کو خراج
عقیدت پیش کرنے کے لئے میں نے کچھ شعر کہے ہیں۔ میں کیا اور میری شاعری
کیا لیکن زیب صاحب سے زبردست قلبی لگاؤ کا نتیجہ ہے کہ کچھ شعر
ہو گئے جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔

حسن عزیز

کانپور

● موت قتیل شفائی کی ہوئی ہے اور دشمنوں نے اڑا دیا کہ زیب غوری
ہمارے بیچ نہیں رہے۔
آپ نے بھی اس خبر کو تصدیق کئے بغیر شب خون میں شائع کر دیا۔
—— وہ جو سپرد خاک ہوا ہے، زبیر شفائی ہے —— نہیں، تو یقیناً محمد احمد
رمز ہوگا

زیب غوری اور موت؟ یہ کیسے ممکن ہے فاروقی صاحب!
جب میر نہیں مرے، غالب کو موت نہیں آئی تو جدید غزل کے اس
شہنشاہ کی موت کیسے ہو سکتی ہے؟

اسمت بیگ

زبیر شفائی

محمد احمد رمز

اس کا چپ ہونا بھی اک شور نوا جیسا
اس کا اظہار ستاروں کی صدا جیسا تھا

زرد زرخیز سے پھوٹا تھا وہ سیلاب کہ جو
شاخ پر پھول تو ہاتھوں میں حنا جیسا تھا

اس نے توڑے نہیں جوڑے تھے دلوں کے رشتے
جب کبھی دیکھا اسے وہ حرف دعا جیسا تھا

دل کے زخموں کا جھگڑا ذکر تو ٹھہرا مرہم
دھوپ کی بات جب آئی تو گھٹا جیسا تھا

آرزو اس کی بظاہر تھی نہایت سرکش
لیکن اندر سے وہ تسلیم و رضا جیسا تھا

ایک پردہ تھا یہ سب ہنسنا ہنسانا اس کا
خود سے بیزار سا دنیا سے خفا جیسا تھا

شاخ سے ٹوٹ چکا تھا وہ جانے کب کا
برگ بے رنگ نہ تھا پھر بھی ہرا جیسا تھا

پھول دیکھے ہیں ان آنکھوں نے بہت کھلتے ہوئے
کیا کھلے گا کوئی ایسا وہ کھلا جیسا تھا

اتنا آہستہ وہ گزرا کہ خبر تک نہ ہوئی
گرد کیا اس کی اُسے موج صبا جیسا تھا

اب نہ تھا نفع و ضرر سے کبھی سروکار اسے
جیسے بھٹکتی ہوئی خود کوئی سزا جیسا تھا

اپنی آواز کے نقش اس نے وہاں بھی چھوڑے
شور لمحوں کا جہاں کوہ ندا جیسا تھا

ہو چلا تھا اسے عرفان عباد و معبود
اس کا معمول ادھر حمد و ثنا جیسا تھا

ہر طرف گنبد خضرا نظر آتا تھا اسے
کوئی منظر ہو مدینے کی فضا جیسا تھا

زیب و رمز آپ تھے پیرایہ فن کی حد میں
اس کا انداز مری طرز ادا جیسا تھا

زیب غوری کا سوگ

اقبال کرشن

سکوت دشت میں گم ہو گئی کیوں صدا تیری
سدا رہے گی یہاں گونجتی نوا تیری
حسینہ ' نجمہ ' جواہر شناور دموسٰی
سبھوں کو آج رلاتی ہے کج ادا تیری
نجزاں نہ دھوپ کے شعلے جھپٹیں گے زیب تجھے
سخن کی راہ میں ہے چاندنی ردا تیری

زبیر شفائی

بساط نظر تھا کہ زرد باغ تھا وہ
دمک رہا تھا مگر طاق بے چراغ تھا وہ
پڑا ہوا تھا سر بحر بیکراں خاموش
کہ آسمان کی صورت میں بے سراغ تھا وہ
ہزار عکس سے بوجھل تھی سرخی سیال
تھا صدر میکدہ لیکن تہی ایاغ تھا وہ
درون قلب لپکتا بجھا شعلہ خود کار
کھلا نہ بھید کوئی نقش تھا کہ داغ تھا وہ
غزل غزل نہ رہی مرگ زیب غوری سے
[illegible] ل افکار نو ——— دماغ تھا وہ

زیب غوری کا سوگ

محمد احمد رمز

نقشِ دیوار بدن تھا وہ سراپا ایسا
ایسی آنکھیں ہی کہیں دیکھیں نہ چہرہ ایسا
جیسے اب کوئی بھی آہٹ نہ ادھر ہے نہ ادھر
ہو گیا بند سرِ راہ دریچہ ایسا
اس کے باہر تھی بس اک گہرا دھواں اندر بھی
سانس لیتا تھا گھٹن میں وہ جیالا ایسا
بار سرِ بستۂ ذات اس پہ تھے کیا کیا ظاہر
دیکھتا تھا وہ اندھیروں میں بھی بینا ایسا
اس کے رنگوں کی دھنک قائم و دائم ہے ابھی
بجھ کے رقصاں ہے فضا میں وہ تھا شعلہ ایسا
ناچتے موروں کا جنگل میں ہو منگل جیسے
اس کی ویرانیٔ دل بھی تھی تماشا ایسا
کتنے گرداب تھے اک شورِ نفس میں اس کے
میں نے دیکھا نہیں بہتا ہوا دریا ایسا
بے نیازی تھی کچھ ایسی کہ ہر اک شے سے گریز
درگزر ہو نہ کوئی ربط سلیقہ ایسا
دے گیا دستِ تعلق کو بھی اپنے نیرنگ
غرب کے غارِ سیہ میں بھی وہ ابھرا ایسا
اپنے سائے میں سمیٹے تھا ہجوم آفاق
ساتھ اب کوئی نہیں یکہ و تنہا ایسا
دھوپ میں سرد سلگتا تھا مگر سائے میں
زندگی ایسی تھی اس شخص کی جینا ایسا
وہ بیاباں ساتھ تھا ہر وقت مگر آخری وقت
دیکھ پائے نہ اسے کوئی بھی مرنا ایسا
حادثے ایسے بھی گزرے ہیں مگر اس کا فراق
جو نہ اچھا ہو کبھی زخم ہے گہرا ایسا
شہرِ پیکر کا ہے حسن رگ سے گزرے تیشہ
کام آیا کہ وہی ایک تھا تیشہ ایسا
میرا اظہارِ محبت بھی تھا نغمہ کوئی
ڈر گیا رمز میں وہ ٹوٹ کے رویا ایسا

حسن عزیز

کب مجازِ فکر و فن سے بھاگنے والے تھے تم
نرغۂ حرف و نوا سے سرخرو نکلے تھے تم
ارضِ فن پر کوئی نقشِ تیرگی باقی نہ تھا
یوں غزل کے آسماں پر مدتوں چمکے تھے تم
وسعتیں ساری سمٹ آتی تھیں دستِ فکر میں
دوریوں کو سامنے لا کر دکھا دیتے تھے تم
سبزہ و گل پر ذرا سی آنچ بھی آنے نہ دی
زرد کی زرخیزیوں سے اس طرح لپٹے تھے تم
دور تک بیتاب ہے لہروں کے دامن میں نوا
بیچ دریا چند لمحوں کے لیے ٹھہرے تھے تم
کیسی اسمِ پاک کی برکت تمھارے دل میں تھی
نورِ آیاتِ جلالی میں نہاں رہتے تھے تم
رات کی سفاکیوں سے خوف کیا آتا تمھیں
تیرگی کرتی بھی کیا، شمعیں جلا رکھتے تھے تم
موت کے صحرا میں آخر کیا تمھیں اچھا لگا
زندگی کے پھول کی قسمیں بہت کھاتے تھے تم
اب ٹھٹھرنا دھوپ میں جلنا مقدر ہے حسن
اب کہاں وہ سائباں جس کے تلے چھپتے تھے تم

مرثیہ زیب غوری
(بہ طرز غزل)

شمس الرحمٰن فاروقی

ابھی کتنوں سے لگ چلتی نہ جانے کتنے گھر کرتی
ذرا کچھ اور بھی جب رنگ دنیا دیکھ لیتا تھا
ابھی تو چشم زخم اخوان عالم تیز کرنے تھے
تمھیں سوئی کو چشم دل میں چبھتا دیکھ لینا تھا
تمھیں خاشاک صبح۔شام کانٹے سا کھٹکتا تھا
کبھی تو خواب گلزار تمنا دیکھ لینا تھا
بہانی تھی دل شب تک جو اپنی جوے خوں اس کی
سر شاخ غزل کو سرسبز ہوتا دیکھ لینا تھا
مرے اے آسماں پرواز وقت شہ پر افشانی
سواد آشیاں طوفان و دریا دیکھ لینا تھا

اُتھل پانیوں کے سودائی

اقبال متین

آج پھر شام ہو گئی لیکن وہ آج بھی نہیں آیا۔ وہ تو اپنے چھوٹے بھائی کی تلاش میں نکل پڑا تھا بغیر کچھ کہے سنے۔ اس کا چھوٹا بھائی کہیں بہت دور چلا گیا تھا اور وہ مجھے چپ چپ دیکھ کر میری دل جوئی کرتا تھا۔ میری دل جوئی کرنے والا کس طرح خود بھی مجھ سے ملے بغیر اتنی ہی دور جا سکتا ہے ــــ میں جانتا ہوں کہ اب دونوں ہی نہیں آئیں گے لیکن شام ہوئی ہے تو ہاتھ میں ہاتھ دیے ہنستے بولتے دونوں ہی آتے ہوئے کیوں نظر آتے ہیں۔ وہ تو دروازے کی چوکھٹ تک آتے ہیں۔ نہ میں انھیں آتا ہوا روک سکتا ہوں نہ جاتا ہوا۔

میرے قلم کی روشنائی بے رنگ کیوں ہو گئی ہے۔ لکھتی ہے تو دکھائی نہیں دیتا کہ کیا لکھ رہی ہے۔ صرف قلم چلتا ہے ــــ اور یہ کتابیں ــــ ان میں تو سارے الفاظ نگینوں کی طرح ہیروں کے توں جڑے ہیں۔ پھر ان کی چمک دمک ماند کیوں پڑ گئی ــــ لکھنے پڑھنے میں کیا جی لگتا تھا۔ اب یہ سارے خزانے کوئی اٹھائے جاتا ہے۔ اور میں دیکھتا رہ جاتا ہوں۔

سدید کہتا ہے۔"

"آج دو بلبلیں کم آئیں۔"!

"میں کہتا ہوں۔"

"تم اپنے بڑے بھائیوں کے ساتھ۔ ادھر ادھر اُتھل پانیوں میں دیکھ آؤ۔"

وہ خوشی خوشی بلبلیں لے آتے ہیں۔ میں بھی خوش ہو جاتا ہوں۔

ان کو پتہ ہی نہیں ہے کہ میرے قلم کی روشنائی بے رنگ ہو گئی ہے۔ اور میری کتابوں کے اوراق سادہ ۔ورنہ وہ بھی سورج غروب ہوتے ہوتے کسی کو دور دیوار کی چپر کھسٹ تک آتا ہوا دیکھ لیتے۔

ہم تو اس صرف بلبلیں لوٹ آتی ہیں تو خوش ہو جاتے ہیں۔

دودھ گاؤں کالونی سے دو فرلانگ کے فاصلے پر نیشنل ہائی وے نمبر (۷) کے کنارے ایک ہوٹل کا افتتاح ہوا ہے ــــ ہوٹل مہاراجہ۔ ہوٹل کا منیجر بہت با اخلاق اور باوضع آدمی ہے۔ حیدرآباد سے ناگپور جانے والی لاریاں اور ناگپور سے بنگلور تک طویل فاصلے طے کرنے والے ڈرائیور، ہوٹل مہاراجہ پر ضرور رکتے ہیں۔ لیکن مدراسی ڈرائیور ہوٹل تاج تک چلے جاتے ہیں۔ دونوں ہوٹلوں کے درمیان بس کوئی فرلانگ بھر کا فاصلہ ہے۔ لگتا ہے تامل ناڈو کو اٹھا کر پنجاب کے بالکل بغل رکھ دیا گیا ہے۔ سڑک کے ایک کنارے پر ہوٹل مہاراجہ اور دوسرے کنارے پر ہوٹل تاج ــــ آمنے سامنے ذرا سا ہٹ کر دو مختلف تہذیبیں، دو مختلف زبانیں، دو مختلف معاشرے اپنا اپنا یادوں کا اثاثہ اپنے اپنے گھروں سے اٹھا لائے ہیں ــــ سفر مدام سفر۔

کہیں جی نہ لگے تو میں ہوٹل مہاراجہ کی کھلی چھت پر آ بیٹھتا ہوں۔

چھت کی سیڑھی پر پڑا اور گلاس رکھ کر ٹھنڈی وھسکی کی چسکیاں لیتا ہوں۔
نظریں دور دور، تک منظر در منظر جانے کیا کھوجتی ہیں ـــــ کوئی سہما
سہما اندر سے نکل نکل کر سکتا رہتا ہے۔ زمین کو چومتے ہوئے درخت۔
درختوں کے جھنڈ پر جھکتے ہوئے بادل۔ گوداوری کا رکنا، سنبھلتا، بڑھتا
ہوا پانی ـــــ یہ سارے منظر مجھ سے دور دور ہو کر کہیں کسی سے
ملتے ہیں۔ آسمان زمین پر اس درجہ جھک آتا ہے۔ یا زمین انگڑائیاں
لے کر آسمان کی باہنوں میں اوپر اٹھ اٹھ کر سمٹ جاتی ہے۔ جانے کیا ہوتا
ہے۔ کوئی کسی سے ملتا ضرور ہے ـــــ اور وہ دونوں مجھے وہیں سے
آتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ڈیم ـــــ DAM پر قطار در قطار روشنیاں جگ مگ کرنے لگی
ہیں۔ ادھر ادھر چاروں طرف سرگوشیاں سی ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔
جھل مل کرتا DAM "ڈیم" ہوٹل مہلاحہ کی کھلی چھت سے کافی دور ہے۔
جب دن ڈوب جاتا ہے تو نظروں کی حدیں جانے والی یہ جھلملاہٹ کیسی اچھی
سی لگتی ہیں۔ کیا میرے اندر اتنا اندھیرا ہے۔

لوگ کہتے ہیں، گوداوری زیریں رو بہنے والا دریا ہے۔ سطح
پر جو پانی ساکت ساکت سا، ٹھہرا ٹھہرا سا لگتا ہے۔ گہرائی میں وہ اُتنا ہی
تیزی سے بہتا رہتا ہے۔ اوپر سے جو شانتی ہی شانتی ہے بھیتر سے وہ ڈول
گئی ہے ـــــ اس دریا میں اندر ہی اندر بڑا اتھل پتھل ہے ـــــ
مجھے گوداوری کبھی کبھی میرا اپنا "میں" لگتا ہے۔

کون جانے کیسے لوگوں کے ہونٹوں پر بیڑی کی طرح
جمی ہوئی مسکراہٹیں کتنے آنسوؤں کی کھارتوں میں چھپائے ہوئے رہتی
ہیں ـــــ اس سوکھے میں گوداوری کی بھی ہڈیاں نکل آئی ہیں۔
ـــــ برسات میں جب یہ ترنگ میں رہتا ہے تو اپنے حدود توڑ کر قریہ قریہ
سڑکیں ناپنے لگتا ہے ـــــ ایسے میں لوگ ہراساں ہراساں جیتے ہیں۔
ادھر پانی، حد نظر تک پانی ہی پانی، جاگتے میں پانی، سپنوں میں پانی،
ـــــ آج یہ راستہ مسدود ہوا۔ کل وہ راستہ ڈوب گیا۔ ڈوبتے ابھرتے
اس منظر میں لوگ کیسے بے دل سے بے خوف سے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے میں

انھیں ادھر نہیں آنا چاہیے تھا لیکن وہ تو مجھے بے خطر پانی کی سطح پر چلتے ہوئے
نظر آتے ہیں ـــــ وہی دونوں جو پانی میں ڈوبی ہوئی گھری کی جھٹ
بھی پہچان لیتے ہیں۔ ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے، ہنستے بولتے، بھری برسات
میں پانی پر چل کر میری طرف آ رہے ہیں ـــــ ان کے تو کپڑے بھی نہیں بھیگے

میرے ساتھی مجھ سے پوچھتے ہیں ـــــ اتنی دور دور کیا دیکھ رہے ہو۔
اب ادھر ادھر دیکھئے تو کچھ نہیں ہے ـــــ پانی اپنے قدموں کو چھو رہا ہے۔
ـــــ لوگ بستی چھوڑ رہے ہیں۔ صرف ایک راستہ کھلا ہے جس کی بسیں اپنے
بس میں ہیں۔

واقعی میں ایسے میں ادھر ادھر کیا دیکھ رہا ہوں ـــــ پانی کے سوا
دیکھنے کو کچھ ہے بھی تو نہیں ـــــ لیکن ان دونوں کا کوئی راستہ متعین ہے۔
نہ کوئی سمت ـــــ وہ تو ہر طرف سے آتے ہیں ـــــ نہیں آتے تو جانے کیوں
نہیں آتے۔ اور جب آتے ہیں تو کوئی ان کا راستہ ہے، نہ موسم ہے، نہ وقت ہے
وہ تو اس طرح آتے ہیں جیسے راستہ، موسم سب کچھ وہی ہیں۔
بچوں نے کہیں سے پر کٹا طوطا پکڑ لیا ہے۔ کسی نے اس کے
پر کاٹ دیئے ہیں۔ پر کاٹ دیئے ہیں تو گھر میں حفاظت سے رکھ لیا ہوتا۔
ـــــ اتنی سی جان فضاؤں میں ڈولنا چھوڑ کر کیا سڑکیں ناپے گی۔
لیکن یہ سجیلا طوطا سڑکیں ناپنے کے لئے نکل پڑا۔ وہ ایک درخت کے
نیچے بلی اور کتے کے خوف سے بے نیاز پھدک پھدک کر اس طرح ترنگ میں
چل رہا تھا جیسے طوطا نہ ہو کوئی چڑیا ہوئی جو پھر سے اُڑ بھی سکتی
ہے۔ چلتے ہوئے اپنے کٹے ہوئے پروں کو وہ مستانہ جوگی کی باہنوں کی طرح
مسلسل ہلا رہا تھا جیسے پر پرواز آزما رہا ہو۔ کہ بچوں نے اُسے دبوچ
لیا۔ اس کے بازوؤں میں اتنی قوت تھی کہ زمین سے اس کا جسم اٹھائے
لیکن وہ سہارا نہ تھا جو فضاؤں کی وسعتوں تک اس کو پہنچا سکتا۔
طوطا یہ جان گیا تھا کہ پر کاٹ کر اسے آزاد کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود
بھی وہ بڑا مست موجی سا لگتا تھا۔ ٹیں ٹیں کرتا کمروں میں پھرا کرتا۔ بچے
اس کی مرغوب غذائیں اس کے آگے رکھ دیتے تو وہ اطمینان سے بیٹھ کر جاتا۔
ایک دن وہ صوفے کے ہتھے پر پہنچ گیا ـــــ صوفے پر براجے سر گھما گھما کر وہ

بلندیوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ایسے میں وحیدو اور سدیدو کو پکارا

"دیکھو دیکھو مٹھو بیٹا صوفے پر کیا بیٹھا ہے"۔

مجو اور سدیدو دوڑے دوڑے آئے۔ سدیدو تالیاں بجانے لگا۔

اس نے اپنی امی کو پکارا۔

امی کیا آپ نے مٹھو بیٹے کو صوفے پر بٹھایا تھا۔

پر نکل آئے ہیں۔ یہ جی موجی تو پر کٹا ہی بھلا تھا۔ تم دیکھتے رہ جاؤ گے اور وہ پُھر سے اڑ جائے گا ـــ بہت بے ایمان ہوتی ہے یہ ذات۔ طوطا چشمی مشہور ہے نا"

"کیا مشہور ہے امی، کیا مشہور ہے۔؟"

"وہ سب تو بعد میں ہوگا پہلے تم اس کو پنجرے میں ڈال دو"۔

طوطا چشم، طوطا، اسٹیل کی چھوٹی سی کٹوری کے ساتھ پنجرے میں بھیج دیا گیا۔ سدیدو نے کٹوری میں پانی کے ساتھ چار قطرے دودھ کے بھی ٹپکا دیے کہ مٹھو بیٹا پانی پی پی کر مکڑا ہوگا ـــ "کیری" کا ٹو اور خربوزے ٹکڑے پنجرے میں رکھ دیے گئے ـــ بچوں نے دیکھا کہ اتنی ساری نعمتوں کی طرف نظر اُٹھائے بغیر طوطا دیوانوں کی طرح پنجرے میں گھوم رہا ہے ـــ ایک ایک تیلی کو اپنی چونچ میں دبا کر کاٹتا ہے۔ زور آزماتا ہے کمروں میں پھرتے وقت جن بازوؤں پر اسے ناز تھا انھیں اس طرح ہلاتا ہے جیسے پنجرا لے اڑ جائے گا۔ لیکن۔ تیلی کٹتی ہے نہ وہ کچھ کھاتا ہے ـــ پنجرے میں پھرتا اور ایک ایک تیلی سے زور آزمائی کرتا۔ تھک جاتا تو ذرا کی ذرا دم لیتا۔

نعمتیں دھری دھری مرجھانے لگیں۔ سڑنے لگیں۔ بے دلی سے مٹھو بیٹا کبھی چونچ میں لے کر کیری یا ٹماٹر کا ٹکڑا کترتا تو شاید اس کو یاد آتا کہ تیلیاں بھی اسی طرح کٹ سکتی ہیں، کچھ کھاتا، کچھ کتر کر چھوڑ کر چھوڑ دیتا اور لپک کر کسی تیلی میں چونچ پھنسائے پڑا رہتا۔

سب کو چھوڑ کر کوئی قیدی زنجیریں کاٹنے میں لگ جائے تو کیسا ہو مشکل ہی سے دو ہی دن بیتے ہوں گے ـــ صبح صبح میں نے دیکھا طوطا اپنی چونچ میں پنجرے کی تیلی دبائے ٹھنڈا ہو گیا ہے ـــ میں نے پنجرے کو خوب ہلایا۔ تب بھی اس کا اکڑا ہوا جسم اس تیلی سے الگ نہ ہو سکا ـــ میں نے

کسی سے کچھ نہیں کہا۔ پنجرہ اتار کر نظر بھر دیکھا اور زیادہ بلندی پر ٹنگا دیا کہ بچوں کی نظر نہ پڑے

اسکول صبح کے تھے۔ بچوں نے اپنی اپنی پیشانیوں پر اپنی امی کے کلمے کی انگلی سے "۷۸۶" لکھوائی اور اسکول روانہ ہوئے۔ جاتے وقت ان میں سے کسی نے اپنی امی کو تاکید کی ـــ

"امی امی مٹھو بیٹے کو آم کا ٹکڑا ڈال دیجئے۔ میں نے اپنی پلیٹ میں رکھ چھوڑا ہے"

"ہاں ہاں ڈال دوں گی، تم جاؤ بھی اسکول دیر آگئی ہے!"

اب میں بھی خاموش رہا۔ مجھے ایسا لگا کہ گوداوری اپنی زیریں سطح سے پنجرے کے اندر سے ہو کر بہہ رہی ہے۔ اور اس کا پانی ہر اس پنچھی میں داخل ہو جاتا ہے جس کے پنکھ اپنے جسم چھوڑ گئے ہوں۔

ایسے میں مجھے اپنی خاموشی ہی بھلی لگی۔

کچھ دیر بعد میری بیوی نے مجھے پکارا۔

"اجی سنتے ہو۔؟"

"میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہے گی؟"

"یہ پنجرہ اتنی بلندی پر ـــ اور ـــ طوطا تو کب کا آخری جست پنجرے سمیت لگائی ہوگی۔ تم نے دیکھا تھا نا، کہ صوفے پر چڑھ کر وہ بلندیوں کی طرف کتنی حسرت سے تک رہا تھا۔ اور اسی لئے میں نے قید کروا دیا تھا اُسے۔

اس سے بہتر تو یہی تھا کہ اس کے پر پھر سے کٹوا دیتیں۔ پر کتر کر بھول جانے میں دونوں کی عافیت ہے۔ اس کی بھی جس کے پر کتر دیے گئے ہوں۔ اور اس کی بھی جس نے پر کاٹ دیے ـــ دیکھو نا اللہ نے اپنا جی بہلانے کے لئے کیسے کیسے انسان پیدا کر دیے اور بھول بیٹھا، ورنہ فرشتے دنیا میں اتارے جاتے تو دو ہی دن میں سسک سسک کر مرنے کی تمنا میں مر جاتے

بن کر ابھرتے رہے ـــــ گاندھیائی فلسفوں نے کھدّر کے نیچے اپنے گوشت پوست کے وجود کو چھپائے رکھا۔ گوشت پوست کے یہ فلسفے خود بھی چیونٹیاں بن کر مویلیوں میں شامل ہو گئے اور ہندوستان سے چمٹ گئے ـــ یہ بھی غنیمت ہے کہ ابھی ہندوستان ہانپتا ہوا دکھائی دے رہا ہے ـ یہ تنفس کیا زندگی کی علامت نہیں ہے۔ کلرک بابو سے لے کر ٹرے جینا تک ایک خونی رشتہ ہے جو بس چلا جا رہا ہے۔ کلرس بلڈ کا رشتہ COLOURLESS BLOOD سفید ہو گیا ہو ـــــ اور اس سفید خون کو ہندوستان کے گرم سرخ خون کی ضرورت ہے۔ اور میری بھارت ماں اپنا سرخ گرم خون سفید خون میں ملائے جا رہی ہے، ملائے جا رہی ہے، صرف یہ کہہ کر کہ سفید خون بھی رنگ پکڑ لے گا۔

لیکن میں کیوں ہر چیز سے اس طرح جڑ جاتا ہوں ـــــ طوطا جن آم کے ٹکڑے کو چھوڑ گیا تھا وہ بھی میں ہوں ـــــ گوداوری کی زیریں رو بھی میں ہی ہوں جو کبھی سڑکوں پر نکل جاتی ہے، کبھی ان پجروں میں داخل ہو جاتی ہے جن میں پنچھی اپنے جسم چھوڑ گئے ہیں ـــــ یہ پنچھی بھی میں ہوں، یہ پجرہ بھی میں ـــــ جہلما بہ کی چھت سے دیکھی جانے والی مدھم روشنی بھی میں ہی۔ ہندوستان کا گرم خون بھی میں ہی ـــــ پھر وہ دونوں کون ہیں ـــــ وہ بھی میں ہی تو نہیں۔

زندگی اس طرح کہاں ختم ہوتی ہے ـــ کہانیوں میں بھی تو نہیں ہوتی ـــــ دادی اماں کہانی سناتی تھیں تو سبز پری کے قید ہو جانے کا بھی ان کے پاس جواز تھا۔ راکشسوں کے ہاتھوں شہزادے کی صورتوں کا بھی اور اس کہانی میں کسی کی موت واقع ہوتی تو سارے حالات اس طرح پیدا کیے جاتے کہ موت حقیقی معلوم ہوتی یقینی معلوم ہوتی ـــــ لیکن وہ دیکھو اس طرح مجھ سے جدا ہوئے کہ میں اپنے اللہ سے بھی کچھ نہ پوچھ سکا ـــ کچھ مانگ نہ سکا۔ حقیقتوں کو اس طرح کہانی بنتے ہوئے کم ہے کو کسی نے دیکھا ہوگا ـــــ میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کو میرا قلم مر مر کر جیوں تب بھی نہیں دکھا سکتا ـــــ کہانی کا حقیقت بننا تو کچھ میں آتا ہے ـــــ لیکن سانس لیتی ہوئی زندہ حقیقتیں پل بھر میں کس طرح کہانی بن کر رہ جاتی ہیں ـــــ میں کس سے کچھ پوچھوں۔ کون بتلائے گا مجھے؟

کاتب تقدیر نے سب کچھ پہلے ہی لکھ دیا تھا ـــــ اور اس طرح لکھا تھا کہ مجھ سے کچھ پڑھا نہ گیا ـــــ مجھے شکایت بھی نہیں ـــــ لیکن آج جب کہ میرے قلم کی روشنائی نے اپنا رنگ کھو دیا ہے تو مجھ سے اپنی تحریر بھی پڑھی نہیں جاتی۔ اس کی شکایت تو میں کر سکتا ہوں ـــ محدب شیشے بھی الفاظ کو آنکھوں کے آگے ابھار تو کر سکتے ہیں معنی نہیں پہنا سکتے ـــــ اور وہ آنکھوں پر پڑا ایک پردہ سا، جو کبھی بھیگی چلمنوں کا کام دیتا تھا ـــ اس پردے سے چھنتی ہوئی نظروں میں اتنا کس بل تھا کہ لفظوں کا مفہوم متعین کرتی تھیں ـــــ وہ چلمنیں جانے کس نے اس طرح لپیٹ کر رکھ دیں کہ آج آنکھیں ان چلمنوں کو ترستی ہیں ـــ

میں نے پلیٹ فارم پر اس کو خدا حافظ کہا تھا۔ نظروں سے اوجھل ہونے تک اس نے اور میں نے رومال ہلائے تھے۔ اس کے بعد وقت چند ثانیوں کے لیے کچھ ٹھہرا ٹھہرا سا لگا تھا ـــ پٹریاں دور دور تک چمک رہی تھیں اور میں چمکتی ہوئی پٹریوں کو زیادہ دور تک جا کر اٹھا لایا تھا ـــ کچھ دن میں انھیں پٹریوں پر سوتا اور جاگتا رہا ـــ پھر سڑکوں، بازاروں اور دفتروں نے مجھے گھسیٹ گھسیٹ کر پٹریوں سے جدا کیا ـــ پھر زندگی بھاگنے لگی اور میں نے اس کو رجھانے کے لئے اس کا پیچھا کیا لیکن وہ بجائے اس کے کہ وہ مِل جاتی پلٹ پلٹ کر بے تحاشہ مجھ پر پتھراؤ کرتی رہی ـــــ مجھے رحم بھی آئے کہیں کبھی۔ ڈھیر ساری دھجیوں کو دیکھ کر کبھی کبھی کسی کو یہ خیال بھی آیا ہے کہ انھیں جوڑ جوڑ کر ٹانکے لگائے جائیں ـــ بوڑھا وقت بیچ راستوں میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ رہتا ہے اور اپنے اطراف بکھری ہوئی دھجیاں دھجیاں زندگی کو آوازے لگا لگا کر فروخت کرتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے ساری دھجیاں خرید لوں اور وقت کے منہ پر پھینک کر کہوں ـــ اب تیرے پاس کیا رہ گیا ہے۔ لیکن یہ بوڑھا شاطر

انگڑائی لے کر اس ادا سے اٹھتا ہے کہ پہچانا ہی نہیں جاتا۔ اس کے چہرے کے نقوش تک بدل جاتے ہیں۔ اب میں یہ دھجیاں کس سے خریدوں گا؟

ایک رات جب میں اپنے گھر پہنچا، بہت سارے رشتہ دار جمع تھے۔ میں نے دیوانوں کی طرح ان سے پوچھا۔ وہ کہاں ہے؟ وہ بھی تو تمہارے ہی ساتھ تھا

سبھوں نے کہا، صبر کرو۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔

میں نے کب کس سے کہا کہ میں نے تو پہلے بھی صبر کیا اور اس سے پہلے بھی صبر کیا ہے۔ اور اب بھی صبر کروں گا ـــ لیکن اللہ کو میرے کچھ منظور کیسے ہو جاتا ہے ـــ اب میں زندگی بھر اس سے یہی پوچھتا رہتا ہوں کہ میرے مالک تجھے یہ سب کچھ منظور کیسے ہوا ـــ اس کے پاس کچھ تو جواب ہوگا ہی ـــ اور مجھے اس کے جواب کے انتظار میں رکھ کر وقت نے ایسی صورتیں بدل لیں ـــ وہ ان دونوں کے ساتھ وہیں ٹھہر گیا۔ ـــ پھر اس نے اپنا نصف حصہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا، تم آگے بڑھ جاؤ۔ میں ان کے ساتھ بھی ہوں، تمہارے ساتھ بھی۔

کتنے برس بیت گئے۔ راستوں کی گرد کو پلکوں کا غازہ بنائے ہوئے۔

کتنے برس بیت گئے سمندروں کی ساری گہرائیوں کو سینے میں چھپائے۔

اب تو ہم اکثر باتوں میں سطحی یا کروشی ہو جاتے ہیں لیکن آج بھی ان کی صورتیں بھلائے نہیں بھولتیں ـــ ان کے ساتھ جو وقت کٹ کر الگ ہو گیا تھا، وہ عمر کی اسی منزل میں انھیں کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے اور جو وقت میرے ساتھ چلا تھا اس نے ایسے ایسے آئینے بتلائے کہ میں خود ہی کو ڈھونڈنے نکل پڑا ـــ ہاتھ پاؤں شل ہو گئے، تو صبر کیے بیٹھا ہوں ـــ انھیں آتے ہوئے دیکھتا ہوں تو ٹوک نہیں سکتا اور جاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو روک بھی نہیں سکتا۔

وہ تو ہاتھ میں ہاتھ دیے دہلیز تک چلے آتے ہیں۔
میرے مالک تجھے یہ سب کچھ منظور کیسے ہوا؟

خواب صورت

سریندر پرکاش

اُس رات میں نے رسولِ اکرمؐ کو خواب میں دیکھا تھا۔

وہ ایک کھیت کے کنارے کھڑے، چند کسانوں سے باتیں کر رہے تھے۔ اور کھیت میں لہلہاتے ہوئے خوشوں میں سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

ان کی شبیہ ویسی ہی تھی جیسی کہ روزمرہ کی بات چیت سن کر ذہن میں محفوظ ہو چکی تھیں۔ سر پر بڑا سا سفید عمامہ تھا اور انھوں نے سبز رنگ کا عمامہ اوڑھ رکھا تھا۔

کسان جب اپنی بات ختم کر چکے تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ کلی کی طرح کھِلی۔ کسانوں نے اپنے ہاتھ پیٹ پر باندھ لئے۔ انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کر کے انھیں کچھ سمجھایا۔ کسانوں نے حامی بھرنے کے انداز میں اپنے سر ہلائے۔ تب وہ وداع ہوئے اور آہستہ آہستہ کھیت کی بنڈھیر پر چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ پھر ان کا سبز عمامہ کھیت کی ہریالی کا حصہ بن گیا اور وہ کائنات کی وسعت میں سما گئے۔

تب میں بہت چھوٹا تھا ——

میں نے صبح کو اپنی ماں کو اپنا خواب سنایا —— اس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ کر کہا۔

"واہگورو، واہگورو!" اور بولی۔ "خوش حالی آنے والی ہے!"

پھر وہ لپک کر کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ چوتھی سیڑھی پر سے کر اس نے پڑوسیوں کی دیوار سے اوپر سے جھانک کے دوسری طرف آواز لگائی۔

"فاطمہ بہن!"

تھوڑی دیر کے بعد میری ماں ہی کی ہم عمر ایک عورت کا چہرہ نمودار ہوا۔ —— اس نے کانوں میں بڑی بڑی گچھے دار بالیاں پہن رکھی تھیں اور سر پر سیاہ دوپٹہ تھا۔

"کیا ہے رام پیاری؟" اس نے سج سبھاؤ سے پوچھا۔ جیسے اس قسم کا بلاوا ایک معمول سا ہو۔ میری ماں نے قدرے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"سنا تم نے اپنے جھندی کو رات میں کیا سپنا آیا؟"

"نہیں تو —— تو کیا آیا اُڑ بیٹے؟"

اور میری ماں نے میرا دیکھا ہوا خواب بہن فاطمہ کے گوش گذار کر دیا۔

"اللہ۔ بہن!" فاطمہ پوری عقیدت سے بول اٹھی۔ "کہاں ہے نی اب؟"

"پیچھے گلی میں بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہے" میری ماں نے بتلایا۔

"ایسی خصمان کھانے نے کیا ثواب کما لیا ہے!" فاطمہ کا چہرہ کہتا ہوا دیوار سے نیچے لڑھک گیا۔

میں گلی میں دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر شاپو کھیل رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور سب طرف سناٹا تھا۔ ایسے وقت میں گھروں کے دروازوں پر بندھی گائیں اور بھینسوں کی ڈکرانے کی آوازیں بڑی عجیب لگ رہی تھیں۔ وہ شاید نہر پر نہانے جانے کو اتاولی ہو رہی تھیں مگر گوبرا ابھی نہیں آیا تھا۔

ہمارے گھر کے سامنے والے لڑکیوں کے اسکول میں ابھی چھٹی نہیں ہوئی تھی۔

شٹاپو بھی عجیب کھیل ہے۔ زمین پر لکیریں کھینچ کر کنوئیں، دریا اور سمندر بنائے جاتے ہیں اور بوٹ پالش کی ایک خالی ڈبیا سے بشارت لے کر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ہمیں اب کائنات کے کون سے خطے کو پھلانگنا ہے۔ باری میری تھی اور میں تیسرا دریا پھلانگنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ کہ فاطمہ نے پیچھے سے آکر مجھے اپنی باہوں میں بھر لیا۔

" اللہ کیا ہوا اسے ساری بات تو بتا۔ سبحان اللہ، تم پہ تو رنگ چڑھا لگتا ہے۔ کیا رتبہ پالیا ہے۔"

وہ اٹھائے اٹھائے مجھے اپنے گھر کی طرف لئے جا رہی تھی۔ ماں اوپر سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی اور بچے سب دم بخود سے کھڑے فکرمند ہو گئے تھے۔ کہ کھیل میں سے اچانک ایک کھلاڑی کے اٹھ جانے سے وہ سارا کچھ پھر سے کیسے منظم کر پائیں گے۔

فاطمہ کے شوہر شیخ اللہ دتہ بازار میں مکان کے پیچھے بانسوں کا کاروبار کرتے تھے۔ لمبے لمبے بانس تو سائبان تانے اور مکان وغیرہ بنانے کے کام آتے تھے لیکن چھوٹی لاٹھیاں لوگ علم اور بھالے بنانے کے لئے لے جاتے تھے جو کہ بعد میں مرنے مارنے کے کام آتی تھیں۔ فاطمہ نے ان کو لفظ بھیج دیا تھا۔ دوسرے پاجامہ کے لئے لٹھے کا ٹکڑا اور قمیص کے لئے پاپلین، ایک سیر جلیبی اور سوا روپیہ نقد لے کر آ پہنچے۔ فاطمہ نے وہ سب میری جھولی میں ڈالا اور مراقبے میں گر گئی۔ شیخ اللہ دتہ دونوں گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے تھے۔ فاطمہ آنسوؤں سے تر آواز میں کسمسانے لگی

" ہمارے رسولؐ، ہمارے رسولؐ"

سچ کے حال کی سی کیفیت میں سر کو ایک بار دائیں اور ایک بار بائیں جنبش دے کر سرگوشی کی۔

" آ میں ــ تم آ میں۔"

شہر کے مرکزی گھنٹہ گھر نے ساڑھے بارہ بجائے۔ لڑکیوں کے سکول میں چھٹی کی گھنٹی بجی۔ گائیں اور بھینسیں رسیاں کھلتے ہی نہر کی طرف بھاگیں۔ بچوں کی ایک پارٹی نے دوسری پارٹی کو ایک گیم سے ہرا دیا۔ جیسے سب طرف حشر سا برپا ہو گیا ہو۔

اس بات کو کئی برس بیت گئے ہیں۔

شہر کے مرکز میں ایستادہ گھنٹہ گھر نے کچھ ضرور بجایا ہوگا۔ لڑکیوں کے سکول میں چھٹی کی گھنٹی بجی ہو گی۔ گائیں بھینسیں ڈکراتی ہوئی نہر کی طرف بھاگی ہوں گی اور زمینوں پر لکیروں سے بنے کنوئیں، دریا اور سمندر بھی پھلانگے جاتے ہوں گے ــــ لیکن کوئی آواز نہیں آتی۔

" ماں اب کبھی پھر ویسا خواب نہیں آیا!" میں نے پوچھا۔

" اب کہاں بیٹا ــــ" وہ اُدھر گئے اور ہم یہاں آ گئے۔" ماں نے جواب دیا۔

ماں اچانک بیمار پڑ گئیں تھیں۔ بہت علاج کروایا لیکن فائدہ نہ ہوا۔ ڈاکٹر نے ایک دن کہا "بہتر ہے کسی سینی ٹوریم میں داخل کروا دو" کافی دوڑ دھوپ کے بعد اُس گاؤں کے سینی ٹوریم میں جگہ مل سکی۔ ماں اس سینی ٹوریم میں ساڑھے تین برس رہیں۔ جس صبح اُس کی موت ہوئی۔ اس سے پہلی شام میں اور میری بیوی اس کے پاس تھے۔ وہ بالکل بھلی چنگی لگ رہی تھیں۔ چہرے پر چمک تھی آنکھوں کی پتلیوں میں ستارے سے ٹوٹتے دکھائی دیتے تھے۔ مارگریٹ نے اس کے سر کے چاندی سے سفید بال سنوار کر پیچھے جوڑا بنا دیا تھا۔ ایسی صحت مند وہ کبھی بھی دکھائی نہیں دی تھی ہم دونوں شام کی بس سے لوٹ آئے تھے۔ گھر میں بچے اکیلے تھے۔ اور پھر مارگریٹ نے کسی لہجے میں کہا تھا۔

" آپ لوگ جائیے۔ ماں بالکل ٹھیک ہیں۔"

مارگریٹ سینی ٹوریم میں کیئر ٹیکر تھی اور میری راکھی بہن بن گئی تھی ہوا یوں تھا کہ ایک بار جب میں اسی طرح ماں کو دیکھنے آیا تھا تو اتفاق سے اس دن راکھی کا تیوہار تھا۔ میں بیٹھا ماں سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا کہ مارگریٹ آئی اور میری کلائی پر راکھی باندھ دی۔ میں بوکھلا سا گیا تھا۔

" ماں جی نے مجھے بیٹی بنا لیا ہے۔" مارگریٹ نے بتایا۔

ماں تھی ہی ایسی جہاں جاتی لوگوں کا من موہ لیتی تھی۔ مجھے یاد ہے تایا جی مرتے دم تک ماں کے عشق میں مبتلا رہے تھے۔ کئی بار ماں کے رخسار

کو چھوکر اور نظریں اس کے چہرے پر گاڑ کر انھیں، میں نے آنسو بہاتے دیکھا تھا۔

"پتا جی کہا کرتے تھے" بیٹا من میں کبھی تعصب نہ لاؤ۔ عقیدہ پکا رکھو جو کچھ پڑھو، اسے بھگوان کے بھیجے ہوئے شبد سمجھو — ورنہ کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اور رہے قمر الدین کے قمرالدین رہ جاؤ گے؟ ان کی عجیب عادت تھی — وہ جس کا نام رہ جاتے یا اسے جاہل کہنے قمرالدین کہہ کر پکارا کرتے۔ ان کی بات زندگی کی کسوٹی پر کئی بار کھری اتری۔ میں نے اکثر دیکھا کہ کوئی قمرالدین اپنے رٹے ہوئے علم، اونچے قد، لمبی شرح اور چہرے پر چپکائی ہوئی چھوٹی مسکراہٹ کے بل بوتے پر کوئی عہدہ پا لیتا ہے۔ مگر اس کے سر میں بھیجا کتنا ہے۔ کوئی وزن نہیں کرتا۔

مرنے کے بعد ماں کا مردہ بھاری ہو گیا تھا۔ ہم کو اس کی موت کی خبر اگلے دن دوپہر کو مل گئی تھی۔ مارگریٹ نے سینی ٹوریم کے ایک کارکن کو ایڈریس دے کر بھیجا تھا۔ میں بیوی بچوں سمیت اس گاؤں پہنچا۔ مارگریٹ سینی ٹوریم کے صدر دروازے پر سوگوار بیٹھی تھی۔ جیسے ہی ہم وہاں پہنچے وہ باری باری سب کے گلے لگ کر روئی۔ وہیں اس گاؤں کے چھوٹے سے شمشان میں ماں کا انتم سنسکار کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی جیسے زندگی کی کتاب کا ایک ادھیائے سمایت ہو گیا

اس دن کے بعد وہ گاؤں ہمارے لئے ایک تیرتھ استھان سا بن گیا۔ ہر راکھی کو وہاں جاتے۔ مارگریٹ مجھے راکھی باندھتی اور پھر ہم سب شمشان میں جا کر بیٹھتے اور ماں کی باتیں کرتے۔ اس دن کے بعد سے مارگریٹ گویا ہمارے خاندان کا ہی ایک فرد بن گئی تھی۔

بس اپنی مخصوص رفتار سے اس گاؤں کی طرف چلی جا رہی تھی۔ باہر وہی بارہا دیکھا ہوا منظر تھا۔

"رستے کی دوست مرد کا سایہ۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک قمرالدین نے دوسرے قمرالدین کو ہنسی کھیل میں گالی دی۔ میں نے ایک بار پلٹ کر دونوں کو دیکھا اور پھر کھڑکی کے باہر بارہا دیکھا ہوا منظر دیکھنے لگا۔

دو متوازی پہاڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں ان کی چوٹیوں پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ مطلع ابر آلود تھا۔ پہاڑیوں کے دامن میں سرخ ٹائیلوں کی چھتوں والے کئی مکان دھرے ہوئے تھے۔ کسی کی کھڑکی کھلی تھی —

کسی کا دروازہ۔ گھروں کے اندر دھندلکا تھا۔ اندر کی کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ ہوا بوجھل تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں جھکی ہوئی کھڑی تھیں اور فضا میں گیلی مٹی کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی۔ سب طرف جل تھل تھا۔ چلتی ہوئی بس بالکل بے حرکت لگ رہی تھی۔

کل راکھی کا تیوہار تھا۔ اور میں اکیلا ہی مارگریٹ سے راکھی بندھوانے جا رہا تھا۔

اس گاؤں در اصل تین حصوں میں بٹا ہوا ہے — پہلے حصہ میں ایک عالی شان مندر ہے جس کے گنبد کا کلس دور سے ہی دکھائی دینے لگتا ہے — اس پر گیروے رنگ کا ایک جھنڈا لہراتا رہتا ہے۔ مندر کی عمارت بڑی شان دار اور پختہ ہے۔ ایک اونچی چار دیواری مندر اور اس کی عمارت سے ملحقہ گیسٹ ہاؤس کو گھیرے ہوئے ہے گیسٹ ہاؤس کے تمام کمرے ایر کنڈیشنڈ ہیں جن میں امریکہ، آسٹریلیا اور یورپ سے آئے ہوئے ان سوامی جی کے عقیدت مند آکر ٹھہرتے ہیں جن کے نام پر یہ مندر تعمیر ہوا ہے۔

وہ سوامی جی کون تھے وہ پوری طرح سے کوئی نہیں جانتا ایک پور آتما جو ایک دن اس دھرتی پر آ اتری۔ اور پھر یہیں کی ہو گئی — سوامی جی کی تصویریں جا بجا لگی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ لنگوٹ باندھے باقی شریر سے بالکل ننگے ہیں۔ ایک ہاتھ اٹھا کر عجیب دیوتاؤں کی سی شان سے بیٹھے ہیں جیسے سارے سنسار کو آشیرواد دے رہے ہوں۔ کسی کسی تصویر میں ان کے سامنے ایک چھوٹا سا ناگ بیٹھا دکھائی دیتا ہے جو ان کی شکتی کے سامنے گویا نتمستک ہو گیا ہے۔ مندر کے بڑے ہال کا ماحول بڑا پر اسرار ہے۔ گھپ اندھیرے میں ان کی سونے سے بنی مورتی چمکتی ہے۔ سوامی جی خوبصورت سے غلام خشیم تھے۔ ان کا چہرہ گیند کی طرح گول تھا۔ مندر میں دن رات تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد آرتی ہوتی ہے جس میں غیر ملکی اور مقامی عقیدت مند قطاروں میں کھڑے ہو کر آرتی گاتے ہیں ایک بھگت ہارمونیم پر ساتھ دیتا ہے اور لاؤڈ اسپیکر سے یہ سُر تال اونچے اوپر آکاش کی وسعت میں پھیلا دی جاتی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ سرشٹی کی ابتدا سے ہو رہا ہے۔

مندر ہی کی عمارت میں ایک طرف ایک مدر لسٹی بینک کی برانچ ہے سامنے

ایک صاف ستھرا ریستوراں ہے۔ جس میں ایک راستہ پیچھے پارک میں جاتا ہے۔ پارک میں کئی پھل دار درخت ہیں۔ اور طرح طرح کے پھولوں کی کیاریاں — غیر ملکی اور مقامی عقیدت مند، یہاں فرصت کے وقت میزوں کے گرد بیٹھ کر چائے کافی پیتے ہیں اور گپ شپ لڑاتے ہیں۔

ریستوراں کے ساتھ ہی مندر کے نام پر بنا پوسٹ آفس ہے جس کے باہر بس اسٹینڈ کا شیڈ ہے — پکّی سڑک کے ایک طرف چند دکانیں ہیں۔ جن میں ایک لانڈری اور ایک پرویژن اسٹور ہے — اور دوسری ضرورت کی چیزوں کی دکانیں۔ مندر سے بہت فاصلہ پر بنی سڑک کے کنارے بنے ایک مکان میں ولایتی شراب کی دکان ہے — آرتی کے سُر فضا میں گونجتے رہتے ہیں — اور سڑک پر خاصی چہل پہل رہتی ہے۔

اس گاؤں کے دوسرے حصہ میں سینی ٹوریم ہے۔

متعدی بیماریوں کے مریض بوڑھے اور بوڑھیاں شہر کی دھول مٹی اور کارخانوں کی زہریلی ہوا سے دور۔ خریدی ہوئی سانسیں، سینی ٹوریم میں لیتے ہوئے ادھر ادھر ٹہلتے ہیں یا پھر سردیوں کی دھوپ میں آرام کرسیاں ڈال کر چہروں پر ہاتھ رکھے آسمان کی طرف دیکھتے بیٹھے نظر آتے ہیں — اسی علاقہ میں گندھک کے پانی کے چشمے ہیں — تیرا کی کا لباس پہنے غیر ملکی عقیدت مند اور شہر سے آئے ہوئے مرد عورتیں اپنے کندھوں پر تولئے ڈالے اُن چشموں کی طرف جاتے اور آتے رہتے ہیں۔

اگر مندر والے حصہ میں آتمک شُدھی کی کریا چلتی رہتی ہے۔ تو اس حصہ میں شریر کو نروگ رکھنے یا کرنے کی کوشش جاری رہتی ہے — دونوں حصوں میں چہل پہل ہے۔ لوگ روپیہ خرچ کرکے روحانی اور جسمانی زندگی لے رہے ہیں۔ مارگریٹ کا گھر اسی حصہ میں سینی ٹوریم کے پچھواڑے واقع ہے۔ ہم لوگ یہاں آئیں تو مارگریٹ کے گھر ہی ٹھہرتے ہیں۔ وہ شہر آئے تو ہمارے ہاں رہتی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا نا — کہ ہم قریب قریب ایک ہی خاندان کے فرد ہوگئے ہیں۔

اور اس کا تیسرا حصہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔

صدیوں پہلے یہ گاؤں بسا ہوگا — کئی بار اس گاؤں کے گھروں کے چھپر آندھی میں اڑ گئے ہوں گے اور سیاہی مائل ہاتھوں نے نئے گھر تعمیر کئے ہوں گے۔ ان گھروں کے گرد پھیلے ہوئے کھیت کروڑوں برس پرانے ہیں — اور اس گاؤں کے اس حصہ کے گاؤں میں بسنے والوں نے ان کھیتوں سے لاکھوں بار اپنے مقدر کی فصل کاٹی ہوگی — وہ سب جو ان گھروں میں رہتے ہیں ادھ ننگے ہیں۔ ان کے جسم دھوپ کی تمازت کی وجہ سے کالے ہوگئے ہیں — ان کی عورتوں کی چھاتیاں، جسم سا پر لگے ہوئے پھلوں کی طرح لٹکتی رہتی ہیں۔ ان کے کانوں میں کئی چھید ہیں جن میں چھوٹی بڑی چاندی کی بالیاں جھولتی ہیں۔ ان کے گھر اندھیرے ہیں اور ان کی عورتیں پینے کے لئے دور گندے تالابوں سے پانی مٹکے مٹکے بھر بھر کر لاتی ہیں۔

اس گاؤں کے مندر والے حصے اور اس حصہ میں کئی صدیوں کا فاصلہ ہے ایک پکی سڑک اس طرف سے اس طرف آتی ہے جو یہاں پہنچ کر کسی کھیت میں گم ہو جاتی ہے اور پھر ان گنت پگڈنڈیاں شروع ہوتی ہیں جو کہیں گھروں کے آگے سے اور کہیں کھیتوں کے درمیاں میں سے گذرتی ہوئی نامعلوم اطراف میں بکھر جاتی ہیں۔

ایک بار جب میں یہاں آیا تو یونہی گھومتا پھرتا ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں مجھے وہ کھیت نظر آیا جس کے خوشوں میں سے شعاعیں پھوٹتی تھیں — جس کے کنارے چند کسانوں کو میں نے ان سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔

"اوہ! تو یہیں ہے اس خواب کا کھیت یہاں واقع ہے!"

میں نے من ہی من کہا۔ اور کافی دیر کھڑا وہاں انتظار کرتا رہا۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ سب طرف سناٹا تھا۔ ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی گذرتی تھی — اور کبھی کبھی کسی پرندے کی چہچہاہٹ سنائی دے جاتی تھی۔ لیکن وہاں کوئی نہ آیا — کھیتوں میں ہریالی لہلہا رہی تھی۔

بس اسٹینڈ پر اتر کر اپنا بیگ اٹھایا اور مارگریٹ کے گھر کی طرف چل دیا۔ میں اب راستوں سے خوب واقف ہوں آنکھیں بند کرکے پہنچ سکتا ہوں — راستہ میں ایک جگہ میں نے ایک بھیڑ دیکھی۔ چند کاریں اور پولیس کی گاڑیاں بھی وہاں کھڑی تھیں۔ سفید اجلے لباسوں میں کچھ لوگ بڑے مصروف نظر آئے۔ میدان میں ایک سائبان تنا ہوا تھا جس کا رنگ برنگا

کیڑا ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ سائبان کے اندر پتلے کاغذ کی جھنڈیاں لگی تھیں۔ ایک طرف ایک بڑی میز اور چند کرسیاں پڑی تھیں۔ میں یہ نظارہ دیکھنے کے لیے رک گیا ۔۔۔ قریب گیا تو دیکھا کہ سائبان کے نیچے وسط میں ایک ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ جس کے گلے میں پھولوں کے ہار پڑے تھے۔ قریب ہی ایک ہون کنڈ بنا ہوا تھا ۔۔۔ جس کے ایک طرف ادھیڑ عمر کا ایک برہمن پوجا کر رہا تھا ۔۔۔ معلوم ہوا کہ علاقے کے وزیر صاحب آئے ہیں۔ گاؤں والوں کے لیے پینے کے پانی کی سہولت کے لئے ہینڈ پمپ کا اودگھاٹن ہونے جا رہا ہے۔

ہون کنڈ میں سامگری جل رہی تھی۔ فضا میں منتر گونج رہے تھے ۔۔۔ منتر جب ایک خاص مرحلہ پر پہنچتا تو سب ہون کنڈ میں سامگری ڈال دیتے وزیر صاحب بھی ۔۔۔ جن کے گلے میں بھی ایک ویسا ہی پھولوں کا ہار پڑا تھا جیسا کہ پمپ کے گلے میں۔

پوجا ختم ہوئی تو وزیر صاحب نے ناریل پھوڑا ۔۔۔ میں نے وزیر صاحب کی جے کا نعرہ لگایا اور تالیاں بجائیں ۔۔۔ وزیر صاحب نے ہینڈ پمپ کا ہتھا پکڑ کر دبایا ۔۔۔ پمپ کے دہانے سے پانی ابل پڑا ۔۔۔ وہ پہلا پانی ایک برتن میں لیا گیا اور پھر چرن امرت کی طرح سب میں بانٹا گیا ۔۔۔ سب نے چلو میں لے کر پانی کو منہ لگایا اور پھر ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنے سر کے بالوں سے پونچھ دیے۔

میں نے مارگریٹ کو دیر سے گھر پہنچنے کی وجہ بتائی تو اس نے کہا۔

"ہاں بیچارے گاؤں والوں کو پینے کے پانی کی بہت تکلیف ہے۔ گندے تالابوں کا پانی پیتے ہیں۔ بہت اچھا ہوا۔"

پروگرام یہ طے پایا کہ میں صبح ناشتہ کھا کر پہلی بس سے نکل جاؤں گا ۔۔۔ شہر کو جانے والی پہلی بس صبح ساڑھے آٹھ بجے جاتی تھی۔

مارگریٹ آخری راؤنڈ لگانے کے لئے سینی ٹوریم گئی۔ میں یونہی سستانے کے لیے اس کے پلنگ پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے نیند آگئی ۔۔۔

مارگریٹ نے واپس آ کر جب مجھے جگایا تو رات ہو چکی تھی اور کھانا میز پر لگا تھا۔ ہم دونوں نے کھانا کھایا ۔۔۔ مارگریٹ نے کہا کہ میں اس کے کمرے میں اس کے پلنگ پر سو جاؤں۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کھانے کا خمار اور پھر بس میں بیٹھے رہنے کی تھکاوٹ کی وجہ سے پڑتے ہی سو گیا۔

پھر ایک خواب ناک فضا قائم ہونے لگی۔ بچپن میں دیکھا ہوا خواب ' فاطمہ کا کشمکش کرتا ہوا چہرہ ۔۔۔ ماں کی جلتی ہوئی چتا اور پھر کئی جانے انجانے چہرے اس طرح میرے گرد منڈلانے لگے جیسے دھاگوں سے باندھ کر چھت سے لٹکا دئے گئے ہوں۔ میں چاہ رہا تھا کہ بچپن میں دیکھے ہوئے خواب کی طرح ایک بار پھر دیدار ہو جائیں ۔۔۔ لیکن لگتا تھا۔ اس نظارے کو کسی نے نظر بند کر رکھا ہے۔ میں اپنے حواس کے جنگل سے نکل کر کسی دوسری دنیا میں جا پہنچا۔

میرے نتھنوں میں کسی جسم کی مہک بس گئی ۔۔۔ اور اچانک ایسا ہوا کہ میں نیند کا تار و پود توڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

"یہ میں نے کیا کیا ۔۔۔ ؟" میں بڑبڑایا۔ جواب یہ تھا کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ بس کچھ ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے جو کچھ کیا یا دیکھا تھا وہ عمل انتہائی شرمناک تھا۔ میں اس کے لئے اپنے ہی سامنے نادم ہو رہا تھا۔ جہالت کے جنگل سے تہذیب کی وادی تک کے سفر کے باوجود میرا ذہن روشن نہیں ہوا تھا ۔۔۔ کمرہ بالکل اندھیرا تھا۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ماچس کی تیلی جلا کر دیکھا۔ ساڑھے تین بجے تھے۔

اس شرمناک عمل نے میرے تمام حواس معطل کر دئے تھے۔ ذہن قریب قریب ماؤف تھا۔ اور کنپٹیوں پر ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔ میں نے لائٹ جلائی اور سگریٹ سلگایا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"ہے بھگوان' یہ سب کیسے ہو گیا ۔۔۔!" میں نے آپ سے سرگوشی کی مجھے کسی پل چین نہیں تھا۔ میں نے خواب میں مارگریٹ کے ساتھ مباشرت کی تھی۔

صبح میں بہت جلد تیار ہو گیا۔ مارگریٹ آئی اور اس نے میری

راکھی باندھی میرے منہ میں مٹھائی کا ٹکڑا ڈالا۔ میں نے اسے ایک سوا ایک روپیہ دیا ۔۔ ہم دونوں بالکل خاموش تھے۔ یہ سارا کچھ اپنے آپ ہو رہا تھا۔ میں نے چلنے کے لئے بیگ اٹھایا۔

"اتنی جلدی ؟ مارگریٹ نے کہا۔

"آہستہ آہستہ نکل جاؤں گا۔ تمھیں بھی تو ڈیوٹی پر جانا ہوگا"۔ میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

چلتے، چلتے میں اس کھیت تک جس کے خوشوں سے شعاعیں پھوٹتی تھیں۔ کافی دیر وہاں کھڑا رہا۔ سوچا کر شاید کچھ طمانیت نصیب ہو۔ وہاں کوئی دکھائی نہ دیا۔ "میں کس کا منتظر ہوں؟" میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ____ اس بار مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ پہاڑی کے پیچھے سے سورج دھیرے دھیرے نمودار ہو رہا تھا۔ کھیت کے کنارے کوئی نہیں تھا۔

میں چلتا ہوا سڑک کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر اس مقام پر پہنچ گیا ۔۔ جہاں کل سائبان تنا ہوا تھا۔ اب سائبان غائب تھا۔ ہون کنڈ ٹھنڈا پڑا تھا۔ پوجا کا سامان ادھر ادھر بکھرا ہوا پڑا ہوا تھا۔ ہینڈ پمپ کے گلے میں پڑا پھولوں کا ہار مرجھا گیا تھا۔

گاؤں کی طرف سے ایک ادھیڑ عمر کی سیاہ فام عورت سر پر مٹی کا مٹکا رکھے آ رہی تھی۔ اس کے کانوں میں چاندی کی بالیاں جھول رہی تھیں پیشانی پر ٹاٹو سے کچھ شبیہ سی بنی تھی۔ اس کے بال اوپر سے بکھرے ہوئے تھے۔ اور پیچھے جوڑا بندھا ہوا تھا۔ وہ سیدھی پمپ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

میں نے سوچا یہ پہلی عورت ہے جو اس ہینڈ پمپ کا پانی پینے کے لئے اپنے گھر لے جائے گی۔۔۔ میں ہینڈ پمپ کے منہ سے پہلا پانی نکلنے کا منظر دیکھنے کے لئے رک گیا۔

عورت پمپ کے قریب آئی ۔۔۔ اس نے اپنا مٹکا زمین پر رکھا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر ہینڈ پمپ کو پرنام کیا ۔۔۔ پھر وہ سیدھی ہوئی ۔ اس نے اپنا مٹکا اٹھا کر دوبارہ سر پر رکھا اور اس سمت بڑھنے لگی جدھر گندے پانی کا وہ تالاب تھا جس میں سے وہ ہر روز پینے کا پانی لے جایا کرتی تھی۔

▲▲

انتظار

انتظار حسین

"یار کب آئے گا وہ؟ مجھے تو نیند آنے لگی۔"

"ابھی سے؟ ابھی کون آدھی رات ہو گئی؟"

"یار میری عجب عادت ہے۔ ویسے میں رات بھر جاگ لوں۔ لیکن اگر کسی کا انتظار کرنے کو کہا جائے تو پھر آنکھوں میں نیند تیرنے لگتی ہے۔"

"فضول آدمی" کنجی آنکھوں والا بولا۔ "انتظار کے عالم میں تو آئی نیند غائب ہو جاتی ہے۔ تیرا باوا آدم نرالا ہے۔ انتظار میں تجھے نیند آتی ہے جب ہی تو تیرا کوئی عشق کبھی پروان نہیں چڑھا۔"

"بس یار ایسا ہی ہے۔ بری عادت جو ہوئی۔" فضول آدمی سٹپٹا کر چپ ہو گیا۔

"لبو تو بہت چپ بیٹھا ہے۔ کیا تجھے بھی نیند آ رہی ہے؟"

"نہیں یار نیند تو نہیں آ رہی۔ مگر یار انتظار کی بھی حد ہوتی ہے۔ آخر کب آئے گا وہ؟"

"بس اب اسے آ جانا چاہیے۔"

"وقت اس نے بتایا تھا؟"

"میرے حساب سے اب اسے آ جانا چاہیے۔"

"کنجے! اپنا حساب ہمیں مت بتا۔ یہ بتا کہ اس کی طرف سے تجھے کیا اطلاع ملی ہے۔ کوئی وقت تو بتایا گیا ہوگا؟"

"لبو جن حالات میں وہ یہاں آ رہا ہے اس میں یہ تو نہیں ہو سکتا کہ کہا جائے کہ میں اتنے بج کر اتنے منٹ پر پہنچ جاؤں گا اور ٹھیک اتنے بج کر اتنے منٹ پر پہنچ جائے۔"

"نوجوان، تو تو تھک گیا ہوگا؟"

"نہیں۔" بس اس نے مختصر سا جواب دیا اور چپ ہو گیا۔ وہ اپنے انتظار کی کیفیت میں کوئی رخنہ نہیں چاہتا تھا۔ اصل میں سب سے زیادہ شدت کے ساتھ انتظار تو وہی کر رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ سب چپ رہیں۔ بولیں نہیں بس انتظار کریں۔ جب کوئی بولتا تو اسے عجب بے کلی سی ہوتی جتنی بات بڑھتی اتنی اس کی بے کلی بڑھتی جاتی۔ اسے اس وقت کل آتی جب بات کرتے کرتے یار بالآخر چپ ہو جاتے۔

لبو نے ایک الکساہٹ کے ساتھ انگڑائی لی۔ "یار بور یت ہو رہی ہے۔" پھر رک کر بولا۔ "کنجے تاش تو ہوں گے۔ لا نکال دو چار بازیاں ہی ہو جائیں۔ وقت تو کٹے گا۔"

کنجا آدمی معذرت کرنے لگا۔ "یار تاش تو اندر بند ہیں۔"

"تاش بھی اندر بند ہیں؟"

"ہاں یار۔"

"یہ تالا کھل نہیں سکتا؟"

"لبو تجھے پتہ نہیں ہے کہ چابی اسی کے پاس ہے۔"

"پتہ نہیں وہ کب آئے گا؟"

"میں یہ پوچھتا ہوں کہ وہ آئے گا بھی؟" فضول آدمی پھر بول پڑا۔

نوجوان نے گھور کر فضول آدمی کو دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

کنجے آدمی نے دلاسہ دینے کے لہجے میں کہا۔ "کیوں نہیں آئے گا اُسے بہ حال آنا ہے۔"

"مگر کب؟" ملو نے سوال کیا۔

"ملو تھوڑا صبر کر۔ اسے بس اب آجانا چاہیے۔"

"ویسے اگر وہ نہ آیا تو؟" فضول آدمی نے پھر ایک سوال اٹھا دیا اور ایسا سوال اٹھایا کہ ایک دفعہ تو سب چکر میں آگئے۔ سب کو اس خیال نے پریشان کر دیا کہ اگر وہ نہ آیا تو پھر کیا ہوگا۔

نوجوان نے تھوڑی برہمی اور بہت اعتماد کے ساتھ اعلان کیا۔ "وہ آئے گا۔"

کنجے آدمی کو اس اعلان سے بہت حوصلہ ہوا۔ اس نے گرم جوشی سے تائید کی۔ "یقیناً آئے گا۔"

ملو بھی قائل ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "اب تو یار اسی پہ سارا دار و مدار ہے۔ اسے بہ ہر حال آنا چاہیے۔"

"یہی میں کہہ رہا ہوں۔" کنجا آدمی بولا۔

"اور یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ" فضول آدمی پھر بول پڑا۔ "کہ سارا دار و مدار اسی پہ ہے۔ وہ اگر نہ آیا تو پھر کیا ہوگا۔"

نوجوان نے شعلہ برساتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ سخت غصے سے بولا۔ "ہمیں CONFUSE کرنے کی کوشش مت کرو۔ وہ آئے گا۔"

CONFUSE ہو جانے کے اندیشے سے وہ چپ ہو گئے۔ دیر تک چپ رہے۔ آخر ملو بول پڑا۔ "یار اب تو بہت رات ہو گئی۔"

کنجے آدمی نے ارد گرد نظر ڈالی۔ "یار آج رات بہت کالی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب وہ نہیں آئے گا۔" مگر ملو کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ فوراً تصحیح کی۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ اس وقت رات میں وہ نہیں آئے گا۔ دیکھتے نہیں ہو رات کتنی کالی ہے۔ پھر یوں بھی اس غیر وقت میں آنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

"پھر؟"

"میرا خیال ہے کہ اب وہ صبح کو آئے گا۔"

"اچھا۔" کنجا آدمی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔"

دونوں نے مل کر ان سارے خطروں کا جائزہ لیا جو رات کے سفر میں مضمر تھے۔ پھر طے کیا کہ وہ اب صبح ہی کو آئے گا۔ نوجوان یہ ماننے پہ آمادہ نظر نہیں آتا۔ مگر کسی نہ کسی طرح انھوں نے اسے قائل ہی کر لیا۔ پھر طے کیا کہ اب تھوڑی کمر لگا لی جائے اور ایک نیند لے لی جائے۔ وہ تینوں لیٹ گئے۔ فضول آدمی اسی طرح بیٹھا رہا۔

"فضول آدمی۔" کنجا آدمی بولا۔ "مجھے تو بہت نیند آرہی تھی۔ اب کیوں نہیں سوتا؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"مجھے اندیشہ ہے۔"

"اندیشہ کیسا اندیشہ؟"

ملو اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "میں نے کہا تھا کہ رات میں اس کے آنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی امکان نہیں ہے۔ اب وہ صبح ہی کو آئے گا۔"

"اور اگر صبح نہ ہوئی تو؟"

فضول آدمی نے پھر ایسی بات کہہ دی کہ ایک دفعہ تو سب چکرا گئے۔ مگر پھر فوراً ہی انھیں احساس ہوا کہ یہ کتنا احمقانہ خیال ہے۔

"یار تو بہت فضول آدمی ہے۔" کنجا آدمی بولا۔ "بھلا اس خیال کی بھی کوئی تک ہے۔ صبح کیوں نہیں ہوگی؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر پتہ نہیں ان راتوں میں مجھے یہ اندیشہ ستاتا رہتا ہے کہ شاید اب صبح نہ ہو۔ ایک رات ہاں پرسوں رات ہی کی تو بات ہے۔ مجھے لگا کہ رات بہت لمبی ہو گئی ہے۔"

"ہاں پرسوں کی رات تو واقعی بہت بھاری گزری ہے۔" ملو نے تائید کی۔

"بس مجھے ایسا لگا کہ اب صبح نہیں ہوگی۔ میں تو بالکل ہی جی چھوڑ بیٹھا تھا۔ وہ تو یہ کہیے کہ اسی وقت مرغا بول پڑا۔"

نوجوان نے اسے غصے سے دیکھا۔ کیا۔ "گویا مرغا نہ بولتا تو صبح نہ ہوتی؟"

نوجوان نے تو یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس کی بات کتنی مضحکہ خیز ہے فضول

لہجہ میں یہ بات کہی تھی مگر اس نے نوجوان کے طنزیہ لہجہ کو یکسر نظرانداز کردیا۔ بہت سنجیدہ ہوکر کہنے لگا "ہاں یہ سوچنے کی بات ہے" اور سوچ کر بولا "میرے والد کہا کرتے تھے کہ دڑبوں میں مرغیاں پھڑپھڑائیں گی اور مرغے بانگ دیں گے۔ اور گائیں کھونٹوں سے بندھی بندھی ڈکرائیں گی اور گھوڑے اپنے تھان پہ کھڑے کھڑے بے کلی سے ہنہنائیں گے اور بگٹٹ بھاگ نکلیں گے مگر صبح کسی صورت نہیں ہوگی۔"

"یہ کون سی رات ہوگی؟" لمبو کچھ خوف زدہ ہوگیا۔

"یہ دنیا کی آخری رات ہوگی۔" چپ ہوگیا پھر سوچتے ہوئے بولا "صبح ہوگی بھی تو وہ صبح نہیں ہوگی۔ سورج میں روشنی ہی نہیں ہوگی۔ بس جیسے چراغ میں تیل ختم ہوگیا ہو اور بتی کی لو بجھنے کو ہو۔"

گنجے آدمی نے تردیدی لہجہ میں کہا "مگر روایتوں میں یہ ہے کہ اس صبح کو دو سورج نکلیں گے۔ ایک مشرق سے ایک مغرب سے۔"

"دوسرا سورج بھی کام نہیں دے گا۔ وہاں بھی چراغ میں تیل ختم ہوچکا ہوگا۔"

"سب بکواس۔" نوجوان آخر پھٹ پڑا۔ "میں ان روایتوں کو نہیں مانتا۔ یہ روایتیں گڑھی گئی ہیں کہ لوگوں کو ان بحثوں میں الجھا کر اور ایسے اندیشوں میں مبتلا کرکے اصل مسئلہ سے ان کی توجہ ہٹادی جائے۔ اس فضول آدمی نے بھی یہ بحث اسی وجہ سے چھیڑی کہ اصل مسئلہ سے ہماری توجہ ہٹ جائے۔"

"اصل مسئلہ؟" فضول آدمی نے حیران ہوکر نوجوان کو دیکھا اور معصومیت سے پوچھا "وہ کیا ہے؟"

"وہ یہ ہے کہ اسے آنا ہے اور پھر ہمیں ...." پھر اچانک رک کر بولا۔ "فضول آدمی اگر تمھیں خود پتہ نہیں ہے کہ اصل مسئلہ کیا ہے تو میں تمھیں کیسے سمجھا سکتا ہوں۔ اور اگر تمھیں کچھ پتہ نہیں ہے تو تم ہمارے ساتھ کس خوشی میں لگے ہوئے ہو؟"

لمبو نے دیکھا کہ نوجوان غصہ میں بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ جلدی سے بیچ میں دخل دیتے ہوئے بولا "نوجوان تجھے تو بہت جلدی غصہ آجاتا ہے۔"

"غصہ۔ غصہ مجھے ابھی کہاں آیا ہے۔ میں تو اپنی طرف سے بہت ضبط کر رہا ہوں۔ مگر کب تک غصہ نہیں آئے گا۔"

گنجے آدمی نے سمجھانے کے انداز میں کہا "نوجوان تجھے پتہ نہیں کہ یہ کتنا فضول آدمی ہے۔ اس کی بات کو تو ایک کان سننا چاہیے اور دوسرے کان اڑا دینا چاہیے۔ اس کا کیا ہے وہ تو نہ خود سوئے گا نہ ہمیں سونے دے گا۔ جلدی ایک نیند لے لو کہ جلدی اٹھ سکو۔"

"نہیں، میں نہیں سوؤں گا۔" نوجوان نے قطعی لہجہ میں اعلان کیا۔

"کیوں؟"

"تم لوگوں کا کیا ہے۔ تم نے تو اپنی طرف سے فیصلہ دے دیا کہ وہ اب صبح کو آئے گا۔ مگر وہ تمھارے فیصلہ کا پابند تو نہیں ہے۔ وہ کسی بھی وقت آسکتا ہے۔"

گنجا آدمی فوراً ہی قائل ہوگیا۔ "یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ کیا پتہ ہے کہ وہ رات ہی میں آ نکلے۔ سو احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ہمیں سونا نہیں چاہیے۔"

لمبو بھی لیٹے سے اٹھ بیٹھا۔ "اچھا یار نہیں سوتے۔ مگر وقت گذارنے کی کوئی صورت ہونی چاہیے تھی۔ تاش تو اندر بند ہیں۔ ویسے کیرم سے بھی شغل کیا جاسکتا ہے۔"

"کیرم بورڈ بھی تو اندر بند ہے۔" گنجے آدمی نے اطلاع دی۔

"یہ تو بڑی بوریت ہے۔"

"کیا کریں یار، کنجی اس کے پاس ہے۔"

"پھر تو واقعی اس کا آنا بہت ضروری ہے۔"

"مگر میں حیران ہوں۔" گنجا آدمی کہنے لگا۔ "وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں قاعدے سے اس وقت تک اسے آجانا چاہیے تھا۔"

"آخر کیا وجہ ہوسکتی ہے؟"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ ابھی تک نہ آنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟"

لمبو کچھ جھجکتے ہوئے بولا "کہیں اس کے ساتھ واردات تو نہیں ہوگئی۔"

"نہیں۔" گنجے آدمی نے اعتماد سے کہا "تو یقین کیجئے۔ وہ مار کھا جانے والا آدمی نہیں ہے۔ اور ان چوٹوں سے مار کھا جائے ہرگز نہیں۔"

"پھر کیا وجہ ہوئی؟"

"یار بات یہ ہے۔" گنجا آدمی سوچتے ہوئے بولا۔ "وہاں سے نکلنا اتنا آسان تو نہیں۔ اسے کوئی داؤں لگا کر ہی نکلنا تھا۔"

"وہ کوفہ سے نکل بھی آئے گا؟" فضول آدمی نے سوال اٹھایا۔

نوجوان نے پھر اسی غصیلی نظروں سے دیکھا۔"کوفہ میں تو ہم ہیں۔"
لمبو نے تائید میں سر ہلایا۔" نوجوان نے ٹھیک کہا۔ کوفے میں تو ہم ہیں۔"
اس کے لہجہ میں کتنی یاس تھی۔
"تو گویا ہم اسے کوفہ میں بلا رہے ہیں۔" فضول آدمی نے زہر خند کیا۔
نوجوان اسے کے بس غصیلی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ جواب کوئی بن نہ پڑا۔
فضول آدمی نے لمبی جماہی لی۔" اب میں واقعی سونے لگا ہوں۔" اس کی آنکھیں مندتی چلی گئیں اور پھر جلدی ہی میں خراٹے لینے لگا۔

لمبو نے جماہی لی۔" اس کے خراٹوں سے مجھے بھی نیند آنے لگی۔" لمبو نے کئی مرتبہ آنکھیں بند کیں اور کھولیں۔ پھر سچ مچ بند ہو گئیں۔

"لو وہ بھی سو گیا۔" کبڑے نے کہا۔

نوجوان نے دونوں سوتے ہوؤں کو حقارت بھری نظروں سے دیکھا اور کبڑے سے مخاطب ہوا۔ "دیکھ رہے ہو؟"

"ہاں دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ لوگ بھلا اس کے ساتھ چل سکیں گے؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔"

"یہ تو کوئی میں کوئی بات نہیں اس نے کیا سوچ کر ان پر اعتبار کیا ہے۔"

"وہ سب کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔"

"پھر اس نے ان پر اعتبار کیوں کیا؟"

کبڑے آدمی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ چپ رہا۔ نوجوان بھی چپ ہو گیا۔ چپ بیٹھا رہا اور اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ کبڑے آدمی کو چپ بیٹھے بیٹھے ایک اونگھ سی آگئی۔ بس ذرا آنکھ لگی تھی کہ فضول آدمی چونک کر اٹھ بیٹھا۔
"کیا وہ آگیا۔"

لمبو بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا "اچھا۔ آ گیا؟"

کبڑے آدمی نے بھی جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور ایسا ظاہر کیا جیسے وہ سویا ہی نہیں تھا۔

"کوئی نہیں آیا۔" نوجوان نے اطمینان کے ساتھ کہا۔
فضول آدمی نے اپنی بات پر اصرار کیا۔" میرا خیال ہے کسی نے دستک دی تھی۔"

"مجھے بھی کچھ لگا تو تھا۔" لمبو بولا۔

نوجوان نے دونوں کو بیزاری سے دیکھا۔ بولا۔" تم دونوں تو سو رہے تھے۔ تمھیں کیسے پتہ کہ کوئی آیا تھا۔ میں جاگ رہا ہوں۔ میں نے دستک کی کوئی آواز نہیں سنی۔ تم نے سنی تھی؟" اس نے کبڑے آدمی سے پوچھا۔

"نہیں میں نے کوئی آواز نہیں سنی۔"

ایک اچھی خاصی بحث چل نکلی کہ وہ آیا تھا یا نہیں آیا تھا۔ فضول آدمی اور لمبو ایک طرف تھے۔ ان کا گمان تھا کہ ان کے سوتے میں کسی نے دستک دی تھی۔ کبڑا آدمی ڈھلمل یقین تھا۔ مگر نوجوان قطعی طور پر اس سے انکاری تھا کہ کسی نے دستک دی تھی۔

"یار یہ تو بالکل انجیل کی دلہنوں والا قصہ ہو گیا۔" فضول آدمی تاسف بھرے لہجہ میں کہنے لگا۔" وہ آیا اور ہمیں سوتا ہوا پا کر چلا گیا۔"

"مگر میں جاگ رہا تھا۔" نوجوان نے چلا کر کہا۔

"یار اس میں غصے کی کیا بات ہے؟" لمبو کہنے لگا۔" بعض اوقات آدمی جاگتے ہوئے بھی غافل ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے اس وقت تم کسی اور خیال میں کھوئے ہوئے ہو۔"

"بالکل غلط۔ سب بکواس ہے۔ میں جاگ رہا تھا اور پورے ہوش میں تھا۔ کوئی نہیں آیا تھا۔ کوئی آہٹ، کوئی دستک نہیں ہوئی۔" اور اس مرتبہ نوجوان نے اتنے قطعی لہجہ میں اور ایسے اعتماد سے اعلان کیا کہ فضول آدمی اور لمبو دونوں چپ ہو گئے اور کبڑے آدمی کو تو بالکل یقین آ گیا کہ کوئی دستک نہیں ہوئی تھی۔ اس نے لمبو اور فضول آدمی سے صاف صاف کہہ دیا۔" یار تمھیں وہم ہوا ہے۔ کوئی دستک نہیں ہوئی تھی۔ اور وہ آتا تو اس طرح واپس تو نہ چلا جاتا۔"

لمبو بولا۔" خیر اگر وہ نہیں آیا تھا تو اچھا ہی ہوا۔ آ کر چلا گیا ہوتا تو پھر مارے گئے تھے۔ اب کم از کم اس کے آنے کی امید تو ہے۔"

"امید۔" فضول آدمی بڑبڑایا۔ پھر دراز ہوتے ہوئے بولا۔" اچھا تم اسی امید کا چراغ جلائے بیٹھے رہو۔ میں تو سوتا ہوں۔"
لیٹتے ہی وہ سو گیا۔ خراٹے لینے لگا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ایک کو دیکھا: "دوستو! تم کب سے یہاں بیٹھے ہو؟"

"کب سے؟" لمبو بولا "کیوں کیا کوئی خواب دیکھا ہے؟"

"خواب" فضول آدمی بڑبڑایا "پتہ نہیں، شاید خواب ہی ہو" چپ ہوا۔ پھر کھوئی ہوئی آواز میں شروع ہو گیا۔ "وہ بالکل میرے سر پہ آ کھڑا ہوا اور گرج کر بولا کہ یہاں کیوں بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کہ ہم سب اس کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ تند و تیز ہو کر بولا کس کے انتظار میں۔ اس پر میں چکرایا۔ کس کے انتظار میں۔ برابر والے سے پوچھا، دوست ہم کس کے انتظار میں یہاں بیٹھے ہیں۔ اس نے پریشان نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر میں نے دوسرے سے پوچھا۔ پھر تیسرے سے۔ پھر ان سب سے پوچھا کہ رفیقو! ہم یہاں کس کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان سب نے کہ جن کی بھویں تک سفید ہو چکی تھیں مجھے حیرت سے دیکھا پھر ایک دوسرے کو۔ اور ہم سب ملول ہوئے کہ ہم نے یہاں اس کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے اس کی بھویں تک سفید کر لیں۔" وہ چپ ہو گیا اور کسی سوچ میں کھو گیا۔

"فضول آدمی" نوجوان غصے میں بڑبڑایا۔

فضول آدمی جیسے ہوش میں آ گیا ہو۔ سنجیدگی سے پوچھا "ویسے ہم یہاں بیٹھے کس کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"ہم اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ نوجوان نے طیش بھری آواز میں کہا "جس کا ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک ہے" گنجے آدمی نے کہا۔

"مگر کون ہے وہ؟" فضول آدمی نے اصرار کیا۔

"تمہارا باپ" نوجوان نے گرج کر کہا۔

"مگر میرا باپ تو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔"

"مگر وہ اس دنیا میں ہے۔ وہ آئے گا اور تمہارے مزاج ٹھکانے لگا دے گا۔"

فضول آدمی چپ ہو گیا۔

نوجوان گنجے آدمی سے مخاطب ہوا "معلوم ہے ایسے لوگوں کا علاج کیا ہے۔" ہاتھ کو ایسے چلایا جیسے پستول چلا رہا ہے۔ "گولی۔" رکا پھر کہنے لگا۔ "وہ جب آئے گا تو ایسے لوگوں کو بخشے گا نہیں۔"

فضول آدمی نوجوان کو تکنے لگا۔ پھر بولا۔ "آننا انتظار کرا کے آنے والے آخر ظالم کیوں بن جاتے ہیں؟"

"ظالم؟ کیا مطلب؟" لمبو نے چکرا کر پوچھا۔

"یہی کہ نجات دلانے آتے ہیں اور پھر ان سے نجات حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

نوجوان نے معنی خیز نظروں سے گنجے آدمی کو دیکھا۔ آہستہ سے کہا "میں نے کیا کہا تھا۔ وہ بات ٹھیک نکلی نا۔"

گنجے آدمی نے فضول آدمی کو شک بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں تم ٹھیک ہی کہتے تھے۔"

لمبو کا ماتھا ٹھنکا۔ "کیا کہہ رہا تھا نوجوان؟"

"کچھ نہیں۔" گنجے آدمی نے مختصر جواب دیا۔

لمبو نے ایک شک کے ساتھ نوجوان اور گنجے کو دیکھا اور چپ ہو گیا۔ ایک وسوسہ اسے ستانے لگا تھا کہ جانے ان دونوں نے ان کے سوتے میں کیا باتیں کی ہیں۔ طرح طرح کی باتیں اس کے دھیان میں آئیں اور ہر بات ایسی کہ اس کے ساتھ دسیوں اندیشے اس کے دل میں پیدا ہوئے۔ پھر اس نے ایک دم سے سارے وسوسوں سارے اندیشوں کو رد کر دیا۔ یہ سوچ کر کہ اس جال میں پھنس گیا تو پھر نکلنا مشکل ہو جائے گا، باقی جو صورت جس وقت پیش آئے گی اس وقت سمجھ لیں گے۔ دھیان کو اس طرف سے ہٹانے کی خاطر اس نے ایک مرتبہ تاشوں کی بات چھیڑ دی۔ مقفل دروازے کو غور سے دیکھا اور بولا "اگر تالا کھل جاتا تو تاش ہی کی کچھ بازیاں ہو جاتیں۔"

"اب وہ آ ہی جائے گا" گنجا آدمی بولا۔ "پھر جتنی چاہے بازیاں کھیلنا۔"

"لو بھلا اس کے آنے کے بعد تاش کھیلیں گے۔ اس وقت اتنی فرصت کہاں ہو گی۔ فرصت تو اب ہے۔"

نوجوان نے تلخ لہجے میں کہا "ہاں جب تک وہ نہیں آتا ہے یاروں کے لئے فرصت ہی فرصت ہے۔ تاش کھیلیں، کیرم کھیلیں، جو فضولیات کرنا چاہتے ہیں کریں۔ میں دیکھوں گا کہ اس کے آنے کے بعد کوئی کیسے ان بے معنی ——— وقت ضائع کرتا ہے۔"

فضول آدمی پریشان ہو کر بولا۔ "گویا اس کے آنے کے بعد مجھے فلیش کھیلنے کی آزادی نہیں ہو گی۔"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"یہ بے عملی کے زمانے کے مشغلے ہیں۔ وہ عمل کا وقت ہوگا۔"

"مگر وہ آئے بھی تو سہی۔" لمبو بولا۔

"آئے گا۔" نوجوان نے تیقن کے ساتھ کہا۔

"مگر کب؟"

"جلدی۔ بہت جلدی۔"

"اتنی رات ہو گئی۔ اب کیا آئے گا۔" تامل کیا۔ پھر بولا۔ "میرے خیال میں اب وہ صبح ہی کو آئے گا۔"

"صبح۔ صبح۔ صبح۔" فضول آدمی جھنجھلا گیا۔ "لمبو تیرے اعصاب پہ صبح کیوں سوار ہو گئی ہے؟"

"صبح نہیں، اصل میں یہ لمبی رات میرے اعصاب پہ سوار ہے۔ پتہ نہیں کب اس کا انت ہوگا...... کب صبح ہوگی...... کب وہ آئے گا۔"

صحیح کہا ہے کہنے والوں نے کہ لمبا آدمی احمق ہوتا ہے۔ لمبو تجھے پتہ نہیں ہے کہ ایسی راتوں کی صبح کیسی ہوتی ہے۔"

"یار یہ بکواس بند کرو۔" کبا آدمی چڑ کر بولا۔ "اگر کسی کے پاس سگریٹ ہے تو وہ نکالے۔"

فضول آدمی نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا۔ "لو سگریٹ کو تو ہم بھول ہی گئے تھے۔" جیب سے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس نکالی۔

لمبو نے سگریٹ پیتے ہوئے کہا۔ "فضول آدمی تو تو بہت کام کا آدمی نکلا۔ اگر سگریٹ نہ ہوتی تو ہم بالکل ہی مارے گئے تھے۔"

تینوں نے ایک ایک سگریٹ لگا لیا۔ پھر فضول آدمی نے ڈبیا نوجوان کی طرف بڑھائی جو ابھی تک اسی طرح تنا بیٹھا تھا۔ "نوجوان سگریٹ پیو؟"

"نہیں۔"

"اچھا مت پی۔ ویسے تیرے سگریٹ نہ پینے سے وہ جلدی تو نہیں آ جائے گا۔ آنا تو اسے اپنے وقت ہی پہ ہے، اگر اسے آنا ہے۔"

"تجھے اس میں کچھ شک ہے؟"

"شک..... نہیں کچھ زیادہ نہیں۔ کیا پتہ ہے وہ آ ہی جائے۔"

نوجوان کا پارہ پھر چڑھنے لگا تھا لیکن لمبو نے دوسرا ہی قصہ چھیڑ دیا۔ سگریٹ کے کش کے ساتھ اس میں کچھ گرمی آ گئی تھی۔ کہنے لگا۔ "یار جاگنے کا پرانا سسٹم اچھا تھا۔ الاؤ روشن کیا، ارد گرد بیٹھے اور کوئی کہانی شروع کر دی۔ داستان والے ذرا زیادہ اہتمام کرتے تھے۔ ان کے رت جگے زیادہ زوردار ہوتے تھے۔" پھر ایک حسرت کے ساتھ کہنے لگا۔ "یار ہمارے درمیان کوئی داستان گو ہونا چاہیے تھا۔"

نوجوان نے زہریلی نظروں سے اسے دیکھا۔ بولا۔ "لمبو اس کے بعد تو کہے گا کہ افیون گھولنے کے لیے کوئی چاندی کی کٹوری ہونی چاہیے۔"

فضول آدمی نے نوجوان کی طنز کو بالکل فراموش ہی کر دیا۔ افیون اور چاندی کی کٹوری کے ذکر پر تو باچھیں کھل گئیں۔ "یار پھر تو لطف آ جاتا۔ ویسے میں نے یہ نشہ کیا کبھی نہیں ہے۔ سالی ہماری قسمت میں تو وہسکی رہ گئی ہے۔ چاندی کی کٹوری میں گھل کر افیون کیا قیامت ڈھاتی ہوگی۔ بس اس کا تو میں تصور ہی کر سکتا ہوں۔

"فضول آدمی۔" نوجوان غصے سے بڑبڑایا۔ "آخر DECADENCE کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

لمبو نے نوجوان کی بات پہ کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ اپنے خیال میں کھویا ہوا تھا۔ لمبا کش لیا اور بولا۔ "یار اگر اس وقت وہسکی ہوتی تو مزہ آ جاتا۔"

"ہاں پھر بدمزہ نہ ہوتی۔" کبا آدمی بولا۔ "کیا کریں یار سالا تالا بند ہے اور چابی اس کے پاس ہے۔"

"کیا؟" لمبو چونک پڑا۔ "وہسکی ہے؟"

"ہاں یار ہے تو سہی۔ پوری بوتل۔ مگر سالی چابی ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"یار، تم نے پہلے نہیں بتایا۔"

"پہلے بتا دیتا تو کیا ہوتا۔"

"خیر یہ تو اسے آ ہی جانا چاہیے۔ بس ابھی آ جائے تو مزہ آ جائے۔ پورا جشن منائیں گے۔"

"یار۔" فضول آدمی یکایک [illegible] وہ ہم سے دغا تو

نہیں کرے گا۔"

"وفا؟" گنجے نے اسے گھور کر دیکھا۔ "وہ ہم سے وفا کرے گا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

نوجوان نے اپنے زہر بھرے لہجے میں کہا "البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اسے ہمارے بارے میں شک ہو کہ کہیں ہم اس سے دغا نہ کریں۔"

"یعنی ہم؟" لمبو نے ہم پر زور دیا تھا۔

"مطلب یہی ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔"

"کوئی کون ہو سکتا ہے؟" فضول آدمی جیسے وضاحت طلب کر رہا ہو۔

"کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ آدمی کو کوئی ہوتے دیر تھوڑا ہی لگتی ہے۔ میں ہو سکتا ہوں۔ تم ہو سکتے ہو۔"

"کیا کہا۔ میں؟"

"ہاں تم۔" نوجوان نے فضول آدمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ایک دم سے وہ پھر طیش میں آ گیا تھا۔ مگر اس مرتبہ فضول آدمی کو بھی تاؤ آ گیا۔ منہ غصے سے لال ہو گیا۔ "گالی میں برداشت نہیں کر سکتا۔" اور فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے نوجوان سے دو دو ہاتھ کرنے پہ آمادہ ہو۔ نوجوان نے پھر آستینیں چڑھا لیں۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ گنجا آدمی اور لمبو دونوں انھیں خاموش دیکھا کیے۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ وہ تو سچ مچ کٹنے مرنے پہ تل گئے ہیں تو انھوں نے اٹھ کر بیچ بچاؤ کرا دیا۔ لمبو نے فضول آدمی کو تھاما۔ گنجے آدمی نے نوجوان کو جیسے تیسے سنبھالا۔ وہ تو بس فضول آدمی پہ ٹوٹ پڑنا چاہتا تھا۔ تو سمجھو کہ دونوں کو الگ الگ بٹھایا۔ کچھ جھڑکا کچھ سمجھایا "اس نازک وقت میں تمھیں لڑنے کی سوجھی ہے۔ حد ہو گئی۔"

نوجوان یوں چپ تو ہو گیا۔ مگر اس کی آنکھوں میں اس کے بعد بھی دیر تک خون اترا رہا۔ فضول آدمی کے سر پہ چڑھا بھوت جلدی ہی اتر گیا۔ غصہ جس تیزی سے چڑھا تھا اسی تیزی سے اترا۔ پھر وہ دنگ گم سم بیٹھ گیا۔ گنجا آدمی اور لمبو بھی چپ سے چپ رہے مگر ان میں انھیں [illegible] تھی۔ وہ بھی تو پتہ نہیں کس بات سے کیا بات نکلے اور وہ دونوں ترنت پھر بھڑک اٹھیں۔

دیر بعد لمبو بڑبڑایا "ہم کس مشکل میں پھنس گئے ہیں۔"

گنجا آدمی اپنی بلی جیسی آنکھوں سے اسے تکنے لگا۔ پھر بولا "یار آدمی بھٹکتا بعد میں ہے، بھٹکتا دیر سے ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ ایک دفعہ آدمی پھنس جائے پھر اسے اتنی جلدی نکلنا تو نکلے۔ اس پہ مجھے حضرت موسیٰ کے ماننے والوں کا قصہ یاد آ گیا۔ یہ لوگ چلتے چلتے ایک صحرا میں جا نکلے۔ وہاں ایسے بھٹکے کہ چالیس برس تک اسی صحرا میں بھٹکتے رہے۔ نکلنے کا راستہ انھیں نہیں مل پا رہا تھا۔"

"چالیس برس تک؟" نوجوان نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں چالیس برس تک۔"

"ان لوگوں کا SENSE OF DIRECTION DEFECTIVE ہوگا۔"

"خیر وہ تو صحرا تھا۔" لمبو کہنے لگا۔ "صحراؤں میں تو یوں بھی سمتوں کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ زمانہ۔ میں تمھیں اپنا اس زمانے کا تجربہ سناتا ہوں۔ ایسا ہوا کہ مجھے گلبرگ ایک دوست کے یہاں جانا تھا۔ رات ایسی زیادہ نہیں گئی تھی۔ اول شب سمجھو۔ ہاں بارش ہو رہی تھی۔ اور بارش کی راتوں میں تم نے دیکھا ہوگا سٹریٹ لائٹس کے باوجود رستے آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ سو خیر کا وہ گھر دیکھا ہوا، اس سٹریٹ کی گلی بھی۔ مگر کہیں قریب ہی جا کر میں بھٹک گیا اور غلط گلی میں مڑ گیا۔ بس پھر وہ ایک گلی سے دوسری گلی میں، دوسری گلی سے تیسری گلی میں۔ وہ گلی وہ گلی جس میں گھر تھا۔ بس آس پاس کی گلیوں میں گھنٹوں بھٹکتا رہا۔ بالآخر ایک ریستوران میں جا کر میں نے انھیں فون کیا اور وہ خود آ کر مجھے لے گئے۔ تو بھائی آدمی کا قدم ایک مرتبہ بہک جائے۔ پھر [illegible] کام ہے۔"

نوجوان سوچ میں پڑ گیا۔ گنجا آدمی بلی کی آنکھوں سے اسے تکتا رہا۔ بولا کچھ نہیں۔ فضول آدمی بولتا رہا۔ کہنے لگا۔ "یار کبھی تو وہ اتنا قریب ہوتا ہے کہ میں اس کے قدموں کی آہٹ سن سکتا ہوں۔ لگتا ہے کہ یہیں آس پاس کی گلیوں میں منڈلا رہا ہے۔ بلکہ اس گھر کی دہلیز کے قریب اور کبھی یوں لگتا ہے کہ وہ صحراؤں میں بھٹک رہا ہے۔ اور یہ کہ وہ ہم تک کبھی نہیں پہنچ سکے گا۔"

"بکواس" نوجوان نے غصے سے ہونٹ چبائے۔

اس نے نوجوان کے رد عمل کو یکسر نظر انداز کیا۔ سرک کر لمبو کے قریب آ گیا۔ رازدارانہ لہجے میں بولا "مجھے لگتا ہے کہ اس وقت وہ کہیں پاس ہے۔"

دبے معمار کیا خیال ہے۔ اسے آنا چاہئے؟"

"میرا خیال"۔ لمبو نے فضول آدمی کو گھور کے دیکھا۔ ہم اسی آس پہ بیٹھے ہیں کہ وہ آئے اور ہم اس مشکل سے نکلیں۔"

"لیکن اگر اس کے آنے کے بعد بھی ہم اس مشکل سے نہ نکل سکے تو؟"

لمبو چکرا گیا۔ نوجوان حسب عادت پھر غصے سے کانپنے لگا۔ گنجا آدمی بہت بے مزہ ہوا۔ "یار کس فضول آدمی کے ساتھ پالا پڑ گیا ہے"۔

"تو کیا چاہتا ہے؟" لمبو نے اس سے سیدھا سوال کیا۔ "اسے نہیں آنا چاہئے؟"

"یہ تو میں نہیں کہوں گا۔ اسے آنا تو چاہئے"۔ رک کر بولا۔ "تم لوگوں کو پتہ ہے کہ اب کے میں نے عریضہ ڈالا تھا۔"

نوجوان چکرایا۔ "عریضہ کیسا عریضہ؟"

"نوجوان، یہ ہم لوگوں کی رسم ہے۔ ہر شب برات پر امام منتظر کے نام عریضے ارسال کرتے ہیں"۔

نوجوان ہنسا۔ "دنیا میں کیسے کیسے توہم پرست لوگ ہیں"۔

لمبو نے بہت میانہ روی برتی۔ نوجوان کو ٹوکا۔ "نوجوان یہ عقیدے کا مسئلہ ہے۔ ہمیں کسی کے عقیدے کی تضحیک کرنے کا کوئی حق نہیں ہے"۔

نوجوان نے ایک تحقیر کے ساتھ 'ہوں' کہا اور چپ ہو گیا۔

وہ پھر شروع ہو گیا۔ "میں نے پہلے کبھی عریضہ نہیں ڈالا تھا۔ گھر کے سب لوگ ڈالا کرتے تھے۔ میں اس کا قائل ہی نہیں۔ مگر، مگر اس برس شب برات پر میں نے آخر شب اٹھ کر وضو کیا۔ پیالی میں زعفران گھولا۔ بہت عقیدت کے ساتھ عریضہ میں اپنی یہ تمنا رقم کی۔ اسے میدے میں لپیٹ کر تاروں کی چھاؤں میں دریا کنارے پہنچا اور اپنے عریضے کو لہروں کے سپرد کر دیا اس توقع کے ساتھ کہ کوئی نیک پاک مچھلی میرے اس عریضے کو امام غائب کے حضور لے جائے گی"۔

"اچھا کیا"۔ لمبو نے اسی میانہ روی کے ساتھ کہا۔

"مگر اب مجھے ڈر لگ رہا ہے"۔

"ڈر؟ کیسا ڈر؟"

فضول آدمی لمبو کے اور قریب کھسک آیا اور ایسے بولا جیسے اس کے کان میں بات کر رہا ہو اور ایک تشویش کے ساتھ "یہی کہ کہیں وہ آدمی آ ہی نہ جائے"۔ ▲▲

م۔ق۔خان

کہا جاتا ہے کہ ایک جنگل شمال میں اپنے گھنے درختوں اور سرسبز لہلہاتی گھاس کے لیے مشہور تھا۔ اس کا شمار دنیا کے خوبصورت جنگلوں میں کیا جاتا تھا۔ دیس اور بدیس کے کونے کونے سے جانور یہاں آتے اور اس جنگل کی خوب صورتی پر دنگ رہ جاتے۔ اس جنگل کا راجہ پنگلک تھا۔ جو اپنی فہم و فراست اور حکمت عملی کے لیے مشہور و معروف تھا۔ راجہ عوام کی رائے سے ہی چنا جاتا تھا۔ لیکن وہ حکومت کچھ خاص مشیروں اور خیر خواہوں کی مدد سے کرتا تھا۔ اسے یہ بھی اختیار تھا یا یوں سمجھا جائے کہ اس نے یہ اختیار حاصل کر لیا تھا کہ وہ جسے چاہے اپنا وارث و جانشین چن لے۔ کہا یہی جاتا رہا تھا کہ عوام کو راجہ پر پورا یقین اور اعتماد تھا کہ راجہ جو کچھ کرے گا عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ہی کرے گا۔ راجہ بھی بار بار اس بات کی یقین دہانی کرتا رہا تھا۔

اور سنا یہ جاتا ہے کہ ادھر دکن میں بھی ایک جنگل تھا جو اپنی دولت خوب صورتی اور کشش میں یکتائے روزگار تھا۔ اس جنگل کا راجہ ایک بیل تھا جو شمال کے راجہ کا باج گذار تھا۔ وہ وفاداری کی حلف بار بار اٹھا چکا تھا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد دونوں کے بیچ غلط فہمی اور تفریق کی خلیج حائل ہوئی تھی۔ ان کے بیچ رابطہ کا کام دمنک سیار کر رہا تھا۔ دمنک کو آج کا کوئی اہم وزیر یا سربراہ ملک کا مشیر خاص یا ایلچی تصور کر لیا جائے جو مختلف صدر مقام پر جا کر ہائی کمانڈ کا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ اور تمام لوگوں کو حلف وفاداری اٹھانے پر مجبور کرتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ دمنک بظاہر دونوں کا خیر خواہ تھا لیکن اندر اندر رشک و حسد کی بھٹی سلگ رہی تھی۔ اور وہ اپنی تمام تر کوششیں اس بات پر صرف کر رہا تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے خائف رہیں۔ دونوں کے درمیان شک و شبہ کی دیوار اونچی اٹھتی جائے۔

جی ہاں قصہ یوں ہے کہ دمنک، شمال کے پنگلک کو بھڑکانے یا دوسرے لفظوں میں مشورہ دینے کے بعد سنجیوک کے پاس آیا جو ادھر دکن میں تھا۔ دمنک نے نہایت رازدارانہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔

”مہاراج! میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ راجہ کے وفادار نمک خوار کو راجہ کے اسرار و رموز کا پردہ فاش نہیں کرنا چاہئے۔ اس سے حکومت کے نظم و نسق میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں، پھر بھی آپ کی محبت اور برتاؤ میں میں اس قدر بندھا ہوں کہ میں مجبور ہوں کہ پنگلک کے سارے ناپاک ارادوں کو آپ تک پہنچا دوں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ نے میری باتوں پر یقین کر کے ہی اس جنگل میں آنا منظور کیا تھا۔ پنگلک کا کہنا ہے کہ آپ تو گھاس کھانے والے ہیں اس لئے آپ اس کی غذا ہیں۔“

دمنک سیار کی یہ باتیں سن کر سنجیوک پر غشی طاری ہو گئی۔ کچھ دیر تو وہ بے سدھ پڑا رہا۔ لیکن پھر وہ بڑبڑانے لگا۔

کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ راجہ کتنا ہی اچھا ہو اگر بدشعار اور بدخصال لوگوں کے درمیان گھر جاتا ہے تو اس کی اپنی ساری فہم و فراست بیکار ہو جاتی

ہے۔ یہ بدشعار کچھ نہ کچھ سازش کرتے ہی رہتے ہیں۔ جیسا کہ کوے سیار وغیرہ نے اس اونٹ کے ساتھ کیا تھا۔

...منک متحیر رہا تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ یہ کون سا واقعہ ہے؟

سمیرک بھی کچھ سنجیدگی کے عالم میں تھا لیکن وہ بولنے لگا۔

کسی جنگل میں ایک شیر رہتا تھا۔ ایک گیدڑ، سیار اور کوا اس کے مشیر خاص اور مصاحب کار تھے۔ چاروں جنگل میں گھوم رہے تھے کہ دور پر ایک اونٹ نظر آیا۔ وہ سوداگروں کے ایک قافلے سے بھٹک کر اس جنگل میں آ گیا تھا۔

شیر نے اسے دیکھا تو بڑا متعجب ہوا۔ اس نے اپنے مشیروں سے دریافت کیا کہ یہ عجیب و غریب مخلوق کیا ہے؟ جا کر پتہ چلاؤ کہ یہ وحشی درندہ صفت ہے یا پالتو ہے؟

فوراً کوا بول اٹھا "یہ اونٹ نام کا جانور ہے۔ یہ تو آپ کی غذا بن کر آیا ہے۔ دیر کس بات کی جھپٹیے اور اسے مار ڈالیے۔"

شیر نے کہا "گھر آئے مہمان کو مارنا گناہ ہے۔ اس طرح بلا خوف و خطر دشمن بھی پناہ میں آ جائے تو اس کو مارنے سے سو برہمنوں کے مارنے کا گناہ ہوتا ہے۔ اس لئے آپ لوگ اس کے پاس جا کر اسے جان بخشی کا مژدہ سنا دیں۔ اور با عزت و احترام یہاں آنے کی دعوت دیں تاکہ میں اس سے یہاں آنے کا سبب دریافت کروں۔"

شیر کا حکم پا کر تینوں اونٹ کے پاس گئے۔ انھوں نے اپنے آقا کا پیغام پہنچایا اور ساتھ ہی اپنی جانب سے یقین دلایا کہ اسے کسی قسم کے جانی یا مالی خطرے کا سوال نہیں۔ وہ خوشی خوشی شیر کے پاس آ گیا۔ شیر کو مؤدبانہ سلام کر کے ایک جگہ بیٹھ گیا۔ شیر کے دریافت کرنے پر اس نے اپنی رام کہانی سنائی شیر اس کے ساتھ پیش آئے واقعات سے کافی متاثر ہوا۔ اس نے اونٹ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تشفی دی۔

"دوست! اب پھر یہاں سے انسانوں کی آبادی میں جا کر بوجھ ڈھونے کی زحمت اٹھانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ اس ہرے بھرے جنگل کو جیسے چاہو استعمال کرو۔ اب سے تم میرے خاص مشیروں میں ہو۔"

اونٹ کو بھلا اور کیا چاہئے تھا۔ وہ جنگل میں رہ کر عیش و عشرت کے دن گزارنے لگا۔ وہ کم از کم دوسرے مشیروں سے الگ تھا کیوں کہ اسے شیر کے شکار پر منحصر کرنا نہیں پڑتا تھا۔ کچھ دنوں کی بات ہے کہ ایک بدمست ہاتھی اس جنگل میں آ پہنچا۔ اس ہاتھی اور شیر میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ شیر کو ہاتھی کے موسلے جیسے دانتوں سے کافی چوٹ آئی خیر تھی کہ جان بچ گئی۔ اب وہ اس قدر مجبور ہو گیا تھا کہ چل پھر بھی نہیں سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیر کا شکار کرنا بند ہو گیا۔ اور اس کے ساتھیوں کو فاقے پر فاقہ کرنا پڑا۔ ان کی حالت زار دیکھ کر شیر نے ایک دن ان سے کہا کہ جاؤ جنگل میں کسی ایسے جانور کو تلاش کرو جسے وہ شیر مار سکے۔ چاروں جنگل میں نکل پڑے۔ اونٹ تو چلتے چلتے اپنا پیٹ بھرتا جا رہا تھا لیکن ان تینوں کا بھوک سے برا حال تھا۔ اور وہ تھک کر نڈھال بھی ہو گئے تھے۔ آخر جب کوئی ایسا جانور انہیں نہیں ملا کہ جسے بزور یا بہ فریب شیر کے پاس لا سکیں تو انہوں نے واپس ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

واپسی میں کوے نے چونچ مار کر سیار کو اشارہ کیا اور دونوں الگ ہو گئے۔ اسی وقت سیار کو ایک بات سوجھی اس نے کہا "بھائی! اس طرح جنگل جنگل مارے پھرنے سے کچھ ہاتھ آنے کو نہیں میرا خیال ہے کہ کیوں نہ اس اونٹ سے فی الحال اپنا کام چلائیں؟"

کوے نے رک کر کہا "دوست کہتے تو آپ ٹھیک ہیں لیکن ہمارے راجہ نے اس کو امان بخشی ہے۔ یہ تو راجہ کے اصول کے خلاف ہے۔"

کوے کی بات سن کر سیار نے گردن ہلاتے ہوئے کہا "تم دیکھو تو سہی کہ میں آقا کو کس طرح تیار کر لیتا ہوں کہ وہ اسے مار کر ہماری دعوت کر دیں گے۔"

وہ سیار اکیلا شیر کے پاس آیا اور اس نے نہایت مغموم چہرہ بنا کر کہنا شروع کیا "جہاں پناہ! شکار کی تلاش بے سود ہے۔ اس کوشش میں ہم سب تھک ہار گئے۔ ہمیں اپنی تو فکر نہیں لیکن آپ کی حالت زار اب ہم سے دیکھی نہیں جاتی۔ آپ کو اس وقت مقوی غذا کی ضرورت ہے ———" سیار اتنا کہہ کر رک گیا۔ وہ شیر کے چہرے پر نظر گاڑے اس کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا "آپ اجازت دیں تو میں اپنی ایک حقیر تجویز پیش کروں۔"

شیر نے آنکھوں کے اشارے سے بیار کو اجازت دی۔ بیار نے کہا "اونٹ کو آپ کے حضور میں بطور غذا پیش کیا جائے۔"

شیر غصے سے کانپنے لگا "کمینے، ذلیل! تم پر لعنت ہو! تم نے پھر کبھی ایسا لفظ زبان پر لائے تو میں تمہیں فی الفور ہلاک کر ڈالوں گا۔ جسے ایک بار امان دی گئی ہو اس کا خون کرنا ظلم ہے۔ نہیں جانتا کہ امان بخشنا سب سے اعلیٰ اور فضل کا ثواب مانا گیا ہے؟"

بیار نے کہا "میں اس بات کا حرف بحرف اعتراف کرتا ہوں لیکن میں جو کہنے والا ہوں اس پر حالات حاضرہ کو نظر میں رکھ کر غور فرمایئے۔ وہ اونٹ خود اپنی زندگی آپ کی بقا کے لیے پیش کرنے کا خواہش مند ہو تو آپ کیا کہیں گے؟

اونٹ نہ سہی ہم میں سے کسی ایک کو مار کر آپ کو اپنی جان بچانا ہے۔ ہمارے رہتے خدانخواستہ کہیں آپ کو کچھ ہو گیا تو ہماری زندگی بے معنی ہو گی۔ پہیے کی دھوری ہی ٹوٹ جائے تو کیا پھر ڈنڈوں کے سہارے پہیے گھوم سکتے ہیں؟"

بیار کی مدلل اور خوشامد بھری گفتگو سے شیر کا غصہ سرد ہو گیا۔ اس نے بیار سے کہا "ٹھیک، تم جیسا بہتر سمجھو کرو۔"

یہ سن کر بیار دوڑا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور کہنے لگا "بھائیو! بھوک کے مارے ہمارے آقا کی حالت بہت نازک ہے۔ اب کسی جانور کی تلاش کرنے یا زیادہ بحث و مباحثہ کرنے کا وقت نہیں رہ گیا ہے۔ ہمارے آقا کو کچھ ہو گیا تو ہم کس کے پاس جائیں گے۔ ہمارا کون ملجا و ماویٰ ہو گا۔ اس لیے ہم چاروں چل کر ان کی زندگی کی حفاظت کے لیے خود اپنی جانیں ان پر قربان کرنے کی پیش کش کریں۔ اس طرح ہم ان کے احسانوں کا بدلہ چکانے میں شاید کامیاب ہو جائیں۔"

تو وہ خود بھوکے اور مضمحل تھے وہ بیار کی بات مان کر شیر کے پاس آئے۔

کوے نے صورت حال سے گوش گزار کیا اور کہا "اس سنگین حالت کے پیش نظر میں خود کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ آپ مجھے مار کر کھا لیں۔ بہرحال آپ کی زندگی نہایت اہم ہے۔ ہمارے جیسے ادنیٰ جانور کی یہ بڑی عزت افزائی ہو گی۔"

ابھی کوا کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ بیار اس کے سامنے آ گیا اور اس نے کوے کو مخاطب کر کے کہا "بھائی، قطع کلام ہوتا ہے، معاف کرنا، آپ بہت چھوٹے ہیں آپ کے کھانے سے آقا کی کیا سیری ہو گی۔ وہ ضعیف ہیں آپ جیسے کوے کا گوشت کھانا اور وہ بھی کھا کر کھانا نہ کھانے کے برابر ہے بلکہ بدترین گناہ ہے۔ تمہاری وفاداری میں حرف برابر آنچ نہیں آتی۔ اب تم پرے ہٹو میں آقا سے التجا کرتا ہوں۔"

بیار کی باتیں سن کر کوا ہٹ گیا اور بیار شیر کے سامنے پیش ہوا۔

"آقا! اس کوے کی جگہ آج آپ میرے خون سے اپنی بھوک کی آگ بجھایئے۔ آپ کا نمک کھایا ہے میں نے بہت کھایا ہے۔ مجھے بھی خدمت کا ایک موقع فراہم کیا جائے۔"

ابھی بیار اپنی باتیں کر ہی رہا تھا کہ باگھ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"اے او بیار بھائی! تم نے ٹھیک کہا۔ بہت نیک ہو تم۔ تو کوے کی طرح چھوٹے نہ ہو باوجود اس کے تمہارے پنجوں میں ایسے ناخن ہیں جنہیں تم اوزار کی طرح استعمال کرتے ہو۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم آقا کے ہم ذات ہو اس لیے تم ان کی غذا نہیں بن سکتے۔ کتابوں میں آیا ہے کہ اگر جان حلق میں بھی آ جائے تو علم و بصیرت رکھنے والا حرام نہیں کھاتا۔ اس لیے آج مجھے مار کر کھا لیں کہ میں دونوں جہاں میں سرخرو ہو جاؤں۔"

باگھ کی یہ جاں نثاری دیکھ کر اونٹ کی غیرت کا جذبہ بھی جوش مارنے لگا۔ اس نے سوچا کہ جس طرح دوسروں نے شیر کو خوش کیا ہے اسی طرح وہ بھی خود کو پیش کر کے واہ واہی لوٹنے میں کیوں کسی سے پیچھے رہ جائے۔ اسے بظاہر جان کا کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے آگے آ کر شیر کی طرف منہ کیا اور کہنے لگا "باگھ نے بجا فرمایا لیکن ان کے پنجے بھی تو ناخنوں سے لیس ہیں اس لیے یہ بھی حضور والا کے ہم ذات ہوئے۔ بڑے لوگوں نے بار بار کہا ہے کہ جو اپنی ذات کا بدخواہ ہوتا ہے وہ دونوں جہاں میں نامراد ہوتا ہے۔ اس لیے میری آرزو ہے کہ آقا مجھے مار کر اپنی زندگی کی حفاظت کریں۔ اس سے مجھے اس دار فانی میں بقائے دوام اور دوسرے جہاں میں خلد بریں ملے گی۔"

اونٹ کا جملہ پورا ہوا تھا کہ شیر نے اپنے پرانے رفقا کی جانب دیکھا۔ باگھ کی حریص نگاہیں اونٹ پر تھیں۔ بیار کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی اور کوا اپنی چونچ کٹکٹا رہا تھا۔ خود شیر کی آنتوں میں بھوک سے اینٹھن تھی۔ شیر نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں اور چشم زدن میں بیار اور باگھ نے دو جانب سے اونٹ پر حملہ کر دیا۔ کوے نے اڑ کر اونٹ کی دونوں آنکھیں نکال لیں۔

اسی وقت سنجیوک بیل نے محسوس کیا۔ کئی طرف سے خوں خوار درندے اس پر جھپٹ پڑے ہیں۔ وہ شور مچانے لگا لیکن وقت کا قاضی اپنا فیصلہ سنا چکا تھا۔ دوستی اور امان کے سارے الفاظ حرف غلط ہو چکے تھے۔ اور پنگلک کھڑا مسکرا رہا تھا۔

اقلیتوں کے لئے مارجن منی قرض سہولت

اتر پردیش مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن ، اقلیتوں کے افراد کے لئے جن میں مسلمان، سکھ، عیسائی، بودھ اور پارسی شامل ہیں صنعت، دکانداری، و دیگر کاروبار کرنے کے لئے جس کی کل لاگت دو لاکھ تک ہوگی، بینک یا مالیاتی اداروں کے ذریعہ مطلوب مارجن منی کا ۷۵ فیصد قرض کے طور پر دے گا۔ اس پر سالانہ سود $\frac{1}{2}$ ۲ فیصد ہوگا۔ سود اور اصل رقم کی ادائیگی ۹ سالوں میں کرنی ہوگی شروع کے تین سالوں میں سود اور اصل کی ادائیگی رکی رہے گی۔

حکومت ہند یا صوبائی حکومتوں نے جن کو صنعت یا دستکاری کے لئے ادارہ ملا ہے یا وہ انجینئر جو بے کار ہیں انہیں اس اسکیم کے لئے بینکوں یا مالیاتی اداروں سے مطلوب سارا مارجن منی قرض کے طور پر مل سکے گا۔

اسکول کے لئے بینکوں یا مالیاتی اداروں سے قرض کی قسطوں کے بعد ہی کارپوریشن سے قرض حاصل ہو سکے گا۔

اس اسکیم و کارپوریشن کی دیگر اسکیموں کی مزید تفصیلات جنرل منیجر ڈسٹرکٹ انڈسٹریز سنٹر یا کارپوریشن کے ہیڈ آفس، ۲۵ نشاط گنج پیپر مل کالونی لکھنؤ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

نیاز حسن
چیرمین

سراج حسین
جوائنٹ منیجنگ ڈائرکٹر

انیس انصاری
منیجنگ ڈائرکٹر

زوال رفت میں پچھلی دھند

(قمر احسن کے نام)

اکرام باگ

سقوط شب۔ ہاں ہاں یہی۔

اس میں تم سے بہت بہت ہی دور، سقوط شب کے زوال میں بہت تیز، جیسے لال غاروں سے لاپرواہ قریب سے قریب ہو رہا ہوں۔ وہاں کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔

ہاں سقوط شب کا داستانی حصار تمھاری مسکراتی آنکھوں سے طلوع ہوا تھا۔ کیسا عجب تھا وہ؟

پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اور کس طرح اس عدم خود کار جھولے میں ہچکولے لیتا سب سے اوپر ہنگوڑے میں پہنچا۔ اس چکر پر میرا اختیار کب تھا۔ میں نے زمین دیکھنے میں بہت سی جد و جہد یں کیں۔ مگر تھاہ کا اندازہ ہی نہیں لگا۔ گھنگھور آسمان پر سورج بھی آنکھ مچولی میں غلطاں۔ اطراف میں نظریں دوڑائیں تو محسوس ہوا کہ شاہ علی بنڈہ یا آما بورہ کا محل وقوع ہے۔ اطمینان کی سانس بھی نہ لینے پایا تھا کہ جھولا پھر سے حرکت میں آیا اور میں نیچے ہی نیچے اور بہت ہی نیچے اور بہت بہت ہی نیچے جاتا رہا۔ سارا محل وقوع اوجھل ہوتا گیا اور ایسا لگا کہ میں ایک وسیع و عریض فولادی ٹنکی میں اتر رہا ہوں۔ اوپر کے سارے منظر غائب۔ سخت۔ سفید اور شعاع سطح کے کچھ اور دکھائی نہ دے رہا تھا۔ آخر کار، ہنگوڑا چند ہی اوپر، سخت دھات نما سطح پر جھولتا رہا۔ ٹنکی کے اوپر کونوں اور دیواروں سے عجیب احباب کی نرم گرم آوازیں ابھرتی رہیں۔ عجیب دھات نما آوازیں۔ مجھے یاد آیا، جب میں دیہات کے عرس میں تمھارے انتظار سے اکتا جاتا تو بلا تاخیر جھولے سے اتر جاتا۔ سامنے راستے کے بڑھائی کے نیچے آوازوں کی بستی میں تمھارے وجود کا سناٹا میرے دل میں اترتا رہتا اور یہاں اطراف کے جنگلی کے پھولوں کے گجرے اور رس بھری آوازیں گونجتی ہوتی تھیں۔ ہمیں یاد ہے نا ایک مرتبہ ایسے ہی موقع پر پھول کے گجرے کو ترجیح دی تھی ... پھر۔ یہ کیسے ہوا۔ کیوں؟ اس عدم خود کار جھولے پر کسی کا کوئی اختیار نہیں ــــ جب مجھے اوپر لایا گیا تو میرا دوست ٹکٹکی لگائے مجھے ہی گھور رہا تھا۔ آج کل وہ کسی شعبے کے سیکورٹی کام پر متعین ہے۔ اس نے مجھے کھینچا۔

'میرا دل ڈوب رہا ہے'

جسم پر بڑی تھکن تھی۔ مجھ کو باور کرلیا گیا کہ اس حصار کا سا سفر کے بعد میں مکمل بیمار ہو چکا ہوں۔ آسمان پر سورج اپنے غسل آسا بدن پر تولیہ پونچھنے میں معروف تھا۔ ایک آدمی جو سابق میں مشہور فزیشن اور روحانی علاج کی طرف راغب ہے، میرا معائنہ کرتا رہا۔ بعد ازاں اس نے مجھے کچھ تصاویر دکھلائیں۔ ہرے بھرے کھیت، ٹوٹے مکان کے اندر درخت سے نکلتا ہوا دھواں، کچھ ان بجھے نقوش زدہ چہرہ، لال مٹی کا دریا۔ نسخہ کی چھٹی میرے دوست کے حوالہ کرتے ہوئے اس نے کہا "سردست کسی آزاد پرندہ کا جوڑا انھیں دکھلائیے۔ حصار کی گہرائی نے ان سے ان کا محل وقوع گم کر دیا ہے۔"

کیسا عجب تھا وہ داستانی حصار۔ تمہاری مسکراتی آنکھوں سے طلوع ہوا۔ میری روح پر اس کے غروب ہونے کی داستان۔ میں یہ سب تمہیں سنا رہا ہوں سنتی ہو نا۔

میں نے ہلکی تمازت دھوپ والی صبحوں میں تمہیں بلا ہا آوازیں دیں۔ گمرہانی پر سفر کرتے سایہ کو قید کرنے کے لئے کون سا جال میرے پاس تھا۔ ـــــ اور وہ اپریل کی چودہ تاریخ تھی۔

شروع شروع میں میں نے تمہارے راستوں پر کتنی اقسام کے پھول کھڑے کئے تھے ان پھولوں کی حصول آوارگی میں بھٹکنا میری واحد سرگرمی تھی۔ نیلے مہربان آسمان کے نیچے، درگاہ سے کتنی دور تھا۔ وہ مکان۔ تمہارا مکان۔ سیاہ گول گول آنکھوں کے بیچ منتظر فاصلوں کی صبحوں میں سفید پھولوں کی خوشبو انتظار کی آخری کمین گاہ تھی۔ یہاں تک کہ تمہارا دروازہ آجاتا۔ وہاں کہاں تھا حصار۔ ایک بوسیدہ انگریزی محاورہ۔ ایسے ہی ایک دن کا کاروباری روابط کا اضافہ کھولتے ہوئے دکھائی دیا۔ آدمی کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ عورت کے کمائے میدانوں میں نکل جائے۔"

تم نے میرے خواب کو بیم عودگی سے سنا، ہلکے ہلکے دھیرے دھیرے اور نرم انداز سے میں نے تمہارے چہرے پر سے تربہ تر زلفوں کو ہٹایا۔ ماحول بڑا جاگا جاگا سا محسوس ہوا۔ سامنے ادھ کھلی کھڑکی ہے۔ دائیں جانب درِ درگاہ کی کلس کا کلغی میں بسر رہتی۔ تھکی تھکی بارش، انار کے درخت میں شعلے بھر رہی تھی اور دور اوپر چاند ڈول رہا تھا۔ میں تمہارے نرم آوار جسم کو ہلکی سی کپکپاہٹ کے ساتھ سخت ہوتے محسوس کیا۔

"عرفانہ!"

"کیا، یہ کیا نام ہ" ایک سوالیہ وجود۔ سیاہ غم آلود بادلوں میں کھو تا جاتا۔

ـــــ "نام" مولسری کے درخت کی سمت دھواں اُچھالتے ہوئے اس کے سبز عبا پوش فقیر نے جواب دیا۔

"سب بھو کرے۔ اللہ ابلیس۔ آدم گٹھ ـــــ تینوں کا بس ایک ہی سیتھو"

"میں نے ایک خواب دیکھا ہے"

"کب؟"

"کوئی چھ روز پہلے۔ ... شاید نو اپریل کی صبح"

ـــــ تو ہوا یہ کہ دن پوری طرح روشن تھا۔ میں اپنے کھیتوں میں حیران سرگرداں، چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ جام کے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ کھنڈ کے منڈ کھڑے تھے۔ کل شام ہی تو ہزار ہا جام شمار کئے جا رہے تھے۔ اب کے دور کوئی ابھرتی دبا۔ میرے دل میں وہی خوف ابھر آیا۔ میں نے سامنے دیکھا۔ سامنے دھند میں وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہی جو ہمیشہ سے میرے تعاقب میں چکر لگاتا رہتا ہے۔ عدم خود کار۔ میں نے اپنے کالے کرتے کی جیب میں شجرہ طاعت کی سرسراہٹ کو چھوا۔ کس قدر اچھی حالت میں تھا۔ پرسوں شام جب حساس جائے واردات میں، بے تحاشا جام لڑھکانے کی پاداش میں، وہ سب میرے خلاف غل مچا رہے تھے، تب آڈیٹوریم میں کوئی بھی میری داستاں سننے کو تیار نہ تھا۔ ایک مسکرو نے اپنے کرتب نما کارنامے سے مجھے بچا لیا۔ آڈیٹوریم میں قہقہے گونجتے رہے کالے گھوڑے سوار میں ہوا سے باتیں کرتا رہا، اور یوں ایک حصار سے نکل نکل کر میں نے موٹے موٹے سرخ منکوں والوں کے بیچ داستان سمجھانے کی نوکری کر لی۔ وہیں پر تم نے اپنی مسکراتی گول گول آنکھوں سے داستان حصار کا اولین سبق دیا۔ ہر شام کالا گھوڑا میرا مونس تھا۔ برا ہو اس دن کا کہ مندر کے عقب میں ایک تالاب ہوتا تھا۔ میں نے باگ کھینچتے ہوئے حالانکہ اس سے درخواست کی کہ وہ کم از کم چند چھنوں کے لئے سہی اپنے آپ کو گردن تک ڈبوئے رکھے۔ مگر وہ تن کر، بدستور اپنے مشتعل انگیز عریاں سینوں کے ساتھ ویسے ہی کھڑی رہی۔ اور یوں نشہ کہ اس کے بدن میں موج زن ہونے پر راغب ہوا۔ ساحل کی کنکریلی ریت پر جب میرے جسم پر منکوں والے کے ڈنڈے برسنے لگے تب تک سورج غروب ہو چکا تھا۔ جب ہوش آیا تو سبز عبا پوش فقیر نے داستان کو توڑتے ہوئے ایک نئی منزل کی طرف اشارہ کیا۔

"اپنے کفر کی شہادت سالک کے مسلک کا آخری وتیرہ ہے۔

پیشانی کا اطمینان ہوا تو میں نے بھاگنا نہ چاہا۔ ہمراہ چلتے چلتے جب ہم اشارہ گاہ تک پہنچے تو ایک طویل لامحدود حصار کے بیچوں بیچ ایستادہ تھی۔ دودھیلا زمانہ نے اس سنگی عمارت پر کیسے کیسے نشان ثبت کر رکھے تھے، اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ ہوا گرم تھی۔ آسمان صاف اور زمین پر دور دور تک کسی سائے کا نام و نشان نہ تھا۔ دروازے کے چوکھٹے سے ایک نیم شکستہ تختی پیوست تھی "خان سرل" بقیہ حصہ پتہ نہیں کہاں کھو گیا تھا۔ وہ اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو اچانک سردی کا احساس غالب ہوا۔ لاتعداد ستون۔ عمارت کا احتمام نظروں سے اوجھل ہے۔ میں نے اس سے کہا:

"یہی ہے وہ دائرہ نما کنواں جو نویں ستون کے بائیں طرف واقع ہے۔"

صاف شفاف پانی یوں موسم اور سفر نے میری آنکھوں میں شدید لاحاصلی کا فیض منعکس کروا لیا تھا۔ میں نے اندر جھانکتے ہوئے اختیار کہا۔

"صرف تین ہی مچھلیاں !!!"

"جب کوئی حصار نہ تھا تو تو کہاں تھا؟" اس نے جواب میں کہا۔

"مٹھ — گڑھ —"

—— یہ تو تمہیں چھ دن بعد خیال ہوا کہ خواب سنایا جائے۔ کیا خواب تھا وہ۔ اس کے لہجہ میں ہر درجہ استفہام تھا۔

"میں بہت پہلے سے اس خدشہ میں مبتلا رہی ہوں کہ آخر کار یہ بوڑھے، فقیر، فقیر اور وہ سب تمہیں ذہنی فتور میں گرفتار کرا دیں گے۔" میری باہوں کے حلقہ سے آزاد ہوتے ہوئے اس نے جھلاتے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "میں خواب کے بارے میں پوچھ رہی ہوں اور تم جواب دیتے ہو، اس ادھ کھلی کھڑکی باہر ایک سنگین حصار ہمارا منتظر ہے۔" تو وہ یک بیک کھڑی ہو گئی۔ میں نے اپنی تر بہ تر قمیص کو دیکھا۔ آج میں کافی سیر کر چکا تھا۔ دراصل کوئی بھی سیدھی اونچی نوکیلی شے مجھے دیوانہ بنا دیتی ہے حالانکہ ابھی کوئی زیادہ فاصلہ طے نہیں ہوا تھا۔ سرما کا موسم اور کولتار کی ٹھنڈی سڑک دور دور پھیلی ہوئی نیم نو فصیلیں اور ان کے بیچ سویا ہوا قیم لے ہوش پانی اطراف کی تمام باولیاں کھارے پانی کی تھیں صرف بہت پیچھے کچی سڑک سے متصل کھلے سرکی باؤلی" میٹھے پانی کے لئے مشہور تھی۔ سامنے سرخ سرخ رنگ کی اونچی نکیلی سیدھی مستقر سی پہاڑی۔ ایک نظر میں ایسا محسوس ہوتا کہ زمین نے اپنا بھیانک روپ اس پہاڑی میں منعکس کر دیا ہو۔

"میری عمر تم سے کوئی چالیس سال زیادہ ہے، پھر بھی یہ سرخی زمین کے اس ہولناک تجربے کی نشانی ہے۔ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں" میں نے ذرا آگے جا کر آپ کی بات سنی۔ اب آسمان کی تمازت کا جال دھیرے دھیرے کھل رہا تھا۔ پھر بھی انھوں نے اب تک اپنے دونوں ہاتھ جیکٹ میں چھپا رکھے تھے۔ دور تک کسان لال زمین کے کھیتوں میں جبر آمیز مشقت میں سرگرداں۔ آسمان پر نیلی نیلی شعاعوں کا مو ستار پہاڑی کے عقب سے سارے ماحول پر محیط ہو گیا تھا۔ حالی کی منکاری کا حصار جیسے سب پر محیط۔

"ہو سکتا ہے وہ واقعی تمام واقعی خطرناک غدار رہے ہوں جنھیں اس پہاڑی کے اوپر باندھ کر توپ سے اڑا دیا جاتا تھا۔ عبرت کے لئے۔ سقوط شب کی اولین ساعتوں میں، جب سورج اپنی آنکھیں اس زمین پر کھولتا ہو گا تب اس سرخ پہاڑی کے اوپر فضا میں اچھلتے سرخ سرخ جسم کے ٹکڑے سارے منظر کو روح فرسا ساتے ہوں گے۔"

"غدار! یہ لفظ تو آدم کا سایہ ہے۔ تم بھی کیا اہل تخت کی طرح یہی سمجھتے ہو کہ یہ پہاڑی اٹل ہے۔ نہیں۔ نئی نئی روایتیں اپنے معانی خود ساتھ لاتی ہیں۔ یہ سب اس کا کھیل ہے کہ وہ خود زمانہ ہے۔"

'زمانہ' میں نے وحشیانہ انداز سے اس کی سرخیاں خود دیکھیں۔ اف۔ تم نے ابھی ابھی چراغ جلایا تھا مگر تمہارے جسم سے نکلتی روشنی میں میں اپنی روح کے اندھیرے کے ساتھ تمہارے اندر گوشہ نشیں ہوں۔ خوفناک سیاہ رنگین حصار تمہارے اس بوسیدہ دروازے کے باہر بڑا منتظر ہے۔ تم چاہو تو اس حصار کو توڑ کر ہم آوارہ، آزاد نکل جائیں۔ سفر لمبا نہیں اور تب تمہیں زمانہ کا احساس قطعی نہ ہو گا۔

"ٹھیک ہے۔ یوں اس لمحہ ہم دونوں اس بھورے پتھر پر بیٹھے ایک ساتھ سرخ پہاڑی کے وقوع پر باتیں کر رہے ہیں مگر صاف سیدھی حقیقت یہ ہے کہ اس بھورے پتھر کو مجھ سے پہلے دیکھا ہے۔ گرما کی انتہائی سرد راتوں، بارش کی دہشت ناک دھوپ اور سرما کی بگولہ اڑاتی شاموں میں ___ اور یہ سب تجربے ہیں۔" مرا لہجہ حملہ آور تھا۔

"تم عالمانہ عمر کی بات کر رہے ہو۔" انھوں نے ایک تیر جاتی کا رہر اپنی نظریں دوڑاتے ہوئے بات جاری رکھی۔ اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ میں نے اس بھورے پتھر کو آج ہی دیکھا ہے تو کیا اس کا وجود مشکوک ہے اور ہماری عمر محض گمان ہے۔ نہیں۔ وقت کا انسلاک ہم سے ہے۔ اور ہم سے ہٹ کر وہ عدم ہے۔

"میں سمجھا نہیں۔"

تم یہ کیا کہنا چاہتے ہو کہ کل جمعہ ہے۔ ٹھیک ہے اگر انسلاک وقت کی حقیقت بس اتنی سی ہے کہ آج جمعرات ہے تو میرا اور تمھارا اس بھورے پتھر کے وجود پر بحث کرنا لایعنی ہے۔ انھوں نے اپنی آنکھیں سرخ پہاڑی پر جماتے ہوئے کہا۔ "میں جس گاؤں میں وہاں کے لوگ اس عالم ویراں میں بس دو ہی کام کرتے تھے۔ بولیاں کھودنا اور اناج کا اُگانا۔ اچانک ایک صبح ہم نے دیکھا کہ ہمارے گاؤں، کھیتوں، جھونپڑیوں اور سرگرمیوں کو ایک زبردست غیض و غضب ڈھاتی ندی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔" وہ کھو سے گئے۔

"تو کیا ہوا!" میں یہ سمجھوں کہ عمر حادثاتی مساطر کو بھی پراسرار ڈھنگ سے پیش کرنے کا ڈھنگ سکھا دیتی ہے۔" میں نے انتہائی تمسخرانہ انداز میں جواب دیا۔

"لیکن میں سوچتا ہوں کہ گاؤں حادثہ ہے یا ندی ___ یا دونوں کا ملاپ۔ مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ندی نے اپنے بچھڑے ہوئے ساتھی گاؤں کو آخر کار دریافت کر لیا۔

"تم کو تو بس بے تکی باتیں کہنے کی فکر لگتی ہے" تم چراغ پا ہو گئیں۔

"تو کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں لوگوں سے یہ کہتا پھروں کہ لوگو اس شخص کی سفید بستی پر مت جاؤ، اسے تو اس سے بطور بزرگی رکھ چھوڑی ہے۔

مگر ___ مگر آپ دونوں کا ساتھ، گھومتے پھرنا، خواہ مخواہ لوگوں میں چہ میگوئیاں پیدا کر رہا ہے۔ بابا تو خیر معصوم ہیں۔"

"لوگ ___" میرے منھ سے چیخ نکل گئی۔ بالآخر وہ تمھارے بوسیدہ دروازے کو ٹھوکر مارتے ہوئے اندر آ چکا تھا اور تمھاری مسکراتی آنکھوں کو روندتا ہوا مجھ پر مسلط ہو گیا۔ تم ہی نے سقوطِ شب کی اولیں ساعتوں میں مجھے ہر قید سے آزاد کیا تھا۔ اب میں تم سے بہت دور نمناک سرد سحر کے لمحوں میں سرخ اونچی سیدھی اور نوکیلی پہاڑی کے اوپر گامزن ہوں۔ میرے عقب میں لمحہ بہ لمحہ حملہ آور ہوئے سنگین حصار کے ہاتھوں فرماں ہے اور نیچے طویل میدان۔ میدان سے پرے کولتار کی سڑک سے بائیں جانب تمھارا ٹوٹا مکان اور دائیں جانب دور درگاہ کا لمبا سایہ اور وہاں سے تھوڑی دور اونچائی پر سرخ پہاڑی کو گھورتا ہوا توپ کا دہانہ

▲▲

بندر اور قلندر

آصف فرخی

مداری کے ہاتھ ایک بندر لگا۔ مداری گلی گلی بندر نچاتا پھرا۔
مداری کا نام تھا قلندر اور بندر کا نام، بندر کا نام تھا۔ "بھندو"
تو وہ بندر پہلے پہل بہت رویا۔ اس وقت وہ بندر نہیں تھا، بلکہ
بندر کا بچہ تھا۔ رسی سے بندھا بیٹھا چیں چیں کرتا رہا، اور کوئی پاس آکر منہ چڑاتا یا
دکھاتا تو کھیسیں نکال کر جھپٹا مارتا۔ رسی کا دوسرا سرا پکڑے مداری بیٹھا
حقہ گڑگڑاتا رہا۔ اور آئینے میں دیکھ دیکھ اپنے سفید بال نوچتا رہا۔ تماشہ
دیکھنے والے یہ سمجھے کہ بندر جنگل کے لئے ہڑک رہا ہے، اور ان ہرے بھرے
جنگلوں کو یاد کرکے روتا ہے، جن میں بندر جاتی دن رات ادھم مچایا کرتی ہے،
اور من ہی من میں ناریل کے ان پیڑوں پر اپنے بھائی بندوں۔۔۔ یعنی کہ
بھائی بندروں کی طرح چڑھنے کودنے دم کے بل لٹکنے اور ناریل توڑنے کے
لئے مچل رہا ہے۔ لیکن مداری کو معلوم تھا کہ وہ بندر کبھی جنگل میں نہیں رہا کیونکہ
وہ چڑیا گھر کے پنجرے سے آیا تھا۔ جس وقت مداری نے اسے خریدا تھا، تو اسے
بڑی مشکل سے اس کی ماں بندریا کے سینے سے الگ کیا گیا تھا۔ اس وقت وہ
ایسا گیگلا سا تھا، تھوکے ہوئے نوالے کا جیسا، اور جسم پر بال بھی نہیں تھے۔
سارے وقت بندریا کے داہنے پستان سے چپکا رہتا۔ دائیں سے اس لئے کہ
بایاں پستان سوکھ چکا تھا اور اس میں دودھ نہیں اترتا تھا۔ یہ بھبوکا بچہ
بندریا ماں کے سینے پر پنجے چلاتا رہا، اور پنجے مار مار کر نچلے ڈال دیئے تھے اور
اپنی ادھ کھلی آنکھیں گھماتا، ماں کے بدن پر سوں سوں کرتا، ورنہ یا ہو کھسیٹنے
لگتا تو بندریا خوخیا کر اسے کاٹ لیتی۔ اس کی پیٹھ پر ذرا ذرا سا اگلی رواں
لگ گیا۔ بار بار کاٹے جانے سے بندر کے گھاؤ پڑ گئے۔ اس وقت تک وہ
پنجرے کے سامنے شور مچانے والوں کو دیکھنے لگا تھا، ان کی آوازیں اور
نعرے سننے لگا تھا، انہیں چھلکے پھینکتے ہوئے اور پنجرے کے بندروں کی نقلیں
اتارتے ہوئے دیکھ دیکھ کر یہ سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا کہ سلاخوں کے دوسری
طرف کھڑے ہوئے یہ لوگ دراصل بندروں کی قید میں ہیں۔ اور وہ سر جھکائے
بندریا کے سینے سے چپکا اپنے آپ کو کسواتا رہا۔ دانتوں کے زہر سے اس
کے زخموں میں پیپ پڑنے لگی۔ یہ دیکھ کر بلدیہ والوں نے اس کی حفاظت
کے خیال سے اسے بندریا ماں سے الگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یوں بھی وہ جو
کام کیا کرنا چاہتے تھے اس کے لئے کوئی نہ کوئی اعلیٰ مقصد تلاش کر لیتے تھے۔
چنانچہ اسے نیلام میں مداری کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ مداری نے بندر کی بولی
جیت لی اور اسے مول لے چلا۔ مداری نے اسے ٹوپی اڑھائی۔ اس کی بڑبڑ
دیکھتی آنکھوں میں دھر کے کاجل تھوپا۔ گوٹے کناری کی لال سرخ بنڈی پہنائی
اور ڈنڈے کی مار پر ایک ٹانگ کے بل پھدکنا سکھایا۔ پھر جناب چھم چل چھم چل۔
مداری نے ایک انگلی پر لپیٹی بندر کی رسی، بغل میں دابا طوطا، پیٹھ پر لادا
جھولے کو اور ایک ہاتھ سے بجاتا چلا ڈگڈگی، ڈگڈگی، ڈگڈگی۔۔۔۔
گلی میں پہنچ کر اس نے ہانک لگائی "آیا بندر والا آیا، لایا بندر کا تماشہ
لایا"۔ مداری کی ڈگڈگی پر بندر ناچا، کودا، تھرکا، تماشائیوں نے

تالیاں بجائیں، بندر نے ہاتھ پھیلا کر پیسے مانگے، اور تماشہ دکھا کر چلا گیا۔

بندر کا یہ تماشہ روزانہ صبح سویرے شروع ہو جاتا ہے۔ روز صبح ڈگڈگی بجتی ہے۔ سورج اور مداری گھر سے ساتھ نکلتے ہیں۔ گلی میں دھوپ کی پہلی کرن کا نیزہ چمکا نہیں کہ ڈگڈگی بج اٹھی۔ مداری نے تھیلا اتارا بندر نے دو تین قلابازیاں کھائیں، بس پھر تماشہ شروع۔ بندر کے گرد ایک بھیڑ اکٹھا ہو جاتی ہے۔ ہجوم آوازے کستا ہے، تالیاں بجاتا ہے، قہقہے مارتا ہے اور سکے اچھالتا ہے۔ بندر ہاتھوں کے بل چلتا ہے، جنٹرمین بابو، بنکر دکھاتا ہے، فرضی بیوی سے لڑتا ہے، تین پہیوں والی سائیکل چلاتا ہے اور ہجوم کے پھینکے ہوئے ٹکڑے اٹھا کر منہ میں رکھ لیتا طوطا کچھ نہیں کرتا، صرف توپ چلاتا ہے، اور توپ چلا کر مداری کے بغل میں بیٹھ جاتا ہے۔

ہجوم نعرہ لگاتا ہے، مداری بندر کو چمکارتا ہے —

"بیٹا آلو ماشر، بھائی لوگ کو تماشہ دکھاؤ۔"

بندر آنکھیں میچ کے گال پھلا لیتا ہے۔

مداری پوچھتا ہے "سرکار خفا ہیں؟"

بندر منہ پھیر لیتا ہے، دونوں ہاتھ سر کے پیچھے ٹکا کر لیٹ جاتا ہے، ٹانگ پر ٹانگ رکھ لیتا ہے اس نے مداری کے تھیلے سے پلاسٹک کا سبز چشمہ نکال کر پہن لیا ہے۔

مداری بندر کو ڈانٹتا ہے "کام نہیں کرے گا تو روٹی نہیں ملے گی۔"

بندر دانت نکوس کر خوخیاتا ہے، پھر تھیلے میں سے لوہے کی ٹوپی نکال کر اوڑھ لیتا ہے۔

مداری زمین پر ڈنڈا پٹختا ہے "اوئے چاولی چینّ دے پتّر۔ تو کیا فوج کا افسر لگ گیا ہے؟"

بندر لپک کر تھیلے سے ایک لکڑی کی بندوق نکال لیتا ہے اور کندھے سے لگا کر ٹوپی ذرا سی ترچھی کر کے تماشائیوں کے سامنے اکڑ اکڑ کر چلنے لگتا ہے

مداری اپنے کان پکڑ لیتا ہے۔ "غلطی ہو گئی جرنیل ساب!"

بندر طوطے کی طرف رخ کر کے بندوق تان لیتا ہے۔ بندوق سے ڈاٹ بعد سے نکل جاتی ہے اور پٹاخہ چھوٹ جاتا ہے طوطا ٹیں ٹیں کرتا مداری کے ہاتھوں سے اڑ جاتا ہے۔ بندر تماشائیوں کی طرف دیکھتا ہے۔ تماشائی اس کی طرف چونیاں اٹھنیاں پھینکنے لگتے ہیں۔ پیسے مداری بٹور لیتا ہے۔ بندر کو تھپک کر اس کے ہاتھوں سے بندوق چھین لیتا ہے۔ اور دونوں آگے چل پڑتے ہیں۔

اور روزانہ تماشے کے بعد بندر پٹتا بھی ہے۔ تماشائیوں کی آنکھ اوجھل ہوتے ہی مداری توڑتا ہے ڈنڈا اور رسی گھسیٹ کر بندر کو لاتا ہے آگے، پھر دے دنادن، دے دنادن، اللہ دے اور بندہ لے۔ میرا مطلب ہے بندر لے۔ بندر لاتیں، گھونسے، تھپڑ، مکے کھاتا ہے، سوکھا پیٹ بجاتا ہے اور روز تماشہ دکھاتا ہے۔

بندر مداری کی آنکھ پہچاننے لگا ہے۔ مداری نے اس کے کان میں بالی پہنا دی ہے۔ بندر کو دو ٹانگوں پر چلنا غیر معمولی نہیں لگتا۔ بندر مداری کے نوالے گنتا ہے۔ بندر کو کبھی کبھی مداری پر پیار آجاتا ہے۔ پھر وہ اس کے سر میں سے جوئیں لیکھیں چننے لگتا ہے۔ مداری نے اپنی بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی نہیں کی۔ مداری جب میونسپل کمیٹی کے نلکے سے نہاتا ہے تو بندر نلکے کا ہینڈل چلاتا ہے۔ بندر نے ایک دفعہ ایک بلی پکڑ کر مداری کے تھیلے میں بند کر دی تھی۔

ایک دن بندر کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ قریب پڑا ریڈیو پوری قوت سے چلا رہا تھا۔ ریڈیو سے کلام اقبال نشر ہو رہا تھا بندر ریڈیو سن رہا تھا۔ اتنے میں وہاں آیا چنا جور گرم والا۔ اس نے گھنٹی بجائی اور آواز لگائی "بابو میں لایا مزے دار چنا جور گرم۔" بندر سب اخبار ریڈیو اور سیاسی شعور چھوڑ چھاڑ تھیلے پر جھپٹ پڑا چنے والے نے ہائے توبہ مچائی اسے کھلی دھاندلی قرار دیا۔ لیکن بندر نے دیکھتے ہی دیکھتے مٹھیاں بھر بھر کے چنے اپنے گالوں میں ٹھونس لئے۔ مداری کو پتہ چلا تو بندر پر بہت خفا ہوا۔ بندر بیٹھا اپنے بند سینے پر

ہنستا رہا اور کہتا رہا "جنگل کی بلا سے!" مداری کو اس پر اور غصہ آیا اور اس نے بندر کی دم دانتوں سے کاٹ ڈالی۔ پھر مداری کو خیال آیا کہ کہیں بندر کو زہر باد نہ ہو جائے۔ مداری کو ڈر ہے کہ اگر بندر مر گیا تو اسے پہلے کی طرح موت کے کنوئیں میں سائیکل چلانی پڑے گی، اور مداری کو اب اونچائیوں سے ڈر لگنے لگا ہے۔

اس رات بندر نے خواب دیکھا کہ مداری کے تھیلے میں بند بلّی تھیلے میں اچھل کود مچا رہی ہے اور اپنے دانتوں ناخنوں سے تھیلے کے بخیے ادھیڑ رہی ہے۔ بلّی کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے اور غرا رہی ہے۔

بندر دن کو پٹتا ہے اور رات کو خواب دیکھتا ہے۔ مداری نے اسے بہتیرا منع کیا کہ تو خواب نہ دیکھا کر، لیکن بندر نہیں مانا۔ ایک رات اس نے خواب دیکھا وہ مداری کے پاس سے رسّی تڑا کر بھاگ نکلا ہے بھاگتا چلا جا رہا ہے، ڈال ڈال، پات پات، ٹہنیوں ٹہنیوں، پیڑوں پیڑوں ہوتا ہوا، بارش میں بھیگتا، دھوپ میں جلتا بھاگتا چلا جا رہا ہے کہ اس نے دیکھا ایک پارک ہے، بالکل ویسا جس میں رات کے وقت مداری چمپی مالش کرانے جاتا ہے۔ اور اس پارک میں پندرہ بچے کھیل رہے ہیں بندر وہاں کود پڑا اور بچوں سے کہا ہمیں بھی کھلاؤ نا۔ ایک بچے نے کہا ہم تو "جھاڑ بندر" کھیل رہے ہیں، تمہیں نہیں کھلائیں گے۔ بندر نے کہا تم نہیں کھلاؤ گے تو میں بھنڈا کر دوں گا۔ بچے نے کہا جھاڑ بندر کیسے ہو سکتے۔ تم تو پہلے سے بندر ہو۔ بندر نے بچے کو چھو کر بھنڈا کر دیا۔ اور بچے کو چور بننا پڑا۔ باقی بچوں نے بندر کے گرد گھیرا ڈال دیا اور اسے چڑانے لگے "سات کھڑوں کو چھولو، سات کھڑوں کو چھولو"۔ بندر نے کھڑے ہوؤں کو چھونا چاہا مگر سب بیٹھ گئے۔ بندر پریشان ہو کر سر کھجلانے لگا، اتنے میں اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے دیکھا کہ مداری ڈنڈا لے کھڑا ہے اور پوچھ رہا ہے "رات بھر کہاں رہے؟"

اس کے بعد مداری نے بندر کو ہتھکڑی پہنا دی تاکہ وہ خوابوں میں زیادہ آوارہ گردی نہ کر سکے۔ مداری کو یہ بھی ڈر تھا کہ وہ کسی روز ہوتا ہوا "چڑیا گھر" نہ واپس چلا جائے اور وہاں بھانت بھانت کے جانوروں میں پھر سے نہ رہ پڑے۔ مداری کو بندر کی طرف سے بہت خدشے تھے۔ بندر نے جو بات بگڑتی دیکھی تو سوچا کہ جمورے سے دوستی کی جائے۔

اس نے جمورے کو پکارا۔ تھیلے میں سے بلّی کی زوردار غرغر سنائی دی۔

بندر نے کہا "اے بھائی جمورے کیوں نہ ہم تم مل کر عامل معمول کھیلیں"

جمورا بندر کو جواب دیتا ہے: "واہ ہم تم سے کیوں کھیلیں، جب تم نہیں آئے تھے تو ہمیں مداری سے گُر کی پوری جھیل ملتی تھی۔ تم تو مداری کے پٹھو ہو۔"

بندر کہتا ہے: "لیکن بھائی جمورے میں بندر ہوتے ہوئے بھی چڑیا گھر سے آنے کے بعد بندر بانٹ کا شکار ہو گیا۔"

جمورا بندر سے پوچھتا ہے: "پھر ہمارا تمہارا فیصلہ کس طرح ہوگا، عامل کون اور معمول کون؟"

اس سے پہلے کہ جمورا اور بندر کچھ اور کہتے سنتے ڈگڈگی بجنے لگی مداری آ گیا اور آتے ہی اس نے بندر کے لات جمائی۔ "یہ آپ ہی آپ بیٹھا کیا بڑبڑائے جا رہا ہے، دیواروں سے باتیں کرنے لگا ہے؟ چل دھندے کا وقت خراب ہو رہا ہے۔"

مداری شہر کے چوک میں کھڑا ہو کر آواز لگاتا ہے۔ مجمع اکٹھا ہو جاتا ہے۔ بندر سڑک کے بیچوں بیچ لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں موند لیتا ہے۔ مداری اسے ڈراتا ہے، دھمکاتا ہے، لیکن وہ اسی طرح پڑا رہتا ہے۔ مداری اس کو جوتے کی نوک سے چھو کر دیکھتا ہے، طمانچہ مارتا ہے، مگر بندر اسی طرح جوں توں پڑا رہتا ہے۔ تماشائی اپنے پیسے واپس مانگنے لگتے ہیں۔ پھر مداری تماشہ شروع کر دیتا ہے۔

مداری زور سے پکارتا ہے۔ "ہم کون؟"

بندر کی لاش بولتی ہے "عامل"

مداری پوچھتا ہے "تم کون؟"

لاش اوپر اٹھ آتی ہے اور جواب دیتی ہے "معمول"۔

مداری : " جو پوچھوں گا بتلاؤ گے ؟"

بندر کی لاش : " بتلاؤں گا ۔"

مداری ڈنڈا گھماتا ہے اور پوچھتا ہے " اچھا تو خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ سچ بتاؤ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے !"

لاش رونے لگتی ہے ۔ " پر آلوں چھاکریاں سائیں "

بندر کی لاش زمین سے بلند ہوتی ہے ، ہوا پر حرکت کرتی ہوئی تماشائیوں کے سامنے سے گزرنے لگتی ہے ۔ مداری اسے لکڑی کے صندوق میں بند کر کے ایک آری صندوق کے آر پار گذار دیتا ہے ۔ جاں نثاری کے دائرے میں کھڑا کر کے چاقو پھینکنے کا مظاہرہ کرتا ہے ، بندر کے سر پہ غبارہ باندھ کر رائفل میں چھرے بھر کے غبارے پھوڑتا ہے ۔ بندر کہتا ہے : " دئی دئی ، پھیرا وظے ، یا قربان ۔ خنزیر کا بچہ تم ام کو کیا سمجھتا ہے ، ام سے مسخری کرتی اے ، خانہ خراب ۔"

مداری لاش پر رومال رکھ دیتا ہے ، کچھ سڑ رہا ہے ۔ سڑنے کی بو آرہی ہے ۔

بندر مداری کو ڈانٹنے لگتا ہے ۔ " اے انگور کے انگو ۔ جا تی تی تی کیوں کرتا پڑا اے ، بابا ابی جاؤ ام لوگ کا کچھ کھالی بیلی نئیں کھاؤ ۔"

لاش ہوا میں رکی ہوئی ہے مداری لکڑی گھما رہا ہے ۔ لاش پھولنے لگتی ہے ۔

تماشائی ایک ایک کر کے ناکوں پر ہاتھ رکھ کے جانے لگتے ہیں ۔

بندر یک لخت اٹھ بیٹھتا ہے اور آنکھیں کھول دیتا ہے ۔ وہ کہتا ہے " میں مر گیا ہوں ۔ مجھے مار ڈالا گیا ہے ۔ کسی نے مجھے مار ڈالا ہے ۔ میرا خون خشک ہو گیا ہے ۔ مجھے زہر باد ہو گیا ہے ، اور ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ میرے اندر کا بندر مر گیا ہے !"

پھر مداری رک کر دیکھنے لگا کہ تھیلے میں سے بلی کب باہر نکلے گی ۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بندر زرا نہیں مرا ۔ بلکہ وہ ترقی کر کے خود مداری بن گیا اور سڑکوں پر ڈگڈگی بجاتا مداری کو نچاتا پھرتا ہے ۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بندر کو زہر باد نہیں ہوا ۔ کچھ لوگ —

کچھ لوگوں کو شہر کی سڑکوں پر کبھی کبھی بندر اور مداری نظر آجاتے ہیں رسی کا ایک ٹکڑا ہے جس کے ایک سرے پر یہ ہے اور دوسرے پر وہ ۔ ڈگڈگی بجتی ہے تماشہ ہوتا ہے ۔ پیسے پھینکے جاتے ہیں ۔ اور تماشے کے بعد وہ تھکے ہوئے لوگ پاس پاس بیٹھ جاتے ہیں دور سے دیکھنے پر یہ معلوم ہوتا ہے جیسے جیسے دو بڈھے رسی سے لپٹے بیٹھے ہیں ۔ پاس جاؤ تو پتہ چلتا ہے کہ ایک بوڑھا دوسرے بندر کے سر میں سے جوئیں چن چن کر کھا رہا ہے ۔ اور ڈگڈگی بج رہی ہے ، ڈگڈگی ، ڈگڈگی ، ڈگڈگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کبوتر

احمد جاوید

وہ پرندہ جو ابتدا میں اپنی اسیری پر بہت ملول تھا اب نہیں ہے۔
آغاز میں اس کی پھڑپھڑاہٹ دیکھنے لائق تھی — وہ اڑنے کے شوق میں
پنجرے کی دیواروں اور چھت سے ٹکراتا، لڑکھڑاتا، گر پڑتا — وہ اس اسرار
پر حیران تھا کہ کھلی اور آزاد فضائیں اس کی دسترس سے یکلخت باہر کیسے ہو
گئیں بعیں — کئی گھڑیاں اس طرح گزار کر آخر اسے ملول ہونا تھا سو
وہ ہوا — دانا نہ چگا پانی نہ پیا — وہ رات اس نے پروں میں سر دیے
کرہیں گزاری — ہر آہٹ پر چونکتے سر گھماتے آنکھوں میں کاٹی۔ کہیں
ارد گرد کوئی چہچہے بھی تھے جو بلاتے بھی تھے مگر راہ میں دیوار تھی۔ کہاں
جانا، کیا کرنا۔

وہ بھی کیا رت تھی جب شاخ شاخ جھولنے، اڑنے پھرنے کی آزادی
تھی، ندی نالوں پر پرواز کرنے، دور نکل جانے اور پھر لوٹ آنے کا
اختیار تھا — گھروں کی منڈیروں پر اترنے چہکنے، صحنوں میں آ بیٹھنے
اور آہٹ پا کر اڑ جانے میں کیسی لذت تھی۔ پروں کی دسترس میں آسمان تھا
اور آسمان کیسی کشش رکھتا تھا۔ یہ بلندی پر پھیلنے اور پھیلتے ہی رہنے کا کھیل
کہاں رہ گیا اور کہاں رہ گئی تھی۔ وہ پرواز جو کبھی اختیار ہی میں ہوا کرتی تھی
— یہاں تو سمٹنے اور سکڑنے کا بھی کوئی مقام نہ تھا۔ کسی پکڑنے والے
پنجے کا انتظار کرنا چاہیے تھا — تو پرندے کے وجود میں لرزش ہوتی تھی
اور کسی منحوس گھڑی کے انتظار میں موسم گزرتے جاتے تھے — لیکن کوئی ہمیشہ
ایسے کیوں کر گزارے، وہ آدمی ہو یا پرندہ ڈھنگ بدلنا پڑتے
ہیں سو اس نے بدلا — دن بیتے جب اس نے پھڑپھڑانا ترک کیا۔
بہت بے چین ہوتا تو کچھ بول لیتا جیسا کہ پرندے بولتے ہیں — دانا پانی
میسر تھا سو ان پروں میں سر دیے کر سوئے کے سوا چارہ نہ تھا جو اب اڑنے
کو ترستے تھے — جیسے تیسے بسر کرتا تھی۔

ایک دن ایک بلی کھلے دروازے سے اندر آئی یوں کہ جیسے انتظار
ختم ہوا وہ لمحہ آیا تھا جو نہ آتا تو اچھا ہوتا۔ وہ سر اٹھا اٹھا گھما گھما اس کی
ہر حرکت دیکھنے لگا — بلی ادھر ہی کو بیکی تھی — بس یا بعد دن کٹنے
تھے۔ اب کوئی مصیبت سر پہ کھڑی تھی۔ پنجرہ ذرا بلندی پہ تھا — بلی سر اٹھا
اس کے رو برو کھڑی غرانے لگی۔ پرندہ اس کے سوا اور کیا کرتا۔ بدحواسی میں
ادھر ادھر پھڑپھڑانے لگا۔ پھڑپھڑاتا رہا۔ جیسے کوئی اس پر جھپٹ رہا ہو۔
ادھیڑ رہا ہو۔ بکھیر رہا ہو۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ کچھ پل گزرے جب وہ رکا
حیران ہوا — کچھ دیر اسے دیکھتا رہا جو غراتو رہی تھی مگر پنجا نہیں بڑھا رہی تھی
وہ اڑنے سے معذور تھا مگر بلی کی دسترس سے بھی باہر تھا۔ اسے اطمینان ہوا۔
اطمینان ہوا تو اس نے بھی اپنی گردن کو پھیلا لیا۔ اور ایک پاؤں بند پنجرے کے
فرش پہ مارتا بولنے لگا۔ جیسا کہ پرندے آپس میں لڑتے ہیں تو بولتے ہیں —
پنجرے کی حفاظت میں پہنچ کر بلی کھانے اور غصہ میں آکر بولنے میں کیا مضائقہ
تھا۔ بلی نے اسے اس عالم میں آتے دیکھا۔ حیران ہوئی۔ کچھ دیر رکی پھر کسی اور

سمت ہوئی۔ پرندے نے اسے جاتے دیکھا سکھ کی سانس لی۔ یہ سکھ کی سانس بھی کئی
دنوں میں میسر آئی تھی۔ گھر کے بچوں نے بھی یہ تماشہ دیکھا تھا۔ اداس در ہوئے تھے۔ پھر وہ
یہ تماشہ روز کرنے لگے۔ بلی روز آتی وہ روز سکھ کی سانس لیتا۔ جب نہ آتی تو لایا رہتا۔
وہ آدمی ہو یا پرندہ دل بہلانے کو کوئی حیلہ چاہیے۔ کہ ہر کھیل کی اپنی ایک لذت ہے۔
پنجرے کی حفاظت میں بلی کھانا اور غصے میں آکر بولنا بھی کیا بولا ہے۔

وہ پرندے جو مزاروں پر بسیرا کرتے ہیں، گنبد و مینار پر اترتے ہیں اور
وہ پرندے جو شاخ شاخ جھولتے ہیں اور ندی نالوں پر چہکتے ہیں۔ جزیروں کی خبر
لانے والے سمندری پرندے اور پرمردوں پر بیٹھنے والے پرندے — سب پابند
ہیں کوئی آزاد نہیں آسمان اور زمین کے درمیان ایک پنجرے میں پھڑپھڑاتے
ہیں۔ یہ تو یوں ہی گمان ہوتا ہے کہ وہ اڑتے پھرتے ہیں، شاخ شاخ جھولتے
ہیں اور آزادی سے گیت گاتے ہیں۔ کھلا ملا آسمان فراموش کر دینا چاہیے
جب پنجرے کی مضبوط جالیوں کے بیچ کوئی خطرہ نہ ہو۔

زندگی کا معمول ایک سا نہیں رہتا طبیعت کے رنگ بھی بدلتے ہیں
وقت بھی بدلتا ہے۔ پنجرے میں بند پرندے ہوں یا آدمی ہمیشہ توجہ میں کب
رہتے ہیں۔ کبھی کبھی نگاہ چوک بھی جاتی ہے کسی کی لاپرواہی یا بے احتیاطی سے
ایک روز پنجرے کا دروازہ کھلا رہ گیا وہ کھلے دروازے پر آیا۔ کچھ دیر رکا رہا
باہر جائے کہ نہ جائے۔ دل میں یوں ہی ایک وسوسہ ٹھہرا ہوا تھا مگر پھر بے دھیانی
میں آپ ہی آپ جست کر آیا۔ سامنے کوئی نہ تھا۔ صحن میں کمروں میں ہر طرف گھومنے
پھرنے کی آزادی تھی وہ گھومتا رہا اور ڈھونڈتا رہا مگر یہ سوچتا نہ تھا کہ تلاش کس کی
ہے۔ منظر جب حافظے سے اترتے ہیں تو شریانوں میں سرکتے ہیں — خون کی گردش
کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مگر یاد نہیں آتے — آدمی اور پرندے اس حساب سے
یکساں ہیں۔ بس کوئی اپنا ہوتا جلدی فراموش کرتا ہے کوئی رفتہ رفتہ۔ بھولی ہوئی
دنیا کے نشان البتہ وجود پر کہیں رہ جاتے ہیں۔ جب کہیں کچھ مانوس سا ہوتا ہے
تو دل اڑنے کو چاہتا ہے۔ اوپر پرندے شور کرتے گزر رہے تھے۔ وہ ٹھہر کر
کچھ سے لگا — اوپر بہت دور کہیں بلندی پہ اک چھت تھی۔ چھت تھی کہ آسماں
تھا۔ بہت ہی دور اور بلند۔ اس نے پر کھول لیے پھیلائے — پھر دیر تک اوپر دیکھتا
چلا گئے کی خواہش کرتا رہا۔ مگر پنجے زمیں سے جدا نہیں ہوئے — پھر کہیں کوئی آہٹ
ہوئی وہ بدک گیا۔ سمٹ گیا۔ سمٹنے اور سکڑنے کو زیادہ جگہ درکار نہیں ہوتی بس
ذرا سا سر جوڑنا ہوتا ہے۔

پنجرے کے کھلے دروازے پر جب کسی کی نگاہ پڑی تو شور مچ گیا۔ پنجرہ
خالی تھا بچوں کے چہرے اتر گئے۔ بڑوں کو بھی پریشانی ہوئی — تلاش بیکار
تھی۔ پرندہ تو اڑ گیا ہوگا۔ پھر ایک وقت کسی نے دیکھا وہ اڑا نہ تھا۔ ایک الماری
کے پائے کے ساتھ لگا چپ چاپ بیٹھا تھا۔ سب مطمئن ہوئے۔ کچھ دیر بعد وہ خود
ہی آیا ٹہلتا ٹہلتا چلا اور جست کر کے پنجرے میں داخل ہوا۔ برتن میں پڑا دانہ دنکا
چگنے لگا۔ سب کے چہرے کھل اٹھے — اسے کھلا نیلا آسمان فراموش ہوا تھا۔

اس دن کے بعد پنجرے کا دروازہ بند کرنے کی قید ختم ہوئی۔ آخر پرندہ
تھا تھوڑی سی کھلی فضا اسے بھی درکار تھی۔ یوں بھی وہ اب مانوس ہو چکا تھا۔
کہاں جانا تھا اسے۔ عام خیال تھا کہ اگر اڑ کر دور بھی چلا گیا تو لوٹ آئے گا
جب دروازے کی قید نہیں تو پنجرے کی کیا حاجت ہے البتہ پرانے
ایک طرف تو اس میں حرج بھی کیا ہے۔ اب وہ ادھر ادھر حرکت کرنے کو آزاد
تھا۔ اس کے لیے تو اب وہ گھر بھی آس کا جنگل تھا۔ ہرا بھرا درختوں اور
جھاڑیوں سے سجا۔ اس کے سوا ادھر ادھر اور کیا ہوگا۔ کہ سب منظر ہے منظر بدلنے
کی بات ہے۔ یہ منظر ہے منظر کون بدلتا ہے۔ جنگل کو گھر اور گھر کو جنگل کون بناتا
ہے۔ یہ آدمیوں کے فکر کرنے کے معاملے تھے۔ پرندے کے وجود میں تو بس اک
ذرا لرزش ہوتی تھی کبھی کبھی — پھر شام تک ٹہلنے کے بہت سے سلسلے تھے۔ جب
بچے کھانا کھانے بیٹھتے یا پڑھتے ہوتے وہ آکر ان کے کندھوں پر بیٹھ جاتا اور
ادھر ادھر پیار سے چونچیں مارتا وہ کھلکھلا کر ہنستے اور پیار سے گود میں بھر
لیتے۔ رات البتہ اسے موسموں کی سختی سے محفوظ رکھنے کی خاطر پنجرے میں
بند کر دیا جاتا — آخر آدمی بھی سونے سے پہلے دروازے کھڑکیاں بند
کر لیتے ہیں —

یہ بچوں کے سوچنے کی بات ہے کہ پرندے کہاں سے آتے ہیں اور
کس سمت کو جاتے ہیں۔ اور ان کے ٹھکانے کہاں مقرر ہیں۔ شاید یہ آسمانوں
سے آتے ہوں اور ادھر ہی کو لوٹ جاتے ہوں۔ یا شاخوں سے نکلتے ہوں
پھولوں اور پتوں کی طرح جیسے کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ یہ مکتب کی کتابوں میں

لکھا ہے کہ آسمان پر پرندے اور زمین پر آدمی سب آزادی کے استعارے ہیں۔
مگر یہ آدمی بھی پنجروں میں بند کئے جاسکتے ہیں۔

بچوں نے اس شام بہت سوچا اور پریشان ہوئے کہ انہوں نے ایک پرندے کو اس کے آسمان سے جدا کر دیا تھا۔ اور پھر اس رات خواب میں ایسے ملک دیکھے جہاں شاہی دربار میں ایسے پنجرے رکھے ہوئے تھے جن میں آدمی پابہ سلاسل تھے۔ اور ان کی حفاظت پر خونخوار درندے مقرر تھے۔ وہ صبح بچوں کے لئے خوف لے کر آئی۔ وہ بہت دیر اداس بیٹھے رہے۔ انہیں پنجرے سے دہشت ہوئی اور انہوں نے پرندے کو دور اپنے آشیانے کی طرف اڑانے کا ارادہ کر لیا۔

بچوں کو یہ علم نہیں ہوتا کہ پالتو پرندوں کو نہیں اڑانا چاہیے کہ ان کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں ہوتا۔

وہ بے جراسے چھت پہ آئے اور منڈیر پر بٹھا دیا اور اس کے اڑنے کا انتظار کرنے لگے۔۔ مگر اس وقت انہیں بہت دکھ ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ پرندہ جست کرکے منڈیر پر تو آ بیٹھا مگر اڑا نہیں۔ وہ ہاتھ جھلائے اسے اڑاتے رہے مگر وہ ادھر ادھر پھلانگتا رہا کہ ایسے کھیل وہ روز کھیلتا تھا۔۔ جب بچے تھک ہار گئے تو سیڑھیاں اتر کر گلی میں نکل گئے کہ یہ ان کے کھیلنے کودنے کا وقت تھا۔ پرندہ منڈیر پر تنہا کھڑا رہ گیا۔

چاروں طرف آسمان تھا اور پرندوں کے چہچہے تھے۔ ہر چیز نئی تھی۔ وہ سرشار ہوا تو یونہی بے ارادہ جسم جھکایا جیسے اڑنا چاہتا ہو مگر جب سر اٹھایا تو ایک مرتبہ یوں محسوس کیا جیسے اور آسمان نہ ہو کوئی چھت ہو جس سے ٹکرا کر گرنے کا اندیشہ تھا۔ ہمت جواب دے گئی۔ نیچے سامنے صحن بھی تھا جہاں آشیانہ تھا مگر گہرائی بہت تھی۔ گرنے کا اندیشہ تھا۔ وہ ادھر ادھر ٹہلتا جھک کر دیکھتا پھر مایوس ہو جاتا۔ پرندے سر پر سے شور مچاتے گذرتے جاتے تھے مگر اسے معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ کون مخلوق ہے اور کدھر کو جاتی ہے۔۔۔

آوارہ کتے گلیوں اور سڑکوں پر بھونکتے پھرتے ہیں اور بلیاں گھروں کی چھتوں اور منڈیروں پر منڈلاتی ہیں۔ سب اپنے اپنے شکار کی تاک میں ہشیار رہتے ہیں۔

وہ بلی بھی بو پاکر آئی اور پھر اس نے اسے چھت پہ منڈلاتے دیکھ لیا۔۔۔ رک غرائی۔ پرندے کا اس سے روز کا کھیل تھا۔ مگر اب کھیل کی صورت اور تھی۔ اس وقت تو وہ اس کے پنجے کی دسترس میں تھا اس سے پھڑپھڑا کر جدا ہوا۔ اس نے پھر جست کی وہ دیوار سے ٹکرا کر پھڑپھڑایا۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ پنجہ زمین پہ مار کر گردن پھلائے اور خود بھی اسی طرح غرائے مگر مہلت نہیں تھی۔ کھیل کی رفتار بڑھ گئی تھی۔۔ وہ پر پھیلاتا پھڑپھڑاتا رہا۔ اسے ان مہربان ہاتھوں کا انتظار تھا جو آتے اور سمیٹ کر پنجرے کی دیواروں میں محفوظ کر دیتے۔ مگر اب تو سامنے بلی کا پنجہ تھا۔ جب راستے بند ہوئے تو کچھ دیر پھڑپھڑا کر اس کا آنکھیں بند کیں اور اپنا پنجرہ آپ ہو گیا۔۔ ہر چند وہ چاہتا تو اڑ سکتا تھا اور حالانکہ بلی نہیں اڑ سکتی تھی مگر وہ فیصلہ نہیں کر پا سکا تھا کہ پر اڑنے کے لئے ہوتے ہیں یا محض پھڑپھڑانے کے لئے۔ وہ آدمی ہوں یا پرندے جب اڑنے کی عادت بھول جائیں تو آخر آخر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اپنا پنجرہ آپ ہو جاتے ہیں۔

۔۔

آتے جاتے موسموں کا سچ

ہرچرن چاولہ

"اُٹھو کاکا باہر چلیں۔" وہ پیار بھری آواز میں کہتے۔

میں لاڈ سے کہتا۔ "دیکھو میں کام کر رہا ہوں چاچا۔"

"پھر وہی!" وہ سرزنش کرتے ہوئے میری طرف دیکھتے۔

"میں سنبھلتا، اپنی دُرستی کرتا۔ "انکل میں کام کر رہا ہوں۔"

وہ میرے ان کو انکل کہنے پر خوش ہو جاتے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ میرے ان کو چاچا کے خطاب کو پسند نہیں کرتے، نہ جانے کس جذبے کے تحت میرے مُنہ سے اکثر چاچا ہی نکل جاتا تھا مگر ان کی ناراضگی پھر مجھے راہ راست پر ڈال دیتی تھی۔

"اٹھو باہر چلیں۔"

میں ادھر ادھر سستی بھری جان مروڑتا۔ ان کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھتا

"تم اٹھو تو سہی۔"

میں با دل ناخواستہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ میں بچہ تو اب نہیں رہا تھا جوانی کی حدوں سے کچھ آگے ہی نکل گیا تھا۔ حتیٰ کہ بہت پہلے تک بھی میرے کچھ کچھ بال سفید ہو چلے تھے۔ عقل داڑھ بھی نکلے زمانہ ہو چکا تھا مگر چاچا مجھے بچہ ہی سمجھتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ یہ احساس دور گہرائیوں تک میرے اندر رسا بسا رہے۔ نہ جانے کیوں مجھے بھی ان پر پورا اعتماد تھا اور میں خواہ مخواہ ان کے سامنے بچہ ہی بنے رہنے میں عافیت سمجھتا تھا۔ شاید چاچا اور انکل کا فرق ہمیں اپنی اپنی ٹھیک راہوں پر چلاتا تھا۔ راہ میری بھی اپنی جگہ ٹھیک تھی، راہ ان کی بھی اپنی جگہ ٹھیک تھی۔ اپنی اپنی سوچوں پر ہر ایک اپنے اپنے پہرے ہوتے ہیں اپنا اپنا اختیار ہوتا ہے۔

گلیاں بازار گھومتے، سیر کرتے چاچا مجھے سمجھاتے جاتے۔ "دیکھو کاکا گھوما پھرا کرو۔ سیر کیا کرو۔ اس سے ٹانگیں مضبوط ہوتی ہیں۔ صحت ٹھیک رہتی ہے اور کبھی کبھی موج میلہ بھی ہو جاتا ہے۔"

"وہ دیکھو کیا پڑا ہے؟" چاچا بوڑھے ہو چکے تھے۔ کمر جھکی مشکل تھی۔ چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے تھے۔

میں دیکھتا۔ کہتا۔ "انکل مونگ پھلی ہے۔"

وہ پیار سے کہتے۔ "اٹھا لے کاکا۔"

میں جھجکتا۔ وہ کہتے "میں جو کہہ رہا ہوں، اُٹھا لے۔"

میرا ان پر اعتماد ٹھاٹھیں مارتا اور اوپر کے کناروں سے آ ٹکراتا۔

"میں مونگ پھلی کا دانہ اٹھا لیتا۔ "کھا لے" وہ کہتے اور میں دانہ چھیل کر منہ میں ڈال لیتا۔

آگے کوئی ریوڑی کا دانہ پڑا مل جاتا۔ وہ بھی مجھے اسی طرح اٹھوا کر مجھے کھلوایا جاتا، پھر کچھ اور، پھر کچھ اور۔ جانے یہ کب تک سلسلہ چلتا رہتا۔ آخر چاچا کہتے "دیکھا ہمارے ساتھ آنے کے کتنے فائدے ہیں۔ کتنی موج کرتے ہو۔"

راستے میں کوئی خوبصورت چہرہ نظر آجاتا تو چاچا کے قدموں اور

نظروں میں حواس جھلک جھلک پڑتی اور ان کے قدموں میں تیزی بھی پیدا
اور نظروں میں بھوک ہی بھوک لہرانے لگتی۔ حالانکہ ان کے جو تھا بیسیوں
پاؤں میں بالکل بیہودہ کاٹ لگے تھے اور بیہودگی انھیں صرف لحاظ داری کے
ناطے بڑا بھائی ماننے سے زیادہ پر بالکل تیار نہیں تھا مگر وہ پھر بھی مجھے
نظر انداز کر کے نپلا دے سکتے تھے پھر کے بھی لگ جاتے مگر جیسے تیر وہ شیاں
ایسی پرچھائیوں کو حل لیتیں اور چاچا کی رتانہ بھری آنکھیں کچھ بھی نہ دیکھ
سکتیں تو ان کا بڑھاپا واپس لوٹ آتا اور وہ پارک کی کسی قریبی بنچ پر
ہانپنے کانپنے ڈھیر ہو جاتے۔

چاچا کی عینکیں تو کئی تھیں مگر درمیاں کی بھوک ان کی بہت تیز
تھی نظریں تو ان کی یہی بتاتی تھیں، آگے کی اللہ جانے چاچا کی کھنڈرات
۔ کبھی کسی عظیم عمارت کا پتہ نہیں دیتے تھے کہ میں دل کو یہ سمجھا لیتا کہ کبھی اس
عمارت میں ننھی نورجہاں رہائش پذیر رہی ہوں گی۔ اور ہو سکتا ہے یہی ان کی
گھبراہٹوں تک اتری بھوک کا کارن ہو۔ دراصل بات یہ ہے کہ چاچا دوسرے
شہر میں رہتے تھے۔ یہاں انھیں کافی سہولتیں تھیں۔ میرے ہاں تو شاید وہ
آزادی بھرا سانس لینے اور میرے احساس تابعداری کا فائدہ اٹھانے آتے
تھے۔ چاچا کے پاس کسی ماہر داستان گو کی طرح کہانیوں کا وسیع ذخیرہ
تھا جو وہ مجھے سنایا کرتے تھے۔ شروع شروع کی ان کی کہانیاں واقعی بہت
مزے دار ہوتی تھیں جیسے پستے باداموں بھری قلفی کی ملائی ہوتی ہے۔ مگر بعد میں
جب انہوں نے دفتروں وغیرہ میں کام کرنے والی عورتوں پر کہانیاں کہنی شروع کیں۔
اور پھر ایسی عورت کو کام پر صرف عشق کرنے جاتا دکھانا شروع کیا تو مجھے
بہت برا لگا کیونکہ سچ یہ تھا کہ زیادہ تر عورتوں نے دفتروں میں ایسے کام اپنے
بہتر مستقبل چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم، اپنے جہیز کے مسائل اور گھر کی غربت
دور کرنے کے لیے شروع کئے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ جب سے ضعیف چاچا نے خود کو
ایسی داستانوں کا ہیرو پیش کرنا شروع کیا تو میں نے انھیں چرنے سے سر سے پاؤں
تک نظروں بھر بھر کر دیکھا اور مجھے لگا جیسے قلفی بنانے والے سے قلفی کے
ڈبے میں نمک بھری برف کا پانی ٹپک گیا ہے۔
بیچ سے اٹھ کر پھر چاچا بازاروں میں آجاتے اور ان کی چلی ہوئی ملائی
کی اونچی دوکان کے میٹھے پکوانوں کی خوشبو اور گرم گرم چائے انھیں اپنی
طرف کھینچنے لگتی۔ وہ اندر لگی میزوں کرسیوں میں سے کسی ایک پر دھڑام سے
گرتے اور دونوں چیزوں کا آرڈر دے دیتے۔ ان کا آرڈر سن کر میری بھوک
بھی چمک اٹھتی۔ مگر چاچا ایک چائے کا گلاس اور مٹھائی کی پلیٹ اپنے سامنے
سرکا لیتے اور کھانے لگتے۔ پھر اچانک ہی چائے لانے والے چھوکرے
کو آواز دیتے " چھوکرے خالی پیالہ لاؤ " میں کہتا۔ لے بھائی مٹھائی
نہیں تو آدھی چائے تو مل رہی ہے مگر وہ پیالہ دراصل چائے ٹھنڈی کرنے
کے لئے منگوایا جاتا تھا۔ چاچا کھاتے رہتے، میں دیکھتا رہتا اور میرے ذہن
پر عرصہ کی ویسی ہی یورشیں ہوتی رہتیں جو بچپن میں ہمارے امیر پڑوسی کے لڑکے
حیدر کے میرے مٹھائی کھانے پر ہوا کرتی تھیں۔ وہ ظالم نہ صرف میرا منہ چڑا چڑا کر
میرے سامنے مٹھائی کھایا کرتا تھا بلکہ مجھ غریب کی غریبی کا مذاق بھی یہ کہہ کر اڑایا
کرتا تھا۔

" راجے راجے کھاتے ہیں، بلیاں بلیاں دیکھتی ہیں۔"

چاچا کی حالانکہ آنکھیں میری ذہنی کوفت کو تاڑ جاتیں مگر پھر بھی
ایک آدھ دانہ مجھے دینا انھیں مشکل لگتا اور وہ میرے ادب اعتقاد کی کمزور
رگ کو زور سے پکڑتے، دباتے اور کہتے " کاکا تو اتنے عرصہ تو میرے ساتھ
کھاتا پیتا رہا ہے۔ اب اپنا پیٹ خراب کرنا چاہتا ہے۔ تمہارے بھلے کی کہتا ہوں
زیادہ کھانا پینا اچھا نہیں ہوتا۔"
اور چاچا ساتھ ہی ابھی ابھی کھائے پیے کی کھٹی میٹھی ڈکاریں مارنے لگتے۔

ایک دن میں نے سوچا چاچا تو میرے اعتماد کا استحصال کر رہا ہے۔ مجھے
ان کے شکنجے سے نکلنا چاہئے۔ مگر میں اپنے ہی جال سے خود کو آزاد نہ کرا سکا۔
ماننے کی دوسری کمزور جگہ مجھے اپنی غریبی نظر آئی۔ میں نے دور گہرائیوں تک
اپنے اندر جھانکا۔ ارے میرے اندر تو خزانے بھرے پڑے ہیں۔ میں کہاں غریب
ہوں۔ صرف احساس غریبی نے مجھے اپاہج کر رکھا ہے۔ میں نے ہاتھ پاؤں
جھٹکے تو انھیں کافی مضبوط پایا۔ پھر تولے تو ان میں بے پناہ طاقتیں
نہاں پائیں۔ میں اڑا، نئی سرسبز و شاداب وادیوں نے مجھے سلام کئے۔
چاچا کی قید سے آزاد، میں نے کھلی فضاؤں میں سانس لیے بھرپور

میں تازہ ہواؤں نے میری بھوکوں کو جگایا۔ نئی پرکیف وادیوں کی گود یوں میں میرے لئے لاتعداد خورد و نوش کے ذخیرے موجود تھے۔ نئی دنیائیں مجھے جھک جھک کر سلام کر رہی تھیں۔ نئے سورج میرے بدن کے رنگوں پر لشکارے مار مار کر انھیں اور زیادہ دل کش اور قابل دید بنا رہے تھے۔ میں نے چاچا کو بھلانا چاہا۔ دل کو سمجھایا۔ اب وقت بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ پیچھے مت دیکھو۔ چاچا پھر تمھیں دھکیل دے گا۔ آگے بڑھو۔ چاچا ہی کو گولی مارو مگر میرے اندر ایک اور کمزور انسان بھی تھا جو چاچے کا دیوانہ تھا اور بزرگ کہتے ہیں کلجگ کا یہ گھور اندھیر زمانہ ایسے ہی انسانوں کے سہارے چل رہا ہے۔

چاچا نے میری چمک دمک دیکھی تو پھر مجھ پر اور زیادہ لٹو ہو کر جوڑ ڈالنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ میرے اندر کا کمزور انسان ان کا ساتھی بن بیٹھا اور سمجھاتے بجھاتے میرے ذہن کو اس نے یہ کہہ کر اور جھڑک کر خاموش کر دیا کہ چاچا میری چمک دمک پر خوش ہوا ہے تم کیوں جلتے ہو۔ چاچا نے مجھے یاد دلایا کہ انھوں نے کبھی مجھے کیسی کیسی موجیں کروائی تھیں۔ انھوں نے میرے اپنے ہی اندر کے کمزور شریف اور غیرت مند انسان کو جگایا۔ ذہن نے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ چیخ کر کہا کاش تم نے ایسی شرافت کا گلا بہت پہلے گھونٹ دیا ہوتا تو زندگی بھر کے استحصال سے تو بچ جاتے مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ میرے اندر چاچا کے خیر خواہ دوست کی جڑیں کافی گہری پیوست ہو چکی تھیں۔ اور سمجھدار ذہن اس کے آگے بے بس تھا۔ میں نے چاچا کو آواز دی۔ چاچا نے کہا۔ آواز کو پیچھے لگاؤ۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ چاچا میرے پاس آ گئے۔ کہا۔ اب مجھے بھی موجیں کراؤ۔ اور میں نے انھیں مجھے کروائی ہوئی عیاشیوں کے بدلے وہ وہ موجیں کروائیں جو میسر وسائل کے باوجود ابھی تک خود نہیں کر سکا تھا۔ غیرت مند جو بہت تھا، شریف جو لاانتہا تھا۔ چوری کا موقع نہیں رکھتا تھا۔

یہاں آنے کے بعد چاچا نے دیکھا کہ میری آنکھیں اب کھل چکی ہیں۔ انھیں میری دیکھتی آنکھیں بہت بری لگنے لگیں۔ ارے کالا تو تو دیکھنے لگ گیا میری چمک دمک اُن کی آنکھوں کو چبھنے لگی۔ اور انھوں نے مجھ سے کم دوسرے چمکیلے چہروں کے گن گانے شروع کر دئے۔ انھیں میرے جیسی موجیں کرانے کے وعدے وعید کئے۔ چنانچہ انھوں نے اب مجھ سے کم پر راضی ہو جانے والے لوگ تلاش کر لئے ہیں اور میرا پیچھا بھی چھوڑ دیا ہے۔ سچ بتاؤں میں اب ان کی ہمارے درمیان پیدا کردہ اس خلیج کے کارن اُداس نہیں بلکہ خوش ہوں کیونکہ میں وہ علاقہ ہوں جو مانگا نہیں گیا۔ جس کے لئے جنگ نہیں کی گئی۔ آزادی خود ہی ایک تحفے کی طرح جس کی جھولی میں آ پڑی ہے۔ ہاں میرے اندر کی جائز سوچوں والا شخص یہ ضرور سوچ رہا ہے کہ غلامی کا یہ طوق میرے گلے سے تو نکلا، چند نے گناہ اور بھولے بھالے دوسرے گلوں میں پڑ گیا ہے۔ دعا گو ہوں کہ خدا انھیں بھی آزاد ہو جانے کی توفیق عطا کرے یا کوئی ایسا ہی معجزہ انھیں بھی آزاد کر دے۔

زمین

مظہر الزماں خاں

وہ نیلی چھت کے نیچے ننگی چت لیٹی ہوئی تھی اور اس کے جسم کے مختلف حصوں پر گہرے گہرے بادل۔ تیز دھوپ، سائے اور رات۔ ٹکڑوں کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے اور وہ سب کے سب سفید لباس میں ملبوس۔ اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے مبہوت کھڑے تھے۔ اور دور بہت اوپر ہوائیں مسلسل ہچکیاں لے رہی تھیں کہ شاید سر برہنہ اپنی آخری اڑان بھرنے کے لئے مضطرب تھا۔

"دیکھا تم نے! چند لمحوں کی پر اسرار خاموشی کے بعد ان میں سے ایک نے سر ہلایا اور اپنے ساتھیوں کے چہروں کو تشویش آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا ـــــ اب اس حال کو پہنچ چکی ہے کہ پچھتر فی صد بیند میں ہے اور پچیس فی صد جاگ رہی ہے کہ پتا نہیں کب پوری طرح سو جائے۔

"ہاں" سبھوں نے بیک وقت کہا۔ اس پر غنودگی طاری ہو چکی ہے کہ آنکھیں نیم وا ہیں اور پورے جسم سے بڑی کرب انگیز آوازیں برآمد ہو رہی ہیں۔ ایسی آوازیں جن میں بے شمار درد رباں بن گئے ہیں کہ اب یہ ان گنت امراض میں مبتلا ہو چکی ہے اور ہر مرض اپنی جڑیں مضبوط کر چکا ہے تاہم نمو کی قوت ہنوز باقی ہے کہ سینے کے اندر سورج مکھی کے لاتعداد پودے کھل کھلا رہے ہیں۔ لیکن زیتون پیدا کرنے سے پہلے اب یہ محروم ہو رہی ہے۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور کل اس کی دونوں ہتھیلیوں کو اپنی چھوٹی چھوٹی ہتھیلیوں سے سہلانے لگا اور سینے پر ہونٹ رکھ کر کچھ دیر تک بلی کی طرح چپ چپ کرنے کے بعد سوالیہ نگاہوں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا ـــ پوست ابھی پوری طرح بے احساس نہیں ہوا کہ گرمی ابھی باقی ہے۔ اور دائیں ہتھیلی کے ایک متاثرہ حصہ پر ہلکی ہلکی بارش جھم جھم گر رہی ہے اور بارود کی بو پورے جسم سے اٹھ رہی ہے اور بیکر کرب انگیز آوازوں کا سلسلہ مسلسل جاری ہے۔

"ہاں۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے ہوئے ایک شخص نے کہا۔ رات میرا جسم اپنے مقام پر ساکت پڑا ہوا تھا اور دماغ ان گنت سایوں میں گھرا ہوا تھا اور ان سایوں کے بیچ یہ ننگی چت لیٹی ہوئی تھی کہ دفعتاً میرے دماغ نے ایک جست لگائی اور میں نے اپنے پنجے اس کے جسم میں گاڑ دیئے اور پھر اسے نامعلوم مقام کی طرف لے اڑا۔

"ہوں" دوسرے نے ٹھنڈا سانس لے کر اپنے ساتھی سے کہا۔ میں اس کے جسم کے مخصوص حصے کو اپنی ذاتی زبان سے چاٹ رہا تھا اور ایک عجیب سی خواہش میرے اندر سلسلا رہی تھی کہ میری خواہش ایک زنجیر تھی جس کی ہر کڑی بجتی تھی تو جھنکار کی آواز سے میں شکلیں بدل بدل کر اس کے جسم کو چاٹنے لگتا تھا کہ میں دنیا کا دوسرا اور آخری آدمی ہوں۔

"ہوں۔ تیسرا ان دونوں کی طرف چند لمحوں تک دیکھتا رہا۔ پھر بولا ـــ" میرے ذہن نے اس کے ذہن پر ابکائی کر ڈالی تھی اور اس کے دھبے جگہ جگہ پھیل گئے تھے کہ مجھے مٹی کے اس عارضی اور پر فریب کھلونے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ میری آنکھیں تو آسمان ہیں۔

"ہم لوگ خواہ مخواہ اپنے اپنے خوابوں کو ملبیا کھیاں بنا رہے ہیں" بھوری

آنکھوں والوں نے کہا۔ دیکھو کہ اس کے سینے کی چوٹیوں پر رِستے والی بے نام چیونٹیاں اس کے اندر چھپی ہوئی سینکڑوں داستانوں کو مسلسل چوس رہی ہیں اور پھر جسم کے مختلف حصوں پر کچے، سرخ زخم پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ جن پر سفید سفید کیڑے اپنی زبان پر تالے لگائے ان سرخ زخموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اپنے اندر سے باہر دکھائی دے رہے ہیں کہ اوپر سے برہم ہونا ان کی موت ہے۔

" اس کے جسم پر اور بھی کئی سرخ اور سفید زخم موجود ہیں جن پر سانس لینے والے کیڑوں کا بھی یہی حال ہے کہ اب اور بھی زخم پیدا ہونے کے امکانات روشن ہیں کہ صدیوں پرانا یہ جسم اپنی تاریخی اہمیت کھوتا جا رہا ہے کہ موسم مسلسل بدل رہے ہیں۔

" ٹھیک کہتے ہو۔" نیلی آنکھوں والا گویا ہوا۔ یہ کہانیوں، داستانوں اور آسیبوں سے بھرا ہوا۔ اہم پرکشش جسم جس کے اندر اوپر لہو تھوکتے ہوئے سورجوں کے میلے کچیلے دھواں دھواں مکان اور آن مکانوں میں ہچکیاں لیتے ہوئے افسانے اور ان افسانوں پر بھاری بھاری راتوں کے برفیلی لحاف اور لوہے کے جنگلوں سے اٹھتا ہوا کثیف دھواں اور اچھی بری۔ مسخ شدہ آوازوں کے دلدل اور ان دلدلوں میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے منظر۔ کس قدر بڑھ گیا ہے اس کا مرض کہ مسلسل شکلیں بدلتا جا رہا ہے اور پھر ساڑھے سات فٹ کے پاؤں کے نشان سے لے کر دو انچ کے نشانات تک اس کے جسم پر نقش ہیں۔ لیکن دھندلے دھندلے ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے ایک دوسرے سے جنگ کرتے ہوئے اور ایک دوسرے پر مسلط۔" بڑا عجیب اور انتہائی بھیانک ہو گیا ہے اس کا جسم۔ تاہم پرکشش ہے۔" چھوٹی ناک والے نے عجیب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" ہم سے پہلے گروپ کی رپورٹ ہے کہ جب اس کے گلے اور انگلیوں کو کھودا گیا تو اندر سے بڑے بڑے تیز اور نوکیلے ناخن۔ ڈھیروں آنکھیں اور متعدد امراض میں مبتلا موسموں کے ساتھ ابرک کے ٹکڑے بھی برآمد ہوئے تھے جنہیں دیکھ کر ان سب کی ریڑھ کی ہڈیوں میں سنسناہٹ دوڑ گئی تھی اور وہ سب کے سب اپنے اپنے مقام کو لوٹ گئے تھے۔ کہ اس کے امراض ان سبھوں کی پہنچ سے آگے تھے۔

" ان سے بھی پہلے گذرے ہوئے گروپ کی بھی کچھ ایسی ہی رائے ہے۔" دائیں طرف کھڑے ہوئے ایک شخص نے کہا۔" اپنی رپورٹ میں وہ لکھتے ہیں کہ اس کے جسم کے اندر دراڑیں پیدا ہو گئی ہیں اور ان دراڑوں میں ہمہ اقسام کے زہریلے کیڑے گھوم رہے ہیں۔ البتہ ان سبھوں کی متفقہ رائے ہے کہ رگوں کی سرنگوں میں بارود پھیلی ہوئی ہے کہ سرخ اور سفید تیندوے اپنے جبڑوں میں بارود بھر کر اس کے جسم میں پھیلا رہے ہیں۔

دراصل ہم سب اپنی اپنی آنکھوں کی ذہانت کھو چکے ہیں۔ اسی لئے گذرے ہوئے لوگوں کی کہانیاں پڑھ رہے ہیں۔ ان میں ایک دانشمند نے کہا جو دیر سے چپ تھا۔ ہمیں چاہئے کہ دوسروں کی داستانیں پڑھنے کی بجائے خود کیا کر سکتے ہیں یہ دیکھنا ہوگا۔ ورنہ اس طرح خواہ مخواہ فضول وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ جبکہ یہ ہمارا آخری گروپ ہے جو اس کے علاج کے لئے یہاں پہنچا ہے۔ چنانچہ ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کے امراض کا علاج کیسے اور کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے ہمیں اس کے پورے جسم کا سروے کرنا ہوگا اور پھر اس کے جسم سے برآمد ہونے والی درد انگیز آوازوں کا سدباب کرنا ہوگا۔" " ٹھیک کہتے ہو۔" سبھوں نے کہا۔ اور پھر اپنی آنکھوں کو اس کے جسم پر پھیلا دیا۔ چنانچہ چند لمحوں کے بعد ایک نے بڑے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ اب اس کی حالت اس بیج کی طرح ہو چکی ہے جو تقریباً مر چکا ہے لہٰذا ہمیں اس کے جسم میں نیا خون داخل کرنا ہوگا ورنہ تلوؤں سے طلوع ہو کر سر میں غروب ہونے والا سورج اپنا سفر ختم کر دے گا تو چاروں طرف ہمیشہ کے لئے ایک گہرا اندھیرا پھیل جائے گا۔

" نہیں۔" دوسرے نے کہا۔" سب سے پہلے ہمیں اس کے جسم سے برآمد ہونے والی آوازوں کا علاج کرنا ہوگا مگر اس طرح کہ اس کے جسم پر پھیلے ہوئے متعدد قافلے متاثر نہ ہونے پائیں۔ البتہ اگر ان قافلوں کے سردار اگر ہلاک ہو سکتے ہیں تو ہونے دو۔"

" ہوں۔" سبھوں نے یک زبان ہو کر کہا اور پھر اس کے ماتھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔" اس کے پورے جسم میں یہی ایک ایسا مقام ہے جسے ہم علاقہ کا اس کہہ سکتے ہیں کہ یہ ابد تک ہنوز یا نگ دیتا رہے گا ورنہ پورا جسم کوڑھ سے متاثر ہو چکا ہے اور کوڑھ مسلسل بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

" ہاں۔ سب نے کہا۔ اب ہمیں اس کا علاج شروع کر دینا چاہئے۔

" ہاں، علاج فوراً شروع کرنا ہوگا کہ آخری درندہ اپنے پنجے میں ماچس دبوچے گھوم رہا ہے اور پھر جسم سے کرب انگیز آوازیں مسلسل بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں کہ پورا جسم درد بن کر رہ گیا ہے۔ اور ان گنت پرندے زخموں پر چونچیں مار رہے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ سب کے سب پورے انہماک سے اس کے علاج کی طرف متوجہ ہو گئے تھے لیکن لگاتار محنت اور مسلسل جد و جہد اور ہمہ اقسام کی دواؤں کے باوجود اب اسے جھٹکے شروع ہو چکے تھے اور پورا جسم تھرتھرانے لگا تھا کہ آنکھیں بند ہوئے لگیں تھیں۔ چنانچہ سبھوں نے آخری بار اس کی طرف دیکھا اور اپنے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر نکل گئے تھے!!

▲▲

درویش

شوکت حیات

وہ اپنے پیٹ پر پتھر باندھے دن رات شہروں اور قصبوں کی خاک چھانتا رہتا۔ اس دن کا انتظار تھا جب زمین ملاؤں سے خالی ہو چکی ہوگی اور لوگ بانگ خیرات کے لئے غریبوں کی تلاش میں مارے مارے پھریں گے اور ہر شخص ایک دوسرے کے جواب پر سوال ہوگا کہ خیرات دینے کے لئے غریبوں کی تلاش میں تو وہ خود بھٹک رہا ہے۔

بات بات پر بڑبڑا کر گالیاں دینا اور خاموش رہتے ہوئے اپنے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے صدیوں کی تاریخ دہرا دینا اس کے اوصاف حمیدہ میں داخل تھے۔ بچے سے لے کر بوڑھے تک اسے سبھی جانتے تھے بہت ساری عورتیں بھی اس کے وجود سے واقف تھیں لیکن کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ پہلی بار اس علاقے میں اس کی آمد کب ہوئی تھی۔

وہ آوارہ گردی کر کے تھک جاتا تو اپنی چار دیواری میں قید ہو جاتا اور بغیر کدال کے کھدائی کا کام شروع کر دیتا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ صدیوں سے کھدائی کرتا چلا آرہا ہے۔ جن لمحوں میں وہ اپنے اس عمل میں مصروف رہتا، اس کے آس پاس کوئی نہیں ہوتا۔ ایک تاریک لمبی سرنگ اپنی تکمیل کے لئے اس کی کھدائی کی منتظر ہوتی اس وقت سناٹے کے بیابان میں وہ اپنی دھڑکنوں کی آواز بھی نہیں سن پاتا۔ اور یہ بھی نہیں جان پاتا کہ وہ زندہ تھا۔ یا اس کا شمار مردوں میں تھا۔ اس قصبے میں پہلی بار اسے آتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا، ایک بار کسی علاقے میں سخت قحط پڑا۔ لوگ زندگی سے بالکل مایوس ہو گئے۔ اچانک وہ نمودار ہوا۔ اس نے آفتابی آنکھوں سے لنڈ منڈ درختوں کو ایک نظر بغور دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان ابر آلود اور درخت ہرے بھرے ہو گئے اسی دن سے اس نے وہ علاقہ چھوڑ دیا اور اس قصبے کی طرف کوچ کر گیا جہاں اس کا استقبال سڑک پر مرے ہوئے چوہوں نے کیا۔ جن لوگوں کو اس کی وجہ سے خشک سالی کے قہر سے نجات ملی تھی، انھوں نے اس کی تلاش میں اپنے علاقے کا چپا چپا چھان مارا لیکن وہ اگر وہاں تھا بھی تو ان کی بصیرت سے دور تھا۔

تب سے اس کے بارے میں بہت ساری باتیں مشہور ہو گئیں۔ جھوٹی، سچی، تند، شیریں، طرح طرح کی باتیں۔ وہ جہاں بھی تھا، ان باتوں کو سنتے ہوئے ان سے بے نیاز تھا کا مادہ اپنی چار دیواری کے اندر کھدائی کے کام میں مصروف [illegible] جوں کا توں تھا لیکن اس کے بارے میں قصہ کہانیوں کا دائرہ پھیلتا جا رہا تھا۔ اور سینہ بہ سینہ اس کا حق تغیر پذیر تھا۔

اسے مکمل طور پر مکمل طور پر مجذوب بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کیوں کہ اکثر و بیشتر اس کی نارمل باتیں اس قیاس کو جھٹلاتیں اور سوچنے والے کا منہ چڑھاتیں۔ کبھی کبھی جب وہ بہت تیز قدموں سے کہیں جا رہا ہوتا تو لوگ اسے بڑبڑاتے ہوئے سنتے۔

"مجھے کہاں جانا ہے... ...؟"

"مجھے کہاں جانا چاہیے...؟"

کبھی کبھی کوئی انجان وارد جو اس سے واقف نہ ہوتا اُسے خود سے مخاطب سمجھ کر اگر کچھ پوچھ بیٹھتا تو وہ کہتا:

"ایک ندی ہے جو راستہ بدلتی چلی جارہی ہے اس کا تعاقب ہم سبھوں کا مقدر ہے۔"

وہ ندی کیا تھی؟ کیوں تھی؟ کہاں تھی اور اس سے اس کا اور سبھوں کا کیا تعلق تھا؟ اس کے آفتابی چہرے کو دیکھ کر کسی کو پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ عام لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس کی آنکھیں تھیں۔ کیونکہ کسی نے اس کی شعاعی آنکھوں میں دیکھنے کی جسارت نہیں کی تھی۔ جس کی غلطی سے نظر پڑ جاتی وہ جذب کی حالت میں پہنچ جاتا۔ جب بھی کسی علاقے میں یہ حادثہ ہوتا تو اسے ایک نئے علاقے میں پناہ لینی پڑتی۔

اسی طرح بھٹکتے ہوئے کتنے ہی پرانے شہر اور قصبوں کی خاک چھانتا اور اپنی چار دیواری کے اندر کھدائی کے کام کو جاری رکھتا ہوا وہ اسی قصبے میں پہنچا جہاں اس کے استقبال میں سڑکوں پر چوہے مردہ پڑے تھے آدمیوں کا جم غفیر دوڑنے میں موٹروں سے مسابقت کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے آفتابی آنکھوں سے چوہوں کی طرف دیکھتے ہوئے جانے کس کیفیت میں "اٹھ" کہا اور بیچ بیچ زن زناتی موٹروں کے آگے پیچھے اغل بغل چاروں طرف سڑک پر چوہے دوڑنے لگے۔

ماہرین کا یہ عام خیال تھا کہ چوہوں کی موت پلیگ کے حملے کے بغیر ہو رہی ہے۔ پورے قصبے کے لئے یہ پریشان کن مسئلہ تھا۔ لوگوں کو اس بات کی فکر لاحق تھی کہ ان کے مرنے سے قصبے میں عجیب قسم کا تعفن پھیلنے لگا تھا۔ جس نے ان کا سانس دوبھر کر دیا تھا۔ مردہ چوہے جب اس کی آفتابی آنکھوں کے اثر سے حرکت میں آگئے تو ایک ہجوم اس کے پیچھے پیچھے ہو گیا اور مجبوراً اس نے اپنی چار دیواری میں پناہ لینی پڑی اور بغیر کدال کے کھدائی کے کام میں مصروف ہو جانا پڑا۔

لوگوں کو اس شخص کے قصے یاد آئے جس نے انجان کتے کا کھانا نکالا تھا اور ٹرک کے حادثے میں عورت سے لتھڑے ہوئے مردہ کتے کو ڈانٹ پلا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"بے ہودے .... میں نے تیرا کھانا پکا دیا ہے، تو اب کھائے بغیر کیسے مر جائے گا.... ؟"

کھانا کھانے کے بعد وہ کتا پھر مر گیا، یہ تو کسی نے غور نہیں کیا۔ لیکن تمام دن اس کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے سارے لوگ یہ جان کر ہاتھ مل رہے تھے کہ وہ کہیں غائب ہو چکا تھا۔ آج ان لوگوں نے مردہ چوہوں کو دوڑتے ہوئے دیکھا تو انھیں وہی پرانا واقعہ یاد آ گیا۔ بجلی کی سرعت کے ساتھ وہ لوگ اس کے پاس پہنچے اور پھر اپنی قسمت کو کوستے رہے کہ آج بھی وہ غائب ہو گیا تھا۔

قصبے میں گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ سورج اور زمین کا درمیانی فاصلہ روز بروز گھٹتا جا رہا تھا۔ دوپہر کے بعد گرمی کی تاب نہ لاتے ہوئے لوگوں کے منہ سے چیخیں نکل جاتیں۔

——— ایسی ہی ایک دوپہر میں جب لوگ رہ رہ کر چیخیں بلند کر رہے تھے وہ اپنی چار دیواری سے باہر نکلا تو سبھوں نے اس کو چاروں طرف سے گھیرتے ہوئے اس کے پیروں اور ہاتھوں پر عقیدتوں کے بوسوں کی بارش شروع کر دی۔ رال سے اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر تر ہو گئے۔ کوئی اس کی آنکھوں میں نہ جھانک پایا۔

"تمھیں کیا دکھ ہے بچو... ...؟"

پہلی بار اس نے خود کو اس لائق سمجھا کہ وہ دکھوں کے جاننے کا اہل ہو گیا ہے۔

لوگوں نے آفتاب کی طرف اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"گرمی !"

"گرمی !"

اس نے کہا۔

"کڑی دھوپ میں کھڑے رہو۔ حتیٰ کہ گھر کے سائبان

میں پہنچ کر تمہیں راحت کا احساس ہوا!"

"اور جن کے گھر نہیں ہیں۔؟"

کسی نے سوال کر دیا۔

اسے سکتہ لگ گیا۔ بہت دیر بعد وہ گویا ہوا۔

"وہ دوسروں کے فاضل گھروں میں پناہ لے لیں!"

"گھر والا اجازت نہ دے تو ۔ ۔ ۔؟"

کسی نے پھر سوال کر دیا۔

اسے پھر چپ لگ گئی۔ اور بہت دیر بعد اس نے کہا۔

"ان پر حملے کر دے!"

موٹروں سے مسابقت کرنے والے لوگ آفتاب کے شعلوں میں سائبان کی راحت کے خواب لئے ہوئے کھڑے ہوئے تو ان کے تمام جسم پر آبلے پڑ گئے۔ بھاگ کر سائبان میں دم لینے پر ان کے تمام آبلوں میں جلن شروع ہوئی تو ان لوگوں نے اس کے نام مغلظات بکنا شروع کر دیا۔

"اس نے ہمیں بیمار سا دیا ۔ ۔ ۔!"

وہ جانتا تھا کہ دھوپ میں جلنے کے بعد ہمارے جسموں پر آبلے اگ آئیں گے۔ پھر بھی اس نے ہمیں گمراہ کیا۔"

ان تمام باتوں سے بیزار وہ اپنی چار دیواری کے اندر کھدائی کے کام میں مشغول رہا۔ بہت دور سے اپنے نام مغلظات سے تو اس نے اپنے چہرے کو جھٹکا دیا۔ سبھوں کے کانوں میں لفظوں کا شعلہ ناچ گیا۔

"گرمی تمہارے اندر تھی ۔ ۔ تمہارے جسموں میں فاسد مواد بھر گیا تھا۔ آبلوں کے پھوٹنے کے ساتھ بہہ جائے گا۔"

اپنے کانوں کے پاس بجلی کی سی کڑک سن کر تھوڑی دیر کے لئے سب کے سب سناٹے میں آ گئے۔ حواس ٹھکانے آئے تو لوگوں کو محسوس ہوا کہ ان کی قوت گویائی سلب ہو گئی ہے۔"

کھدائی کرتے کرتے آفتابی آنکھوں والا سرنگ کے آخری سرے پر پہنچ گیا تو اس کی آنکھیں آنے والے لمحے کی انجانی کیفیت سے سرشاری کے لئے بے قرار ہو گئیں۔ خود پر قابو پاتے ہوئے وہ بالکل خاموش اور ساکت تھا۔ سرنگ کے دوسرے سرے پر بھائیں بھائیں کرتے ہوئے خلا نے اس کا استقبال کیا۔ دھیرے دھیرے اس کے سپاٹ پن میں حرکت رونما ہوئی۔ اس کی آفتابی آنکھیں جوں کی توں خالی کی خالی رہ گئیں۔ ان کے اندر دور دور تک ایک نہ ختم ہونے والا اپنے بال و پر سمیٹ چکا تھا۔ پورا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ وہ باادب انداز میں دوزانو ہو گیا۔ اور پھر ایک مدت تک اسی طرح دوزانو رہا جس طرح ایک مدت سے کھدائی کے کام میں منہمک رہا تھا۔

وہ باہر نکلا تو اپنے سارے لباس تار تار کر چکا تھا۔ عورتیں اسے دیکھتے ہی اپنے آپ کو بے خبری کے سپرد کر دیتیں۔ کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی خالی خالی آنکھوں میں خود کو ڈوبنے سے بچا لیتیں۔ اپنے رشتہ دار مردوں کو دیکھتے ہی تعفن کو محسوس کرتے ہوئے اپنی ساری کے پلوؤں سے ناک داب لیتیں۔

لوگوں نے اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ چوہوں کے نہ مرنے کے باوجود ایک بار پھر وہی تعفن سارے قصبے میں رینگنے لگا تھا۔ اسے مادر زاد برہنہ آزادانہ طور پر ادھر ادھر گھومتے ہوئے دیکھا گیا تو لوگ اس کے قریب آئے بغیر اس کی طرف چادر پھینکنے لگے۔ اس کے جسم پر چادروں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا اور اسی طرح چادروں کے بوجھ کے نیچے دبا دبا وہ اپنی چار دیواری میں پہنچ گیا۔

دوسرے دن وہ باہر نکلا تو پھر اسی طرح مادر زاد ننگا تھا۔ رینگتے ہوئے تعفن کو پھیلتے ہوئے لوگوں کی پیشانیاں شکن آلود ہو گئیں۔ کل جو لوگ اس پر چادر ڈالنے سے رہ گئے تھے، انھوں نے اپنی جانب سے دور ہی سے ایک ایک چادر اس کے جسم پر پھینک دی۔ وہ اپنی چار دیواری میں داخل ہوا اور تیسرے دن پھر باہر وارد ہوا۔ تو اسی طرح برہنہ تھا۔

ان تمام لوگوں کی بھنویں تن گئیں جنھوں نے اسے چادریں دی تھیں۔ بہت سارے لوگ جو اسے اب تک چادر نہیں پائے تھے، انھوں نے اپنی اپنی چادروں سے اس کے جسم کو ڈھک دیا۔

یہ سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا۔ جس طرح اُس کی کھدائی کا کام اور دوڑا دو ہونے کا عمل ایک مدت تک جاری رہا تھا۔ قصبے کے تمام لوگ اسے چادریں دے چکے تو وہ اسی طرح ننگ دھڑنگ دوسرے قصبے کی طرف روانہ ہونے لگا۔

"یہاں کا کام ختم ہو گیا ـــ اب آگے کوچ کرو . . . ." وہ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ بازار سے گذرتے ہوئے لوگوں نے اُسے آج بھی برہنہ دیکھا تو اپنے اپنے ہاتھوں میں پتھر اٹھا کر اس کی طرف اچھالنا شروع کیا۔

وہ بغیر کسی احتجاج کے سنگریزے جھیلتے ہوئے لہو لہان ہوتا رہا۔ بے ہوش ہو گیا تو لوگوں نے اس کے منھ پر پانی کے چھینٹے ڈال کر اُسے ہوش میں لائے۔ پھر سنگریزوں کی بارش۔ اسی طرح وہ بار بار ہوش میں ہوش میں لایا گیا اور بار بار بے ہوش کیا گیا۔ آخری بار ہوش میں آنے پر لوگوں نے اس کے سر کے لمبے بالوں کے گچھے پکڑ لئے اور جھٹکے دینے لگے۔

"کہاں ہیں چادریں . . . . . . بول چادریں کیا ہوئیں؟"

وہ خاموش تھا۔ اُس کے چہرے کی لہریں بالکل ساکت تھیں۔ اُس کی انتہائی آنکھیں جہاں خلاؤں نے اپنا ہال در پر سمیٹ لئے تھے، بند تھیں۔

لوگوں نے بالوں کو پھر جھٹکے دئے۔

"وہ ننگا کہیں کا . . . . . . مرنے سے پہلے ہمیں ہماری چادریں واپس کردے . . . چادریں ہم نے اس لئے تو نہیں دی تھیں کہ وہ تو ننگا رہے . . . . جلد ہماری چادروں کا پتا بتا . . . . مر گیا تو چادروں کے غائب ہونے کے راز پر پردہ پڑا رہ جائے گا۔"

کسی نے کہا۔

"اس نے یقیناً چادریں فروخت کردی ہیں۔ یہی دھندا ہو گیا ہے اس کا۔" . . . . !

وہ آنکھیں بند کئے رہا۔ تھوڑی دیر بعد لڑکھڑاتے ہوئے کھڑا ہوا اور تھکے قدموں سے آگے بڑھا اور تمام قصبے والے اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

بہت دور تک دھیمے دھیمے قدموں سے وہ چلتا رہا۔ اس دوران میں آہستہ گام ہونے کے لئے بار بار جھڑکیاں بھی سننی پڑیں لیکن وہ اسی طرح چلتا رہا۔ جیسے اس کے اوپر بہت بھاری بوجھ تھا اٹھائے ہوئے چل رہا تھا۔

چار دیواری کے آگے آکر وہ رکا۔ آنکھیں بند کئے ہی اس نے گردن گھما کر بھیڑ کی طرف دیکھا اور اندر داخل ہو گیا۔ لمبی سرنگ جو چادروں سے بھری جا چکی تھی، سامنے تھی۔ اس نے تیزی کے ساتھ چادریں نکال کر باہر پھینکنی شروع کیں۔ تمام چادریں جیسے بہت بھاری تھیں ان کے اندر کچھ بندھا ہوا تھا۔ سب کی سب آواز پیدا کرتی ہوئی زمین پر گر رہی تھیں۔

تمام چادریں اس نے سرنگ سے نکال لیں تو بولا۔

"اپنی اپنی چادریں پہچان کر لے لو . . . . اب بھی میرا رخ نہ کرنا . . . . . میں اسی طرح ننگا اس سرنگ میں سفر کرتا رہوں گا جس کے دونوں سروں پر خلا میرے استقبال کے لئے تیار ہے۔ میں صدیوں سے مصلوب ہوں۔ تمہاری چادریں ٹھکانے لگا رہا ہوں اور تمہارے سنگریزوں سے لہو لہان ہو رہا ہوں . . . ."

پھر اس نے ڈانٹا۔

"اپنی چادریں لو اور دفع ہو جاؤ!"

سب کے سب اپنی چادریں پہچان کر اپنے قبضے میں کرنے لگے۔ اس نے پھر کہا۔

"سن لو . . . . یہ چادریں تمہاری ہیں اور ان چادروں میں جو کچھ ہے وہ بھی تمہارا ہے . . . . انھیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤ . . . . !"

سارے لوگوں نے اپنی چادریں سنبھالیں۔ اب انھیں یہ جستجو ہوئی کہ وہ چادروں کو کھول کر دیکھیں کہ ان کے اندر کیا ہے۔ اور سبھوں نے اپنی اپنی چادریں کھولیں تو چونک کر ایک ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔

سبھوں کی چادروں میں ان کے اپنے اپنے کٹے ہوئے کئی کئی سر انھیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

اب اس نے کہا

"دیکھ لو . . . . . اگر تمہاری چادریں میں اوڑھ لیتا تو تو تمہارے ذریعہ تمہارے اپنے قتل کے اتنے واقعوں پر نقاب کس طرح

اتا...... انھیں سنبھالو اور مکتی دے دو۔ مجھے اپنی چادروں
بوجھ سے ... میں اسی طرح ننگا بھلا...... جاؤ.... تم سب
کو......"

وہ رونے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں سے سمندر
ابل پڑے گا۔

سارے لوگ اس کے قدموں پر گر پڑے اور گڑگڑا کر یہ درخواست
لے لگے کہ ان چادروں سے وہ اس سرنگ کو بھر دے۔ انھیں واپس
نے پر مجبور نہ کرے ورنہ وہ کہیں کے نہیں رہیں گے۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ بس اس کی آنکھوں سے دریا رواں تھا۔
لوں نے دیکھا کہ روتے روتے وہ بالکل نڈھال ہو چکا ہے تو اپنی اپنی
دروں کی گٹھریں پہلے کی طرح باندھ کر سرنگ میں رکھ آئے۔

واپس پہنچے لوگ اپنی اپنی جگہ جزیروں میں تبدیل ہو چکے
تھے۔

بے پر کا پرندہ

جتیندر بلّو

جسم نے کہا تھا کہ وہ فلاں شہر کے فلاں مقام پر بازو پھیلائے میرا منتظر ہوگا۔ میں مقررہ دن کے مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گیا تھا۔ لیکن جسم وہاں نہیں تھا۔ میں نے اس کے لئے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ خوب صورت شہر کا صاف ستھرا علاقہ تھا۔ اور ویسا ہی دلکش منظر۔ لاتعداد فلک بوس عمارتیں دور دور تک کھڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ جن کے آگے ایک ہی طرز کے پست قد مکانات روبی پست لگ رہے تھے۔ لگتا تھا شطرنجی مہریں ردبدل کر کے کھڑے کر دیئے گئے ہیں اور وہ اس انتظار میں ہیں کہ کب انہیں حکم ملے اور وہ ایک دوسرے کو پچھاڑ کر اپنی بہادری کا ثبوت دے سکیں۔ میں جس صاف شفاف پل پر کھڑا تھا وہاں رنگ برنگی موٹریں تیز رفتاری سے گزر رہی تھیں۔ پانی کی سطح پر چھوٹے بڑے اسٹیمر ہولے ہولے پھسل رہے تھے۔ مقامی لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ہر کوئی خود میں کھویا ہوا قیمتی کپڑوں میں ملبوس دکھائی دے رہا تھا۔ ان کے لباس اس قدر جدید، بیش بہا اور جاذب نظر تھے کہ میں رشک کئے بنا نہ رہ سکا۔ میں نے ایک نظر خود پہ ڈالی۔ برسوں پرانا کوٹ، معمولی سی پینٹ، عام قمیض، ارزاں جوتے۔ میرا لباس ان کے معیار زندگی سے کہیں میل نہ کھا رہا تھا۔ بعض راہ گیر مجھے یوں دیکھ رہے تھے، جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں اور غلط مقام پر چلا آیا ہوں۔ ان کی بھری بھوری و نیلی آنکھیں کبھی ناپسندیدگی کا اظہار کرتی تھی اور کبھی نفرت سے پھیل جایا کرتی تھیں۔ لیکن میں دل ہی دل میں ان کی دنیاوی سمجھ بوجھ پر ہنس رہا تھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر ریلنگ سے ٹیک لگائے ادھیڑ عمر کا ایک شخص کھڑا تھا۔ فربہ اندام، ہونٹوں میں سگار اور بائیں ہاتھ میں پھیلا ہوا بھاری سرخ کوٹ۔ اس کی چیرتی ہوئی نظریں میرے اندر دور تک اتر رہی تھیں۔ وہ عجیب ڈھنگ سے مجھے دیکھ رہا تھا، یہی لگتا تھا کہ وہ یقیناً سوچ رہا کہ میں اس پار کی دنیا سے آیا ہوں، جہاں بھوک، غربت، بے روزگاری، ریاکاری اور جہالت کا دور دورہ ہے لیکن میں نے اپنے خیال کو جھٹکا، احساس کمتری کو صلیب پر لٹکایا اور کھلے ماحول میں جسم کو تلاش کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں میری پشت پر قدموں کی آہٹ ہوئی اور کسی نے میرا شانہ تھپتھپایا۔ میں خوشی سے جھوم اٹھا کہ جسم حسب وعدہ آ پہونچا ہے۔ لیکن مڑ کر دیکھا تو فربہ اندام شخص میرے مقابل کھڑا تھا ٹٹولتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا، پھر گلا صاف کر کے یقین کے ساتھ بولا۔

"تیسری دنیا سے آئے ہو نا؟"

"میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔"

"کیسی ہے دنیا تمہاری؟"

"اپاہج۔"

بے ساختہ میرے ہونٹوں سے سچ کہہ ڈالا تھا۔ میں خود بھی حیران تھا کہ میں نے اتنا بڑا سچ ایک اجنبی کے آگے کیونکر اگل ڈالا ہے۔ حالانکہ میرا سچ تو دنیا کا سچ تھا۔ لیکن اس نے اجنبی پر کوئی تاثر نہ چھوڑا تھا۔ بلکہ یوں لگتا تھا کہ وہ حال ہی میں پلاسٹک سرجری کے عمل سے گزرا ہے۔ مصنوعی جلد کے نیچے اصلی جلد دب کر رہ گئی ہے۔ اور ردعمل کا واضح ہونا ممکن نہیں رہا۔ آخر کار اس کے موٹے موٹے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے کپکپائے۔

"تمہاری دنیا اپاہج ہے، اور تم اس دنیا میں چلے آئے ہو، جو..."

"مکمل طور پر اندھی ہے۔"

اس کے الفاظ تھے کہ میں نے اسے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ وہ دم بخود، حیران پریشان میرے سامنے کھڑا تھا۔ پلاسٹک سرجری کا خول ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر کئی سوالات ابھر آئے تھے۔ وہ کچھ دیر تک گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر افسوس کے ساتھ بولا۔

"جن سامراجی طاقتوں نے تمہیں صدیوں تک استعمال کیا۔ جس طرح چاہا تمہیں توڑا، پھوڑا، بانٹا اور لوٹا تم انہی کی دھرتی پر انہیں سجدہ کرنے کے لئے آئے ہو؟"

میں ایک طویل سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ تاریخ کے صفحے، کئی قوموں کے استحصال، لوٹ مار، غلامی اور بربریت پر تھے اپنے آپ وا ہونے لگے — پس ماندہ قومیں، جو چند طاقتوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیاں بنی رہی تھیں آج بھی دوراہے پر کھڑی سوچ رہی تھیں کہ خود کو سنوارنے کے لئے کون سی راہ اختیار کریں، کس کا دامن پکڑیں، کہاں جائیں، کہاں نہ جائیں۔ حرم کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ مجبوراً مجھے اس شخص سے مخاطب ہونا پڑا۔

"شاید تمہیں پتہ نہیں وقت نے کتنی تیزی سے کروٹ بدلی ہے دنیا کا دائرہ سمٹ کر رہ گیا ہے۔ وہ روز بروز محدود ہوتی جا رہی ہے آج ان لوگوں کو ہر قدم پر ہماری ضرورت ہے اور ہمیں ان کی۔"

"اس لئے تمہارے لاکھوں بھائی بند ان ملکوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں — قدم قدم پر دکھ اٹھاتے ہیں۔ دن بدن اپنی شناخت، انفرادیت اور تمدنی جڑیں بھی کھوتے جا رہے ہیں۔"

"جن حقائق کا ذکر تم کر رہے ہو — ان سے بھی بڑھ کر ایک حقیقت ہے — اور وہ ہے پیٹ کی آگ۔ جس میں جل کر انسان سب کچھ کھونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

"تو تمہیں بھی وہ آگ یہاں کھینچ کر لائی ہے؟"

"نہیں۔ میرے آنے کا مقصد کچھ اور ہے۔"

یہ کہہ کر میں پھر حرم کی تلاش کرنے لگا۔ پل کے ایک کنارے سے مایوس ہو کر جب میں دوسرے کنارے کی طرف دیکھ رہا تھا تو قدرتاً میری نظریں اس سے ٹکرا کر رہ گئیں۔ اس کے لبوں پر پتلی مسکراہٹ تھی، ذہین آنکھوں کے پیچھے کچھ کچھ عیاری چھپی ہوئی تھی۔ اسے غور سے دیکھنے پر مجھے محسوس ہوا کہ یہ تو وہی شخص ہے جو نام نہاد برابری کا دم بھرتا رہتا ہے۔ جگہ جگہ اپنی خیال پرستی کو پھیلانے کی فکر میں رہتا ہے اور خود کو ساری سربراہ ٹھہراتا ہے۔ اس نے بڑی چابک دستی سے سبھی لوگوں کا ہاتھ بھی تھامنا چاہا تھا۔ لیکن کچھ ہوش مندوں نے جب اپنے اردگرد زنجیریں پھیلتی ہوئی محسوس کیں۔ تو انہوں نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت مضبوط ہونے سے پہلے ہی جھٹک لیا تھا۔ لیکن ایسے بھی نادار مفلس اور ناتواں تھے، جو آج تک اس کی گرفت سے آزاد نہ ہو پائے تھے میں ضروری سمجھا کہ اسے یہاں آنے کا مقصد بیان کر دوں، ورنہ وہ سپر گلیو (Super glue) کی طرح مجھ سے چمٹا رہے گا اور میرا پنڈ چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔

"تمہیں تو پتہ ہے کہ دنیا کے سمٹنے پر زندگی نے اپنا لباس کس طرح سے بدلا ہے۔ آج دنیا کے ہر بڑے شہر میں لوگ ایک طرح کی زندگی جی رہے ہیں۔ ان سوچنے سمجھنے، دیکھنے اور جینے کا ڈھنگ بھی ایک ہوتا جا رہا ہے۔"

"یعنی باہر کی تہذیبی ہوا نے تمہاری جڑیں بھی کھوکھلی کر ڈالی ہیں۔" اس نے مجھ پر گہرا طنز کیا۔ "اور" وہ ہوا تمہاری رگوں میں اتنی رچ چکی ہے۔ تم اپنا رہن سہن بھی کھو چکے ہو۔"

ندامت سے میرا سر جھک گیا۔ میرا قدیم ورثہ جس پر میں کبھی نازاں تھا، جس کے چرچے دنیا کے کونے کونے میں ہوا کرتے تھے اور جس کی تعریف میں کئی مورخ کتابیں لکھ چکے تھے۔ اسے فراموش کرنے پر وہ مجھے شرما رہا تھا۔ میرا تمدن بھی جسے میں رفتہ رفتہ جھلا چکا تھا، مجھ پر ہنس رہا تھا۔

"ہاں۔ کچھ ایسی ہی حالت ہے ہم لوگوں کی — لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ کہیں تو دنیا میں بھرے ہوئے پیٹ کی اکتاہٹ ہے اور کہیں خالی پیٹ کی جھلاہٹ — یہ ایک ایسا خطرناک سوال ہے، جس نے انسانی بقا کو خطرے میں ڈال رکھا ہے۔"

اس نے اتنے زور سے قہقہہ بلند کیا کہ خود بہ خود میرا چہرہ آسمان کی طرف اٹھ گیا۔ لیکن وہاں شگاف پڑنے کی بجائے کالے گھنے بادل آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ راہ گیر پلٹ پلٹ کر اسے یوں دیکھ رہے تھے۔ گویا انہیں یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ کوئی شخص یہاں بھی اتنا کھل کر ہنس سکتا ہے۔ بہ مشکل اس نے خود پر قابو پا کر کہا۔

"یہ خطرناک سوال تو صدیوں سے موجود تھا۔ ہے اور شاید رہے گا۔"

"تو پھر دنیا ایک ہی دھماکے سے اڑ جائے گی — نہیں تو کیا ہے کہ آج دنیا میزائلز کے دہانے پر کھڑی ہے — نیوکلر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ لوگ خوفزدہ ہیں۔ ڈراؤنے خواب دیکھتے ہیں۔ اگر اس سوال کو حل نہ کیا گیا، تو صرف ایک دھماکہ پھر تم اور میں نظر آئیں گے۔ آنے والی نسلیں بھی ہمارے ساتھ ختم ہو جائیں گی۔"

وہ کچھ دیر کے لئے سہم سا گیا۔ فکرمند، ہراساں، خوفزدہ، اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ میری آنکھیں حسب معمول پل کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک سفر کرنے لگیں۔ موٹریں جوں کی توں گزر رہی تھیں۔ خوش پوش خوش شکل لوگ جوں کے توں آ جا رہے تھے۔ لیکن وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، جس کی مجھے اشد ضرورت تھی۔ معاً میرا چہرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ اس نے سگار کی راکھ جھاڑ کر کہا۔

"تمہارے پاس ایک انمول ہیرا ہے اور وہ ہے تمہارا صدیوں پرانا علم — وہ تمہاری پہچان بھی ہے۔ لیکن تمہارے علم نے ان طاقتوں کو پہچاننے میں تمہارا ساتھ برابر نہیں دیا۔"

مجھے اس پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اس نے ایسی بے جا بے تکی بحث چھیڑ ڈالی تھی۔ جو کسی بھی مقام، کسی بھی موڑ پر ختم نہ ہونے والی تھی۔ نتیجتاً ہم ایک دوسرے کو ذہنی طور پر زخمی کر ڈالیں گے اور حاصل وصول کچھ بھی نہ ہوگا۔ لیکن اس نے اپنی بات کو جاری رکھا۔

"ان طاقتوں نے دنیا کے ہر کونے میں ایسا شرمناک کھیل کھیلا تھا جسے تاریخ کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ وہ معصوم لوگوں کی چمڑی ادھیڑتے رہے اور خود قیمتی لباس پہنتے چلے گئے۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا جب ان کی عیاری لوگوں کی سمجھ میں آ گئی۔ یکجا ہو کر انہوں نے طاقتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ اور ایک نظام کو گلے سے لگایا — تمہاری نجات بھی اسی میں ہے۔"

میں مسکرایا اور بولا۔

تمہاری یہ بات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ لیکن شاید تم نے وہ قصہ نہیں سن رکھا — ایک شخص اندھا تھا اور دوسرا اپاہج۔ دونوں زندگی گزارنے سے معذور تھے۔ لیکن دونوں کے ہاں زندگی گزارنے کی تڑپ بھی تھی۔ کافی سوچ وچار کے بعد انہوں نے یہ صورت نکالی کہ اندھا اپاہج کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھ سکتا ہے۔ اور اپاہج اندھے کی ٹانگوں سے زندگی کا سفر طے کر سکتا ہے۔ ایک دوسرے کا سہارا بن کر انہوں نے رہی سہی زندگی خوشحال طریقے سے بسر کی۔ آج ہماری حالت بھی یہی ہے۔ جسم اندھا ہو چکا ہے اور میں اپاہج۔"

جسم کا ذکر آتے ہی میں پھر اسے تلاش کرنے لگا۔ لیکن صورت حال میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ غالباً جسم نے بھی مقامی موسم کی طرح اپنا ذہن بدل ڈالا تھا۔ کتنے جوش کے ساتھ چھاتی پیٹ رہا تھا

مار کر کہا تھا کہ وہ فلاں شہر کے فلاں مقام پر بانہیں پھیلائے میرا منتظر ہوگا ــــــ اور مجھے یہاں تک پہونچنے کے لئے کتنے دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑا تھا۔ کئی انجان شہروں کی دھول میرے نتھنوں نے جھیلی تھی۔ ہزاروں میل کی مسافت میرے آبلہ زدہ پیروں پر لکھی گئی تھی۔ صرف اس امید پر کہ میں اور جم بغلگیر ہوتے ہی اس حد فاصل کو مٹا ڈالیں گے، جس نے ہماری زندگیاں الگ الگ خانوں میں بانٹ رکھی ہیں، دنیا کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ پھر نہ کوئی حد فاصل ہوگی، نہ استحصال، نہ جنگ، نہ بھوک نہ غربت، نہ محرومیاں، نہ ہی آتما کی کرب۔ اچانک اس کی آواز مجھے ماضی اور مستقبل سے کھینچ کر حال میں لے آئی۔

" جسے تم تلاش کر رہے وہ نہیں آئے گا۔"

اس کے پراعتماد لہجے نے مجھے اندر باہر سے ہلا کر رکھ دیا۔ میری تمام ہمت میرا ساتھ چھوڑتے ہوئے محسوس ہوئی۔ لیکن میں نے خود کو سنبھالا کھوئی ہوئی ہمت کو اکٹھا کیا۔ اور جرأت کے ساتھ کہا۔

" یہ تم کیسے جانتے ہو کہ وہ نہیں آئے گا؟"

" میں ہر بات کی خبر رکھتا ہوں۔ اس دنیا میں جو بھی حادثہ پیش آتا ہے یا ہونے والا ہوتا ہے۔ اس کی خبر مجھے پہلے سے ہوتی ہے۔"

میں حواس باختہ پتھرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ لیکن وہ فخریہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے دنیا بھر کے راز اس کے سینے میں دفن ہوں۔ مہین سی مسکراہٹ بھی اس کے لبوں پر ابھر آئی تھی، جو ان گنت معنی ساتھ لئے ہوئے تھی۔ اور جسے سمجھنے کے لئے مجھے ہزار جنموں کی ضرورت تھی۔ تاریک، پراسرار فضا میرے ارد گرد پھیلتی جا رہی تھی۔ مجھے ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں جم اور اس شخص نے آپس میں گٹھ جوڑ تو نہیں کر رکھا؟ اور میں جو کئی ساگر، کئی پربت، کئی استھان عبور کر کے یہاں تک پہنچا ہوں، ان کی ملی بھلی سازش کا شکار نہ ہو جاؤں؟ میں یکسر محتاط ہو گیا تھا لیکن اس نے میرا ذہن جلد ہی پڑھ لیا تھا۔ سنجیدگی سے بولا:

" جو تم سوچ رہے ہو سراسر غلط ہے۔ میں اور جم تو آپس میں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔"

" پھر بھی تم جانتے ہو کہ آج جم مجھ سے ملنے والا تھا؟"

" ہاں۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو میری حالت بھی تمہاری طرح ہو جائے گی۔"

" یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

" انجان بننے کی کوشش مت کرو۔ تم تو جانتے ہو کہ جم کے پرکھوں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ وہ دنیا بھر کی دولت سمیٹنا چاہتے تھے۔ جگہ جگہ انہوں نے نوآبادیاں قائم کر رکھی تھیں لیکن دوسری جنگ کے بعد خواب میں دراڑ پڑ گئی۔ جم اور اس کے ساتھیوں نے دراڑ کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن دراڑ گہری ہوتی چلی گئی۔ تب سے ہمارے درمیان سرد جنگ جاری ہے اور ہم ایک دوسرے کو جڑ سے اکھاڑنے پر آمادہ ہیں۔"

اس کی باتیں مجھے قائل کرتے ہوئے بھی قائل نہ کر پا رہی تھی۔ ابھی وہ دن آنکھوں میں گھوم کر رہ گیا، جب جم سے میری ملاقات ایک گمنام جزیرے پر ہوئی تھی۔ چاروں طرف ناریل کے دراز قد پیڑ تھے اور ان کے اطراف دشال سمندر۔ جم نے خاص طور پر مجھے وہاں مدعو کیا تھا۔ اس کے گماشتے بھی وہاں موجود تھے۔ وہ خاموش لیکن سوچی سمجھی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ہر لب پہ پتلی سی مسکراہٹ تھی، جسے سمجھنا مشکل تھا۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ مجھے پسند کر رہے ہیں یا نہیں۔ جم انتہائی فکر مند تھا اور پریشان بھی۔ حالات اتنی تیزی سے بدل چکے تھے کہ کئی مجبور، قلاش اور دانشور لوگ مساوی سربراہ کا ہاتھ تھام کر اس کی جڑیں مضبوط کر چکے تھے۔ جم ڈر رہا تھا کہ کہیں میں بھی اس کا دامن تھام کر اس کے ہاتھ مضبوط نہ کر ڈالوں۔ ورنہ عالمی توازن بگڑ جائے گا اور جم کا پلڑا مزید کمزور ہو جائے گا۔ وہ اپنا مستقبل میرے ذریعے اور میرا مستقبل اپنے ذریعے خوش گوار، خوش رنگ اور بامقصد بنانے کا آرزو مند تھا۔ وہ کم و بیش زندگی کا ہر مسئلہ میرے ساتھ طے کر چکا تھا۔ اور ہم جلد ہی مل جل کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے والے تھے۔ جس کی بنیاد انسانی اور اخلاقی اقدار پر ہوگی۔ لیکن اس کی ہر بات دلیل اور رویے سے اس کا احساس جرم یوں نمایاں تھا، گویا اس کے سینے میں نوکیلی پھانس اٹکی ہوئی ہو۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس کی بے پناہ دولت نے اس کی آنکھوں پر اتنے پردے ڈال رکھے ہیں کہ وہ

اپنا دلی سکون ۔ ذہنی یکسوئی اور روحانی شانتی ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھا ہے ۔ وہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو نوچ کر کہہ رہا تھا ۔

" ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے مشینیں بنائیں لیکن ہم نے ان پر قابو نہیں پایا ، انہوں نے ہم پر قابو پا لیا ہے اور ہم چلتے پھرتے Robot بن کر رہ گئے ہیں "

مجھ پر گہری فکر لاحق ہو گئی تھی ۔ اس لئے کہ یہ لعنت تو ہمارے یہاں بھی پہنچ چکی تھی ۔

" کیا تمھیں پتہ ہے کہ ہم نے اونچی اونچی عمارتیں چوڑی چوڑی سڑکیں لمبے لمبے پل اور بڑے بڑے ادارے کیوں بنائے ؟ "

میں خاموش رہا ۔

اپنا احساس کمتری دور کرنے کے لئے ۔ ہماری تاریخ کی عمر تو تین سو سال ٹھہری ۔ جبکہ تمہارا دو ، تین ہزار دس صدیوں پر پھیلا ہوا ہے "

گماشتوں پر یہ بات ناگوار گزری تھی ۔ وہ سخت نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے ۔ لیکن جم نے ان کی ذرا بھی پرواہ نہ کی ۔

" پھر ہم نے جدید سے جدید ہتھیار بنائے ۔ انہیں آزمانے کے لئے ہمیں علاقوں کی ضرورت تھی ۔ ہم نے جنگی کھیل رچانے کی خاطر قوموں کو خریدا ۔ کہیں تو مذہب کے نام پر اور کہیں سبز باغ دکھا کر ۔ "

میرے بدن میں برقی لہر دوڑ گئی تھی ۔

" پھر ہم نے قوموں کو بھڑکایا ، گمراہ کیا ، انہیں آپس میں لڑایا ان کے دلوں میں اتنی نفرت پیدا کی کہ وہ قیامت تک لڑتے رہیں گے ۔ لیکن کوئی بھی مسئلہ حل نہ ہو پائے گا ۔ "

یہ کہہ کر وہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگا تھا اس کے قہقہوں سے اس کے گناہوں کی بازگشت سارے جزیرے میں گونج رہی تھی ۔ گماشتے ششدر سے تھے ۔ لیکن مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ ہماری معاشی جڑیں کتنی صفائی سے کاٹی گئی ہیں ۔ پرواز سے پہلے ہی ہمارے پر کاٹ دیئے گئے ہیں ۔ اور ہمیں بے پر کا پرندہ بنا کر مجبور کیا گیا ہے کہ ہم آب و دانہ کی خاطر کبھی ایک طرف دیکھیں تو کبھی دوسری طرف ۔

" ان کے لئے ہم سے ہتھیار خریدنا ناگزیر تھا ۔ اپنی حفاظت کی خاطر انہوں نے قیمتی سے قیمتی ہتھیار خریدے اور ہم نے امن کی خاطر ان کی ہر مانگ پوری کی ۔ بے شمار دولت سے ہماری گردنیں اونچی ہو گئیں اور ہم خود کو دنیا کا بادشاہ سمجھ بیٹھے ۔ لیکن آگے چل کر ہمیں ہر ڈالر ، پونڈ ، فرینک اور مارک میں خون دکھائی دینے لگا "

جم کے اس پچھتاوے کا احساس بڑھتا جا رہا تھا ۔ میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا ۔ تاکہ وہ اپنی چھاتی سے تمام گناہوں کو اگل کر ماضی سے چھٹکارا پائے اور خود کو کسی حد تک نارمل محسوس کرے ۔ اب تو کوئی جانتا ہے کہ ہمارے ہاں کس قسم کے انسان پیدا ہوئے ہیں ۔ کھوکھلے ادھورے ، بیمار ، بے ضمیر ، بے روح ، ہر کوئی ذہنی قبر کھود کر اس میں دفن ہے ۔ ہمارے ہاں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جیسے کوئی آدرش کوئی قدر ، کوئی مادی آسائش ، کوئی نشیلی ، کوئی سیال پرستی ، کوئی فلسفہ پر نہیں کر پا رہا ہے ۔ "

گماشتوں کی گردنیں جھک گئی تھیں ۔

" یقین کرو مستقبل کے نام پر ہم لرز اٹھتے ہیں ۔ ہمارے ارد گرد گاڑھا اندھیرا پھیل جاتا ہے اور ہم بے چہرہ ہو جاتے ہیں ۔ ہم قریب قریب اندھے ہو چکے ہیں ۔ اور میں تو بالکل ہی اندھا ہو چکا ہوں "

میں خوش تھا کہ سچ براہ راست اس کے دل سے ابھر کر فضا میں پھیل رہا تھا ۔

" وقت بڑا ظالم ہے ۔ اس نے ہمیں مجبور کر دیا ہے ۔ ہم ماضی سے رشتہ کاٹ کر اور اپنے گناہ بھلا کر ایک صاف ستھری زندگی شروع کریں ۔ تم یسوع کی خاطر آؤ ۔ ہمیں تمہاری ضرورت ہے اور تمہیں ہماری مجھے پوری یقین ہے کہ ہم ایک دوجے کے لئے مسیحا ثابت ہوں گے "

ایک مرتبہ پھر اس کی آواز مجھے ماضی سے کھینچ کر حال میں لے آئی ۔

" تم نے جم کو سمجھانے میں یقیناً جلد بازی کی ہے "

پل ویران ہو چکا تھا ۔ کاروں کا آنا جانا لگ بھگ ختم ہو چکا تھا تا حد نظر کوئی پرچھائیں نظر نہ آ رہی تھی ۔ جیسے اندھیرا دبے پاؤں وارد

ہو کر تیغ بستہ ہوا بھی ساتھ لے آیا تھا، جو میرے بدن میں کپکپی پیدا کر رہا تھا لیکن میری بے چین نظروں کو ذرا بھی چین نہ آ رہا تھا۔ پل پل اکا دکا شخص نظر آ جاتا، تو میں اچک کر اسے دیکھنے لگتا۔ شاید ــــ شاید۔

"تم چاہو تو صدیوں تک یہاں کھڑے رہو ۔ وہ نہیں آئے گا۔"

"لیکن یہ تو بتاؤ، وہ آیا کیوں نہیں؟" میں نے بیزار ہو کر کہا۔

"تیر کے موہنہ کو ایک بار خون لگ جائے تو وہ مرتے دم تک نہیں چھوٹتا"

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ جو جم کے کاروبار کی طرف تھا۔ مجھے اس کے کاروبار سے سخت نفرت تھی۔ میں کئی بار اسے لعن طعن بھی کر چکا تھا، لیکن جم کا اپنا زاویۂ نظر تھا۔ مجھے سوچ میں گم دیکھ کر وہ بامعنی نظروں سے مسکرا دیا۔ پھر راز دارانہ لہجے میں بولا۔

"ان دنوں جم کے پڑوس میں زوروں کی جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ وہاں میرا اثر اتنا پھیل چکا ہے کہ جم پریشان ہے۔ اس کے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ میرے اثر کو کیسے ختم کرے۔ ورنہ وہ خطہ بھی اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔" دو بلاکوں میں بٹی ہوئی رعونت بھری دنیا ان کے زیر سایہ سانس لیتے ہوئے دیش، سیاسی منظر اور پس منظر آنکھوں گھوم کر رہ گیا۔

"بھلا تم خود ہی سوچو وہ کیسے آ سکتا ہے۔ اسے دولت تم سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کے لئے بندوقیں بیچنے کا یہ سنہری موقع ہے۔"

یکبارگی مجھے لگا کہ فضا میں دندناتی گولیاں چلنی شروع ہو گئی ہیں۔ بم چھوٹ رہے ہیں۔ راکٹ چھوٹ رہے ہیں۔ جنگی جہاز آسمان پر چنگھاڑتے ہوئے نیپام برسا رہے ہیں۔ عمارتیں تاش کے پتوں کی طرح اڑی جا رہی ہیں، ویت نام، بیل فاسٹ، تہران، کابل، بیروت، جوہانسبرگ، انگولا کا راڈ سکا۔ اور اب سیلواڈور کی دھرتی خون سے لت پت ہو گئی ہے۔ مظلوموں کی چیخ و پکار راہوں میں گونج رہی ہے۔ بے بس لوگ ہتھیلی پہ جان رکھے بے تحاشہ بھاگے چلے جا رہے ہیں ــــ میرے بدن کا سارا خون امڈ کر آنکھوں میں جمع ہو گیا۔ وہ میری شعلہ بار آنکھوں کی تاب نہ لا سکا اور اس نے چپکے سے موہنہ پھیر لیا۔ لیکن میں نے جھلا کر کہا۔

"اس جرم میں جم ہی نہیں، تم بھی برابر کے شریک ہو۔ تم بھی بندوقیں بیچتے ہو؟"

"ہاں۔ میں مانتا ہوں۔ لیکن میری اور جم کی بندوق میں فرق ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"جم کی بندوق آدمی کو مالک کے رحم و کرم پر زندہ رکھتی ہے۔ جب کہ میری بندوق اسے جینے کا حق دلاتی ہے۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تم دونوں کا انسانی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ بندوقیں بیچتے وقت تم لوگوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ انسانی زندگی کی کوئی قیمت ہے بھی یا نہیں ــــ کروڑوں آدمیوں کا خون تمہارے چہروں پر لکھا ہوا ہے۔"

جم کی طرح اس کے پاس بھی میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ دنیا کی عدالت میں گنہگار کی حیثیت سے کھڑا تھا۔ لیکن کوئی بھی قانون ایسا نہ تھا جو اسے سزا دے سکتا۔ کوئی بھی طاقت ایسی نہ تھی جو اسے چھو سکتی۔ چار و ناچار میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ لیکن میرے دل کی بات لبوں پر ضرور ابھر آئی۔ میں پوری طاقت سے چلا اٹھا۔

"تم لوگوں کی نظریاتی جنگ نے دنیا کو کس قدر تباہ کر رکھا ہے۔ ہر حصے میں تم لوگوں نے اپنے اپنے پنجے پھیلا رکھے ہیں۔ کبھی جنگ ایک علاقے میں ہوتی ہے، تو کبھی دوسرے میں اور کبھی تیسرے میں۔ اب تو لوگ بالکل بھول ہی چکے ہیں کہ امن کس چڑیا کا نام ہے۔"

"تم خوش نصیب ہو۔ میں نے ہر جگہ پنجے پھیلا رکھے ہیں۔ ورنہ تم آج بھی جم اور اس کے ساتھیوں کے غلام بنے رہتے۔"

"تمہارا مطلب ہے صرف جم اور تم کو آزاد رہنے کا حق ہے۔"

میرے سوال نے اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ اس نے جواب دینے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ جواب دینے کے قابل نہیں رہا۔ تو اس نے اپنا چہرہ بڑھتے ہوئے اندھیرے کی طرف گھما دیا۔ ہوا کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ میرا بے جان لباس اس کا مقابلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ قدم اٹھانے سے پہلے میں نے کہا۔

"جم سے تمہاری ملاقات تو ضرور ہو گی۔ اس سے کہہ دینا کہ

میں آیا تھا۔"

"اسے یہ بتانا ضروری نہیں، اس شہر میں قدم رکھنے پر تمہاری اطلاع اسے مل چکی تھی ــــ وہ تم سے ملنا بھی چاہتا تھا۔ لیکن۔ ۔ ۔ ۔"

"لیکن کیا؟"

"اگر وہ ایسا کرتا، تو اس کے ساتھی اس کی لاش کو پل کے کنارے پر پھینک کر چلے جاتے۔"

مجھے ساری کائنات گھومتی ہوئی نظر آئی، سوائے اس کے، جو آنے والے پل پر بھی آنکھ رکھتا تھا۔ وہ کس قدر محتاط ہوشیار، باخبر تھا۔

میں نے قدم اٹھایا، تو وہ بھی سر جھکائے میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بجلی کے کھمبے دور دور کھڑے روتے ہوئے لگ رہے تھے۔ پل کے کنارے پر پہنچ کر وہ اچانک رک گیا۔ اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی زندہ ہوں ــــ چلو میرے ساتھ۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہارے ہر دکھ کا علاج میرے پاس ہے۔ صرف میرے پاس۔"

اس کے لہجے میں خلوص تھا، آنکھوں میں ہمدردی اور چہرے پر اپنائیت۔ لیکن میں نے نفی میں گردن ہلائی اور یہ سوچ کر آگے بڑھ گیا کہ یہ لوگ انتہائی خطرناک، شاطر اور مفاد پرست ہیں۔ ان کے معیار بھی دوہرے ہیں، جن پر میں موقوف تھا اور نہ جانے کب تک رہوں گا ــــ

یکبارگی میرے اندر ہلچل ہوئی اور ایک نیا افق ابھر کر میرے سامنے پھیل گیا۔ دھندلاہٹ کے غائب ہوتے ہی منظر صاف ہوگیا۔ ننھے منے بچے، جو ابھی چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوئے تھے، کھردری زمین پر رینگ رہے تھے۔ وہ کسی کا سہارا لئے بنا اٹھتے تھے، احتیاط سے قدم اٹھانے کی کوشش کرتے تھے لیکن اپنا توازن کھو کر لڑھک جایا کرتے تھے۔ لیکن گرتے گرتے بھی سنبھل جایا کرتے تھے۔ پھر نئے عزم کے ساتھ اٹھتے تھے۔ لڑھکتے تھے، سنبھلتے تھے گرتے تھے۔ لیکن چوٹ کھا کر بھی ہمت نہیں ہارتے تھے۔ انجام کار وہ پوری طاقت سے اٹھ بیٹھے۔ انہوں نے مل جل ایک قدم اٹھایا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا اور دیکھتے ہی دیکھتے قدم بڑھاتے چلے گئے۔ کھردری زمین ہرے بھرے میدان میں تبدیل ہو گئی۔ بچے کسی کی مدد کے بغیر اپنی دھن میں چلے جا رہے تھے اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں ان بچوں میں شامل ہی نہیں۔ ان میں سے ایک ہوں۔

کھمبوں کی زرد روشنی مجھے اجلی اجلی دکھا دینے لگی۔ ◆◆

آنندلہر

پردہ ہٹتا ہے۔ گوتم اور سُدھا اسٹیج پر کھڑے باتیں کرتے ہیں۔ جن کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔

(ایک آدمی ڈھول بجاتے ہوئے وہاں سے گذرتا ہے)

گوتم۔ ایشور کتنا و شال تصور ہے۔ مگر ہم نے اسے ایک شبد میں ڈھال دیا ہے اور تمام زندگی ہم اس شبد کو لکھتے اور مٹاتے رہتے ہیں۔

سُدھا۔ غلطی تو یہاں پر ہے کہ ہم سمجھتے ہیں دن آتا ہے اور رات آتی ہے مگر اصل یہ نہیں ہے۔

گوتم۔ پھر سچ کیا ہے؟

سُدھا۔ سچ صرف یہ ہے کہ سورج نکلتا ہے اور ڈھلتا ہے۔

(ایک بوڑھی عورت وہاں پر آتی ہے جس کی کمر جھکی ہے اور جو لاٹھی کے سہارے چلتی ہے)

بوڑھی عورت۔ (گوتم سے مخاطب ہو کر) بیٹا وہ مجھ سے اتنا آگے نکل گیا کہ میں اب اس کے پیچھے کبھی نہیں رہی اور میں اس کا پیچھا کرنے کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتی۔

گوتم۔ مگر کیوں؟

بوڑھی عورت۔ تمام عمر لوگ میرے پیچھے رہے اور میں اس کے پیچھے رہی۔

سُدھا۔ پھر کیا ہوا؟

بوڑھی۔ میں اس سے بہت پیچھے رہ گئی اور لوگ مجھ سے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں اکیلی بھٹک رہی ہوں۔

سُدھا۔ زندگی بڑی عجیب و غریب شے ہے۔

(وہ بوڑھی پہلے ہنستی اور پھر روتی ہے)

گوتم۔ (بوڑھی سے مخاطب ہو کر) تم جا کہاں رہی ہو؟

(بوڑھی کچھ کہے بغیر وہاں سے چلی جاتی ہے)

گوتم۔ سفر اتنا لمبا ہے کہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ کون کہاں پچھڑ جائے۔

(ایک بچہ روتا ہوا اسٹیج پر آتا ہے)

سُدھا۔ کیوں رو رہے ہو؟

بچہ۔ میرا غبارہ آسمان میں کھو گیا ہے۔ اور میں نیچے دھرتی پر رہ گیا ہوں۔

گوتم۔ کوئی بات نہیں نیا لے لینا۔

بچہ۔ مگر جب میں اسے چھوڑوں گا تو وہ بھی آسمان میں چلا جائے گا۔

(گوتم اور سُدھا ہنستے ہیں) اتنے میں ایک اور بچہ اسٹیج پر آتا ہے۔

وہ بچہ۔ ہمارا غبارہ کھو گیا اور تم ہنس رہے ہو۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

(ایک بوڑھا شخص اسٹیج پر آتا ہے)

بوڑھا شخص۔ آسمان کسی وقت بھی ہم پر گر سکتا ہے۔

(دونوں بچے خوشی سے ہنستے ہیں)

دونوں بچے۔ جب آسمان نیچے گرے گا تو ہم ستاروں کو چرائیں گے۔

(سدھا اور گوتم پریشانی کے عالم میں کھڑے ہیں۔ اتنے میں

ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے جس [illegible] گوتم اور سدھا کے بال اُڑنے

لگتے ہیں ایک شخص دوڑتا ہوا وہاں آتا ہے۔

وہ شخص۔ آؤ آؤ دوڑتے ہوئے آؤ۔

سُدھا۔ مگر کہاں اور کیوں ؟

وہ شخص۔ یہ پوچھنے کا بالکل وقت نہیں ہے۔

گوتم۔ مگر جانا کہاں ہے ؟

وہ شخص۔ بے وجہ سوالوں میں مت اُلجھو۔ تمھیں صرف میرے ساتھ آنا ہے

گوتم اور سدھا بغیر وجہ معلوم کئے ہم تمھارے ساتھ نہیں آ سکتے۔

ایک عورت۔ سنتی ہو۔

دوسری عورت۔ کچھ بولو گی تبھی تو سنوں گی

پہلی عورت۔ بس پھر وہی ہوا۔

دوسری عورت۔ کیا ہوا ؟

پہلی عورت۔ اسے پھر بچہ جنتے ہوئے تکلیف ہوئی۔

ایک سرگوشی شاید اسی لئے عمر تو بڑھی مگر اس کا قد

اتنا ہی رہا۔

(دو سائے اسٹیج کے پردے پر نظر آتے ہیں)

ایک سایہ۔ انسان کہتا ہے کہ میں نے اندھیرے میں اس کا ساتھ

نہیں دیا۔

دوسرا سایہ۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روشنی میں کب ہم نے

اس کا ساتھ دیا ؟

(دونوں سائے ہنستے ہیں اور ہنستے ہی جاتے ہیں)

(چند کردار اسٹیج پر آتے ہیں اور روتے ہوئے چلے جاتے ہیں)

ایک کردار۔ آسمان کی طرف پتھر پھینکتا ہے

دوسرا کردار۔ تم اس سے صرف اپنے بازوؤں کو ہی تھکاؤ گے۔

پہلا کردار۔ مگر وہ کیوں ؟

دوسرا کردار۔ کیونکہ پتھر کبھی آسمان کو زخمی نہ کر سکے گا۔ اور نیچے دھرتی

پر ہی گرے گا۔

پہلا کردار۔ پتھر نیچے سے اوپر جائے تب بھی دھرتی زخمی ہوتی ہے۔ یا اوپر

سے نیچے گرے تب بھی دھرتی ہی زخمی ہوتی ہے۔

پہلا کردار۔ کل مجھ سے میرے سائے نے پوچھا

دوسرا کردار۔ کیا ؟

پہلا کردار۔ یہی کہ تم میری جدائی میں روتے ہو۔ مگر سوال پیدا ہوتا

ہے کہ ہم اکٹھے ہی کب تھے ،

اتنے میں ایک کردار ان کے سامنے آ کر رونا شروع کر دیتا ہے اور

وہ دونوں ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔

آواز۔ سیاہ بادلوں کے اندر روشنی چھپی ہوئی ہے۔

آواز۔ وہ شخص اتنا رویا کہ ہنسنے لگا۔

آواز۔ وہ اتنا ہنسا کہ رونے لگا۔

(اسٹیج پر خاموشی چھا جاتی ہے۔)

ایک کردار دوسرے سے۔ ارے بھائی میں نے تمھیں ہنستے ہوئے اندازہ

کیا تھا تم رو کیوں رہے ہو ؟

دوسرا پہلے سے۔ تمھارا کہنا تھا کہ ہنستے جاؤ مگر تم اس بات کو بھول

جاتے ہو کہ آخر ہنس ہنس کر آدمی کو رونا ہی ہوتا ہے۔

(ایک کردار بھاگتا ہوا اسٹیج پر آتا ہے)

تیسرا کردار۔ بھاگو۔ بھاگو۔

دونوں کردار۔ مگر کہاں ؟

تیسرا کردار۔ یہ پوچھنے کا وقت نہیں ہے۔ اور نہ ہی بتلانے کا وقت ہے۔

وہ تینوں بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔

لڑکی اور لڑکا۔ (ایک قدم آگے بڑھا کر) ٹھہرو ہمیں بھی ساتھ لے چلو۔

(اور وہ دونوں وہیں پر ساکت کھڑے ہو جاتے ہیں)

تیز ہوائیں چلنے کی آوازیں آتی ہیں۔ ایک شخص اسٹیج پر آتا ہے۔

وہ کچھ تھکا ہوا بھی ہے۔ اتنے میں ایک بوڑھا بھی اسٹیج پر آتا ہے۔

وہ دونوں الٹی سمتوں میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔

کردار اسٹیج پر نہیں آتے صرف آوازیں آتی ہیں۔

ایک شخص۔ پوجا منظور ہو گئی ہے۔

دوسرا شخص مگر بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے ؟

پہلا شخص۔ وہ شخص چھت سے گرا اور بچ گیا۔

دوسرا شخص۔ یہی تو قدرت ہے اسی کو بھگوان کا کرشمہ کہتے ہیں۔

(پردے پر گوتم اور سدھا کے سائے نظر آتے ہیں۔)

سُدھا۔ گوتم۔

گوتم۔ ہاں کہو سدھا۔

سُدھا۔ اس سے پہلے کہ وقت ہمیں الگ کر دے کیوں نہ ہم خود ہی ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔

گوتم۔ مگر کیوں؟

سُدھا۔ ایشور کو پانے کے لئے یہ ضروری ہے۔

گوتم۔ نہیں سُدھا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

سُدھا۔ مگر کیوں؟

گوتم۔ کوئی بھی بھگوان یہ نہیں چاہ سکتا کہ اس کے بندے آپس میں پیار نہ کریں۔

(اسٹیج پر دھول چھا جاتی ہے۔ کچھ نظر نہیں آتا۔ کانچ کے برتن ٹوٹنے کی آواز آتی ہے)

آواز۔ کانچ کے برتن آخر کار ٹوٹ ہی گئے۔

آواز۔ رشتوں کا پرچار کرنے والا بہرہ نکلا۔

آواز۔ وعدے تو صدیوں تک ساتھ رہنے کے تھے مگر لمحوں میں ٹوٹ گئے۔

(اتنے میں ایک کردار وہاں پر آتا ہے اور زور سے بولتا ہے)

کردار۔ یہ تمام بت ان لوگوں کے لئے ہیں جنھوں نے آواز کے خلاف بغاوت کی تھی۔

آواز۔ سچ یہ ہے کہ یہ بول رہے تھے کہ ان سے آواز چھین ہی لی گئی۔

(یہ کہہ کر وہ کردار وہاں سے چلا جاتا ہے اور دوسرا کردار وہاں پر آتا ہے)

کردار۔ یہ تمام بت ان لوگوں کے ہیں جنھوں نے راستوں کو کاٹنا چاہا تھا۔

آواز۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ چل ہی رہے تھے کہ راستے گم ہو گئے۔

کردار۔ اچھی طرح سن لو کہ ہر وہ شخص جو راستے سے بھٹکے گا اس کا انجام بھی یہی ہوگا۔ وہ تمام بت بولتے ہیں۔ کیا بات ہے کہ ہم سب کچھ دیکھتے ہیں مگر ہمیں کچھ نظر نہیں آتا۔

(ایک لڑکی اور لڑکا اسٹیج پر آتے ہیں اور وہ دونوں مل کر بولتے ہیں۔)

لڑکی اور لڑکا۔ لوگ اتنے نزدیک آئے کہ ایک دوسرے سے بہت دور چلے گئے۔

(ایک کردار بھاگتا ہوا اسٹیج پر آتا ہے)

کردار۔ اگر ہمیں یہ نہیں معلوم کہ ہم کہاں سے آئے ہیں تو ہمیں یہ کیسے پتہ لگ سکتا ہے کہ ہم کو جانا کہاں ہے؟

آواز۔ درخت اگر اوپر بڑھتا ہے تو اتنا نیچے بھی جاتا ہے۔

آواز۔ گونگے درخت کبھی پتوں کی کہانی بیان نہ کر سکے۔

آواز۔ لوگ تو آخر چل ہی پڑے مگر راستے رک گئے۔

(پردے سے پھر گوتم اور سُدھا کے سائے نظر آتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ہیں)

گوتم۔ درخت سے بیج پھوٹتے ہیں۔

سُدھا۔ اور بیجوں سے درخت پیدا ہوتے ہیں۔

گوتم۔ بس ایک دائرہ ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔

سُدھا۔ (زور سے ہنستی ہے)

(اتنے میں وہ لڑکی اور لڑکا پھر بولنا شروع کر دیتے ہیں)

وہ دونوں۔ لوگ کانوں کے ہوتے ہوئے بھی نہ جانے کیوں نہیں سن سکے۔

(اتنے میں ایک بچہ اسٹیج کے اوپر سے گرتا ہے)

بچہ۔ ٹھہرو۔ میری بات بھی سنتے جاؤ۔

وہ دونوں۔ مگر یہ کیا ضروری ہے کہ ہم تمھاری بات سنیں۔

بچہ۔ اگر تمھیں بات کرنے کا حق ہے تو سننا بھی تمھارے لئے ضروری ہے۔

وہ دونوں۔ بولو۔

بچہ۔ مگر آنکھوں کے ہوتے ہوئے بھی لوگ کب دیکھ سکتے ہیں۔

وہ دونوں۔ ایسی کون سی چیز تم دونوں نے دیکھی ہے جس کی بنا پر تم یہ کہہ رہے ہو؟

اغلب

نجم باگ

ابھی اس نے کھڑکی کھولی تھی کہ حافظ کی کتب سیاہی سے لتھڑی
آواز آئی۔ اس نے لائٹ آن کی اور رنگین پردوں وال پھر سے اوڑ گئی۔ اللہ اکبر۔
کبھی کبھی کبھی... حنائی انگلیاں، سیاہ مشک و عنبر زلفیں بھری بھری
چھاتیاں، چشم ناتمام کے شوخ اشارے طرار مشرکانہ رویہ میں یا اللہ!
نمازیں بھی محفوظ نہیں۔

بھیا اٹھو۔ دن نکل آیا ہے۔

بس کی رفتار کو کاٹتی چشم آب سے عاری۔ کتب سیاہ کاغذ سے پر
لادے۔ وہ کتابوں سے متصل عمارت کو روانہ ہو جاتا۔ سارے کرونے انگلیاں
کرتے دفتروں میں مصروف رہتے۔

دو ستوار زندگی بے مقصد غیر شناخت اور حیوانیت سے آشنا تر۔

نقرئی آواز۔

جناب! مقصد تو زندگی ہے۔

توبہ۔ الحذر یہ گلیاں کب تک سڑکوں کو ویران کرتی رہیں گی۔

سن لو۔ چلو کہا امانت کو ہم نے پوری ایمانداری سے لوٹا دیا۔ زندگی
میں خوش گمانیاں نہ ہوں تو کوئی خواہ نخواہ

سنو! تمھیں اس بات کا قطعی اختیار نہیں ہے کہ تم سائے کے طرف دار
رہو۔ سائے ہی تو کرسیوں کے محافظ ہیں اور پھر سے کوئی جواب بھی نہیں
ہوگی۔ یار جب ہم نے طے کر لیا ہے کہ زندگی دائروں حرکتوں سے عبارت ہے۔
اور ایک طویل مسافت کے بعد پھر میں عہد خستہ کی طرف روانہ ہوتا ہے
تو تمھیں کیا پڑی تھی کہ تم اس رفتار کو روکنے کی کوشش کرتے۔

مگر! الطارق، الغزالی، صبح امید . ہونہہ لگتا ہے مطالعہ
نے دماغ ڈھیلا کر دیا ہے۔ بھائی ہر چیز رفتار ہی کا ایک حصہ ہے۔ کاش
کائیں آزادی ذمہ داریوں سے چھٹکارا ہو شاید۔ اس نے روتے ہوئے کہا تھا
کاش میں ایک پرندہ ہوتا

احتیاط ہو۔ کیا تم نے بات دیو WE HAVE NOT نہیں پڑھا۔ مسرت
خطوط شرنگیں میں مقید نہ ہو تو پیٹ کو سڑک پر اچھال دیں۔ اُف
کیا تم کسی ایسی منزل سے واقف ہو جہاں سکوں کی جگہ خطوط شرنگیں
ڈھلتے ہوں۔ لگتا ہے اسی لیے ہونٹوں کے زیر لب مسکراہٹ اس کا
مسکرا اڑاتی رہی۔

ابھی تک کمرے پہ بیٹھو گی۔ دیکھو کاشائی برسی خود غرض ہوتی
ہیں۔ کہیں آنکھ لڑا دینا کیا مال و متاع کمائی نہیں ہے۔ پھر وعدہ
وفاداری سے کیا مطلب؟ جیسے مخلوق ہے۔ دیکھو۔ وفاداری
انفرادی بلاجیت ہی تو ہے۔ سروں پر دستی باندھے سب کے سب
گوش بر لب تھے اور وہ کہ تفسیر کے باب پہ باب ختم کر لینے پر تلا ہوا تھا
پتیں آہستہ آہستہ اس کے مساموں میں راستہ بنا رہی تھیں۔
توبہ۔ توبہ خدایا ہدایت تیری ہی جاگیر ہے۔

تفہیم غالب

شمس الرحمٰن فاروقی

نہ جانے کیوں کہ مٹے داغ طعن بدعہدی
تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

وزن : مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن

بحر : مجتث مثمن مقبوض مخبون مقطوع

اس شعر کے صحیح معنی باوجود طویل غور وفکر مجھ پر پوری طرح روشن نہیں ہوئے۔ مختلف فاضل شارحین نے اس پر جو لکھا ہے اس کی تکرار یا خلاصہ کرنا طول امل ہوگا، کیونکہ کسی کا بھی انداز ایسا نہیں کہ جس سے غور وفکر کی کوئی راہ کھل سکے۔ نمونے کے طور پر حسرت موہانی کو سنئے: "خدا جانے بدعہدی کا نشان کب مٹے گا یعنی تو لاکھ آرائش و زیبائش کرے مگر اس داغ بدعہدی کے ہوتے ہوئے جب تو آرائش کے لئے آئینہ دیکھتا ہے وہ بھی تیرے لئے ورطۂ ملامت بن جاتا ہے۔ آئینے کی تشبیہ ورطے سے ظاہر ہے اور آرائش چونکہ اغیار کے دکھلانے کے لئے کی جاتی ہے، اس لئے اس سے بدعہدی لازم ہے۔"

اس شرح میں پہلی مشکل یہ ہے کہ "داغ" کے معنی "نشان" لئے گئے ہیں لیکن لفظ "طعن" کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ "طعن" کا نشان بے معنی بات ہے۔ اگر "طعن" کو نیزے کے وار یا نیزے کی چوٹ کے معنی میں لیا جائے تو "نشان" کا جواز بنتا ہے، لیکن پھر بدعہدی کو نیزے کی چوٹ ماننا پڑے گا، اور بات پھر بگڑ جاتی ہے۔ ("نیزے کی چوٹ" یوں بھی محذوف معنی ہیں۔ "طعن" دراصل نیزہ زنی یا نیزہ بازی کو کہتے ہیں، یا پھر نیزہ بازی کے دوران حریف کے نیزے سے نیزہ لڑانا کو کہہ سکتے ہیں۔) پھر یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ "آئینہ" سے "آرائش کے لئے آئینہ دیکھنا" ہی کیوں مراد لیا جائے۔ اگر ایسا ہے بھی تو آئینے کو ورطۂ ملامت کیوں کہیں؟ یعنی یہ کیوں فرض کریں کہ آئینہ معشوق کو ملامت کرتا ہے؟

طباطبائی نے لفظ "داغ" کو نظرانداز کیا ہے۔ طباطبائی نے یہ مزید کہا کہ مطلب بھی اچھی طرح ادا نہیں ہوتا: یا کہتے ہیں کہ "خدا جانے وعدہ خلافی کا دھبہ کیسے دھلے گا... وعدہ خلافی کا داغ آئینے کے سامنے اور زیادہ نمایاں ہو جانا چاہئے۔" یہاں لفظ "داغ" تو ہے لیکن لفظ "طعن" کا دامن چھوٹ گیا، اور شرح کے شروع میں "وعدہ خلافی کا دھبہ" پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔ مشکلات آگے نہیں بڑھیں۔ بے خود موہانی کہتے ہیں: "مجھے حیرت ہے کہ بدعہدی کا دھبہ تیرے دامن اخلاق سے کیوں کر چھوٹے گا۔ یعنی جو اتنا باحیا ہو کہ آئینہ دیکھتے ہوئے شرما جائے، اس سے بدعہدی کیوں کر کی جا سکے گی۔" یہاں گزارش یہ ہے کہ جب معشوق بدعہدی کرے گا ہی نہیں تو اس کا دھبہ چھوٹنے یا نہ چھوٹنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟ اور "داغ" کا لفظ پھر محتاج شرح رہ گیا۔ اور یہ بات بھی نظرانداز ہو گئی کہ شعر میں "طعن بدعہدی" کے داغ کی بات ہو رہی ہے نہ کہ صرف بدعہدی کے داغ کی۔ یعنی بدعہدی کا واقع ہونا یا نہ واقع ہونا زیر بحث ہی نہیں ہے۔ کہا صرف یہ گیا ہے کہ اگر تجھے کسی نے بدعہدی کا طعنہ دیا تو خدا معلوم اس طعنے کا داغ کیوں کر مٹے گا۔ "تجھے کہ" سے لوگوں نے "تجھے تو" مراد لیا ہے، لیکن اس کے معنی "تیری نظر میں" بھی ہو سکتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے غور کیجئے تو مصرع اول میں ایک نئی صورت حال سامنے آتی ہے۔ مصرعے میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ بدعہدی کا طعنہ معشوق کو دیا جائے گا یا دیا جا سکتا ہے۔ مصرعے میں تو صرف داغ طعن بدعہدی کی بات ہے۔ لوگوں نے فرض کر لیا کہ چونکہ بدعہدی اکثر معشوق کی طرف سے ہوتی ہے، اس لئے یہ مصرع معشوق کے بارے میں ہے۔ لیکن اگر یہ فرض کیا جائے کہ بدعہدی کا طعنہ عاشق کو دیا جاتا ہے یا دیا گیا ہے تو دوسرے مصرعے میں "تجھے کہ" کے معنی [illegible] کی روشنی میں شعر کے معنی حسب ذیل ہو سکتے ہیں:

جواز • شمارہ ۲۲ • مدیر: سید عارف • نیا پورہ • مالیگاؤں، ناسک • چالیس روپے •

ہندوستان میں اردو رسالہ، وہ بھی خالص ادبی رسالہ نکالنا دشوار کام ہے۔ اس کے باوجود رسالوں کے عام نمبر اور خاص نمبر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ قابلِ تحسین ہیں وہ مدیران جو ادبی رسالے شائع کرتے ہیں لیکن جہاں تک سوال ہے معیاری رسالوں کا تو وہ گنتی کے چند ہیں۔ ماہنامہ "جواز" ان ہی گنتی کے چند رسالوں میں سرفہرست ہے۔ اس کا عام نمبر بھی دیگر رسالوں کے کچھ خاص نمبر سے کم نہیں ہوتا۔

زیرِ تبصرہ شمارہ "جواز" کا خاص نمبر ہے۔ سید عارف صاحب نے اس نمبر پر بڑی محنت کی ہے۔ فیض اور بیدی کے انتقال پر انہوں نے جو اداریہ لکھا ہے وہ خود مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ دورِ جدید کے معتبر اور ابھرتے ہوئے تقریباً تمام فن کار اس شمارے میں شامل ہیں۔ کئی مفصل تنقیدی مضامین کے علاوہ شعری حصہ میں بلراج کومل، قاضی سلیم، ساقی فاروقی، وزیر آغا، محمد علوی، فضیل جعفری، شمس الرحمٰن فاروقی، زبیر رضوی، بشر نواز، فضا ابن فیضی، زیب غوری، ندا فاضلی، سید عارف، محمد ظہار الحق، منصور سبزواری، حامدی کاشمیری، فاروق شفق، لطف الرحمٰن، اشرف القادری اور اسعد بدایونی اور افسانوی حصہ میں منیر مسعود، مومن سعید، قمر احسن، رشید امجد، سلام بن رزاق، مرزا حامد بیگ، شوکت حیات، شفق، حسین الحق، مظہر الزماں خاں، عبدالصمد، احمد داؤد، مجید انور، آنند لہر اور انور خان کی تخلیقات شامل ہیں ان کے علاوہ تراجم، بارہ افسانوی مجموعوں پر تبصرے اور خطوط بھی شامل ہیں۔

حصۂ مضامین میں شمس الرحمٰن فاروقی کے "شور شعر انگیز" کا اقتباس ہی پڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ کتاب شائع ہوگی تو میر کے بارے میں سارے مروج تصورات پر لوگوں کو نظر ثانی کرنا ہوگی۔ پھر وارث علوی کا مضمون "فکشن کی تنقید کا المیہ" جو شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب "افسانے کی حمایت میں" پر تبصرہ ہے۔ پورے ۷۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اتنی طویل اور اتنی بے مغز تحریر لکھنے کا فن صرف وارث علوی ہی جانتے ہیں۔ وارث علوی صاحب جیسا اردو ادب نے واحد تبصرہ نگار پیدا کیا ہے جو کتاب کی ضخامت کے برابر تبصرہ لکھتا ہے۔ ان کے بارے میں میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ جو بات ۲ سطروں میں کہی جا سکتی ہے وارث علوی اس پر کم سے کم ۲ صفحات لکھ سکتے ہیں۔ الفاظ کے اس بحرِ مواج میں بہہ کر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ پہلے کیا لکھ چکے ہیں۔ فاروقی کے بارے میں ان کے مضمون "شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری" (شب خون شمارہ ۹۹ صفحہ ۳۰ ۱۹۷۶ء) کا صرف ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے :۔

> اپنی ادبی روایت اور تہذیبی سرمایہ سے گہری واقفیت مغربی ادب کا وسیع مطالعہ، حزم، حسن نظر اور استدلالی فکر، رچا ہوا ذوقِ سخن اور غیر معمولی قوتِ محاکمہ، بے باک لیکن مہذب اندازِ گفتگو اور بے نظیر اسلوب نگارش فاروقی کی تنقید کی قابلِ رشک خوبیاں ہیں۔ انہوں نے اپنے اسلوب کو ایک مدرسانہ، شاعرانہ اور راہبرانہ عیوب سے پاک رکھا اور دوسری طرف اسے انتخاب، جالب اور راسین ناگی کی بہکی ہوئی انفرادیت کے اشکال اور ابہام سے بھی محفوظ رکھا، ضرورت پڑنے پر وہ بے تکلف گفتگو کو فلسفیانہ تقریر میں بدلنے اور تنقید کو مدرسا اور تجزیہ گاہ کی محشری فضاؤں میں لے جانے سے بھی نہیں گھبرائے۔ انہوں نے سب سے پہلے چند ایسے مسائل پر لکھا جن پر ہمارے یہاں کوئی تنقیدی سرمایہ نہیں تھا۔ ابھی تک تو فاروقی نے جو کچھ لکھا ہے اس پر کوئی اضافہ نہیں کر سکا۔ اضافہ کی بات جانے دیجئے اس پر سنجیدگی سے لوگوں نے غور تک نہیں کیا۔ فاروقی نے اردو تنقید کی فضائیں بدل دیں لیکن آج بھی اردو کا عام نقاد اس طرح تنقیدیں لکھ رہا ہے گویا سوتے ہوئے ترکستان میں آیا

تھا انہیں پتہ ہی نہیں تھا کہ فاروقی اردو تنقید کا ایک اہم موڑ ہیں جس پر اردو تنقید کو یا تو مڑنا ہوگا یا اس سے انحراف کرنا ہوگا۔"

وارث علوی نے "جواز" میں فاروقی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا جواب خود ان کے مندرجہ بالا اقتباس میں موجود ہے۔

معلوم ہوتا ہے "جواز" میں شامل یہ مضمون وارث علوی کا تنقیدی SWAN SONG ہے کیوں کہ اس میں ان کی تضاد بیانی، لفظوں کا بے تحاشا اسراف، فکری ژولیدگی، مزاج کی کدورت اور نظر کا تلون اپنی معراج پر ہے۔ اب انہوں نے اردو تنقید میں اپنا مقام ہمیشہ کے لئے متعین کر لیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی اسی کتاب "افسانے کی حمایت میں" پر ایک مضمون شہنشاہ مرزا کا بھی شامل اشاعت ہے۔ شہنشاہ مرزا نے اپنی بات سلیقہ سے کہی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ ان کا مضمون وارث علوی کے مضمون سے کہیں بہتر ہے۔ (اگرچہ دونوں کے علم میں زمین آسمان کا فرق ہے) یہ الگ بات ہے کہ میں ان کے نظریہ سے متفق نہیں۔ اور یہ بات بھی الگ ہے کہ وارث علوی اور شہنشاہ مرزا دونوں ہی صاحبان کو فاروقی کا استدلال اور ان کی زبان سمجھنے میں جگہ جگہ تسامح ہوا ہے۔ یوں تو سید عارف صاحب مضامین کی ترتیب کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں ترتیب نامناسب لگا ہے۔ مثال کے طور پر بلراج کومل، ساقی فاروقی، محمد علوی، وزیر آغا وغیرہ سے پہلے عزیز قیسی کی تخلیقات شائع کی گئی ہیں۔

مجموعی طور پر چالیس روپے کا یہ خاص نمبر ضخامت کے لحاظ سے بھی اور مواد کے لحاظ سے بھی سستا ہے۔ سید عارف صاحب یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اتنا عمدہ اور ضخیم نمبر شائع کیا۔

کتابت، طباعت اور گٹ اپ اچھا ہے۔

——— سید ارشاد حیدر

شبستان • فیض نمبر • مدیر: ادریس دہلوی • آصف علی روڈ نئی دہلی • پندرہ روپے •

کسی شاعر یا ادیب کی موت کے بعد اکثر رسائل "خاص نمبر" نکالتے ہیں، فنکار ہندوستانی ہوں یا پاکستانی۔ ہمارے ملک کے مدیران پر خاص نمبر ضرور نکالتے ہیں لیکن پاکستانی رسائل ہندوستانی فنکاروں کے خاص نمبر کم ہی نکالتے ہیں۔ احتشام حسین کرشن چندر، بیدی، فراق، بانی، اور خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ بے شمار شاعر اور ادیب ہمارے درمیان سے اٹھ گئے۔ پاکستان نے کس کس پر اور کتنے نمبر نکالے؟ لیکن ہم پاکستانی ادبا اور شعراء کی موت پر بھی اسی طرح "نمبر" نکالتے ہیں جیسے اپنے ہندوستانی لکھنے والوں کی موت پر نکالتے ہیں۔ یہاں جوش نمبر بھی نکالا گیا اور فیض نمبر بھی خواہ ان کا معیار کیسا بھی ہو۔

"شبستان" جو محض ڈائجسٹ ہے۔ کوئی ادبی رسالہ نہیں۔ اس کا زیر تبصرہ شمارہ "فیض نمبر" ہے۔ یہ ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں چالیس مختصر مضامین مع تصاویر شامل کئے گئے ہیں۔ تقریباً سبھی مضامین تاثراتی یا سوانحی ہیں۔ کچھ رپورتاژ بھی شامل ہیں اگرچہ تنقیدی مضامین کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔ پھر بھی ان مضامین سے فیض کے بارے میں خاصی معلومات فراہم ہو سکتی ہیں۔ مضمون نگاروں میں خود فیض کے علاوہ سجاد ظہیر، اشفاق حسین، احمد ندیم قاسمی، گوپی چند نارنگ، خواجہ احمد عباس، قمر رئیس، اور احمد فراز وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

نمبر کے آخر میں نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ، سر وادیٔ سینا، شام شہر یاراں، میرے دل، میرے مسافر، اور غبار ایام سے منتخب کلام بھی شامل کیا گیا ہے جو ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

کتابت، طباعت اور گٹ اپ عمدہ ہے۔

——— سید ارشاد حیدر

سلیم اختر

اردو دوستوں کے لئے ایک خط

مکرمی تسلیم!

شاید یہ بات آپ کے علم میں نہ ہو کہ "اردو وادب کی مختصر ترین تاریخ" کی صورت میں، میں ایک ایسی مقبول کتاب کا مصنف ہوں جس کے اب تک دس ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ پاکستان کی کئی یونیورسٹیوں میں ایم۔ اے اردو کے طلبا اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ حکومت پاکستان نے اسے سول سروس کے اعلیٰ امتحان C.S.S. کے نصاب میں بھی شامل کر رکھا ہے۔ یہ سب اس لئے ممکن ہو سکا کہ میں ہر نئے ایڈیشن میں نیا ضمیمہ تحریر کر کے کتاب کو اپ ٹو ڈیٹ رکھتا ہوں اور اس مقصد کے لیے ہمیشہ نئے ادبی مواد کی جستجو میں رہتا ہوں۔

بھارت کے کئی ادیبوں نے کتاب میں ایک ضروری اضافہ کی طرف توجہ دلائی یعنی تقسیم ملک کے بعد لکھے جانے والے بھارتی ادب اور ادیبوں کا بھی تذکرہ ہونا چاہیے کہ ایسا ہونے پر یہ برصغیر میں اردو وادب کی ایک جامع اور اپ ٹو ڈیٹ تاریخ ثابت ہوگی۔ میں اس برس "اردو وادب کی مختصر ترین تاریخ" کو مکمل طور پر نظر ثانی کے بعد نئے سرے سے لکھنے کا منصوبہ بنا رہا ہوں اور اس مقصد کے لئے آپ اپنے ادارہ کی مطبوعات عنایت کر کے میرا ہاتھ بٹا سکتے ہیں بھارت میں اردو، اردو وادب اور ادیبوں کے بارے میں معلومات کے حامل مقالات متفرق تحریروں اور قیمتی مشوروں سے بھی نواز سکتے ہیں۔

اگر آپ اپنے ادارہ کی جانب سے کوئی اخبار یا رسالہ نکالتے ہیں تو اس میں میری جانب سے ایک اعلان بھی شائع کرایا جا سکتا ہے۔ آپ مجھے اس انداز کے دیگر اداروں کے پتے بھی بھیج سکتے ہیں۔ یا پھر میری اس چٹھی کی نقل انہی سفارشات کے ساتھ انہیں مہیا کر سکتے ہیں۔ میں آپ کی مدد کا دیباچہ میں بطور خاص شکریہ ادا کروں گا۔

بھارت میں اردو زبان اور ادب اور ادیبوں کے بارے میں "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" میں ابواب کی تحریر ایک چیلنج سے کم نہیں اور آپ کی مدد سے ہی میں یہ چیلنج قبول کر سکتا ہوں۔

مخلص

سلیم اختر

کہتی ہے خلق خدا

ممنون ہوں کہ آپ نے میرا شیطان کی آنت نما مضمون "اردو نظم اور اس کی اصناف" ایک ہی شمارے میں شائع کر دیا میں یہ صراحت کرنا بھول گیا کہ یہ مضمون اقبال کے انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونی ورسٹی سری نگر کے ایک سیمینار منعقدہ اگست ۱۹۸۳ء کے لئے لکھ کر بھیجا گیا تھا۔ میں نے مطبوعہ مضمون کا اپنے مسودے سے جستہ جستہ مقابلہ کیا۔ ایک اہم اور چند غیر اہم اغلاط کتابت دکھائی دیے درج کرتا ہوں۔

ص ۱۴ کالم ۲ کی فٹ نوٹ کی آخری سطر کا پہلا جملہ حاشیہ ۱۸ کے ساتھ ہے جب کہ حاشیہ ۱۹ دوسرے جز (مشمولہ شعر، غیر شعر اور نثر) کے قبل لکھا جانا چاہیے۔

ص ۳۱ پر قطعے کے سلسلے میں ایک سطر چھوٹ گئی ہے جس سے مفہوم میرے عندیے کے برعکس ہو گیا ہے۔ سطر ۱۶ کے پہلے لفظ 'غزل' کے بعد ذیل کے الفاظ کا اضافہ ہونا چاہیئے۔ قوسین کے الفاظ سلسلہ ظاہر کرنے کے لئے ہیں اضافے کے لئے ہیں (غزل) نہیں کہہ سکتے۔ موضوعی اعتبار سے وہ قصیدے کی ذیل میں نہیں آسکتے۔ اس لئے انھیں قطعہ کہے بغیر کوئی چارہ نہیں

ص ۱۰، کالم ۱، سطر ۱۲ ممشر کو معشر پڑھئے

ص ۲ کالم ۲ سطر ۲۔ "جکری کا ہے" میں چھوٹا ہر انقطہ ہیں ہے۔

اگلی سطر کا 'بیسن' بھی دراصل 'بین' ہونا چاہیے۔

ص ۴۳ کالم ۱، سطر ۹ گو ہر علی شبیر کو گوہر علی مشیر پڑھیے۔
اگلی سطر میں 'اپنے جوش (خروش)' اسے جوش و خروش بنا لیجیے۔
صفحہ ۲۲ کالم ۲ سطر ۳ ڈاکٹر محمد حسین کو ڈاکٹر محمد حسن پڑھیے۔
ص ۸۰، کالم ۱، سطر ۱۱ 'کرہیسہ' اور 'کو رہیسہ واد' پڑھیے۔

حیدرآباد گیان چند

● شمارہ ۱۲۸ میں ڈاکٹر گیان چند کا مضمون (اردو نظم اور اس کی اصناف) بڑا بسوط اور بھرپور ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے جدید و قدیم اصناف نظم پر جس علمی و تجزیاتی انداز میں بحث کی ہے بے حد معلومات افزا ہے اور متعلقہ مضمون کے تمام گوشوں کو سمیٹنے میں کامیاب ہے۔ دوسرا قابل ذکر مضمون شمس الرحمن فاروقی کا ہے۔ (میر کا لسانی کارنامہ) فاروقی صاحب نے میر کی لغطیات، لفظیات کے انتخاب اور برتاؤ میں میر کے آزاد روانہ تکلف رویے۔ روزمرہ اور بول چال سے قریب الفاظ، تراکیب کے بے ساختہ استعمال اور میر کے دردمندانہ لہجے کی سادگی و نرمی کو اپنے مضمون کی اساس بنا کر اظہار خیال کیا ہے جس میں ان کا مخصوص تنقیدی و تجزیاتی اسلوب نمایاں ہے۔ دو مضامین بہ عنوان 'تفہیم غالب' شمارے کی آبرو ہیں۔ حصہ نظم بھی خاصا وقیع ہے، اور عمیق حنفی، محمد علوی، بلراج کومل، ساقی فاروقی کی نظمیں اور ساقی۔ جاوید ستہ ہیں۔ انور شعور، محمد اظہار الحق کی غزلوں سے منور "تنقیدی افکار" پر بلراج کومل نے بڑی چابکدستی و ہوشمندی سے تبصرہ کیا ہے اور کتاب کے بعض اجزاء پر خصوصی توجہ دی ہے۔ سیب ارشاد حیدر بھی اپنے تبصرے میں کامیاب ہیں۔

مئو ناتھ بھنجن فضا ابن فیضی

● رفتہ رفتہ سبھی رفقا ساتھ چھوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ باقی جو رشتہ بجلی کرشن اشک، مارش شاد اور اسد ریب نے بھی رخت سفر باندھ لیا۔ گرد و پیش عجیب تکلیف دہ سناٹا محسوس ہوتا ہے۔ زیب نے کراچی میں انتقال کیا۔ اچانک ان کی وفات کی خبر پڑھ کر بڑا صدمہ ہوا۔ عالیہ گرلس اسکول کے مشاعرے کے موقع پر رشتہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی جس کی صدارت آپ نے فرمائی تھی۔ کیا خبر تھی کہ یہ آخری ملاقات ثابت ہو گی۔ ادھر زیب غوری کی شاعری نے بڑا خوش گوار موڑ لیا تھا جسے پڑھ کر ایک نوع کی نئی تازگی اور گرمی کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن افسوس کہ جب وہ اپنی آواز اور اسلوب کے سفر میں منزل سے قریب ہو رہے تھے موت کے ہاتھوں نے انھیں ہمیشہ کے لئے ہم سے چھین لیا۔ بہر حال انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اور خوب لکھا ہے، وہ ان کے شعری مقام و منصب کے تعین کے لئے کافی ہے۔ اللہ مغفرت کرے!

مئو ناتھ بھنجن فضا ابن فیضی

● شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون "میر کا لسانی کارنامہ" شہارے کی جان ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد یہ حقیقت آئینہ ہو جاتی ہے کہ میر پرانے کو قابلِ ترک اور ہر نئے کو قابلِ قبول نہیں سمجھتے تھے۔ وہ الفاظ کا مستقبل جانتے تھے، اسی لئے قابلِ قبول نئے پرانے الفاظ کو استعمال کر کے وہ اردو زبان کو ایک ایسا اسلوب دے گئے جو اپنا اور صرف اپنا دکھائی دیتا ہے گا۔

غالب کے شعر ؎

کرے ہے بادہ ترے لب سے رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش میں انھوں نے اپنے ذہنِ رسا سے خوب کام لیا ہے اور گوہرِ معنی تلاش کر لیا ہے لیکن شعرِ مذکور کی تقطیع مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن بنتی ہے۔ ارکان مزاحفہ کو منفصل شکل میں لکھنے سے ہی خیال آئے گا کہ یہ شعر بحرِ مجتث میں ہے کیونکہ اس بحر کا جزو رکن مس تفعلن ہے اس کی شکل مخبون مفاعلن ہے۔ اسے مفاعلن ہی لکھنا چاہئے۔

علاوہ ازیں انھوں نے اس وزن کو مخبون مقطوع کہا ہے۔ اسے مخبون محذوف مسکن کہنا چاہئے کیونکہ فاعلاتن سے بذریعہ خبن فعلاتن حاصل ہوا۔ پھر بذریعہ زحاف حذف تن کو حذف کیا، فعلن بچا۔ اس پر تسکین کا عمل ہوا تو فعلن بسکون عین بنا۔ قطع کی تعریف ہے کہ یہ رکن کے آخر سے وتدِ مجموع کے ایک حرفِ متحرک کو ساقط کرتا ہے۔ یہاں فاعلاتن کے آخر میں سببِ خفیف ہے جسے حذف ہی کیا جا سکتا ہے نہ کہ قطع۔

چنڈی گڑھ کندن اراولی

● اس میں کوئی شک نہیں کہ جو مواد رکن اپنی سالم میں منفصل یا مفروق ہیں۔ ان کی مزاحف شکل کو بھی منفصل لکھا جائے تو بہتر ہے۔ لیکن چونکہ منفصل ارکان اسی لئے وضع کئے گئے تھے کہ ان پر بعض زحافات کا عمل ہو سکے اور بعض کا نہ ہو سکے، اس لئے اگر ان کی مزاحف شکل کسی ایسے زحاف کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے جو منفصل اور متصل دونوں اوزان میں مشترک ہے (جیسے کہ زحاف خبن، جو مستفعلن میں بھی وارد ہوتا ہے اور مس تفعلن میں بھی) تو اس مزاحف شکل کو متصل لکھنے میں چنداں قباحت نہیں۔ پرانی کتابوں میں ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ رہا سوال فعلن بسکون عین کو محذوف مقطوع کہنے کا، تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ فاعلاتن پر حذف کا عمل کر کے فاعلن بنائیے۔ پھر فاعلن پر قطع کا عمل کر کے فعلن بسکون عین بنا لیجئے۔ اس طرح ایک زحاف کم لگتا ہے۔ مرزا اوج نے "مقیاس الاشعار" (لکھنؤ ۱۸۸۶) کے صفحہ ۶۰ اور ۶۱ پر زحاف قطع کی جو تعریف کی ہے اس سے بات صاف ہوتی ہے۔ اسی کتاب کے صفحہ ۱۱۸ پر انھوں نے فاعلاتن کی فرع فعلن بسکون عین کو "باجتماع حذف و قطع" برآمد کیا ہے۔ لیکن اراولی صاحب کا یہ ارشاد بالکل درست ہے کہ فعلن بسکون عین کو مخبون محذوف مسکن بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن بعض لوگوں (مثلاً محقق طوسی) نے اس کو فاعلاتن کے سقوط میں کا نتیجہ مانا ہے اور زحاف کو تشعیث کا نام دے کر رکن کو مشعث قرار دیا ہے۔

نئی دہلی شمس الرحمٰن فاروقی

حساب گیا چند صاحب کا مضمون اتنا طویل ہے کہ پڑھتے پڑھتے جان ہی نکل گئی — بہت سی باتیں چونکہ مبتدیانہ قسم کی ہیں اس لئے برا نہ مانئے تو کہوں کہ خاصی بوریت بھی ہوئی، لیکن اس جان لیوا قسم کے مقالہ سے بھی کام کی کئی باتیں حاصل ہو گئیں، اس لئے موضوع زیرِ بحث کے سلسلہ میں جین صاحب کے علم و مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مقالہ "میر کا لسانی کارنامہ" میں کلامِ میر کے مطالعہ کے لئے ایک نئی جہت قائم کر دی ہے۔ یہ بات تو صحیح ہے کہ میر نے اپنی شاعری میں ایک منفرد لسانی نظام قائم کیا ہے لیکن اس کی بنیاد پر میر کے ان اشعار کو جو "پستش بغایت پست"[1] کے ضمن میں آتے ہیں بلند تو نہیں کہا جا سکتا، گو ان کے مضمون سے اس امر کا شائبہ نہیں ہوتا کہ آپ محض منفرد لسانی نظام کی وجہ سے میر کے متعدد پست اشعار کی بیجا ستائش کر گئے ہیں۔ تنقید و تفہیم کا مقصد تو یہ ہونا چاہئے کہ "خوب" کی "خوبی" اور "بد" کی بدی ثابت کی جائے۔ اگر جنون کا نام خرد اور خرد کا نام جنون پڑ جائے تو آپ اسے کیا کہیں گے۔ میر کی شاعری کا خاصا بڑا حصہ خس و خاشاک ہے۔ ہم خس و خاشاک کو تو ہر آبدار تو نہیں کہہ سکتے۔ ہاں کوئی ہیرا ہو تو اسے

---

[1] حالی صاحب کو کوئی دوسرے لوگوں کی طرح سہو ہوا ہے۔ میر کے بارے میں "پستش بغایت پست" کا حکم کسی نے نہیں لگایا۔

مراد شی ثروت کو مختلف زاویوں سے دکھا سکتے ہیں۔ آپ کو شکوہ یہی ہے کہ انھوں نے نے میر کے لسانی اجتہاد کی تعریف میں معمولی درجے کے اشعار کو بھی بلند کرنا چاہا ہے۔

میں ان کے نتائج ذہن کے سے متفق ہوں کہ میر کا بڑا کارنامہ اور اس کے اشعار کی اثر انگیزی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میر نے شاعری میں اس کے میڈیم (یعنی الفاظ) کو مانع نہیں بننے دیا ہے۔ الفاظ شعر کے لئے وسیلۂ اظہار بھی ہیں اور ایک طرح سے اظہار جذبات کے لئے رکاوٹ بھی بنتے ہیں۔ میر نے اس وسیلہ کی اہمیت کو بہت حد تک کم کیا ہے، اس انکار وسیلہ کے نتیجہ میں یہ ٹوٹ پھوٹ تو ہونی ہی چاہئے تھی۔ غالب نے اپنی چابک دستی سے وسیلہ کو بھی DECORATIVE بنا دیا ہے۔ اس طرح اگر چہ غالب کے یہاں حسن کی دوبالگی پیدا ہو جاتی ہے مگر اصل شعر پہ ایک پردہ بھی پڑ جاتا ہے۔ میر نے اس حجاب درمیاں کو اٹھانے کی کامیاب اور ناکام کوشش کی ہیں۔ خیر چھوڑیئے اس بحث کو مجھے آپ سے کوئی جھگڑا تو کرنا نہیں ہے۔

علیم اللہ حالی
پٹنہ

حالی صاحب کو بھی دوسرے لوگوں کی طرح سہو ہوا ہے۔ میر کے بارے میں "بستش" بعنایت پست حکم کسی نے نہیں لگایا۔

شمس الرحمن فاروقی
نئی دہلی

میر کے اس لسانی کارنامہ کو سراہتے ہوئے فاروقی صاحب نے تجدیداً کی ایک طرح سے نفی کی ہے۔ پچھلی دفعہ حیدرآباد میں انھوں نے کہا تھا کہ شہر آشوب وغیرہ بھی کہا جا سکتا ہے تو ان کا منشا اس سے یہی رہی عوام سے قریب کو اپنانا تھا۔ اردو ہندی اور فارسی الفاظ میں اضافت و عطف کا استعمال بھی وہ جائز قرار دیتے ہیں بلکہ میر کی زبان کی دکنیت کو سراہتے ہیں جبکہ یہی کچھ اگر کوئی آج کا دکنی شاعر استعمال کرے تو اسے زبان سے ناآشنا سمجھا جاتا۔ ڈاکٹر گیان چند جین صاحب نے بے حد مدلل مضمون لکھا۔ ایسی ایسی اصناف گنا ڈالیں جو شان و گمان میں نہ تھیں۔ ہمارا سنجیدگی سے شعر کہنا کبھی کام نہ آیا۔ مگر جب تفنن طبع کے طور پر (ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی) کے اصرار پر غیر مقفیٰ و غیر مردف غزل کہی تو اس پر ڈاکٹر صاحب کی نظر انتخاب پڑی۔ اپنی ادبی ACTIVITY کے تحت یک سطری نظمیں لکھیں تو وہ بھی ڈاکٹر جین کے ہاں بار پا گئیں۔ ڈاکٹر جین صاحب نے "ترائیلوں" کے لکھنے والوں میں میرا ذکر نہیں فرمایا۔ حالانکہ میرا دوسرا مجموعہ "ایلان" ترائیلوں پر ہی مشتمل ہے۔ (آخری مرحلے پر اس میں کچھ آزاد نظمیں اور غزلیں بھی شامل کر لی گئی تھیں)

مجموعہ ڈاکٹر جین کی نذر بذات خود میں کر چکا تھا (شاید وہ بھول گئے)، کئی مبادلے سے اقرا میں بھی ترائیلے شامل ہیں۔

رؤف خیر
حیدرآباد

● شب خون شمارہ ۱۳۸ میں گیان چند جین صاحب کا طویل مضمون "اردو نظم اور اس کی اصناف" نظر سے گذرا۔ اس مضمون کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ اگر ہمارے اکثر نقاد صنف (GENERE) اور ہیئت (FORM) کے فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ صنف کا تصور مضمون کے بغیر نامکمل ہے۔ جب کہ ہیئت اس قید سے آزاد ہوتی ہے۔ البتہ بعض اصناف ایسی بھی ہیں جن کے لئے ہیئت بھی مخصوص ہے جیسے قصیدہ۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے بیشتر نقاد صنف اور ہیئت کے فرق کو ملحوظ رکھے بغیر آزاد نظم، نثری نظم، قطعہ، رباعی، مثنوی یہاں تک مصرعوں کی تعداد کی بنیاد پر وجود میں آنے والی ہیئتوں تک کو، جن میں مثلث، مسدس وغیرہ شامل کیے ہیں، صنف کہتے ہوئے کوئی تکلف محسوس نہیں کرتے جب کہ ان کے لئے کوئی موضوع مخصوص نہیں ہے۔

——— ہماری قدیم شعریات تمدن کو ایک ایسی صنف قرار دیتی ہے جس کی ہیئت مخصوص ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو غزل کسی بھی زمانے میں عشقیہ موضوعات تک محدود نہیں رہی۔ کم از کم جدید غزل کی حد تک تو یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ اس اعتبار سے غزل بھی اول و آخر ہیئت ہے اور یہی ایک بات (اگر مظہر امام صاحب کو ناگوار نہ ہو تو ارا) غزل کو باطل قرار دینے کے لئے کافی ہے۔

اس سے قبل شب خون شمارہ نمبر ۱۲۷ میں فاروقی صاحب کا مضمون "فیض اور کلاسیکی غزل" بہت فکر انگیز لگا۔ اس مضمون میں فاروقی صاحب نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ "جہاں مضمون آفرینی ہوتی ہے وہاں SELFPITY نہیں ہوتی۔ جہاں کیفیت ہوتی ہے وہاں SELFPITY کا خطرہ ہوتا ہے۔" جب کہ اسی مضمون کے آخری پیراگراف میں فاروقی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ اُن (فیض) کی غزل میں اردو غزل کی وہ تہذیب بول رہی ہے جس میں مضمون آفرینی اور کیفیت کا عمل دخل تھا۔ فیض کے یہاں کیفیت کا جادو نظموں میں بھی بڑھ چڑھ کر بولتا ہے"۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیفیت (جسکی

وجہ سے خود ترحمی یا SELF PITY پیدا ہوتی ہے یا پیدا ہو سکتی ہے) کو خوبی تصور کیا جائے یا خرابی؟؟ شمارہ ۱۳۸ میں فاروقی صاحب نے اپنے مضمون "میر کا لسانی کارنامہ" میں میر کا یہ شعر نقل فرمایا ہے ؎

کام میرا بھی ترے غم میں کہوں ہو جائے گا
جب یہ کہتا ہوں تو کہتا ہے کہ ہوں ہو جائے گا

اور لکھا ہے کہ "یہاں بھی 'ہوں' کو 'کہیں' کے معنی میں استعمال کیا ہے" اگر اس عبارت میں کتابت کی غلطی نہیں ہے تو میں یہ عرض کردوں گا کہ 'ہوں' سے یہاں لاتعلقی، اکتاہٹ اور بیزاری کا اظہار مقصود ہے۔ اس سے کسی بھی حالت میں 'کہیں' کے معنی مراد نہیں لیے جا سکتے۔

سری نگر — عبید صدیقی

● فاروقی صاحب کی تحریر میں "کہوں" کی جگہ "ہوں" کتابت کی غلطی ہے۔ سیاق و سباق سے بھی ظاہر ہے کہ ہوں کی جگہ "کہوں" ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ "کیفیت" میں خود ترحمی کا خطرہ ہے' تو ظاہر ہے کہ صرف اس بنا پر کہ یہ خطرہ ہے "کیفیت" کو عیب نہیں کہہ سکتے۔ اچھا شاعر کیفیت کو برتتا ہے لیکن خود ترحمی سے احتراز کرتا ہے۔

شب خون — الہ آباد

● گیان چند جین صاحب نے اپنے مضمون میں معراعرل کے سلسلے میں میرے ایک خط سے (جو پہلے شب خون اور پھر شاعر میں شائع ہوا تھا) ایک جملہ حوالے کے طور پر دیا ہے۔ آپ کے کاتب صاحب نے حامدی کاشمیری اور میرے حوالوں پر غلطی سے ایک ہی نمبر دیا ہے۔ بہرحال رسالہ بہت دلچسپ اور معیاری ہے۔

سری نگر — علیم الرحمٰن

● شمارہ نمبر ۱۳۷ اور ۱۳۸ میں وضعیات پر صلوٰۃ آغاز پر مختصر نوٹس دلچسپ ہیں۔ البتہ زبان اور اصطلاحات مشکل استعمال کی گئی ہیں۔ سرسوتی گجراتی زبان میں کئی سیر حاصل مضامین اس موضوع پر لکھے گئے۔ چار نام جو آپ نے پیش کیے ہیں۔ ان سے آگے بھی فہرست بڑھائی جا سکتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی سے گذارش ہے کہ وہ اس موضوع پر تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار خیال کریں۔

حیدرآباد — محی الدین

● شمارہ نمبر ۱۳۷ سے متعلق مجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ میں اردو کے کسی اعلیٰ رسالے کے مدیر کو کسی سوال سے دوچار کروں۔ "شب خون" کے لیے یہ تو یہ قصہ مسرت کا سامان پیدا ہوگا۔ سو اگر یہ سوال محض میرا نہیں ہے تو میں اسے آپ کے سامنے رکھنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ شب خون شمارہ ۱۳۷ صفحہ ۵۹ پر شائع نظموں کے ساتھ حرف بعد شری کیا غیر ضروری نہیں ہے؟ اگر نہیں تو رسالے کی دوسری نظموں کے ساتھ "آزاد لفظ" ضروری نہیں ہے۔

سوال یہ نہیں ہے کہ یہ روایت کس نے شروع کی، سوال یہ ہے کہ کیا "شب خون" اسے ختم نہیں کرے گا؟

پٹنہ — سونو

● "شب خون" میں شمس الرحمٰن فاروقی کا میر پر سلسلہ مضمون بھی باصرہ نواز ہوا۔ لفظوں کی اس ہدایت پر شاید انھوں نے پہلی مرتبہ بحث چھیڑی ہے۔ محاورہ، اعمال وغیرہ پر محمد عسکری مرحوم کے مضامین ملتے تھے بہرکیف خدا ان کو سلامت رکھے کہ ان کے ناتے ہم لوگ بہت کچھ سیکھ لیتے ہیں۔ راقم الحروف آجکل قرۃ العین حیدر کی "اداس نسلیں" اور "آگ کا دریا" پر کام کر رہا ہے۔ سید ارشاد حیدر کا ایک تبصرہ شاید شب خون نمبر ۱۳۰ میں شائع ہوا تھا۔ جس میں موصوف نے CATACYST کی بات قرۃ العین کے تعلق سے جملہ قلم کی ہے۔ بہرحال آپ کی نیک خواہشات اور دعائیں شامل ہوں تو انشاء اللہ اچھا سا مضمون ترتیب دے سکوں گا۔

مدراس — غیاث اقبال

● شب خون شمارہ ۱۳۱ میں وارث علوی کی کتاب "حالی مقدمہ اور ہم" پر سید ارشاد حیدر کا تبصرہ شائع ہوا تھا اس میں قرۃ العین کا کہیں ذکر نہیں۔ شب خون شمارہ ۱۲۳ میں مرتب "پرانی شہ شیشہ جنبہ" ، جعفر شائع ہوا تھا۔

شب خون — الہ آباد

• گیان چند جین - جیسے محقق کا بالاستیعاب اور محققانہ مضمون "اردو نظم اور اس کے اصناف" بہت پسند آیا۔ اس قدر تحقیق و تدقیق سے کام لیا گیا ہے اور جس قدر انھوں نے بنیادی حوالے دیے ہیں یقیناً وہ حیرت ناک ہیں۔ یقیناً اس سے ادبی معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ محترم فاروقی صاحب کا مضمون میر کا لسانی کارنامہ بھی خوب ہے۔ غزلوں میں جناب ظفر الحق صاحب کی تعطیلہ غزل کا جواب نہیں خدا کرے وہ اسی طرح کی غزلوں کی طرف بھی توجہ فرماتے رہیں۔ جناب انور شعور نے بھی بڑا ہی اچھوتا انداز اختیار کیا ہے۔ جناب ساقی فاروقی صاحب اچھی غزلیں کہتے ہیں۔ معلوم نہیں وہ کیوں ایسے بے معنی نظمیں لکھ کر خود کو ضائع کر رہے ہیں۔ اسی سے آپ نے اس طرح کی نظموں پر ایک سلسلہ کا آغاز کیا تھا مجھے پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ عدیم الفرصتی کی وجہ سے میں اس وقت لکھ نہیں سکا ارادہ تھا۔ تو اب ضرور لکھا ہوگا۔ بہر حال ابھی تک اس طرح کی نظموں کا کوئی ہیئتی پیکر سمجھ میں آسکا ہے۔ کوئی مفہومی جہت مل سکی۔ اس طرح بے احساس اور نامفہوم چیزوں کو پڑھتے ... کچھ ادبی نامہ میں جان ہو سکا۔

اگر آپ ساقی صاحب کی نظم "کبرہ" اور اس کا معنوی تجزیہ مجھے دے دیں تو میں کچھ عرض کر دوں۔

حیدر آباد — خورشید انور، مدہوشی

• ڈاکٹر گیان چند کا مضمون "اردو نظم اور اس کی اصناف" دیکھ کر بے ساختہ جی چاہا کہ دوسروں میں ادارۂ شب خون کی ادبی کاوشوں کو سراہوں

———

شب خون، ذہنی تربیت میں جو اہم کردار ادا کر رہا ہے اس سے وہ اہمیت اور شہرت کا مالک تو عرصے سے ہے مگر اب ادارہ کی اس نئی پالیسی سے یہ قبولیت عام بھی حاصل کرے گا۔ اس کے قبل کے شمارہ میں فاروقی صاحب کا ایسا ہی دقیع مضمون اور اس سے پہلے مرزا بیگ صاحب کا مضمون "اسلوبیات میر کے چند مباحث"، آپ کی اس پالیسی کی نشان دہی کرتے ہیں کہ آپ اردو ادب کے کسی اہم پہلو پر ایک بڑا جان دار اور دقیع مضمون پیش کر کے شب خون کی کھوئی ہوئی مقبولیت دوبارہ حاصل کر لیں۔

اس شمارے میں ڈاکٹر گیان چند کا مضمون "اردو نظم اور اس کی اصناف" بڑا دلچسپ المطالعہ ہے۔ نظم کی تقسیم پر بھرپور مکمل تفصیلی، تحقیقی اور تنقیدی بصیرت سے پُر ایک ادبی دستاویز ہے اور یہ چیز ڈاکٹر گیان جیسے نادر محقق و ناقد بھی ہو اس کی نکتہ رسی اور باریک بینی کا ثبوت ہے مگر ساتھ ہی ایک بات ضرور کھٹکتی ہے کہ گیان چند جیسا صاحب نظر ایسا اس بیان میں "نثری نظم" کو صرف نظر کر جائے جب کہ نثری نظم کا معاملہ بھی اردو ادب میں بڑی اہمیت حاصل کر چکا ہے اور اب یہ نظم معرّا نظم کے آگے مات ہے۔ اس سلسلے میں میں یہ جاننا چاہوں گا کہ ڈاکٹر صاحب یہ بتائیں کہ وہ نثری نظم کو نظم تسلیم کرتے ہیں یا نہیں۔ سید ارشاد حیدر کے تبصرے بھی بڑی نوک پلک کی چیز ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حسین حیات اور کارنامے پر ان کی باریک بینی اور حسین عباس عابدی کی گرفت پر پھر لکھوں گا۔

الہ آباد — حمید حیدر

• شب خون شمارہ نمبر ۱۳۸ میں گیان چند کا مضمون مکمل ہو کر بھی بڑا تشنہ ہے۔ علوی پھر پسند آئے۔ فاروقی صاحب کا مضمون بے حد معلوماتی ہے۔ چند غزلیں اچھی لگیں۔ ویسے مجموعی اعتبار سے تمام تخلیقات بہتر ہیں۔ سید ارشاد حیدر کے تبصرے پڑھ کر بڑی تقویت ملتی ہے۔ حالیہ تبصرہ بڑا جان دار ہے۔

رانچی — پرویز رحمانی

• میر کی زبان پر جناب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا مضمون لسانیات کے باب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

بمبئی — واحد حسن

- اس سال کا سوویت لینڈ نہرو انعام جیلانی بانو کو ملا ہے۔ ہم انھیں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ جیلانی بانو کا نیا ناول "بارش سنگ" کچھ دن ہوئے پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ اور اب ہندوستان میں بھی چھپنے والا ہے۔
- "پرندوں بھرا آسمان" پر بلراج کومل کو اس سال کا ساہتیہ اکاڈمی انعام تمام اردو دنیا کے لئے خوشی کا باعث ہوا ہے۔ بلراج کومل نے شعر، تنقید اور افسانہ تینوں میدانوں میں جدید ادب کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اس وقت وہ جدید شاعری کے میر کارواں ہیں اور یہ انعام ان کے بلند مقام کا ادنیٰ سا اعتراف ہے۔
- اس سال کے غالب انسٹی ٹیوٹ انعامات میں جناب مکیش اکبرآبادی جناب ابو محمد سحر، ماسٹر پرتاپ گڈھی مرحوم اور جناب گوپی چند نارنگ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ادب کے ان بلند پایہ خدمت گذاروں کی قدر و قیمت کا کچھ نہ کچھ اعتراف ہوا ہے۔
- کچھ دن ہوئے مشہور انگریزی شاعر، نقاد، مورخ، ناول نگار، ماہر علم الاصنام اور کئی ادبی تحریکات کے سرِ بر آوردہ رابرٹ گریوز —ROBERT GRAVES— کا نوے سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ عمر کے آخری تیس برسوں میں اس کا دماغ بیکار ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے یہ دن اپنی بیوی اور خاندان والوں کی دیکھ بھال کی وجہ سے آرام سے گذارے۔ گریوز کے دو تاریخی ناول I, CLAUDIUS اور CLAUDIUS THE GOD قدیم رومانی تہذیب اور تاریخ کی غیر معمولی فہم اور کردار نگاری کی نزاکت کے باعث اب بھی مقبول خاص و عام ہیں۔ اسی طرح ملٹن کی سوانح حیات پر مبنی اس کا ناول WIFE TO MR MILTON اب بھی پڑھنے کے لائق ہے اگرچہ اس میں ملٹن کی کردار نگاری جس انداز سے کی گئی ہے، وہ بہت سے لوگوں کو ناگوار گذری۔ اپنی کتاب THE GREEK MYTHS کی دو جلدوں میں اساطیر کی نئی تعبیر پیش کی اور علمانہ تحقیق و تعبیر کا نیا معیار قائم کیا۔ اس کی تنقیدی کتاب THE WHITE GODDESS کلاسیکی شاعری پر نئی روشنی ڈالتی ہے

- آنند لہر کے افسانوں کا مجموعہ "انحراف" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

شاعری کے میدان میں وہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور ازرا پاؤنڈ کا ساتھی تھا۔ گریوز کی موت کے ساتھ مغربی شاعری کے اس غیر معمولی دور کے آخری فرد کا خاتمہ ہو گیا۔ جس نے انگلستان، فرانس، جرمنی، اسپین، اٹلی اور امریکہ میں اس زمانے کے قدآور ادیبوں کو پیدا کیا۔

- گریوز نے بھرپور زندگی گذاری تھی اور اس کی موت پر ہمارا افسوس اس احساس سے بھی مملو ہے کہ دنیا کو سب کچھ دے چکا تھا جس کے لئے وہ پیدا ہوا تھا۔ اس کے برخلاف جرمن ناول نگار ہائنرخ بوئل Heinrich Boll جس کی موت انہتر برس کی عمر میں ہوئی، ابھی میدان ادب میں بہت کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ بوئل کو بعد از جنگ عظیم کے جرمنی کا ضمیر کہا گیا ہے اس لئے کہ اپنے ناولوں کے ذریعہ شکست خوردہ جرمنی کے روحانی اور ضمیری بحران اور اس کی پیدا کردہ المیہ صورت حال کی تصویر کشی، دلی ہمدردی، لطیف حس مزاح اور نفسیاتی ژرف نگاہی کے ساتھ کی۔ اس کا ناول GROUP PORTAIT WITH A LADY بعد از جنگ عظیم جرمنی میں ایک بیوہ کا زبردست نفسیاتی مطالعہ ہے۔ بوئل کی موت معاصر ادب کے لئے بڑا سانحہ ہے۔
- مہذب لکھنوی نے اپنی کتاب "دورِ شاعری" کے ذریعہ لکھنوی نظریات اور اصول شعر کو آسان اور افسانوی انداز میں پیش کر کے کلاسیکی مزاج کے نوجوان شعراء کی تربیت کی تھی۔ زندگی کے آخری تیس سال انہوں نے اپنا عظیم الشان لغت "مہذب اللغات" مرتب کرنے میں گذارے۔ افسوس کہ ان کی موت کے باعث یہ کام ادھورا رہ گیا۔
- مشہور جدید شاعر اور نقاد مظفر حنفی کو نیشنل کانفرنس آف چائلڈ ایجوکیشن نے قومی اعزاز عطا کیا ہے۔ ہم انھیں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

شب خون

141

Rs. 3-50

کہانی اور پلاٹ : روایتی نظریہ اور وضعیاتی نظریہ
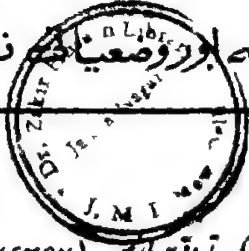
بورس توماشیوسکی کے روسی مضمون THÉMATIQUE کا انگریزی ترجمہ کرتے وقت لی لیمن (LEE LEMON) اور میرین رائس (MARION REIS) نے توماشیوسکی کی روسی اصطلاحوں FABULA اور SUJET کو "کہانی" (STORY) اور "پلاٹ" (PLOT) کے نام سے رائج کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں اس بات کا واضح اشارہ موجود ہے کہ مترجمین کی نظر میں FABULA اور SUJET میں وہی فرق ہے جو ای۔ ایم۔ فارسٹر نے اپنی کتاب "ناول کے مختلف پہلو" (ASPECTS OF THE NOVEL) میں تجویز کیا ہے۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تصورات کے یہ دونوں جوڑے بالخصوص "کہانی" (STORY) اور FABULA ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ مثلاً وقت کے گذران کا عنصر فارسٹر کی تعریفات میں بھی نمایاں ہے۔ (فارسٹر کی رو سے) "واقعات اگر اپنی زمانی ترتیب کے ساتھ بیان کئے جائیں تو یہ کہانی ہے۔ رات کا کھانا ناشتے کے بعد آئے، سوموار کے بعد منگل آئے۔ موت کے بعد جسم سڑنا شروع ہو۔ تو کہانی کی اس تنظیم میں صرف ایک خوبی ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سامع کے دل میں یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ پھر کیا ہوا، اس کے برخلاف بہ قول فارسٹر، "پلاٹ میں واقعات کا بیان اس طرح ہوتا ہے کہ اس میں علت پر زور دیا جاتا ہے۔ بادشاہ مرگیا، پھر ملکہ مرگئی، یہ کہانی ہے۔ بادشاہ مرگیا، پھر اس غم میں ملکہ کی موت ہوگئی۔ یہ پلاٹ ہے۔" لیکن فارسٹر کی بیان کردہ تفریقات کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ تصورات کے ان جوڑوں (یعنی FABULA اور SUJET اور STORY اور پلاٹ) میں بہت شدید افتراق ہے۔ ۱

وضعیاتی اصولوں کے ان جوڑوں میں سب سے پہلا اور فوری اہمیت کا فرق اس شے سے متعلق ہے جسے ان کا طرز وجود کہا جا سکتا ہے۔ SUJET وہ چیز ہے جو ہمارے سامنے مکمل فن پارے (ARTIFACT) کی حیثیت سے موجود ہے، یعنی وہ متن جسے خود فن کار نے اپنے ہاتھوں سے ڈھالا اور بنایا ہے اس کے برخلاف FABULA بنیادی طور پر SUJET کی تجرید اور اس کا بیان نو ہے۔' FABULA تجریدی قماش کا ہوتا ہے۔ اس میں وہ تمام عناصر واقعات اور کردار کی گروہ بندیاں اور ابعاد نہیں ہوتے جن سے' SUJET عبارت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، جو چیزیں FABULA میں نہیں ہوتیں' وہ حسب ذیل ہیں: غیر وقتی اہمیت رکھنے والے بیان جو مصنف کی طرف سے ہوں۔ مثلاً "ٹام جونز" کے تمہیدی الباب۔ تناظر (PERSPECTIVE) سے تعلق رکھنے والے منظری تاثرات (REFRACTIONS) جو کہ بیانیہ کے غیر شخصی توقیتی بیان (CHRONELOGUE میں) تحریفی یا ابہام پذیر عناصر داخل کرتے ہیں یا کم سے کم اس توقیتی بیان کو کسی نہ کسی خاص سمت میں رائج کر دیتے ہیں۔ ہر جگہ موجود رہنے والے وضعیاتی طرز، جیسے (۱) واقعات میں مشابہت جن کی جہت زمانی ارتقا کو بڑھانے یا مختلف عناصر کو یک جہت (INTEGRATE) کرنے کی طرف نہیں ہوتی۔ متن کا ٹھوس لفظی تن کا رانہ اظہار جو کہ نہ صرف بڑے بڑے قبل از لفظی انشائی تعمیرات کو شکل بخشتا ہے، بلکہ ان کی شکل متعین بھی کرتا ہے اور اس کی پشت پناہی بھی کرتا ہے (مثلاً لفظوں پر مبنی اشاروں کے ذریعے، ابہام کے ذریعے یا ایسی کڑیاں بنا کر جو واقعات کی ترتیب کے ماورا ہوتی ہیں) بلکہ SUJET میں تو ایسی درستی وعمل آوری کی ایسی منطق بھی ہو سکتی ہے جس کے ذریعہ SUJET اور FABULA میں وہ رشتہ قائم ہو جاتا ہے جو کائنات صغریٰ اور کائنات کبریٰ میں ہوتا ہے۔

مائر سٹرن برگ

۱۹۷۸

شب خون

مارچ، اپریل، مئی، ۱۹۸۶ء

مدیر، پرنٹر، پبلشر: عقیلہ شاہین ٹیلی فون: ۵۳۵۵۰۰ ۳۴۹۶ جلد: ۲۰ شمارہ: ۱۴۱
مطبع تاج آفسٹ پریس الہ آباد سرورق: خطاط: فیاض احمد
بارہ شمارے ۳۶ روپے فی شمارہ: تین روپے ۵۰ پیسے دفتر: ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد

ترتیب و تہذیب

شمس الرحمٰن فاروقی

راجندر سنگھ بیدی

بلراج کومل

زمین آغاز ہے۔

زمین انجام ہے۔

زمین مادرِ مہربان ہے۔

زمین لمحہ بھر کی شفیق وقفہ پناہ ہے۔

زمین تسلسل ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے تعلق سے یہ سب باتیں میرے ذہن میں بہ یک وقت ابھرتی ہیں۔

لوگ کہتے ہیں:

بیدی پنجاب کی زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

بیدی ترقی پسند ہیں۔

بیدی بقول منٹو لکھنے سے قبل بھی سوچتے ہیں، لکھتے ہوئے بھی سوچتے ہیں اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہیں۔

بیدی چخوف کے انداز میں لکھتے ہیں۔

بیدی مشکل افسانہ نگار ہیں۔

بیدی کردار نگاری کے فن میں یکتا ہیں۔

زمین کی پہچان روئیدگی سے ہے۔ زندگی کے مظاہر سے ہے۔ نمو اور مادہ سے ہے۔ رشتوں کے تصادموں اور رشتوں کی مفاہمتوں سے ہے۔ بیدی کی کائنات میں یہ سب عناصر موجود ہیں۔ یہ سب عناصر چوں کہ بنیادی ہیں۔ اس لئے ان کے ساتھ اکثر اوقات اساطیری اور دیومالائی نوعیتیں وابستہ کی گئی ہیں۔

ان سب آرا کے ہجوم میں راجندر سنگھ بیدی بہرحال زمین کی طرح متواتر اور مسلسل ہیں۔

بیدی کی کائنات کی جسمانی حدود بہت زیادہ وسیع نہیں ہیں۔ ان کے کردار۔ مرد، عورتیں اور بچے۔ زیادہ تر کردار چھوٹے قصبوں، چھوٹے شہروں کے رہنے والے لوگ ہیں۔ ان میں اکثر جسم سے موت کا ناگزیر وقفہ محدود جغرافیائی حدود میں گذارتے ہیں۔ وہ ہنری جیمز یا قرۃ العین حیدر کے کرداروں کی طرح سفر کی لذتوں یا سفر کے مسائل سے دوچار نہیں ہوتے اور اگر وہ رحمان کی طرح عازمِ سفر ہو بھی جاتے ہیں تو اپنی منزل تک نہیں پہنچ پاتے۔ بیدی کے کچھ کردار بڑے شہروں کی جذباتی تصادموں کے زیر و بم میں سے بھی گذرتے ہیں۔ لاہور، کلکتہ، بمبئی اور بے علم ساحلی شہروں کا ذہنی، روحانی اور سماجی کرب برداشت کرتے ہیں اور بالآخر زندگی کرنے کا فن سیکھ جاتے ہیں۔ طبقاتی تقسیم کے میزان کے مطابق بیدی کے اکثر کردار نچلے درمیانہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ محنت کش طبقے کے کردار اور اونچے طبقے کے کردار بیدی کے ہاں خال خال نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں کچھ ایسے مرد، عورتیں اور بچے ان کی دنیا میں آباد ہیں جن کو کسی ایک انداز میں مخصوص حد بندیوں میں قید کرنا ممکن نہیں ہے۔ بیدی کے ہاں زیادہ تر مرد دکان دار، چھوٹے کاروبار کرنے والے لوگ، نوکری پیشہ سرکاری یا غیر سرکاری ملازم، ڈرائیور اور مختلف

نیر واضح آعصیلات کے افراد ہیں۔ کتھو رام، علی حولم، جیارام، مادھو، پھرایا لال، مدن بھاگو، سندر لال، موہن جام، دربادی لال، جھبی پت، گمس ٹکلے، مکندی کمل مایو، مادھو، تلوکا منگل، پچھمن، مراری لال، ضیم، تھادو، گھنڈی لال، پولھورام، رحمان، سنت رام، سب کردار بیدی کی ننھی منی دنیا کے رہنے والے لوگ ہیں۔ ان کے رویے کچھ ردیے طبقاتی نوعیت کے ہیں۔ جب کہ دوسرے حالص جبلی اور بنیادی نوعیت کے ہیں۔ بیدی کے یہ سب کردار اکثر اوقات کثیرالجہت کردار ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی بہت سی پرتیں اور تہیں ہیں جو مختلف تضادوں سے سطح آب پر ابھرتی ہیں۔ کتھو رام، درباری لال، جھبی پت، گمس ٹکلے بظاہر سیدھے سادے انسان ہیں۔ لیکن جبلی اور سماجی تضادات کی کشمکش میں گرفتار ہیں۔ بیدی کے وہ کردار جو زوال عمر کے نشیب میں پہنچ چکے ہیں یا زوال عمر کے نشیب کے قریب و جوار میں ہیں، کم و بیش شفیق اور فراخ دل ہیں۔ اور تضادات میں گرفتار ہونے کے باوجود ہمدرد، جذبات سے معمور ہیں۔ سنت رام، حضور سنگھ، سندر لال سب تضادات میں گرفتار ہیں۔ سب ہمدرد، جذبات سے معمور ہیں۔ بیدی ان سب میں شامل بھی ہیں اور ان سے الگ بھی۔ جب بیدی بطور راوی خود بیانیہ میں شامل ہو جاتے ہیں تو کبھی بار ایسے معنی لیکن کہانی کے تعلق سے غیر ضروری خیالات کہانی میں شامل کر دیتے ہیں۔ وہ افسانے جن میں بیدی کا انداز خود نوشت سوانح یا اعتراف ذات کا ہے۔ یا تھ ہمارے قلم ہوئے، دو آئیے کے سامنے۔ بیدی کے فن کی عام سچائی سطح سے نیچے رہ جاتے ہیں۔

بیدی اپنے ان سب مرد کرداروں کا اخلاقی محاکمہ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ آئیے دیکھیں بیدی اپنے نسوانی کرداروں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں:

ھولی۔ گرہن کی رات کو ایک انتہا سے فرار ہونے کے عمل میں ایک بدتر انتہا کا شکار ہو گئی۔

دُکھی۔ محرومی، شفقت اور بابائیت آسودگی کی آرزو میں گرفتار۔ (دُکھی)

کنسو۔ لیڈی چیٹرلی کے انداز میں علی جو کی باہوں میں تلاش تسکین کرتی ہے۔ (اغوا)

رادھا۔ احتجاج کی آواز بنتی ہے۔ (دس منٹ بارش میں)

اندو۔ سرتاپا ماہتاب کی طرح شفاف اور مسرور (اپنے دکھ مجھے دے دو)

لاجونتی۔ صرف عورت بن کر زندہ رہنا چاہتی ہے۔ دیوی بننا اسے منظور نہیں ہے۔ (لاجونتی)

کیرتی۔ خود اعتمادی کی دولت اپنے انہدام سے حاصل کرتی ہے۔ (متھن)

سونفیا۔ جبلی ضرورتوں میں گھر کر ٹیڑھے راستے تلاش کرتی ہے۔ (سونفیا)

رانو۔ ازلی و ابدی غیر مفتوح نسائیت۔ زندگی کا تسلسل (ایک چادر میلی سی)

کندن۔ ماں بننے کی آرزو سے سرشار عورت۔ (یوکلپٹس)

جوگیا، کلیانی، سیتا، سواتی، کلکاری، سوترا اچلا، عزیزہ سب عورتیں ہیں۔ بیدی کے سب نسوانی کردار، بیدی کے مردوں کی طرح طبقہ داری زاویوں سے آزاد ہیں۔ وہ اپنی صورت حال کو مردوں کی طرح نہ تو مکمل طور پر قبول کرتی ہیں۔ نہ رد کرتی ہیں۔ نہ اس صورت حال سے فرار اختیار کرتی ہیں، نہ اس کے خلاف احتجاج کرتی ہیں۔ نہ اس کو جھیلتی ہیں۔ تمام تضادات کے کرب کے ساتھ ہولی، تکی، گوری، سکھیا، لاجونتی، اندو، رانو، کلیانی، جوگیا ٹھیک اسی طرح جیتی جاگتی عورتیں ہیں۔ جس انداز سے ملم، بھاگو، سندر لال، درباری لال، تلوکا، منگل، جیتے جاگتے مرد ہیں۔ بیدی ان میں سے کسی کردار کو مشتہر مفروضوں اور اخلاقی مدبندیوں سے آلودہ نہیں کرتے۔ وہ ان کو ان کی تمام مجبوریوں، پاکیزگیوں اور آلودگیوں کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور اپنی بے پناہ فراخ دلی اور ہمدردی سے زندگی کے تمام رموز و اسرار سے ان کے خد و خال کو روشن کر دیتے ہیں۔

مرد اور عورت کے رشتے کا ذکر کرتے ہوئے بیدی اکثر غیر ازدواجی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ بکی اور دیہاتی نوجوان مادھو اور رامو، موہن جام اور اچلا، درباری لال اور سیتا، سواتی، نسیم دا، کمل مایو، کلیانی، جھبی پت۔ یہ سب لوگ علتوں اور ناآسودہ اشتہاؤں کے کرب میں گرفتار ہیں۔ یہ سب لوگ دیواروں سے سر ٹکراتے ہیں اور لہولہان ہو کر گھر لوٹ جاتے ہیں۔ بیدی کے کچھ کردار عادت کا شکار ہیں۔ ان میں کچھ لوگوں کو تسکین صرف نشیب ہی میں مل سکتی ہے۔ کچھ کو حالی کے کرداروں کی طرح آزاد غیر رسمی فضائیں۔ پولھو رام کی علالت معمول سے وابستگی کی علامت ہے۔ عزیزہ صرف ماحول کی غلاظت میں زندہ رہ سکتی ہے۔ صاف آب و ہوا اس کے لئے مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ گھنڈی لال نامرد ہو چکا ہے لیکن مالن کے لئے صرف بیٹھا ہے۔ جھبی پت اور سونفیا کے ذریعہ تسکین بہم پہنچانا ممکن نہیں ہے۔

پریم چند، کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، بیدی۔ شاید بیدی
ان سب میں پریم چند کے زیادہ قریب ہیں۔ دونوں کے اکثر کردار قریبی
زندگی کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ دونوں کے ہاں ہمدردی اور انسان
دوستی کا بے پناہ جذبہ ہے۔ دونوں کے ہاں افسانے کی ساخت کا التزام ہے۔
ان قربتوں کے باوجود دونوں کے رویوں میں اختلاف کی سطح پر کچھ مخصوص
اور منفرد خصوصیات بھی ہیں۔ مثلاً پریم چند اپنے مردوں اور عورتوں کو تضادات
سے آزاد رکھتے ہیں۔ اگر کچھ مسائل ان کو درپیش ہوتے ہیں تو پریم چند فوراً
ان کا کوئی آسان حل تلاش کر لیتے ہیں۔ پریم چند کے افسانوں میں قاتل
اور مقتول، اکثر آنکھ جھپکنے کے وقفہ میں کمال فراخ دلی سے ایک دوسرے
کو معاف کر دیتے ہیں اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔ پریم چند
اکثر پورے سچ کو قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں، اس لئے وہ آدھا ادھورا
سچ تخلیق کرتے ہیں۔ جب وہ پورے سچ کو قبول کرنے کی سطح پر پہنچتے ہیں تو
'گئودان' جیسا عظیم ناول اور 'کفن' جیسا عظیم افسانہ تخلیق کرتے ہیں۔

بیدی تک پہنچتے پہنچتے اسی رویے میں کچھ بنیادی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ بیدی
نہ تو پریم چند کی طرح آسان تصفیے کے افسانہ نگار ہیں۔ اور نہ ہی منٹو کی طرح ہر جگہ ارض ما
خدا کی تلاش کرتے ہیں۔ بیدی کے کچھ کردار مرد اور عورتیں۔ خاص طور پر عورتیں
زمین دوز جذبوں کی عورتیں ہیں۔ کیرتی، سوبھیا، کلیانی، رانو۔ سب زمین دوز
جذبوں سے بھرپور ہیں۔ ان کے اکثر کردار اندھیروں میں گرفتار ہیں۔ لیکن
خود اذیتی کے کرب سے گزرتے ہوئے بعض اوقات کلیانی اور مہی پت، درباری
لال اور سیتا، سندر لال اور لاجونتی، اور مدن اور اندو کی طرح ذہنی اور روحانی
تغیر کا تجربہ کرتے ہیں۔ ان میں کچھ خوش قسمت بطور کردار، بھاگو اور سنت رام
راملیا اور رانو کا مرتبہ اختیار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بیدی کے نسوانی
کرداروں کے ارد گرد گھومنے والے مرد شاید زیادہ تر مخاصمانہ قوت کے مظہر ہیں۔
(قلعہ کا، مہی پت، درباری لال علم۔) اس لئے بیدی کی بنیادی ہمدردی
مرد کرداروں سے زیادہ نسوانی کرداروں کے ساتھ ہے۔ زمین کے ساتھ ہے
حق تو یہ ہے کہ بیدی کے نسوانی کردار۔ اندو، لاجونتی، رانو، سیتا۔ ماں کی
کے مختلف روپ ہیں۔ اس لئے بیدی کے ہاں جب سب راستے مسدود ہو جاتے

دائرہ شامل ہو گیا ہے۔ بھولا، رحمان، بیل، بھاگو، سنت رام، اندو، رانو،
لاجونتی ان گنت جہتیں اختیار کرتے ہیں اور بار بار ذہن کے دروازے پر
دستک دیتے رہتے ہیں۔ رانو، تلوکا، منگل تشدد کے تسلسل سے متصادم ہیں
اور اسی تسلسل میں ربط و ترسیل کے نقطے تلاش کرتے ہیں۔

فکشن کے کرداروں کی رسمی تقسیم کرتے ہوئے ان کو عام طور پر
FLAT کرداروں یعنی ثابت کرداروں اور ROUND کرداروں میں بانٹا گیا ہے لیکن
فکشن کے اکثر کردار بہرحال FLAT کرداروں یعنی ثابت کرداروں کے ذیل میں
آتے ہیں۔ موپساں کے اکثر کردار ثابت ہیں، ان دونوں کے برعکس دستوئیفسکی کے
مثیلی (MYTHY) اور متشکل (ROUND) کردار ہیں۔ ثابت کردار عام طور پر
قومی سماجی صورت حال کی یا قومی سماجی رویوں کی نمائندگی کرتے ہیں و ROUND
کرداروں کا دائرۂ عمل ناگزیر طور پر وسیع تر ہوتا ہے کسی منفرد جذباتی، روحانی،
فکری جہت کی وجہ سے جو انسانی صورت حال کی کلیت پر حاوی ہو جاتی ہے
اور ہمہ گیر تلازمات کو جنم دیتی ہے۔ بعض فن کاروں کے ہاں اکثر کردار بظاہر
ثابت دکھائی دیتے ہیں لیکن وہ افسانوی فضا جس میں وہ سانس لیتے ہیں
ان کو بال و پر سے سرفراز کر دیتی ہے۔ کرشن چندر کے ثابت کرداروں کی افسانوی
فضا کی سحر طرازی حاوی ہے۔ منٹو کے کردار ثابت ہوتے ہوئے بھی مخصوص اور
منفرد خد و خال اور شخصی اکائیوں کی وجہ سے وسیع تر دائرۂ معنویت اختیار
کر لیتے ہیں۔ بعض فن کاروں کے ہاں فضا کے طلسمات کا سحر تو قائم ہو جاتا
ہے لیکن کردار یا تو سرے سے غائب ہو جاتے ہیں یا بے نام ہو جاتے ہیں۔ بعض
دوسرے فن کار بنیادی نوعیتوں کی تلاش میں اشارے، علامت اور امیج
کو بروئے کار لاتے ہوئے شعری حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر افسانہ نگار کے پیش نظر مقصد کیا ہے۔
فکشن کے سلسلے میں، حقیقت نگاری اور سماجی حقیقت نگاری کی تحریکیں
فکشن کو سماجی دستاویز قرار دینے پر اصرار کرتی ہیں۔ فکشن کے سلسلے میں جاری
تصور غالباً یہی ہے۔ دورِ جدید میں استعارے اور علامت کی سرگرم پیش قدمی
نے اس تصور میں بہت سی دراڑیں پیدا کر دی ہیں۔ نتیجتاً دستاویزی تفصیلات
رفتہ رفتہ استعارے اور علامت کی شعری استعداد کو قبول کرنے لگی ہیں۔

ہیں تو جل یا کلیانی کے ننھے منے بیٹے کی صورت میں یکہ یکہ ہی تاریک صورت حال کو منور کرنے کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ یا پھر کھی کے لڑکے کے لڑکے پن کو جو سینے والی کندن جیسی ماں پیدا ہو جاتی ہے۔ یا پھر راتو تام کی عورت جو بھابی اور ماں ہوتے ہوئے بھی اپنے دیور منگل سے ارتباط کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ایک بار پھر زمیں بن جاتی ہے۔ دائروں کے تسلسل سے گذرتی ہوئی ایک بار پھر ماں۔ ایک بار پھر زمیں۔

بیدی کی پہچان زمین کی پہچان ہے۔ بیدی کی عظیم تخلیقات گرہن' 'رحمان کے جوتے' 'ہتھیاں اور پھول' 'بھولا'، 'چیچک کے داغ'، 'اپنے دکھ مجھے دے دو'، 'لاجونتی'، 'بتل' 'تار دے' 'گرم کوٹ' 'کوکھ جلی' 'کوارنٹین' 'ایک چادر میلی سی'، اور متعدد عظیم کہانیوں کی پہچان ہے اس مست 'رماقت' یگا گمت کی پہچان ہے جو صرف ماں کے قدموں میں نصیب ہوتی ہے ہمارے دائرۂ ادراک کو وسیع تر کر دیتی ہے۔ ہمیں محدود جسمانی' علاقائی اور جغرافیائی وابستگیوں سے ماورا لے جاتی ہے۔ اور ہمیں انسانی صورت حال کی بنیادی نوعیتوں سے روشناس کراتی ہے۔

▲▲

نیاز فتح پوری

انتظار حسین

اگر میں ایک مثال سے بات شروع کروں تو مجھے معاف کر دیجئے کہ منطق کے ساتھ چلنا مجھے نہیں آتا۔ مثالوں اور حکایتوں سے اپنا کام نکالتا ہوں۔ لیجئے کیا مثال یاد آئی ہے۔

گیلی لیو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ پادریوں کے جتنے اس کی عدالت میں پیشی کا دن آئی، علاوہ لوگ اس تصور کو کیسے ہضم کر سکتے ہیں کہ زمین جس پر حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تھے سورج کا طواف کرتی ہے، سورج کو اس کا طواف کرنا چاہئے تو گیلی لیو سے کہا گیا کہ یا تو اس خیال سے باز آؤ کہ زمین گردش کرتی ہے یا پھر مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ادھر گیلی لیو کے شاگرد یہ توقع باندھے بیٹھے تھے کہ مرشد کلمۂ حق کہے گا اور دار پہ چڑھ جائے گا۔ مگر گیلی لیو عدالت سے بخیر و عافیت واپس آیا۔ شاگردوں کے پوچھنے پر کہا کہ زمین تو اس وقت بھی گردش کر رہی ہے اور میں کیوں نہ کہوں گردش کرتی رہے گی مگر میں نے یہ کہہ کر اپنی جان بچالی کہ زمین ساکن ہے۔ اس پر وہ آدرش پسند شاگرد بہت بے مزہ ہوئے اور بولے۔ بدنصیب ہے وہ قوم جس میں شہید پیدا نہیں ہوتے۔ گیلی لیو نے جواب میں کہا کہ بدنصیب وہ قوم ہے جسے شہیدوں کی ضرورت رہتی ہے۔

پتہ نہیں دونوں میں سے سچی کون ہے، شاید دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سچے ہوں۔ اور اگر یوں ہے تو ہم مسلمان لوگ خالی بدنصیب نہیں۔ ساتھ میں خوش نصیب بھی ہیں۔ ہم بدنصیب ہیں کہ ہمیں ہر زمانے میں شہیدوں کی ضرورت رہی ہے۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ ہر زمانے میں ہمارے درمیان شہید ظہور کرتے رہے ہیں۔ تو یوں ہے کہ مسلمان اپنی تاریخ میں فکر و احساس کی ذہن و قلم کی آزادی کی روایت قائم کر سکے ہوں یا نہ کر سکے ہوں انھوں نے بہرحال اس قیمتی انعامی قدر کے لئے شہادت پیش کرنے کی ایک روایت ضرور قائم کی ہے۔ کبھی شہنشاہیت، کبھی سامراجیت، کبھی آمریت، کبھی ملائیت کوئی نہ کوئی اکھیڑا ہماری جان کے ساتھ لگا ہی رہا۔ ہر اکھیڑا ہم سے شہید مانگتا رہا، ہم بقدر ہمت پیش کرتے رہے۔ سب سے بڑی مثال ہمارے تصور میں امام حسین کی ہے کہ انھوں نے کربلا میں کلمۂ حق کہا اور شہید بھی ہو گئے۔ اسی مثال سے یہ پتہ بھی چل جاتا ہے کہ مسلمان اپنی تاریخ کے اولین مرحلہ ہی میں اس الجھیڑے میں پھنس گئے تھے جہاں ضمیر بحران سے دوچار ہوتا ہے اور آزادی فکر و احساس ایک سنگین مسئلہ کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ پھر شہادتیں پیش کرتے ہی عمر گذری۔ کربلا ہمارا مستقل استعارہ بن گئی۔ ہم کتنے بدنصیب ہیں، کتنے خوش نصیب ہیں۔

اور اب میں اپنے ہم عصروں سے ایک مثال لاتا ہوں۔ وہ ایوب خان کا زمانہ تھا اور ہمارا دوست احمد مشتاق اٹھتے بیٹھتے ناصر کاظمی کو طعنے دیتا تھا کہ تم اس عہد کے نمائندے شاعر ہو۔ یہ سچ بولنے کا وقت ہے اور تم ہو کہ چپ ہو۔ ناصر نے ایک دن سنا، دو دن سنا۔ آخر کو بولا کہ مشتاق سچ روز روز نہیں بولا جاتا۔ میں ایک دفعہ کربلا میں سچ بول کر سر کٹا چکا ہوں۔ اب تمھاری باری ہے۔ وہی گیلی لیو اور اس کے شاگردوں کا قصہ۔ اور مصیبت ہماری یہی ہے کہ روز ہی کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی رہتی ہے اور روز وہی تقاضا کہ کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق۔

بے شک وہ بہت بڑا جبر تھا جس کے خلاف امام حسین نے شہادت پیش

کی نفی مگر جبر کی ایک صورت وہ بھی تو تھی جس کے ردعمل میں حافظ اور خیام کی رندانہ
شاعری پیدا ہوئی تھی اور ہماری ہند اسلامی روایت میں اس ردعمل میں میر وغیرہ شعر
پیدا ہوئے۔ پھر میر، غالب اور نظیر اکبرآبادی ایسے شاعر۔ آخر کوئی بات تو ہوئی ہوگی
کہ میر نے یہ کہا کہ ؎

میر کے دین و مذہب کا کیا پوچھو ہو کر ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

حسن جبر کا یہ لوگ ردعمل ہیں اسے ملائیت کہہ لیجئے۔ اگر زیادہ احتیاط برتنا چاہیں
تو کٹ ملائیت کہیئے۔ ہاں انگریزی میں ایک اصطلاح ہے PURITANISM
اردو میں تو اس کی متبادل اصطلاح ہے وہ بدقسمتی سے ایک فرقے کے ساتھ گڈمڈ ہو گئی
ہے حالانکہ یہ مسئلہ کسی فرقے کا نہیں ایک رویے کا ہے۔ اس رویئے والی مخلوق کسی
بھی فرقے میں پائی جا سکتی ہے حتیٰ کہ بریلویوں اور شیعوں میں بھی۔ خیر تو چلیئے اس کا
ترجمہ بھی کئے لیتے ہیں۔ اسے طہارت پسندی کہہ لیجئے۔ جو ہماری آزادی فکر و احساس
کی راہ میں مستقل روڑے اٹکاتی چلی آئی ہے اور ہماری دیومالائی طرز احساس میں
کہ اس رس کی دین ہے کھنڈت ڈالتی رہتی ہے اور ایک بات ان نقادوں اور
دانشوروں سے معذرت کے ساتھ کہوں گا پرانی غزل پر فراریت اور زوال پسندی
کے فتوے لگائے تھے۔ ہماری پرانی غزل مزاحمتی شاعری کی ایک نمائندہ مثال ہے۔
یہ رند کس قسم کا کردار ہے اور واعظ، شیخ اور محتسب سے کیوں الجھ رہا ہے۔ حالی
ترائی تو نظر نہیں آتا۔ یہ کردار تو وسیع المشربی اور آزاد خیالی کا پیکر نظر آتا ہے
شاید آزاد تخلیقی روح جو ہماری تہذیب کو تعصب اور تنگ نظری کی دستبرد سے بچانے
کی کوشش کرتی رہی ہے۔ ملائیت آپ اور طہارت پسند حضرات اس تہذیب
کو گھونٹ کر ایک حوض کم آب بنانے کے درپے رہے ہیں۔ اور اس کا تقاضا یہ
رہا ہے کہ کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے۔ مسلمانوں کی تخلیقی روح اپنے
اظہار کے لئے اتنی کھلی فضا مانگتی ہے جتنی مثلاً الف لیلہ میں نظر آتی ہے

سمجھا یہ جاتا ہے کہ ہماری تہذیب میں بس تصوف کی روایت قلب و نظر پر
پابندیاں لگانے کے خلاف لڑتی رہی ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ ہمارے شعر و ادب اور
فنون لطیفہ کی روایت بھی اس رویے کے خلاف برسرپیکار رہی ہے تو اگر ہمارے
یہاں تصوف کی روایت اور شعر و ادب اور فنون لطیفہ کی روایت میں ایک
رشتہ نظر آتا ہے تو اس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ دونوں کو ایک مشترکہ دشمن سے سابقہ
پڑا ہوا ہے۔ اور غزل تو ہے پوری تحریک۔ مزاحمت۔ بیشک غزل گل و بلبل کی
شاعری ہے مگر یہ گل و بلبل کا آسان تذکرہ ہے اور زلف و رخسار کی حکایت کو اتنا
طول کیوں دیا جا رہا ہے۔ طہارت پسندوں کی نفی حسن کے پس منظر میں شاید اس کی
معنویت زیادہ سمجھ میں آئے۔ یوں لگتا ہے کہ جمالیات دشمنی کی تحریک کے خلاف قلب
و نظر کی آزادی کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

اب یہ تو میں نے کہنے کو تو کہہ دی۔ مگر منت میں بیک وقت دو گروہوں کی دشمنی مول
لے لی۔ بات یہ ہے کہ جہاں ترقی پسند نقادوں نے بات چھوڑی تھی وہیں سے بات کا
سرا آج کل کے ملائیت پرستوں نے پکڑا ہے۔ گل و بلبل کی شاعری کے بارے میں وہ ویسی ہی باتیں
کرتے ہیں جیسے اگلے زمانے کے ترقی پسند کیا کرتے تھے۔ ویسے تو یہ دونوں گروہ ایک
دوسرے کی ضد نظر آتے ہیں مگر کیا پتہ ہے طرز احساس کی سطح پر کوئی رشتہ موجود
ہو۔ اصل میں جہاں بھی نظریہ آئے گا شاعری کے متعلق ایسی ہی باتیں کی جائیں گی۔
یہاں مزاجی حالہ رہا ہے کہ روسو کے ایک فقرے کو تھوڑی ترمیم کے ساتھ دہرا دیں
آدمی آزاد پیدا ہوا تھا مگر جواب ہر جگہ نظریوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ایک
وقت تھا کہ لوگ اپنے سیدھے سچے جذبات اور احساسات کے ساتھ اپنے تجربوں
اور مشاغل کے ساتھ جیتے تھے، ناچتے تھے، گاتے تھے، شعر کہتے تھے، الاؤ کے گرد بیٹھ کر کہانی
سنتے سناتے تھے اور مگن رہتے تھے جیسے بلبل چہکتی رہتی ہے کوئل کوکتی رہتی ہے اور مگن
رہتی ہے۔ خیر بلبل سے تو آج بھی کوئی نہیں پوچھتا کہ بی بی اس تیری چہکار کا مقصد
کیا ہے۔ کوئل سے کوئی سوال کرتا ہے کہ اس کوک کی افادیت کیا ہے مگر شاعر نظریہ
ماروں کے نرغے میں گھر گیا ہے۔ اس سے یہ سوال کیا جاتا ہے اور یہ سوال فکر و احساس
پر پابندی کا نقطہ آغاز ہوتا ہے اور اس اعتبار سے نیاز فتح پوری کی روایت سے
لگاؤ نہ ہونے کے باوجود مجھے اس کے اک معنی نظر آتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد اور منشی پریم چند
اپنے جوش تبلیغ میں جس طرح اردو فکشن کو تخلیقی تجربے کی سطح سے گرا کر وعظ و پند کی
سطح پر لانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے اس کے پس منظر میں شہاب کی
سرگذشت کسی قدر بامعنی نظر آتی ہے۔ ایسے میں جب داستانوں والا جو کم باز عاشق
ہمارے فکشن سے سدھار چکا تھا اور نیا ابھرتا ہوا عاشق اصلاح پسندوں کے
نرغے میں تھا تو نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر یلدرم وغیرہ کی طرف سے اسے تھوڑا

سہارا تو ضرور ملا۔ اس طرح کم از کم اصلاح پسندوں کی عملی زندگی اور اخلاق پرستی کے مقابلہ میں عشق کی قدر قائم تو رہی۔ اور چلتے چلتے یہ بھی کہتا چلوں کہ شہاب کی سرگذشت کا کمزور پہلو اس کی رومانیت نہیں بلکہ رومانی انٹلکچوئلزم ہے۔ اسے دیکھئے اختر شیرانی نے اپنی رومانیت کے ساتھ کسی انٹلکچوئلزم کا پھندا نہیں ڈالا تھا اس لئے ان کا رومانی رنگ زیادہ جاندار نظر آتا ہے۔

ویسے ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ شہاب کی سرگذشت والی رومانیت ۱۹۳۶ء والی حقیقت نگاری سے بالکل ہی پٹ گئی۔ کرشن چندر کے ہوتے ہوئے ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے۔ خیر بحث دوسری ہے میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ نظریوں نے ادب کے ساتھ کیا کیا ہے۔ کس طرح ان کے بہانے ادیب کی آزادی رفتہ رفتہ سلب کی گئی ہے نظریے اکل کھرے ہوتے ہیں۔ دو صوفیوں کی واردات کتنی ہی مختلف ہوں وہ ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہتے۔ شاعری کی مختلف طرزیں بھی ایک دوسرے کے ساتھ گذارہ کر سکتی ہیں۔ رزم کی شاعری اور بزم کی شاعری ایک ہی وقت میں پروان چڑھ سکتی ہیں مگر کوئی نظریہ دوسرے نظریے کو ایک ساتھ نہیں دیکھ سکتا۔ ہر نظریہ باقی نظریوں کو منسوخ کر کے فتح کا پرچم بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک ہی وقت میں سو رنگ کے پھول آرٹ اور ادب کے چمن میں کھل سکتے ہیں۔ نظریوں کی بنجر زمین میں نہیں کھل سکتے۔

جب کوئی نظریہ سر اٹھاتا ہے تو گویا فکر و احساس کی آزادی کے لئے ایک نیا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ اور جب کوئی گروہ فکر و احساس پر پابندی لگانے کا حق کرتا ہے تو وہ کسی نہ کسی نظریے کی آڑ لیتا ہے کیونکہ فکر و احساس کی آزادی کو کچلنے کے لئے نظریے سے زیادہ موثر ہتھیار ابھی تک آدمی نے دریافت نہیں کیا ہے۔

بس جب کوئی دانستہ کسی نظریے کے ساتھ ادب پر گرجتا برستا ہے اور مرض کی تشخیص کر کے لکھنے والوں کے لئے نسخہ مرض تجویز کرتا ہے تو مجھے شک ہونے لگتا ہے کہ کہیں لائین کا یہ کوئی نیا براند تو نہیں یا یہ کہ پرانی غزل کا محتسب اور واعظ نئی منطق سے مسلح ہو کر تو وارد نہیں ہوئے ہیں اور فکر و احساس پر پابندی بہر حال پابندی ہی ٹھہرے گی۔ خواہ پرانی منطق سے لگائی جائے یا نئی منطق سے لگائی جائے۔ اور یہ کہ جابروں کی طرف سے لگائی جائے یا جبر کے خلاف لڑنے والوں کی طرف سے لگائی جائے۔ دیکھئے کبھی کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے کہ آزادی ذہن و قلم کے لئے لڑنے والے خود آزادی ذہن و قلم کے لئے خطرہ بن جاتے ہیں اور یہ خطرہ زیادہ سنگین ہوتا ہے۔ جابر کا معاملہ تو کھلا ہوا ہوتا ہے لیکن جبر کے خلاف جہاد کے داعیوں سے تو ایک گہرا وابستہ ہوتا ہے سو جب وہ سوچنے اور لکھنے والوں پر کسی خاص نہج پر لکھنے اور سوچنے کی پابندیاں لگاتے ہیں تو شروع میں خطرے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں جب ان کے ہاتھ میں طاقت آ چکتی ہے اور اپنی تاریخ کا یہ ماجرا بھی عجیب ہے یا شاید پوری انسانی تاریخ ہی کا ہو کہ جد و جہد کے وقت میں کربلا کی مثال کا اعلان کیا جاتا ہے مگر کامیابی کے بعد کربلا کا نام لینے والے کربلا سے گذر جاتے ہیں۔ پھر وہ دوسروں کے لئے کربلا پیدا کرتے ہیں۔ یوں مظلوموں کی ہر فتح کے ساتھ نئے ظالم اور نئے مظلوم پیدا ہوتے ہیں۔ اور سوچنے اور لکھنے والوں کو جہاں سے آگے ہو کے رفاقت آتی تھی وہیں سے انہیں عداوت کی بو آنے لگتی ہے۔ سیکولر نظریوں والوں پر موقوف نہیں، مذہب کے نام پر انقلاب لانے والوں نے بھی یہی کیا ہے۔ پہلے انہوں نے مذہب سے واردات اور مابعد الطبیعیات والے خواص کو خارج کر کے انیسویں صدی کی متروک عقلیت کی کھرل میں پیس کر اسے نظریہ بنایا اور اپنی دانست میں مذہب کو موڈرنائز کر دیا۔ پھر اگر اس کے نام پر کوئی چھوٹا سا انقلاب لانے میں کامیاب ہو گئے تو فکر و احساس پر اور تخلیقی تجربے پر اسی قسم کا احتساب کیا، اسی قسم کی پابندیاں لگائیں جو نظریاتی انقلابوں کی عطا ہیں۔ پھر ایک نئی کربلا اور نئے کربلائی۔

مطلب یہ ہوا کہ جو شخص سوچتا ہے، محسوس کرتا ہے، لکھتا ہے وہ بیچارہ تو اکیلا ہے جن سے خستگی میں داد پانے کی توقع ہوتی ہے ان کی طرف سے بھی یہ نہیں پتا کہ کب بیداد کا تیر چل جائے اور چونکہ یہ تیر نظریے میں بجھا ہوا ہوتا ہے اس لئے زیادہ قاتل ہوتا ہے۔ سو زمانہ پر آشوب ہے اور سوچنے اور لکھنے والا نرغے میں ہے یعنی وہ جو واقعی سوچتا ہے اور واقعی لکھتا ہے۔

▲▲

وجود، تصور خوف اور قرۃ العین حیدر

غیاث اقبال

وجود اور عدم کی ماہیت اور اس کی تفہیم کی ضمن میں انسانی ادراک و احساس کبھی خوابیدہ نہیں رہے اور یہی بیدار ذہن اپنی مسلسل تلاش اور جستجو میں انہماک کے باوصف اس موضوع یا مسئلے کے افہام کل کے دعوے دار کہلا سکے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ مسئلہ نظریہ کی صورت میں ابھرا تھا جس کی وجہ سے دو گروہ وجود میں آ گئے کہ ایک اس کی ماہیت کی تفہیم سے انکار کر دے تو دوسرا گروہ اس کے اقرار علم بردار کہلائے بلکہ اس کی نوعیت غیر متنازعہ ہے اور لامحدود وسعت لامحدود و دیگر اس کی خلا میں کھوئی ہوئی ہیں جس کو آدمی شعور سے ماورا حقیقت کہتا ہے اور انسان کی متاع شعور کے علاوہ تو کچھ نہیں۔ چنانچہ لیوی بروہل[1] نے اس بنیاد پر انسانی شعور کو وقت کا خالق کہا ہے۔ نفسیات میں بھی شعور ہی کو وجود کے احساس کی روح رواں گردانا گیا ہے۔ ایروکلس نے وقت کو تخلیق کا لازمہ کہا ہے۔ یہ انسانی شعور کو وقت اور وجود یعنی تخلیق کا محرک کہا گیا ہے۔

برگساں[2] "وجود" کی ماہیت پر رقم طراز ہے:

> میں ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلتا ہوں۔ میں گرمی محسوس کرتا ہوں یا سردی محسوس کرتا ہوں۔ میں خوش ہوتا ہوں یا ملول ہوتا ہوں۔ میں کام کرتا ہوں یا کچھ نہیں کرتا۔ میں اطراف کی کسی چیز کو دیکھتا ہوں یا کسی اور چیز کا خیال کرتا ہوں۔ میرا وجود احساسات، تاثرات، ارادوں اور خیالات کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ جو باری باری مجھے مصروف رکھتا ہے۔ اور میں لگاتار بدلتا رہتا ہوں۔ لہٰذا میری داخلی زندگی میں کوئی چیز ساکن نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ ایک مستقل حرکت ہے۔ مختلف کیفیتوں کی ایک ایسی دائمی روانی جو سکون و ثبات سے ناآشنا ہے۔"

[1] LEVY BRUHL PRIMITIVE MENTALITY P121, P123 (1923)

[2] HENRI BERGSON THEORY OF CREATIVITY & DURATION P36

نیوٹن نے بھی زمان کے متعلق ایک دائمی روانی کی بات کی ہے جو انسانی شعور کی متحرک کیفیت پر دال ہے:

> " زمان کوئی چیز ہے جو اپنے ہی اندر بہتی ہے اور اپنی فطرت کی بدولت مساوی رہتی ہے۔"[1]

ڈاکٹر تاراچند رستوگی لکھتے ہیں:

> " اوستا (AVESTA) میں کبھی زروان کو زمان و مکان کی علامت کہا گیا ہے۔ جس کا مفہوم زمان لامحدود یعنی ابد ہے۔ اور ڈریگو خواداتہ (DEREGHO – KHUADATA) انسانی شعور سے وابستہ وقت کا تصور ہے جو ابد سے لیا ہوا ایک حصہ ہے۔"[2]

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے ابد کا تجزیہ یوں کیا ہے:

> " ابدیت کو جب تحلیل کیا جاتا ہے تو یہ وضعی زمان وجود میں آتا ہے۔ جیسے ہم اپنی سہولت کی خاطر ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کر دیتے ہیں۔"[3]

علامہ اقبال زمان کو ایک حقیقت اور انسانی زندگی کو زمان میں ایک مسلسل

[1] " SOMETH'NG WHICH IN ITSELF AND FROM ITS OWN NATURE FLOWS EQUALLY "

[2] ماہنامہ "آہنگ" گیا ـــ اقبال کا تصور زمان ـــ ڈاکٹر تاراچند رستوگی۔

[3] "کاروان فکر" ص ۱۱۲

حرکت کہتے ہیں۔ آڈلر شعور سے ماورا حقیقت کو ابد کہتا ہے[۱] غالب وقت کی ماہیت کے بارے میں کہتے ہیں۔ ع

کو ہر چہ رفت بہ ہر عہد در زمانہ ہست

ریل میں سفر کرنے والا مشاہدہ کر سکتا ہے کہ سارے اجسام ارضی فرار ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں مشاہدہ کرنے والا وہاں سے ہٹ جاتا ہے۔ آئین اسٹین وقت کو مکان کا چوتھا بعد (FOURTH DIMENSION) قرار دیتا ہے جس کی رو سے ہر مشاہدہ کئے جانے والی چیز (منظور OBJECT) تغیر پذیر ہے اور جوں جوں مشاہدہ کرنے والے (ناظر SUBJECT) مقام اور رفتار بدلتے جاتے ہیں، اسی طرح اس شئے کی کمیت، ہیئت اور جسامت بھی تبدیل ہو جاتی ہے یعنی حرکت اور سکون دونوں، مشاہدہ کرنے والے کے لئے اضافی حیثیت رکھتے ہیں۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے وزیر آغا نے لکھا ہے :

"دریا ہمارے اندر ہے اور سمندر ہمارے چاروں طرف ہے۔ دریا انسان کا وقت ہے اور سمندر دھرتی کا وقت۔" چنانچہ اس تناظر میں "کائناتی وقت کی ابدیت اور انسانی وقت کی ناپائیداری اور فنا کا احساس بہرکیف انسانی شعور کے ساتھ وابستہ رہتا ہے :[۲]

"زمانہ" (دہر) میں ہوں۔[۳] کہہ کر ابد (یا خدا) نے جو کہا ہے اس کا مطلب ہے کہ انسانی شعور بذات خود ایک لمحہ ہی جو ابدیت سے مستعار ہے۔ اور یہ لمحہ دریا کی طرح مد و جزر کی کیفیات لئے تند و تیز اور کبھی پرسکون رہ کر سمندر کے وسیع تناظر میں ضم ہو جاتا ہے۔ جو جسم اس لمحہ مستعار کا مسکن ہے، اس کی ناپائداری ہی بذات خود وقت کی ابدیت کا مظہر ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ زندگی کا کوئی مظہر قطعی طور پر ہمیشہ کے لئے مکمل نہیں۔"

قرآن مجید میں ابد کی وضاحت کے لئے کہا گیا ہے :۔ "اور اس پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور جسے موت نہیں۔ اور اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہو جس نے آسمانوں اور زمینوں کو اور دونوں کے درمیان سب چیزوں کو چھ دن میں پیدا کیا۔"

مذکورہ بالا مباحث اور نظریئے انسان کے شعور کو وقت (زمان) وجود اور حرکت سے وابستہ کرتے ہیں۔ اور ابد کے مقابلے میں انسانی شعور کی مراجعت اور اس کی تحدید پر متفق ہیں۔ مزید برآں یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ انسان اپنے شعور کے بل پر ماہیت زماں کی تفہیم کی سعی کر سکتا ہے۔ مگر مکمل طور پر وقت پر محیط نہیں ہو سکتا۔

لیوی برول نے "انسانی شعور کو وقت کا خالق" کہا ہے۔ دراصل اس نکتہ کی نشاندہی کرتا ہے کہ شعور سے وقت اور وقت سے تاریخ جنم لیتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے لکھا ہے۔ "تاریخ خود وقت ہے اور وقت خود تاریخ ہے۔" تاریخی تناظر میں ہر وہ چیز شامل ہو جاتی ہے جس کی انسانی شعور کے نتیجہ میں تخلیق ہوئی ہو۔ اور فلسفہ تصوف بھی تاریخ ہی کا ایک باب ہے۔ وجود و عدم، ازل اور ابد، ہو کہ "زمان" و "مکان"، وقت اور شعور ایک حقیقت کی تلاش کے وسیلے ہیں۔ اور "حقیقت" کی تلاش و جستجو انسانی اذہان کی مجبوری ہے۔

کروچے نے تاریخ کی ماہیت پر بڑی فکر انگیز بات کہی ہے :

"تاریخ وہ چاہے وہ کسی بھی عہد کی ہو، اس کا اصلی موضوع حال ہے۔ مورخ موجودہ عملی زندگی کی ضروریات کے مدنظر ماضی سے روشنی مستعار لیتا ہے اور اس طرح اپنے تخیل سے ماضی کو حال کا جزو بنا لیتا ہے۔ اور اس طرح وہ اس شعور کو زندہ رکھتا ہے جو موجودہ سوسائٹی کو اپنے ماضی کے ساتھ ہے۔ اصل میں ماضی کا شعور بھی حال ہی کا شعور ہے بلکہ خود اپنی ذات کا شعور ہوتا ہے۔"[۱]

مذکورہ بالا مفاہیم کی روشنی میں قرۃ العین حیدر کے بیشتر ادب پاروں کی ہیئت اور ان کا انداز بیان شعور کی رو تکنیک سے وابستہ ہے جو ان کی اپنی ذات کے شعور سے وابستہ رہنے کا پہلا ثبوت ہے اور ان کے ماضی کے شعور سے شغف رکھنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ حال کا شعور رکھتی ہیں۔ ایڈلر کے بقول "نفسیات کی رو سے بھی جو موجودہ عملی زندگی کی ضرورت ہی۔ ماضی کو حال کا جزو بنانے پر اصرار کرتی ہے۔ اور ماضی کی روشنی کے اکتساب پر زور دیتی ہے جو

---

۱ CONTRIBUTION TO ANALYTICAL PSYCHOLOGY (PIET ADLER)

۲ نظم جدید کی کروٹیں۔ ص۱۶۱

۳ لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ وَأَنَا الدَّهْرُ۔ زمانہ کو گالی مت دو (کیونکہ) زمانہ میں ہوں

۱ بحوالہ "کاروان فکر" یوسف حسین خان۔ ص۱۲۰

تاریخ کے تسلسل کے لئے از حد ضروری ہے۔ تاریخ انسان کے شعوری حالات کا ماخذ ہے۔ یاد ماضی کی روشنی کے تعلق سے گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے کہ

"یادداشت ہی کے ذریعے ہماری اجتماعی زندگی اپنے ماضی کو امید میں بدلتی ہے۔ اور زندہ رہنے کا عمل جاری رہتا ہے۔" (اردو افسانہ۔ روایت اور مسائل ص ۴۸۲)

قرۃ العین حیدر کو بعض ناقدین نے NOSTALGIC کہہ کر ان کے فنی رتبے کے احساسی ضیا کی تحدید کی ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ ادب NOSTALGIC عنصر کی شمولیت کے بغیر نامکمل ہی رہ جاتا ہے۔ یا مقصد کے تعین میں کم مائیگی اور تہی دامانی کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ نیز تخلیقی میلانوں کو ترتیب دینے اور تکمیل کی جانب گامزن ہونے میں قدغن محسوس کرتا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے بھی خود کے NOSTALGIC ہونے کا نہ صرف اعتراف کیا ہے بلکہ منطقی استدلال کے ذریعے اپنے اس رویے کو حق بجانب بھی کہا ہے۔

"آگ کا دریا" کی طلعت کی زبانی وہ کمال کو سمجھاتی ہیں

"میں نے محسوس یہ کیا ہے کہ میرا ماضی میرے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ دوسروں کے لئے دنیا کے لئے اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ نہ دنیا کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

"میرا ماضی میرا حال ہے۔" کمال نے طلعت کی بات دہرائی۔

"اور دنیا کو صرف حال سے دلچسپی ہے۔" ہری شنکر کی آواز گونجی۔

"لیکن ماضی حال ہے۔ حال میں ماضی شامل ہے اور مستقبل بھی۔ وقت کی اس شعبدہ بازی نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے۔" طلعت نے کہا۔

"میں وقت کے ہاتھوں عاجز آ چکی ہوں۔ تم میں سے میری کوئی مدد کیوں نہیں کرتا۔"

(ص ۶۶۲)

"تمھاری مدد؟ طلعت بیگم! شاید آئن اسٹائن بھی نہیں کر سکتا۔"

"میرے ماضی سے دوسروں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟" کمال نے پھر سے دہرایا!

"وقت برابر موجود ہے! وقت مسلسل حال ہے۔" طلعت نے کہا۔

"میرے پاس صرف ماضی ہی ایسی چیز ہے جو محفوظ ہے۔ جسے دوسرے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔ جو وقت کی دسترس سے باہر ہے۔ میں خود اب ماضی ہوں۔"

تمھاری طرح۔" (ص ۶۷۵)

قرۃ العین حیدر نے "آگ کا دریا" کی ابتدا ٹی۔ ایس ایلیٹ کی نظم سے کی ہے۔[1] جس میں ماہیت وقت کا سہارا لے کر عمل کی ترغیب دی گئی ہے۔ جو ان کے موقف کی وضاحت میں مدد و معاون ہے:

آگے بڑھو مسافرو۔۔۔ ماضی سے بھاگ کر
تم مختلف النوع زندگیوں یا کسی قسم کے مستقبل کی طرف
رواں نہیں ہو!
آگے بڑھو۔۔۔ تم جو سمجھتے ہو کہ سفر میں ہو
تم وہ نہیں ہو جنھوں نے بندرگاہ کو پیچھے ہٹتے دیکھا۔
یا جو دوسرے ساحل پر اترو گے
اس لمحے، کہ دونوں کناروں کے درمیان وقت معطل ہے۔"

ایلیٹ کے ایک چار حصوں والے نظمیے (چوسانیے) کا آغاز ملاحظہ فرمائیے:

"وقت گذشتہ اور وقت موجودہ دونوں ہی میں
شاید وقت آئندہ بھی شامل ہیں
اور وقت آئندہ، وقت گذشتہ میں
اگر سارا ہی وقت ازل ابد سے موجود ہے
تو سارا ہی وقت اسیر وقت ہے۔
جو کچھ ہو سکتا تھا، ممکن تھا، وہ محض ایک تجرید
ایک استمراری امکان
اندازہ اور تصور کی دنیا میں
جو کچھ ہو سکتا تھا، ممکن تھا اور جو ہو چکا، سب
ایک ہی انجام کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو سدا موجود ہے۔"[1]

انسان اپنے فانی وجود کے پیش نظر اپنی سی جد و جہد سے ہم کنار ہو کر زماں کی ابدی حقیقت کو فراموش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کامیاب نہیں ہوتے چوں کہ ہر لمحہ جو گذرتا ہے، انسان کو موت سے قریب تر لاتا ہے جس کا

---

[1] صفحہ ۱۰۲ "آگ کا دریا"

تصورِ غم آگیں ہے۔ وہ اکتا دینے والے اب سے گھبرا کر مستقبل میں اپنی آرزوؤں کا خواب دیکھنے کی تمنا کرتا ہے مگر مستقبل بھی اب کی طرح غیر یقینی ہے جس کوئی۔ ایس۔ ایلیٹ نے "یا جو دوسرے ساحل پر اترو گے ___ آگے بڑھو مسافرو" کہہ کر انسانی زندگی کی مجبوریوں اور انسانی شعور کی محدود وسعتوں کے غم ناک اور کرب ناک تصور کو بھلانے کی کوشش کی ہے۔ اور مزید استغراق تفہیم وقت، پیغام عمل کی گونج سے منسلک ہو جانے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں وہ زندگی کو حرکت سے اور ایک تسلسل معنوی سے موسوم کرتا ہے۔

قرۃ کے تمام فن پاروں میں وقت کے ابدی اور لازوال ہونے اور اس کے مقابلے میں انسانی وجود کی لمحاتی اور ناپائدار زندگی کا تصور مرکزی موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خوف ہی ان کے پاس ایک طرح سے تازیانۂ عمل کا درجہ بھی رکھتا ہے۔ "میرے بھی صنم خانے" کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔

"ہم سب اس مخصوص لمحے میں، اس مخصوص جگہ خود کو موجود پاتے ہیں۔ زندگی کے مختلف ٹکڑے اس وقت خاص طور سے کسی طرح جمع ہو گئے ہیں۔ پھر کچھ ہوگا۔ کوئی ایسی بات ہو جائے گی جس سے یہ ٹکڑے بکھر جائیں گے۔ پھر وقت کی پرواز کے ساتھ کوئی نیا موڑ آ جائے گا۔ کوئی نیا حل تلاش کر لیا جائے گا۔ ہم جہاں ہیں اس جگہ سے ہو گئے یہ سے آگے نکل جائے گا۔ زندہ رہنے کی خواہش زندگی کی متضاد قسم وقت کے ریگستانوں میں کھو جائے گی۔ یہ چھوٹے چھوٹے معصوم بے بس انسان آنے والے دن اور آنے والی راتیں، ان سب کے لئے کیا لائیں گی، ان کی آنکھیں ابھی کیا کیا دیکھیں گی۔ ان کے دل کیوں دھڑکیں گے کوئی نہیں جانتا۔ یہ سب کیوں ہے۔" صفحہ ۱۸۱-۱۸۲۔

وقت کے اس شدید احساس پر ہنس میئر ہوف (HANS MEYER HOFF) نے لکھا ہے:

"اس دور کے ہر دل نگارشے "فلسفہ وجودیت" کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔"[2]

وقت کے گزرنے کا یہ احساس چونکہ باشعور انسان ہی کو ہو سکتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا اپنا وجود اس عظیم کائنات، اس مسلسل نہ رکنے والے وقت میں کوئی رتبہ اور عظمت سے بری ہے۔ یہی وہ احساس ہے جو انسان کو ایک جانب اس کے خود موجود ہونے کا یقین دلاتا ہے تو دوسری طرف یہی شعور اور خیال اس میں اس کے ناپائدار اور لمحاتی ہونے کا خوف اور احساس بھی پیدا کر دیتا ہے۔ "آگ کا دریا" کا یہ اقتباس اسی مسئلہ پر مزید روشنی ڈالتا ہے:

"پل کی پل میں وہ سارا زمانہ داستان میں تبدیل ہو گیا۔ یہ سب کے سب اک آن میں ماضی کے دھندلے ناقابل یقین غیر حقیقی کرداروں کی حیثیت اختیار کر لیں گے جن کی کائنات کے وقت کے بہتے ہوئے سمندر میں کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔" صفحہ ۵۴

"یہاں تک کہ ایک روز تاریخ ناموں کا تسلسل زمان و مکان بھی نکل جائیں گے۔" صفحہ ۵۹

"وقت اپنے آپ سے منحرف نہیں ہوتا۔ وقت سے تم بچ نہیں سکتے اور اپنی اصلی حالت کو پا کر کوئی پھر اپنے آپ سے انحراف نہیں کرتی۔ وقت کے سامنے کوئی رستے نہیں، کوئی منطق نہیں، کوئی طاقت نہیں۔ وقت پر تمہارا کوئی قابو نہیں رہ سکتا۔ جو آنکھیں رکھتا ہے وہ وقت کے ارتقا کو پہچان لیتا ہے۔" صفحہ ۹۹

برہمن قانون ساز گوتم کا حوالہ دیتے ہوئے کمال کہتا ہے:

"گوتم کے فلسفۂ علم میں کہا گیا تھا کہ اس مرکب اشیاء کی دنیا کا مسبب الاسباب وہ ہے۔ ابتدائے آفرینش کے بعد پھر ابتدائے آفرینش تھی۔ اور کوئی ایسا مخصوص نکتہ نہ تھا جہاں سے وقت شروع ہوا ...... یہ حکماء کہتے تھے کہ وقت کا لمحہ مختلف انسانوں کے لئے مختلف ہے۔ انسانی وقت دیوتاؤں کے وقت کا سواں اور برہما کے وقت کا دس لاکھواں حصہ ہے۔ چیونٹی وہ محسوس کرتے کہ دنیا ہی وجود کی ساری کائنات سلسلہ نہیں کر سکتی۔ اس نے پڑھا

"ہم زمان و مکان حقیقت کی بہت ہیں۔ اور حقیقت وجود میں

[1] محولہ شعر غیر شعر اور نثر۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔

[2] TIME IN LITERATURE - PP. 28-29

آنے کی کیفیت کا دوسرا نام ہے۔ ابدی ارتقا اور اشکال ہیئتوں
کے پر پیچ نمو اور دنیاؤں کے تسلسل کا ایک ایسا چکر ہے جو
کبھی ختم نہ ہوگا۔" صفحہ ۱۰۶

کمال سوچتا ہے:

"خیال، خیال کو خود نہیں جان سکتا۔ خیال اپنے آپ سے باہر
نہیں جا سکتا۔ کائنات سے باہر کوئی نہیں۔ اور خدا سے باہر کوئی
کائنات نہیں۔ حق و باطل میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن ان سب سے بالاتر
ذات مطلق ہے جو سناٹا ہے۔ ... شونیہ۔ سناٹا شونیہ جو
ذات مطلق ہے جو صفر کا تصور ہے۔" صفحہ ۱۷۳

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے بھی لکھا ہے کہ:

"شعوری زندگی کا اقتضا وجود ہے اور وجود عمل سے عبارت ہے۔
تاہم انسان کا انفرادی وجود آنی اور فانی ہے۔ تہذیبوں کی زندگی
بھی محدود ہے۔ زمان کے دائمی اور کبھی نہ ختم ہونے والے سیلان میں
بیسیوں تہذیبیں جنم لیتی ہیں اور موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں۔ فطرت
کو انسانی مقاصد کا شعور نہیں رہتا جو دراصل خود انسان کی
ذہنی کیفیت کا عکس ہوتے ہیں۔"[1]

تصور خوف کی توجیہہ کرتے ہوئے کیر کے گارڈ کہتا ہے:

انسان جب اپنے لمحاتی وجود کے بارے میں غور کرتا ہے تو اسے کسی طور
سکون میسر نہیں آتا۔ وہ اس جد و جہد کی جانب یا اپنے ذہن اور فکر کی
قوتوں کو متوجہ کرتا ہے اور عمل سے اپنے لمحاتی وجود کو بھلا دینے میں
ڈال دیتا ہے۔ جب اس کے اندر کا عمل غائب ہو جاتا ہے تو اسے دوبارہ
موت کے غم آگیں کربناک تصور اور انسانی حد بندیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔[2]

قرۃ العین کے شعور کی رو بھی اسی طرح مد و جزر کی کیفیت سے دوچار ہوتی
ہے کہ ان کے کردار جب عمل سے قریب ہوتے ہیں تو ان میں ایک طرح کا تحرک پیدا ہوتا
ہے اور جب شعوری عمل سے دور ہوتے ہیں تو پھر اپنے وجود کے لمحاتی ہونے کے

---

[1] کاروان فکر صفحہ ۱۲

[2] S KEIRKEGAARDE "THE CONCEPT OF DREAD" P_116-17

خوف سے پابہ جولاں ہو کر اپنی ہی جڑوں میں واپس چلے جانے کی خواہش کرتے
ہیں۔ بایں ہمہ چند لمحوں بعد دوبارہ عملی جد و جہد سے منسلک ہو جاتے ہیں۔
تذبذب اور اس کے بعد کا اہتزاز اور پھر ایک طرح کی نامرادی کے احساس کا پرتو
ان کے باعمل شعوری کرداروں میں بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کہتی ہیں:

"پراکرتی اندھی ہے۔ اور بے حس ہے۔"

ونے جواب دیا:

"پرش اسے دیکھتا ہے تو شعور کا خارجی اور مادی دنیا میں اور
داخلی ذہنی دنیا میں اکٹھا ارتقا ہوتا ہے۔ اور ایک خیال کی تخلیق
ہوتی ہے کہ پراکرتی ابدی ہے۔"

"ہمہ وقت مصروف عمل جب تک پرش کی نظروں میں ارتقا کی منزلیں
طے کرتی ہے، بے حس مادہ ذہن کی جوت سے روشن ہو جاتا ہے۔ ذہن
میں بڑی طاقت ہے۔" (آگ کا دریا صفحہ ۱۹۶)

وجودی انسان عمل کی جانب جب متوجہ ہوتا ہے تو اسے بقول سارتر انتخاب
کے کرب سے واسطہ پڑتا ہے کہ عمل کی بنیاد آخر ہو کیا؟ مادیت کا حصول کہ روحانی
فراز؟ شخصی مفاد یا حریت؟ یا سماجی مفاد اور آزادی؟ ذات؟ کہ آفاق؟ چونکہ
سارتر الحاد پسند تھا اسے روحانی رفعت اور کسی طرز فکر سے زیادہ بر سر عمل رہ کر
شخصی آزادی کا حصول زیادہ اہم تھا۔ اس تفصیل سے قطع نظر، فانی زندگی کے
خوف اور اس سے وقوع میں آنے والے ذہنی حبس سے انقطاع کی صورت پیدا
کرنے کی ضمن میں وجودیت کا فلسفہ عمل اور سفر کی تلقین تو کرتا ہے۔ مگر عمل اور
سفر کی سمتوں کی نشان دہی میں وحدت تصور کا رویہ عنقا ہے۔ مثال کے طور
پر سارتر نے فرد کی 'آزادی' کے حصول کو مقدم گردانا ہے۔ جب کہ دوسرے
فلسفی معاشرہ کی آزادی پر زور دیتے ہیں۔

برگساں کی عملی سمت انسانی اعمال کے مقصد اور مقتضا کو منفعت
(UTILITY) کی تخلیق سے ہم کنار کرتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے حصول تک
پہنچنے والا عمل اگر وقوع میں نہیں آتا تو معاشرہ کوئی کیفیت کی تخلیق نہیں کر سکتا۔
اس دوران اس کا وجود صرف خانہ پری کرنے کا سا ہوتا ہے۔"[1]

---

[1] THEORY OF CREATIVITI P 224

تخیل چوں کہ اخلاقی قدروں کا بھی خالق ہے اور اخلاقی قدروں کا
عمل بھی بذات خود ایک طرح سے منفعت (UTILITY) کی تخلیق ہے، چناں چہ
سان ذی شعور ہونے کے باوصف اگر اپنے عمل کی جہت منفعت کی تخلیق تصور
سے تولا محالہ "وہ ابدی زماں کے تصور کے مقابلے میں ہیار ہے"۔ اور اس کی یہ
یاری کم از کم اس کے وجود (انفرادی) کی ضامن ہے۔ اس کے برعکس اگر فرد یا
عاشرہ مادی زندگی کو اپنا مقصود بنالے تو اس کا تخیل صرف مادی منفعت
کی تخلیق ہی کر سکے گا۔ اور جس کے حصول کی شعوری کاوشیں بجائے خود کی تکمیل کے
مادہ کی تکمیل میں کوشاں ہوں گی۔ جس طرح انسان کو اپنے وجود کا احساس خود
اپنی ہی ذات میں پیدا ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح اپنے اندر کی تہی مائیگی اور خلاء اندرون
کو پر کرنے کے لئے واقعی طور پر 'منفعت' کی تخلیق ناگزیر ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کو
ہیں ہو اگر کسی ایک کی تہی مائیگی اور خلاء اندروں کو کسی دوسرے کے عمل نے پر
کیا ہو۔ یوں بھی ایسی عملی شکل جس سے محض مادی ترقی ہو سکتی ہے جمود یا تعطل عملی
کی نشانی باور کی گئی ہے۔ نیز تعطل عمل اور جمود شعور سے مبرا ہو جانے کی کیفیت
کا نام ہے۔ اسی لئے ارسطو کا خیال تھا کہ پیدا نہ ہونا سب سے اچھا ہے۔ ایسی
نامرادی کا احساس اس تہذیب میں پیدا ہونا لازمی تھا جو صرف مادی زندگی
کو اپنا مقصود اور منتہا سمجھتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ خوف اور دہشت کے فشار سے
انسانی شخصیت چیک جاتی ہے۔ چناں چہ زندگی کی بے ثباتی کے کرب سے محفوظ
رہنے کے لئے قرۃ العین حیدر کے کردار (ABSURD) آسائشوں کے حصول
میں خود کو منہمک و مشغول کر دیتے ہیں۔ اور انسانی وجود کے مقتضا یعنی 'منفعت'
کی تخلیق کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جیسے شہلا رحمٰن اور ان کی قبیل (میرے
بھی صنم خانے) کے نسوانی کردار جن کی زندگی کا صرف ایک مقصد ہے کہ ان کی شادی
کسی آئی۔ اے۔ ایس افسر سے ہونے والی ہے؟ جس رویہ ذہنی کو ایلیٹ بے عملی
کی زندگی کہتا ہے۔ اور "زندگی کو کافی کے چمچوں سے ناپنے کی سرشت" کہتا ہے۔
یہ مانی ہوئی بات ہے کہ داخلی زندگی ایک ناقابل انکار حقیقت ہونے
کے باوجود ONTOLOGICAL BEING (انسان) کے لئے چاہے جس قدر
اہم ہو فطرت کے تناظر میں بے اعتنائی ہوا کرتی ہے۔ یہ نکتہ عینی کی نگاہ سے
اوجھل نہیں ہے۔ وقت مسلسل CONTEMPORARY یا PARALLEL TIME

کے آغاز اور انجام کی تلاش میں انہاک کسی ٹھوس ماحصل سے ہم کنار نہیں کرتا
اسی لئے قرۃ العین حیدر نے 'آگ کا دریا' میں مختلف موقعوں پر جو کچھ کہا ہے
وہ صرف سفر مسلسل کی وضاحت کے ضمن ہی کی ایک چیز ہے۔ اور کسی بھی منفعت
کی تخلیق والے ضابطے پر ان کا ایقان نہیں ہے۔ اسی لئے وہ کہتی ہیں :

" فلسفے، آزادی اور افکار ــــ لغویات ہے"۔ (آگ کا دریا ص ۵۳۲)

" واقعات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ حقیقت، روایت، وقت
کا فاصلہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لمحہ فانی ہے۔ انسان گم نام
ہے۔ اس کی تخلیقات، فن پارہ، تصنیفات کی کوئی ابدیت کے
اس سمندر میں کوئی علاحدہ حیثیت نہیں سمجھی جاتی"۔ (ص ۳۱ء)

" انسان جب مر جاتا ہے تو اس کو جلا دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ
اس کی تاریخی معنویت کچھ نہیں"۔ (ص ۳۱ء)

بایں ہمہ قرۃ العین حیدر دنیا کی بے ثباتی اور انسانی عمل کی بے معنویت سے
پژمردہ نہیں ہو جاتیں بلکہ کہتی ہیں :

' ہندوستان کا سارا فلسفہ سفر ہے۔ چلتے رہنا، تلاش کرنے کی
عادت'۔

" ہندوستانی فلسفے میں کوئی کسی کو حکم نہیں دیتا۔" یہ مت کرو۔
یا یوں تم کو کرنا پڑے گا یہاں انسان اپنے عمل کا خود مختار ہے"۔
(راو جا کرشنن) ص ۱۱ء

" اس نے دیکھا چاروں اور جلال ہے۔ اور اس میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا
موجود ہے۔ دنیا کا ازلی انسان اور ابدی انسان، تھکا ہوا، شکست
خوردہ، ابشاش، پر امید۔ انسان جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے"۔ (ص ۸۳ء)

حقیقت کی تلاش و جستجو کا جذبہ نہ صرف شعور کو متحرک رکھتا ہے بلکہ خوف
اور دہشت کے تصور کو تازیانہ باور کر کے ابدی لمحہ زیاں ہو جانے کی سعی بے جا
ہے اور ایک ایسی کایا کلپ (METAMOR PHOSIS) سے دوچار ہو جانے
کا آرزو مند ہے جو در حقیقت کایا کلپ نہیں بلکہ تحلیل ابدی ہے اور جو صفر کا
تصور ہے۔ جو شعور ذات انسانی کا نقطۂ منتہا ہے۔

افسانے میں بیانیہ اور کردار کی کشمکش

شمس الرحمٰن فاروقی

نئے افسانے کے بارے میں عام طور پر اس تشویش کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اس کو روایت سے اللہ واسطے کا بیر ہے، اس میں روایت شکنی کا رجحان ہے۔ اس میں بیانیہ کی روایتی خوبیاں نہیں ہیں یا بہت کم ہیں۔ افسانے سے بیانیہ کے اخراج کا ذمہ دار جدیدیت کو ٹھہرایا گیا ہے۔ یعنی جدیدیت کے جرائم کی فہرست میں بیانیہ کا قتل بھی شامل ہے۔ چنانچہ بعض حلقوں کی طرف سے جب افسانے کی موت کا اعلان ہوا تو اس کے کچھ دنوں بعد (یعنی تحقیق و تفتیش کی کارروائی پوری کرنے کے بعد) یہ بھی کہا گیا کہ جدیدیت نے افسانے کو چیستان بنا کر ان ہزاروں قارئین سے اسے چھین لیا تھا جو انسانی مسائل کے تخلیقی افسانوی اظہار کو، افسانے کا افسوں جانتے تھے۔ (ڈاکٹر قمر رئیس) اس بات سے قطع نظر کہ تخلیقی افسانوی اظہار کی اصطلاح میری سمجھ سے بالاتر ہے، اس بیان میں بنیادی بات یہ ہے کہ افسانے میں کسی قسم کا افسوں ہوتا ہے اور وہ افسوں اس وقت جاتا رہتا ہے جب افسانہ چیستان بن جائے۔ اور افسانہ چیستان تب بنتا ہے جب افسانہ نگار کو افسانے کی روایت کا شعور نہ ہو۔ ڈاکٹر قمر رئیس آگے چل کر ایک نوجوان افسانہ نگار ابن کنول کے بارے میں فرماتے ہیں کہ انھوں نے افسانے کی بحالی میں نمایاں حصہ لیا ہے، کیونکہ اردو میں افسانے کی روایت کا شعور وہ اپنے ہم عصروں سے کچھ زیادہ ہی رکھتے ہیں۔ اس وقت میں ابن کنول کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال نہ کروں گا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اردو افسانے کی جس نام نہاد روایت کی پاس داری قمر رئیس صاحب اور ان کے ہم نواؤں یعنی ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر محمد عقیل کی طرف سے ہو رہی ہے وہ اردو افسانہ تو کیا، مغربی افسانے کی بھی روایت نہیں ہے کیوں کہ یہ حضرات جس روایت کی بات کر رہے اس کی عمر مشکل سے سو سال ہے اور اس کے آغاز کا سہرا امریکی ناول نگار ہنری جیمس کے سر ہے۔ یعنی ان حضرات کی نظر میں پریم چند اور ان کے فوراً بعد کا بیانیہ ہے جس میں کردار کو افضلیت حاصل ہے۔ یہ وہ بیانیہ ہے جو کردار کی داخلی زندگی کی وضاحت کی خاطر واقعہ کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور اس بیانیہ کی رو سے واقعہ پیش ہی اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس کے اس کے ذریعہ کردار کی نقاب کشائی ہو اور کردار کی نقاب کشائی اس لئے کی جائے کہ اس کے ذریعہ کرداروں کی آپس میں کش مکش اور خود ان کی داخلی زندگی اور تصورات و خیالات یعنی MENTAL EVENTS اور MENTAL CONFLICTS کو ظاہر کیا جا سکے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ واقعے کو کردار کا اظہار تصور کرنے کا نظریہ بیانیہ کا روایتی نظریہ نہیں ہے۔ یہ نظریہ بڑی حد تک بیانیہ کی روح کا استحصال کر دیتا ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے نئے افسانے جن میں کردار کی کوئی خاص اہمیت نہیں، بلکہ جن میں واقعہ ہی تقریباً سب کچھ ہوتا ہے، بیانیہ کی اصل روایت سے نزدیک تر ہیں۔ اور جب میں نئے افسانے کہتا ہوں تو میری مراد انتظار حسین کے افسانے نہیں جن میں داستانی رنگ ہر ایک کو نظر آتا ہے۔ میری مراد آٹھویں اور نویں دہائی کے افسانے ہیں جن میں باقاعدہ پلاٹ

بیا ہے نہ کھی ہو لیکن اس میں واقعے کی کثرت ہے۔ روایتی بیانیہ کی شان
واقعات کی کثرت ہے کردار نگاری نہیں۔ یہ بات اب اتنی عام ہو چکی ہے کہ ہمارے
مرثیہ خواں حضرات اگر شولز اور کلاگ کی ہی کتاب پڑھ لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا
کہ بیانیہ کی اصل روایت کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"کردار نگاری کا سب سے اہم عنصر وہی ہے جسے کردار کی داخلی
زندگی کہتے ہیں۔ یہ عنصر جتنا کم ہوگا فن پارے کی تعمیر میں دوسرے
بیانیہ عناصر مثلاً پلاٹ، حالات کا بیان، دوسرے واقعات
کے حوالے اور بدیعیات کا حصہ زیادہ ہوگا۔ کامیاب بیانیہ
کے لئے ضروری نہیں ہے کہ اس میں داخلی زندگی پر زور دیا
جائے اور اسے تفصیل سے پیش کیا جائے۔ لیکن اسے اس کمی
کو پورا کرنے کے لئے دوسرے عناصر کا استعمال کرنا ہوتا ہے۔
اگر اسے خود کو انسانی دلچسپی کی چیز کی حیثیت سے باقی رکھنا
منظور ہو۔ یونانی داستانی قصوں میں یہ کمی پیچیدہ پلاٹ،
محاکاتی بیان اور صنائع بدائع سے بھرپور بدیعیات سے پوری
کی جاتی تھی۔ یہی حال سولھویں اور سترھویں صدی کے انگریزی
اور فرانسیسی داستانی قصہ گویوں کا ہے جو یونانیوں کے متبع
تھے۔"

اس بیان سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ کردار اور واقعہ کے آپسی ردعمل
اور کردار نگاری کے ذریعہ واقعات کے تانے بانے جوڑنا قدیم بیانیہ کی رسم نہیں
قدیم بیانیہ کی رسم یہی تھی کہ واقعات کی کثرت ہو، افسانے کو موثر اور قابل قبول بنانے
کے لئے ایسی بدیعیات یعنی RHETORIC یعنی PERSUASIVE TECHNIQE
استعمال کی جائے جو بہت رنگین اور صنائع بدائع سے بھرپور ہو۔ جس شخص نے ہماری
داستانوں کا ایک صفحہ بھی پڑھا ہے وہ اس بات کو تسلیم کرے گا کہ شولز اور
کلاگ کا بیان ہماری داستانوں (یعنی ہماری اصل بیانیہ روایت) پر حرف بحرف
صادق آتا ہے۔

افسانے میں بدیعیات کا معاملہ بہت اہم اور دلچسپ ہے۔ بدیعیات
سے مراد وہ طریقے ہیں جن کے ذریعہ افسانہ نگار اپنے واقعات کو قابل قبول بناتا
ہے۔ ان طریقوں کے شعوری یا غیر شعوری ہونے سے بحث نہیں۔ بنیادی بات
یہ ہے کہ یہ طریقے ہر افسانہ نگار کو استعمال کرنا ہوتے ہیں چاہے وہ نام نہاد
واقعیت نگار ہو یا تمثیلی یا علامتی۔ مائر اسٹائن برگ (MEIR STERNBERG)
نے ایک ... اسی موضوع پر لکھی ہے اس نے ایک ماہر نفسیات کا
ایک تجربہ نقل کیا ہے جس کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے۔ ایک عبارت ترتیب
دی گئی جس میں ایک فرضی شخص مثلاً زید کے بارے میں بعض باتیں کہی گئیں۔
شروع میں جو باتیں کہی گئی تھیں، عبارت کے آخری حصے میں ان تمام باتوں
کی بالکل الٹی باتیں کہی گئیں۔ مثلاً اگر شروع میں لکھا کہ زید بہت نیک دل اور
مخیر تھا تو آخر میں لکھا کہ وہ بہت سخت دل اور کنجوس تھا۔ یا اگر شروع میں
لکھا کہ زید بہت سخت دل اور کنجوس تھا تو بعد میں لکھا کہ وہ بہت نیک دل اور
مخیر تھا۔ دونوں طرح کی عبارتیں کئی لوگوں کو دی گئیں اور ان سے کہا گیا کہ ان کو
جو عبارت دی گئی ہے اسے بغور پڑھ کر زید کے بارے میں اظہار خیال کریں
ہر شخص نے اپنی عبارت کو بغور بار بار پڑھا لیکن زید کے کردار کے بارے میں جو
بھی اظہار خیال کیا گیا وہ ان باتوں پر مبنی تھا جو عبارت کے شروع میں
تھیں۔ اگر شروع میں زید کی تعریف لکھی تھی تو زید کو اچھا آدمی بتایا گیا۔
اگر شروع میں اس کی برائی لکھی تھی تو اس کو برا بتایا گیا۔ بعض پڑھنے والوں
نے تو بعد کی عبارت کو بالکل نظر انداز ہی کر دیا، اور بعض نے اس کی توجیہیں
طرح طرح سے کیں۔ اس تجربے سے اس بات کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ
افسانہ نگار اپنے قاری پر کس قدر اختیار رکھتا ہے۔ اب اگر وہ اس اختیار
کو ٹھیک سے استعمال نہ کر سکے تو اس میں قاری کا کیا قصور؟ لیکن اگر قاری
کی نیت صاف نہ ہو اور وہ افسانے میں فرضی چیزیں تلاش کرنا شروع کر دے
تو افسانہ نگار کی بدیعیاتی کارروائی (RHETORICAL STRATEGY) ناکام
ہو سکتی ہے۔ فرضی چیزوں سے میری مراد یہ ہے کہ اگر قاری کو افسانے میں
کردار کی تلاش پر اصرار ہو جب کہ افسانہ نگار آپ کو واقعہ سنا رہا ہے تو
لامحالہ اس کے ساتھ آپ ناانصافی کر رہے ہیں۔ ہاں اگر واقعہ خود ان
صفات کا حامل نہ ہو کہ کردار نگاری کی کمی محسوس نہ ہونے دیں تو اور بات ہے۔
میں نے اوپر بہتری چیز کا ذکر کیا ہے۔ افسانے میں کردار اور بیانیہ کی

اکُسٹ فاٹ' ماڑسری جیمز سے ہوتا ہے۔ یہ جیمز ہی تھا جس نے کردار کے اظہار میں اس قدر غلو کیا کہ اس نے اکثر جگہ "ناول نگار" یا "فکشن نگار" کا لفظ ہی نہیں استعمال کیا بلکہ "ڈراما نگار" لکھا یعنی اس کا خیال تھا کہ ناول نگار دراصل ڈراما نگار ہوتا ہے اور جس طرح ڈرامے میں تمام واقعات کا اظہار کردار کے حوالے سے ہوتا ہے اسی طرح ناول میں بھی ہونا چاہئے۔ ہنری جیمز نے ناول میں واقعات کے اسلوب اظہار کے لئے (منظری) SCENIC اور (غیر منظری) NON-SCENIC کی اصطلاحیں وضع کیں۔ "منظری" سے اس کی مراد تھی وہ اسلوب جو ڈراما سے قریب تر ہو، یا جس میں واقعات اس طرح نمایاں کئے جائیں جس طرح ڈراما میں ہوتے ہیں۔ اور غیر منظری سے اس کی مراد تھی وہ اسلوب جو ڈراما سے دور تر ہو۔ جیمز نے تقریباً ہمیشہ اس نام نہاد "منظری" اسلوب کو "غیر منظری" اسلوب پر فوقیت دی ہے۔ کردار اور واقعہ کے رشتے کردار نگاری کی واقعہ پر فوقیت کے بارے میں ہنری جیمز کے بعض اہم بیانات حسب ذیل ہیں۔ یہ میں نے اس کے مختلف مضامین سے اخذ کئے ہیں۔

(۱) "کردار کیا ہے اگر وہ واقعے کی تعیین نہیں ہے؟ واقعہ کیا ہے اگر وہ کردار کی وضاحت نہیں کرتا؟ کوئی تصویر یا کوئی ناول کیا ہے اگر وہ کردار کے بارے میں نہیں ہے؟ کردار کے علاوہ ہم ناول یا تصویر میں تلاش ہی کیا کرتے ہیں اور حاصل ہی کیا کرتے ہیں؟ اگر کوئی عورت اس طرح کھڑی ہو کہ وہ اپنا ہاتھ میز پر ٹکائے ہوئے آپ کو ایک خاص انداز سے دیکھے تو یہ ایک واقعہ ہے۔ یا اگر یہ ایک واقعہ نہیں ہے تو میرا خیال ہے یہ کہنا بہت مشکل ہوگا کہ پھر یہ اور کیا ہے؟

یہ اقتباس جیمز کے مشہور مضمون THE ART OF FICTION کا ہے۔ اس کی اشاعت کو صرف ایک سو ایک برس ہوئے ہیں لیکن یہ بیان اتنا پراثر ثابت ہوا ہے کہ یار لوگ بیانیہ کی ہزاروں برس پرانی روایت کو بھول کر اس بیان کی روشنی میں بیانیہ کی روایت مرتب کرتے ہیں۔ محمد احسن فاروقی بھی ان لوگوں میں شامل ہیں لیکن دیکھئے زویتان تاڑاراف TZVATAN TODOROR اس باب میں کیا کہتا ہے۔

"ہم نے شاید ہی کوئی ایسی مثال اور دیکھی ہو جس میں خالص خود رائی نے خود کو ہمہ گیر حقیقت کے طور پر پیش کیا ہو۔ ممکن ہے جیمز کا نظریاتی آدرش ایسا ہی بیانیہ رہا ہو جس میں ہر چیز کرداروں کی نفسیات کے تابع ہے۔ لیکن ادب میں ایک پورا ناقابل نظر انداز رجحان موجود ہے جس کی رو سے واقعات اس لئے نہیں ہیں کہ وہ کردار کی وضاحت کریں بلکہ اس کے برخلاف وہاں تو سارے کے سارے کردار ہی واقعات کے تابع ہوتے ہیں۔ مزید برآں کہ اس رجحان کی رو سے کردار کی اصطلاح جس چیز کی نشاندہی کرتی ہے وہ نفسیاتی مربوطی یا کردار کے ذاتی انوکھے رجحانات کا اظہار نہیں ہے۔"

ایک دوسرے سیاق و سباق میں ٹاڈراف یہ سوال بھی پوچھتا ہے کہ ممکن ہے پلاٹ کے بارے میں جو خیال ہے کہ وہ علت اور معلول کا نتیجہ ہوتا ہے، وہ آج کل کے پلاٹ کے بارے میں صحیح ہو، لیکن اس تصور کا اوڈیسی کے پلاٹ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے جہاں ہر بات دیوتاؤں نے پہلے ہی سے طے کر دی ہے؟ مراد یہ ہے کہ ہم لوگوں کو پلاٹ اور کردار کے بارے میں اپنے ان خیالات پر نظر ثانی کرنا چاہئے جو ہم نے پچھلے سو برس سے کچھ کم یا زیادہ کے عرصے میں مغرب میں دریافت کئے ہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ناول چوں کہ جدید صنف سخن ہے اس لئے اس پر جدید ہی خیالات کی روشنی میں بات ہوگی کیوں کہ ناول تو ہنری جیمز کے پہلے سے موجود تھا بلکہ دنیا کے سب سے بڑے ناول نگاروں میں سے کم سے کم تین یعنی ڈکنس، بالزاک اور فلابیئر ہنری جیمز کے پہلے تھے اور دو یعنی دستوئفسکی اور ٹالسٹائی بھی جیمز کے بزرگ ہم عصر تھے۔ لہذا ہنری جیمز (جو ٹالسٹائی، دستوئفسکی اور ڈکنس کو پسند نہیں کرتا تھا) کہاں کا ارسطو ہے کہ ہم ناول کے بارے میں اس کی ہر بات مان لیں؟ خیر جیمز کے بعض اور جواہر ریزے ملاحظہ ہوں

(۲) "کسی مصنف کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ روحوں کا علاج کرے، چاہے اس کے نتیجے میں اسے محاکات کو دبانا، بلکہ منہا ہی کیوں نہ کرنا پڑ جائے۔ اس کو چاہئے کہ وہ اپنے کرداروں کی خبر رکھے، اس کے محاکات اپنا معاملہ خود ہی ٹھیک کر

لیں گے ":

یہ تحریر اس کے بالکل آخری زمانے (۱۹۱۴) کی ہے۔ ایک اور ملاحظہ ہو:

(۳) "سچی بات یہ ہے کہ ایک بات مجھے بڑے زبردست طریقے
سے سچی معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی تصویر میں جو لوگ
ہیں یا کسی ڈرامے میں جو فاعل ہیں وہ اسی حد تک دلچسپ
ہیں جس حد تک وہ اپنی اپنی صورت حال کو محسوس کرتے ہیں۔
کیوں کہ جو پیچیدگیاں ظاہر ہوتی ہیں خود ان کو ان کا شعور
جس حد تک ہوتا ہے، اسی حد تک ہمارا اور ان کے شعور
کا رشتہ قائم ہو سکتا ہے":

یہ دیباچہ ۱۹۰۸ کا ہے۔ آگے چل کر وہ ہیملٹ اور شاہ لیئر کی مثال دیتا ہے کہ یہ لوگ FINELY AWARE ہیں اور ہمیں ان لوگوں سے ہمدردی کم ہوتی ہے جو روحانی طور پر اندھے یا احمق یا غیر مہذب ہوتے ہیں یعنی افسانے میں ایسے کرداروں کا ذکر ہونا چاہیے "جو حساس ہوں، اپنا شعور رکھتے ہوں" اور ظاہر ہے کہ اس طرح کے کردار کو وضاحت سے بیان کرنے کے لئے اس کی داخلی زندگی اور MENTAL EVENTS کی گہرائیوں میں جانے کے سوا چارہ نہیں۔ جیمز مزید کہتا ہے کہ بڑے بڑے واقعہ نگاروں مثلاً اسکاٹ، زولا اور ڈیوما نے یہ کیا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کے کسی مہم سے دوچار کیا ہے اور اگر ایسا نہیں کیا ہے تو انھیں نقصان بھی اٹھانا پڑا ہے معلوم نہیں ہومر یا فردوسی کے کرداروں یا قدیم تر زبانی یا تحریری داستانوں کے کرداروں میں کس قسم کا دماغ جیمز صاحب کو نظر آتا ہوگا۔ ٹماڈاراف نے خوب کہا ہے کہ روایتی بیانیہ میں تو واقعہ ہی کردار ہے۔ دوسری بات وہ یہ کہتا ہے کہ جب ہنری جیمز کہتا ہے کہ "الف نے ب کو دیکھا" تو اس کے نزدیک الف اہم تر ہے لیکن الف لیلیٰ کی قصہ گو شہرزاد کے لئے بے اہم تر ہے یعنی کس طرح دیکھا گیا، کس نے دیکھا، یہ اہم نہیں ہے، بلکہ کیا دیکھا گیا، اہم ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ میں کردار نگاری کے خلاف ہوں۔ کردار نگاری اور کردار کی نفسیات کی تہوں میں اتر کر کیچڑ اور موتی کھنگالنا بڑی عمدہ اور اہم چیز ہے۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ کردار نگاری اور بیانیہ ہم معنی نہیں ہیں اور نہ ہی کردار نگاری بیانیہ کی قدیم روایت کا حصہ ہے۔ بیانیہ کی قدیم روایت اور جدید طریق کار میں بنیادی فرق بدیعیات کا ہے گرامر کا نہیں یعنی دونوں کے قاعدے ایک سے ہیں لیکن اپنی بات کو قائم کرنے کے لئے جدید یعنی ہنری جیمز کا طریق کار یہ ہے کہ اس کے ذریعہ اس شخص کو اہمیت دی جاتی ہے جس پر واقعہ گزرا۔ قدیم روایت کی رو سے وہ شخص اہم نہیں ہے جس پر واقعہ گذرا، بلکہ واقعہ خود اہم ہے۔ اس طرح اس چیز کی اہمیت کم ہو جاتی ہے جسے ہنری جیمز POINT OF VIEW نقطۂ نظر کہتا ہے۔ یعنی واقعہ بیان کرنے والا (راوی) اور مصنف الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے رولاں بارت کہتا ہے کہ "متن کو اس کے باپ (یعنی خالق) کی گارنٹی کے بغیر پڑھا جا سکتا ہے ... ایسا نہیں ہے کہ مصنف اپنے متن میں واپس نہیں لوٹ سکتا۔ وہ لوٹ سکتا ہے، لیکن محض ایک "مہمان" کی طرح۔ اگر مصنف ناول نگار ہے تو وہ اپنے متن میں خود کو ایک کردار کی طرح درج کر دیتا ہے۔ اس کے دستخط کسی خاص احترام و مراعات (PRIV'LAGE) یا پدرانہ اہمیت کے حامل نہیں ہوتے ... اس کی زندگی (وجود) اس کی کہانیوں کا سرچشمہ نہیں رہ جاتی، بلکہ ایک ایسی کہانی بن جاتی ہے جو اس کی تحریر کے ساتھ ساتھ چلتی ہے"۔ بارت کی مراد یہ ہے کہ بیانیہ میں جب کوئی واقعہ بیان ہوتا ہے تو پھر اس میں مصنف کے ادراکات شامل نہیں ہوتے، بلکہ راوی کے ہوتے ہیں۔ لیکن بیانیہ کے غیر روایتی نظریات کے حامل نقادوں کی رو سے وہ نقطۂ نظر اہم ہے جس جگہ سے واقعہ کو دیکھا جا رہا ہے۔ واقعہ کی تلاش نے ہمارے فکشن کو اس منزل تک پہنچا دیا جہاں کوئی بیان کوئی روداد اپنی اصل شکل میں باقی ہی نہیں رہی واقعیت کے نام پر واقعے ہی کا استیصال ہو گیا۔

پھر سوال یہ ہے کہ روایتی بیانیہ کس طرح کام کرتا ہے؟ اس کی بدیعیات کیا ہے؟ اور اس کی کارفرمائی ہم آج کے افسانے میں کس طرح دیکھ سکتے ہیں؟ اگر آج کا افسانہ واقعی روایتی بیانیہ کا پیرو ہے تو اس میں اس طرح کا تاثر کیوں نہیں ہے جو ہم روایتی بیانیہ میں دیکھتے ہیں؟ آخری سوال کا تو جواب یہ ہے کہ روایتی بیانیہ کی پیروی کی ایک اہم شرط ہئے افسانے نے نہیں پوری کی ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ بیانیہ میں صرف راوی کا POINT OF VIEW ہو،

کسی کردار کا یا مصنف کا نہ ہو۔ واقعیت کی مار ہمارے افسانہ نگاروں پر اس قدر زبردست ہے کہ جب وہ کوئی منظر بیان کرتے ہیں تو خود اپنے تاثرات بیان کرنے لگتے ہیں یا کسی کردار کے۔ اپنے تاثرات بیان کرنے میں مشکل یہ ہے کہ پھر افسانے کی RHETORIC کم زور پڑ جاتی ہے۔ اور کردار کے تاثرات بیان کرنے میں مشکل یہ ہے کہ کردار ان کے یہاں ہے نہیں۔ لہٰذا منظر کا بیان بھونڈا اور مصنوعی ہو جاتا ہے اور پریم چند ہی افسانے کا بھوت آموجود ہوتا ہے۔ روایتی بیانیہ میں واقعہ خود کردار کا قائم مقام ہوتا ہے یعنی کردار کے MENTAL EVENT نہیں بیان ہوتے بلکہ اس کے اعمال بیان ہوتے ہیں۔ اس لئے اس میں یہ سوال نہیں اٹھتا کہ ہم کس کے ادراکات سے دوچار ہو رہے ہیں۔ یہ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) "سمندر کی لہروں اور عورتوں کے خون کو راستہ بتانے والا چاند ایک کھڑکی کے راستے اندر چلا آیا تھا اور دیکھ رہا تھا، دروازے کے اس طرف کھڑا مدن اگلا قدم کہاں رکھتا ہے؟ مدن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی اور اسے اپنا آپ یوں معدوم ہو رہا تھا جیسے بجلی کا کھمبا ہے جسے کان لگانے سے اندر کی سنسناہٹ سنائی دے جائے گی"

(بیدی۔ اپنے دکھ مجھے دے دو)

مدن کی شادی کی پہلی رات ہے۔ وہ حجلۂ عروسی میں ایک قدم رکھ کر ٹھٹکا کھڑا ہے۔ اس منظر کا بیان انتہائی اعلیٰ درجے کا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں، لیکن اس بیان میں چاند کو سمندر کی لہروں اور عورتوں کے خون کا راستہ بتانے والا کیوں کہا گیا ہے؟ "راستہ" کی معنویت پر غور کیجئے۔ پھر مدن خود کو بجلی کے سنسناتے ہوئے کھمبے کی طرح محسوس کر رہا ہے۔ اس پیکر کی استعاریت محفوظ رکھئے۔ یہ چیزیں بیان کی قوت میں اضافہ کرتی ہیں، لیکن یہ چاند جو اس منظر میں ہے، مدن نے دیکھا ہے کہ بیدی نے؟ اور مدن کی سنسناہٹ بھرے بیان کو ہم مدن کی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں یا بیدی کی آنکھ سے؟ اگر [illegible] چاندنی نہ ہوتی تو کیا اس وقت بھی بیدی اسے سمندر کی لہروں اور عورتوں کے خون کو راستہ بتلانے والا لکھتے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ لہٰذا یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ چاندنی بیدی نے بنائی ہے۔ وہ چاند جو مدن کا اگلے قدم اٹھنے کے انتظار میں ہے نہ واقعی ہے نہ استعاراتی، بلکہ بیدی کا کھلونا ہے۔ بجلی کے سنسناتے ہوئے کھمبے کا سا بدن کبھی اس وقت نہ ہوتا جب سہاگ رات کے بجائے مثلاً امتحان کے پہلے پرچے یا نوکری کے انٹرویو کے وقت کا ذکر ہوتا۔ یہ سب تفصیلات اعلیٰ پائے کی ہیں، خوب صورت ہیں، حسب حال ہیں لیکن ان کا واقعے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ واقعے پر طاری کی گئی ہیں کیوں کہ راوی نے افسانہ نگاری شروع کر دی ہے۔ لہٰذا "کیا ہوا؟" "کیا دیکھا؟" اہم نہیں ہے، بلکہ "کس پر ہوا؟" "کس نے دیکھا؟" اہم ہے۔ اور ان دونوں سے زیادہ اہم ہے "کس نے بیان کیا؟" غیر روایتی افسانے میں لاشخصیت کا پتہ نہیں، وہ لاشخصیت جو فلابیر کی زندگی کا آدرش تھی۔ لیکن بیدی بہر حال قدیم بیانیہ کی روایت میں نہیں ہیں، لہٰذا ان کے یہاں اس طرح کی دخل اندازی چل جاتی۔ نیا افسانہ نگار تو قدیم بیانیہ کو اپنانا چاہتا ہے اور جب وہ واقعیت نگاری کی ٹوپی پہن کر اس بزم میں آتا ہے تو اس کی پگڑی اچھلتی نظر آتی ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے۔

(۲) "ننھے ننھے پتھر جب پرسکون پانی پر گرے تو پہلے کائی پھٹی، پھر دھوپ اندر گئی، پھر برف پگھلی، پانی میں ہل چل ہوئی، لہریں اٹھیں اور صدیوں کی جمی کائی بہہ کر دور چلی گئی، تہہ میں سوئی ہوئی مچھلیاں ان پتھروں کی طرف لپکیں۔ ایک دنیا کا طلسم ٹوٹا۔ ایک دنیا کی آنکھ کھلی، پتھر برستے رہے، ہنگامہ جوان رہا، لہریں زندگی کی علامت بن کر آگے اور آگے بڑھتی رہیں۔"

(شفق: کانچ کا بازی گر)

تحریر اپنے درجے اور رتبے کے اعتبار سے بیدی سے کچھ ہی کم ہے۔ لیکن یہاں کردار تو ہے نہیں پھر یہ کس کے ادراکات بیان کئے جا رہے ہیں؟ اور یہ MENTAL EVENTS کو ادراک کا درجہ کیوں دیا جا رہا ہے؟ بظاہر یہ ادراک اس مرکزی کردار کے ہیں جس نے خود کو "میں" کے نام سے متعارف

کیا ہے، لیکن ہوگا۔ دن کی سہاگ رات تو پھر بھی ایک دل چسپ یا کم سے کم ایک TITILLATING موقع تھی، یہاں کس صورت حال کا اظہار کیا جا رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ کردار کو سہا کر دیا گیا ہے، لیکن کردار نگاری سے ابھی نجات نہیں ملی ہے۔ جو تاثرات بیان کئے جا رہے ہیں وہ افسانہ نگار ہی کے ہیں، راوی کے نہیں۔ افسانہ نگار نے اپنے خیالات "میں" کے ذریعے ادا کیا ہے۔ لیکن "میں" تو کوئی شخص نہیں ہوتا، جب تک کامیو کے THE FALL کے مرکزی کردار کی طرح وہ ہم کو اپنے بارے میں براہ راست نہ بتائے۔ یہاں جو "میں" ہے وہ کردار نہیں ہے، کردار کا بھوت ہے جس کی نقاب افسانہ نگار نے اوڑھ لی ہے۔ اگر باقاعدہ کردار ہوتا تو ہم اس سے سوال جواب کرتے۔ موجودہ صورت میں ہمارے پاس کردار نہیں ہے، لیکن راوی بھی نہیں ہے، صرف افسانہ نگار ہے۔ پھر بیانیہ کی قدیم روایت کے خدوخال کیوں کر نمایاں ہوں؟ اب ایک اور اقتباس دیکھتے ہیں:

(۳) "ہر چیز تھم گئی ہے، چوراہے پر سے گزرتی بسیں، گاڑیاں، راہ گیر، سب وقت کے فرسودہ فریم میں تصویر کے مانند ساکت ہو گئے ہیں۔ صرف شام اتر رہی ہے، دھیرے دھیرے گلی کوچوں میں، سڑکوں پر، ٹیلی گراف کے تاروں پر، اپنے گھروں کو رواں ہوتے انسانوں کے جم غفیر پر۔"

(انور خاں: شام رنگ)

سب سے پہلی بات تو یہ کہ یہ شام بیدی صاحب کی اس شام سے ملتی جلتی ہے جب سورج کی ٹکیہ بہت لال تھی۔ یہ شام بھی زور اور عبارت کے مرتبے میں بیدی سے کچھ ہی کم ہے۔ لیکن بیدی کی شام ان کرداروں کے ادراک میں تھی جن سے ہم فوراً ہی دوچار ہوتے ہیں۔ یہاں پھر وہی "میں" ہے جس میں کوئی کرداری صفت نہیں۔ بنیادی بات یہ کہ دونوں افسانہ نگاروں کی بدیعیات ایک سی ہے۔ بیدی کے یہاں وہ کامیاب اس لئے ہے کہ وہ قدیم روایت کے بیانیہ کے برخلاف کردار نگاری کر رہے ہیں۔ یہ ایک بات ہے کہ اس طرح کی منظر کشی جس میں افسانہ نگار اپنے کرداروں کی تقدیر کا فیصلہ مقدمہ شروع ہونے کے پہلے کر دیتا ہے، واقعیت کے نام پر بے ایمانی ہے لیکن وہ بے ایمانی اپنی شعریات کی حدود میں ہے۔ انور خاں کردار نگاری سے منحرف ہیں، لیکن ادراکات وہ بیان کر رہے ہیں جو راوی کے نہیں بلکہ کردار کے حوالے سے خود ان کے ہیں۔ یہی انور خاں جب سیدھی سادی تمثیل (ALLEGORY) لکھتے ہیں مثلاً "فن کاری" تو غیر معمولی طور پر کامیاب ہوتے ہیں۔

(۴) "جب شششی نے چائے کے داموں میں اضافہ کر دیا تو بھارت ہندو ہوٹل میں مختلف میزوں پر بیٹھنے والے بے روزگار نوجوانوں میں برہمی پھیل گئی۔ ملک کی اقتصادیات، سیاسیات اور سماجیات پر طویل بحث کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ انھیں احتجاج کرنا چاہئے۔ انھوں نے ٹیبل والے سے اخبار منگوا کر اس شام منعقد ہونے والے پروگراموں کی تفصیلات دیکھیں اور ایک پروگرام جس میں شہر کے تمام سربرآوردہ اور معزز لوگوں کی آمد متوقع تھی، چن لیا۔"

(انور خاں۔ فن کاری)

تمثیل ابھی قائم نہیں ہوئی ہے لیکن ہلکے ہلکے اشارے موجود ہیں۔ یہ آغاز بلراج کومل کے افسانے "کنواں" کی یاد دلاتا ہے۔ لیکن اگر وہ افسانہ یاد نہ بھی آئے تو بھارت ہندو ہوٹل، بے روزگار نوجوانوں کی بحث، اخبار میں کا کالم دیکھ کر احتجاج کی جگہ متعین کرنا، ان سب سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ معاملہ وہ نہیں ہے جو بظاہر نظر آتا ہے۔ ان تفصیلات کی اہمیت نہیں ہے بلکہ جس ترتیب سے وہ یک جا کی گئی ہیں وہ اہم ہے۔

چوں کہ بیانیہ کی قدیم روایت واقعے کی کثرت کا تقاضا کرتی ہے اور کردار کو واقعے کا تفاعل ٹھہراتی ہے، لہٰذا اس کے سامنے دو مسائل ہیں اوّل یہ کہ واقعات کو کس طرح پیش کیا جائے اور دوئم یہ کہ جب کردار کی داخلی زندگی بیان ہو تو اس کے خیالات (اگر کوئی ہیں) کس طرح بیان کئے جائیں؟ پہلے سوال کا جواب تو آسان ہے۔ بیانیہ کی کوئی بھی ترکیب کارگر ہو سکتی ہے۔ تمثیل کی مثال سامنے ہے۔ مسئلہ افسانے کے ابہام یا اشکال یا علامتوں سے افسانہ نگار کے شغف کا نہیں ہے۔ علامت تو کسی بھی

کے افسانے میں ہو سکتی ہے، اور آج کل کے زیادہ افسانوں میں علامت ہے بھی نہیں۔ مسئلہ دراصل یہ ہے کہ افسانہ یعنی بیانیہ کس طرح وجود میں آئے؟ واقعات کس طرح درج کئے جائیں اور کس طرح کے واقعات ہوں؟ ان مسائل پر میں پہلے بھی تھوڑا بہت اظہار خیال کر چکا ہوں۔ ایک بات میں نے اور کہی ہے کہ افسانہ نگار کو قاری پر غیر معمولی اختیار حاصل ہوتا ہے۔ وضعیاتی (STRUCTURALIST) نقاد تو ہر افسانے کو RELATIONSHIPS اور CATEGORIES میں بانٹ کر چھٹی کر دیتا ہے۔ میں نے وضعیاتی اور بعد وضعیاتی تنقید سے تھوڑا بہت سیکھا ضرور ہے۔ لیکن مجھے اس بات کا احساس ہے کہ محض RELATIONS اور توازن کے اقسام بیان کر دینے سے واقعے کی واقعاتی قدر کا تعین نہیں ہو سکتا۔ یہ بات غور کرنے کی ہے کہ آخر افسانہ آزاد وجود رکھتا ہے یا نہیں؟ بعض نقادوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ افسانے میں لسانی سطح کے علاوہ ایک SEMIOTIC سطح بھی ہوتی ہے اور وہ لسانی سطح کے مانند ہوتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ہم وہاں تک نہ جائیں اور یہ کہیں کہ افسانے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو واقعہ اور دوسری اس واقعے کو بیان کرنے والا۔ بیان کرنے والے کے بغیر واقعہ بے معنی ہے اور واقعہ کے بغیر بیان کرنے والا ہو ہی نہیں سکتا۔ تو پھر ان دونوں میں وہ کیا رشتہ ہے جس کی بنا پر ہم اسے افسانے کی سطح پر قبول کرتے ہیں؟

ظاہر ہے کہ یہ رشتہ اس بات میں مضمر ہے کہ بیان کرنے والے نے واقعے کو بیان کرنے کے لائق سمجھا لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ بیان کرنے والے نے واقعے میں کوئی خاص معنی دیکھے، یا کہیں ایسا تو نہیں کہ بیان کرنے کے بعد اس میں معنی پیدا ہو جاتے ہوں؟ کیوں کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ بیان کئے ہوئے واقعے کے معنی کسی کے لئے کچھ ہوں اور کسی کے لئے کچھ۔ اگر تشریحات (HERMENEUTICS) کے نئے نظریات کی روشنی میں دیکھیں تو گاڈامر کی طرح یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب کوئی تخلیق وجود میں آگئی تو اس کے معنی بھی ہوں گے کیوں کہ تخلیق کی فطرت ہی یہی ہے کہ وہ بامعنی ہو۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیان کرنے والا معنی کی غرض سے واقعہ نہیں بیان کرتا بلکہ وہ اس کو بیان کرنے کے لائق اس لئے سمجھتا ہے کہ اس میں خود اس کے لئے معنی ہیں اور وہ اس کے ذہن میں بطور واقعے کے قائم ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اس کو قاری کے بھی ذہن میں بطور واقعے کے قائم کر دے۔ یعنی بیان کرنے والے کو ایک شارح درکار ہوتا ہے جو بیان کی ہوئی چیز کی شرح واقعے کے طور پر کر سکے۔ لہذا واقعہ اور اس کو بیان کرنے والا مل کر ایک تیسرا رشتہ خلق کرتے ہیں جو شارح کا ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ ابلاغ کا نہیں بلکہ بیانیہ کے اختیار کو کامیابی سے استعمال کرنے کا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ افسانہ نگار جو بھی کہتا ہے، شارح اس کو مان لیتا ہے۔ پھر افسانہ نگار شارح سے یہ کیوں نہیں منوا لیتا کہ میں نے افسانہ لکھا ہے جغرافیہ کی کتاب نہیں؟ روایتی بیانیہ وہ کیا کام کرتا ہے جس کی بنا پر ہم اس کو افسانہ یعنی FICTION مان لیتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو سرگرم عمل رکھتا ہے، یہاں تک کہ ان کا سوچنا بھی عمل ہوتا ہے یعنی ان کا سوچنا گفتگو کا عمل (SPEECH ACT) ہوتا ہے۔ نئے افسانے میں واقعہ کثرت سے ہے، لیکن عمل بہت کم ہے۔ اس میں مکالمہ بھی سوچ کی شکل میں نظر آتا ہے، بجائے کہ سوچ کو مکالمہ کا رنگ دیا جائے۔ یہاں چند مثالیں دیکھئے:

"کوکب دل سے اپنے باتیں کرتا ہے کہ اے کوکب کاش کہ عمرو مجھ کو اس حال زار میں نہ دیکھتا۔ عمرو بیٹھنے والا دربار صاحب قراں کا ہے۔ جس وقت عمرو اس بارگاہ آسماں جاہ میں جا کر بیٹھے گا اس دربار میں جو اماں صف شکن تیغ زن جلوہ فرما رہے ہیں فرزندان صاحب قراں صاحب شوکت و شان جس امر کا ارادہ کرتے ہیں بدون فتح قدم نہیں ہٹاتے۔ اسد نامدار نے کیا کیا جفا اٹھائی سات برس گنبد نور میں قید رہا چاہیے حوصلہ پست ہو تاکہ ملک ساحران میں ہمارا قدم نہ جمے گا۔ افراسیاب ہمارے قتل کئے قتل نہ ہو سکے گا۔ حوصلہ میا کی، مزاج میں برہمی ہوتی، ہوش ربا کو چھوڑ کر چلے جاتے۔ جفا اٹھانے سے اور حوصلہ بڑھا آج تک کھیت سے پاؤں نہیں ہٹایا۔ اے کوکب سب کی نگاہوں سے گر جاؤ گے۔ سمجھ

جائیں گے کہ صرف جادوگر ہے، ہنر مارت سے نابلد ہے۔
اپنے مقام پر آشیں گے مردان عالم طلن کریں گے۔ یہ تو
ناممکن ہے کہ اتنا بڑا معرکہ عظیم مشہور و معروف نہ ہو۔ پس
اے کوکب واپس ہونا روگردانی اس مقدمے سے سراسر
نامردی ہے۔ عمرو نے دیکھا جب پتلے مارے جا چکے اور
کوکب زخموں میں چور ہو چکا شمشیر زنی کی کبھی طاقت نہ رہی
بیچ میں سے تلواروں کے نکل کر الگ کھڑا ہوا سامنے سے
ابر کے ہٹ آیا ... عمرو حیران ہے کہ یہ کیا معرکہ گذرا کوکب
کے جی چھوٹ گئے ... اے عمرو بزرگوں کا جو قول ہے سخن
شنیدن بیخ دولت کوکب نے اس کے خلاف کیا۔ ہم نے
کہا تھا کہ تامل کرو ہم عیاری کر کے ماہیان کو ماریں گے اس
وقت جوش جرأت میں ہمارا کہنا نہ مانا۔ آخر مجبور ہو کے
پلٹ گیا۔ صاحب غیرت ہے ایسا نہ ہو اپنی جان دے۔ اب
کہاں جا کر تلاش کروں ؟

(طلسم ہوش ربا جلد ہفتم ص ۲۶-۲۷)

یہ داستان گوئی کا بہترین نمونہ نہیں ہے لیکن نمائندہ نمونہ ضرور ہے۔ خیال
کو تقریر کی شکل میں دکھانے کے پیچھے یہ قدیم نظریہ ہے کہ خیال دراصل
خاموش تقریر ہوتا ہے۔ اور خود تقریر دراصل بولی ہوئی تحریر ہوتی ہے۔
اسی وجہ سے پرانی داستانوں اور رزمیوں میں کرداروں کے خیالات بھی
ایسی زبان میں بیان کئے جاتے ہیں جو دراصل تحریری زبان ہوتی ہے۔
تحریر اور تقریر کے بارے میں یہ نظریہ اب بالکل غلط ثابت ہو چکا ہے لیکن
آپ کو صحیح نظریہ لینا ہے یا کامیاب افسانہ نگاری کرنی ہے ؟ افسانہ نگار جب
داستانی شعریات قبول کر رہا ہے تو اس افسانہ نگار کے لئے تو وہی نظریہ درست
ہوگا جو اس شعریات سے برآمد ہو۔ اس اقتباس میں مندرجہ ذیل باتیں
لائق توجہ ہیں۔

(۱) تقریر یعنی SPEECH ACT کی زبان، آہنگ اور لہجہ۔
(۲) حال، ماضی، مستقبل کی یکجائی (عمرو ... کہا ہے ... بیٹھے گا
... جلوہ فرما رہے ہیں ... ارادہ کرتے ہیں ... قدم نہیں ہٹاتے)
(۳) ماضی کا بطور حال کے استحضار (کیا کیا جفا اٹھائی ... قید رہا
... چاہے حوصلہ پست ہوتا ... نہ جمے گا ... چلے جاتے ... اور حوصلہ بڑھا)
(۴) مستقبل اور حال کا ادغام (گر جاؤ گے ... نابلد ہے ... مشہور
و معروف نہ ہو ... نامردی ہے۔)
(۵) دو تقریروں کے بیچ میں بیان (عمرو نے دیکھا)
(۶) ماضی کا بہ طور حال بیان (عمرو نے دیکھا ... مارے جا چکے
... چور ہو چکا۔)
(۷) ماضی کا فلیش بیک۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یہ محض خیال بہ طور تقریر نہیں ہے، بلکہ تقریر کے اندر
بھی ماضی حال اور مستقبل کے واقعات کا عمل جاری رہتا ہے۔ یہ بظاہر سادہ
سی تحریر بہت پیچیدہ اور حرکت سے بھرپور ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے
افسانہ نگار کو چاہئے کہ وہ داستانی زبان استعمال کرے۔ ہمارے شعرا کو جب
تیر کی نقل سوجھتی ہے تو "آؤ ہو، جاؤ ہو" "چمن کے بیچ" لکھ کر خوش ہو لیتے
ہیں کہ ہم نے حق ادا کر دیا اور نثر نگاروں کو جب داستانی رنگ اپنانا ہوتا ہے
تو وہ صاحبو "قصہ کچھ یوں ہے" "اے مرد نیک نہاد" وغیرہ قسم کے فقرے لکھ
کر سمجھتے ہیں کہ ہم نے "بوستان خیال" دوبارہ لکھ دی۔ میں تو ان ترکیبوں کو
اپنانے کی سفارش کر رہا ہوں جن میں سے بعض کو ہم نے مندرجہ بالا عبارت
میں دیکھا۔ بیانیہ کی ایسی بہت سی ترکیبیں قرۃ العین حیدر نے استعمال کی
ہیں اور بڑی خوبی کے ساتھ۔ انھوں نے داستان گویوں کی اس ترکیب کو سمجھ
لیا ہے کہ افسانہ حرکت سے عبارت ہے اور حرکت کا راز زمانے کی SIMUL-
TANEOUSLY میں ہے۔ م۔ ق۔ حال لکھتے ہیں۔

"وہ جگہ دیوتاؤں اور دیویوں سے بھر گئی۔ ان کے ہمراہ
اگر رشی منی تھے تو بھوت اور اسور بھی تھے۔ بہ ہیئا عجیب
وحشیانہ ڈھنگ سے جھانجھ پیٹ رہے تھے۔ وشنو ڈھول بجا
رہے تھے۔ سرسوتی وینا کے تاروں کو چھیڑ رہی تھی اور
اندر مری کی تان اڑا رہے تھے اور بھوت اسور بدمست

بر کر محو رقص تھے۔ نٹ راج کی جٹا طوفان کی زد میں
آئے درختوں کی طرح دیوانہ وار جھوم رہی تھی۔"

یہاں افسانہ نگار کو علامتیں جمع کرنے کا اتنا شوق ہے کہ انہیں عبارت بنانے کی زحمت نہیں۔ اسی طرح کہ احمد حسین قمر کی طرح ماضی، حال اور مستقبل سے ادغام کے ساتھ لکھے تو فرق معلوم ہو جاتے ہیں۔ مظہر الزماں خاں کی عبارت میں زیادہ تسلسل ہے اگر حرکت بڑھ جائے تو ان کے امکانات اور روشن ہوں۔

نئے افسانہ نگاروں نے پریم چندی افسانے کو مسترد کر کے ادب کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس نے بڑی قربانیاں دے کر یہ سبق سیکھا ہے کہ کردار محض ایک کھونٹی ہے جس پر کسی بھی قسم کا لباس ٹانگا جا سکتا ہے لیکن پریم چندی افسانے سے اس کو ابھی پوری طرح گلو خلاصی نہیں ملی ہے۔ دوسری طرف اسے نثری نظم کا خطرہ ہے۔ نثر کا ہفت خواں طے نہ کر سکنے کے باعث اس کا ذہن نثری نظم کے نخلستان میں ٹھہرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نثری نظم میں آسانی یہ ہے کہ بات کم لفظوں میں کہہ دی جاتی ہے۔ لیکن افسانہ لفاظی مانگتا ہے۔ پروست نے یہ بات سمجھتے سمجھتے بیس برس لگا دیے۔ ہمارے افسانہ نگاروں کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، اردو افسانے میں مزدور کی پیش کش، اردو افسانے میں عورت کی پیش کش، اردو افسانے میں نفسیات، اردو افسانے میں فلسفہ۔ یہ سب تو ہو چکا۔ اب ذرا واقعہ بیان ہو جائے۔

■■

ایجنٹ اور خریدار حضرات سے اپیل

ہمارے قارئین کو یاد ہوگا کہ آج سے تقریباً بیس سال قبل جب شب خون کا اجرا ہوا تھا تو ہم نے اس کی سالانہ قیمت محض دس روپیہ اور فی شمارہ ایک روپیہ رکھی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج اپریل ۱۹۸۶ء میں تمام اشیا کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاک خرچ میں خاصا اضافہ ہو چکا ہے۔ ہم نے پچھلے کئی برسوں میں شب خون کی قیمت کی سطح ایسی رکھنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے قارئین پر کم سے کم بار پڑے اور ہمارا خسارہ بھی اتنا نہ بڑھ جائے کہ ہمیں پرچہ ہی بند کرنا پڑے۔

کاغذ کی گرانی کے باوجود ہم نے اس شمارے سے بجائے نیوز پرنٹ کے اور ینٹ کاغذ پر طباعت شروع کر دی ہے اور سرورق کے لئے بھی پہلے سے بہتر کاغذ استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس لئے آئندہ شمارہ یعنی شمارہ ۱۴۲ سے شب خون کے ایک پرچے کی قیمت چار روپے اور سالانہ پینتالیس روپے ہوگی۔ ایجنٹ اور خریدار حضرات نوٹ فرمالیں۔

امید ہے فی شمارہ صرف پچاس پیسے کا اضافہ ہمارے قارئین کے لئے بار خاطر نہ ہوگا۔

جو صاحبان اس شمارے یعنی شمارہ ۱۴۱ سے خریداری شروع کریں گے یا تجدید خریداری کریں گے ان سے پرانی قیمت ہی لی جائے گی۔

اردو ماہنامہ شب خون، ۳۱۳۔ رانی منڈی، الہ آباد

دھوپ

غیاث احمد گدی

دھوپ گہری، تیکھی، تمام عالم سنگ وحشت تپیدہ تپیدہ موسم شعلہ بداماں کہ درختوں نے ہریالی اتار، مدت ہوئی، حراں کا خاکستری لباس زیب تن کر لیا ہے اور آسمان کی سمت مسلسل تکے جا رہے ہیں۔

ہر درد بے کراں، ہر سانس شمشیر برہنہ۔

کلیجے کو کاٹتی، چیرتی وجود سے بے برگ و گیاہ، ریگستان میں اترتی، اترتی، اترتی جا رہی ہے۔ جہاں دور تک دھول ہی دھول ہے اور کچھ نہیں،

لیکن دل ہے کہ بدستور تڑپتا ہے۔ وقت کی مانند اسے ذرا قرار نہیں، ٹھہراؤ نہیں، ٹھہراؤ نہیں۔

گرم دھوپ میں سلگتے ہوئے مٹیلے آسمان کے نیچے بکھرے بے یار و مددگار ستم رسیدہ جھونپڑیاں اور ان میں رہنے والے بے نور آنکھوں اور افسردہ دل افسانوں کے لبوں سے گرم، دبیز گاڑھا دھواں، احساسات میں دردناک کیلیں ٹھونکتا، پھولتا کرتا، افسردہ ماحول کو حوصلہ، گہرا گہرا اور گہرا ہوتا، بکھری مایوسیوں کو مزدوں کرتا چلا جا رہا ہے اور آس پاس سارے میں دھوپ دھوپ اور دھوپ بکھری تڑپ رہی ہے

ستم رسیدہ جھونپڑی میں دو بوڑھی ٹھنڈی، بے آب آنکھیں، ان آنکھوں میں تیرتی ہوئی اداس الجھی الجھی سی کیفیت، دکھ درد اور افسردہ احساسات کے نازک موڑ پر ٹھہری ہوئی بے نور نگاہیں، دریچے سے باہر جہاں دھول اڑاتی، سلگتی، تپتی تپاتی فضا میں تیرتی ہوئی، ڈولتی ہوئی گرم سلاخ ہوا کے درمیان حراں کے خاکستری لباس زیب تن کیے ہوئے بے برگ و گیاہ درختوں کی تڑختی جلد سے محروم ہوتی گرد آلود شاخوں پر گرسنہ گدھوں کو دیکھ کر سلگ سلگ اٹھتی ہیں ـــــ

بے آب بوڑھی آنکھیں کچھ محسوس کر کے پھیلتی ہیں، آنکھوں میں ڈوبتی دھند جہاں تہاں سے چھٹتی ہے، لمحہ بھر بعد پھر خیمہ تان دیتی ہے۔

افسردہ آنکھیں اپنے آپ میں ڈوب جاتی ہیں اور گہرے اندھیرے میں کچھ ڈھونڈتی ہوئی بے قراریوں کا زہر اس گھونٹ لیتی ہیں۔

درختوں پر بیٹھے گرسنہ گدھوں کا غول نیچے زمین کی جانب گہری بھوکی آنکھوں سے تک رہے ہیں۔ بار بار چونچ کو شاخوں پر تیز کرتے ہیں اور ایک جگہ سے پھدک کر دوسری جگہ آ جا رہے ہیں۔ لہو کے انتظار نے ان کی آنکھوں میں چمک پیدا کر رکھی ہے۔

نیچے دھول اڑاتے کچے فرش پر بے آب آنکھیں موندے گردن کے زخم کی ٹیسیں سہتا، بیل، وہ بیل جو کل تک کولھو میں جتتا سارا سارا دن سرسوں کی رگوں سے سوں تیل نچوڑ کر رکھ دیتا تھا۔ تھوتھا ریں میں "آ زے موت کے انتظار میں کراہتے دبے ہوا سے بے رحم جھونکوں کو سہمی سہمی سی سانس لے رہا ہے۔

برسوں کولھو میں جتے رہنے کے سبب اس کی گردن پر مدگو شت جمع ہو گیا تھا جو سخت پتھر کی مانند جگہ جگہ سے تڑختا ہے۔ جسم کے اندر ہی اندر پیپ کھلتی گئی، گردن کے نچھلے گوشت کو چھیدتی پھاڑتی باہر نکل آئی ہے اور سیکڑوں ننھے ننھے سوراخوں میں جھانکتی جس پر ان گنت مکھیاں ٹوٹی پڑ رہی ہیں لیکن قریب المرگ بیل درد کے احساسات سے دور، بے حس و حرکت پڑا ہے۔ اس کی سرد آنکھوں سے آہستہ آہستہ زرد پانی بہہ کر زمین

کی ڈھول کو ختم کرتا جا رہا ہے۔

ہوں کے انتظار میں اس کی سانس ٹھہر ٹھہر کر چل رہی ہے۔

سامنے والی سنسان سڑک پر فوجیوں کے بھاری بھرکم بوٹوں سے پچ پچ کی آواز اندیشوں کے جہان درد کو بیدار کرتی ہے

سارے ماحول پر خوف و ہراس کا روح فرسا سناٹا پھیلتا پھیلتا دلوں کو گرفت میں لے لیتا ہے لیکن حبس کے باعث برگ و گیاہ درخت پر بیٹھے ہوئے گدھوں کی آنکھوں میں گرسنہ چمک فزوں تر ہے۔

بوڑھی ٹھنڈی بے آب آنکھوں کی گدلاہٹ کنتی ہے؟ چھٹتی ہے، تھرتھراتا ہوا ناتواں ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھتا ہے، بند مٹھی چھتری کی طرح کھلتی ہے اور آنکھوں کے سامنے بکھر جاتی ہے

آنکھوں میں ٹھہرا ہوا درد پگھلتا ہے اور نمی بن کر کناروں پر ٹھہر جاتا ہے۔
بوڑھے ٹھنڈے بے جان ہونٹوں پر جمی ہوئی پپڑی کی ایک پرت ٹوٹ کر نیچے گر جاتی ہے۔
خشک زبان ہونٹوں پر اس کو ڈھونڈ کر واپس اندر منہ میں چلی جاتی ہے جہاں مزا ذائقہ لعاب بھی خشک ہو چکا ہے۔

اوپر درختوں پر بیٹھے گدھوں کی آنکھوں میں گرسنگی فزوں ہوتی جا رہی ہے اور گرم سفاک ہواؤں کے ذہن سے سڑنے کی لاشیں گندی ہوتی محسوس ہوتی ہیں ——

وہ بوڑھی بے آب آنکھیں جھپکتی ہیں اور لمحہ بھر میں درد سے بھر جاتی ہیں۔

ٹھیک اسی وقت بیل کے قریب فرش پر کھیلتا وہ سات سالہ بچہ دکھائی دیتا ہے جو کھلا نہیں بیٹھا اور ہر چیز کو گھور گھور کر دیکھتا ہے۔ سونگھتا ہے۔ ہر چیز کو پوچھتا ہے اور اگر اسے جواب نہیں ملتا ہے تو اسے آپ کو کھسوٹ ڈالتا ہے جیسے دیکھتے ہی بوڑھی ٹھنڈی آنکھوں میں جانے کہاں سے چمک آ جاتی ہے اور بوڑھی ٹھنڈی رگوں میں لہو رواں ہو جاتا ہے بوڑھا ٹھنڈا ہاتھ اچانک خلا میں یوں لٹکتا ہے جیسے کسی نظر نہ آنے والی شے کو گرفت میں لے لینا چاہتا ہو دوڑ کر پکڑنا چاہتا ہو ....

چاروں سمت سے سمٹ کر دبوچ لینا چاہتا ہو۔

اچانک زوردار گرم ہوا کا پتھریلا جھونکا اٹھتا ہے اور سمت جہاں بگولے کی صورت آس پاس کی ساری چیزوں کو نگلتا دوڑتا جو رقص کا سا سماں

پیدا کرتا ہے جس کے باعث آس پاس کی ساری اشیاء ذرا دیر کے لئے تھرا جاتی ہیں۔ عالم پر نزاع کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ دور تک کلیجے سے تار سا کھنچتا ہی چلا جاتا ہے۔ تھمی گہری لیکن دھوپ میں سلگتی کسی جھونپڑی کے اندر سے دل دوز چیخ اٹھتی ہے اور گرد اور دھول میں لتھڑے ماحول کو پھلانگتی ہوئی بوڑھی بدن چھاتی کے لق و دق ویرانے میں برچھی گاڑ دیتی ہے۔ بوڑھا ٹھنڈا ہاتھ چھاتی کو سہلاتا ہے۔

بوڑھی ٹھنڈی آنکھوں کی کائی ذرا دیر کو پھٹتی ہے۔ لہو آنکھوں کی دھول آہستہ سے بیٹھتی ہے۔ سنسان خاموش سڑک پر بھاری بھرکم جوتوں کی بھاری بھرکم بے رحم ظالم آواز سنائی دیتی ہے اور پچ پچ، پچ پچ آواز دلوں میں دہشت جگاتی گونجتی رہتی ہے۔ درختوں پر اونگھتے ہوئے مردہ خور پرندوں کے حلق کی سرسراہٹ فزوں اور آنکھوں کی چمک فزوں تر ہو جاتی ہے۔

باہر ایک اور گرم بگولہ چکر کاٹتا ہوا عفریت کی طرح مشرق کی جانب نکل جاتا ہے اور سارے ماحول کو تتر بتر کر جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے جس کے باعث فضا ایندھن کی طرح سلگ اٹھتی ہے۔

بھاری نوکیلے قدموں کی دہشت ناک چاپ بھاری بھرکم الاپوں جیپوں کی دہشت ناک گھڑگھڑاہٹ کے درمیان پھر وہی زچہ کی آگ میں سلگتی ہوئی چیخ سنائی دیتی ہے۔ چیخ جھنجھوڑتی دور تک گونجتی ہوئی ہواؤں کو چھیدتی چھیدتی کائنات کو لپیٹ میں لے لیتی ہے تب وقت کی سانس کی آمد و رفت میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔
گویا تخلیق کا کرب اور درد کا احساس سارے پر مسلط ہو گیا ہو۔

"شاید بچہ مر گیا ہے ... ... " دائی تشویش کا اظہار کرتی ہے۔

"پیٹ میرا ہو گا۔"

تشویش گہری ہو جاتی ہے۔ دائی پھولے ہوئے پیٹ پر آہستہ آہستہ شفقت سے ہاتھ پھیرتی ہے۔ پیٹ میں لگاتار چھپے والے کچھ کے ماحول کو توڑ دینا چاہتی ہے جو اندر ہی اندر حاملہ عورت کی ناف میں دھنستا ہی جا رہا ہے۔ سارا عالم تاریکی میں ڈوبتا تھکتے کھولتے ہوئے سمندر کی مانند ہو گیا ہے۔

عورت پر وحشت طاری ہے۔ وہ کرب کے آخری سرے پر گہرے تاریک کنوئیں میں جھانک کر دیکھتی ہے اندھیرے میں خوفناک ظلمات کے اتھاہ گہرائی میں۔

"کوئی ہے .... ؟"

"کوئی نہیں .... "

"کوئی نہیں ...."

پیڑوں میں چھپے والی برچھی دور تک اتر گئی ہے۔ عورت بے قرار ہو کر پھر چیخ پڑتی ہے۔ سارا عالم اس گہری چیخ کی لپیٹ میں لمحہ بھر کے لئے ساکت ہو کر کراہ اٹھتا ہے۔

کرب میں لپٹی ہوئی لہو رنگ چیخ دور تک برچھی کی انی کی طرح ماحول کو چھیدتی بوڑھی چھاتی میں ایک بار پھر اتر جاتی ہے۔ لرزتا ہوا تھرتھراتا ہوا ہاتھ ویران چھاتی کے سناٹے میں برچھی کی انی کو تلاش کرتا ہے مگر وہ تو اندر اتر چکی ہے۔

ٹھنڈی بوڑھی بے آب آنکھیں درد سے بند ہو جاتی ہیں۔ گرم پانی کا قطرہ ٹوٹ کر آنکھوں سے باہر رخساروں پر پھیل جاتا ہے۔

ذرا دیر بعد تاریک اور روشن خطوط کے پرپیچ تکرار سے بوڑھی آنکھیں پھر کھلتی ہیں اور دریچے کے باہر درختوں پر بیٹھے ہوئے گدھوں کے غول کو، پھر فرش پر خاک بسر نیم مردہ بیل کو تکتی ہیں جو ہر پل کے انتظار میں سانس کی آمد و رفت گن رہا ہوتا ہے جس کے جسم میں کوئی تڑپ نہیں کوئی آگ نہیں۔ سرد بے جان مایوسیوں کی اتھاہ گہرائی میں غوطہ زن !

تبھی بیل کی گردن کے بدگوشت پر بھدا کا کوا بیٹھ جاتا ہے اور پیپ سے بجبجائے ہوئے سیکڑوں سوراخوں میں چونچ مارنے لگتا ہے۔ سیاہی مائل پیپ آلود خون سوراخوں سے ابل کر گردن کے نیچے بہنے لگتا ہے۔ وہیں دھوئیں میں کھیلتا ہوا بچہ بیل کے بدگوشت پر پھدکتا اور زخم پر چونچ مارتے کوا کو دیکھتا ہے اور اٹھ کر ہش ہش کر کے کوا کو بھگاتا ہے۔ ہش ...... بھاگ جاؤ، بھاگ جاؤ ...

کوا ذرا دیر کو اڑ کر بیل کی پیٹھ پر بیٹھ جاتا ہے۔ پھر گردن کے بدگوشت پر حسب دستور چونچ مارنے لگتا ہے۔ پیپ اور سیاہی مائل لہو پھر بہنا شروع ہو جاتا ہے، جسے دیکھ کر نوعمر لڑکے کی آنکھوں میں آگ سی روشن ہو اٹھتی ہے۔

دونوں بوڑھی بے تاب آنکھوں میں منجمد درد پگھلنے لگتا ہے۔ نگاہیں دریچے سے باہر کے خاموش سنسان ماحول کی بے حسی سے ہٹ کر کوٹھری کے اندر جھلنگ چارپائیوں پر بے فکری کی نیند سوئے ہوئے جوان بیٹوں کے ٹھنڈے جسم پر ایک لمحہ کو ٹھہرتی ہیں جو سہنے اور سہتے رہنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ آنکھوں میں پگھلتا ہوا نامعلوم درد پھر منجمد ہونے لگتا ہے تبھی باہر والا نوعمر بچہ بھاگتا ہوا اندر آتا ہے اور چارپائی پر بے فکری کی نیند سوئے جوان جسموں کو جھنجھوڑنے لگتا ہے۔

" اٹھو! اٹھو! "

" جلدی اٹھو بیل مر جائے گا !! "

" اٹھو! بیل مر جائے گا !!! "

' مر جائے گا ____ !!!! وہ زور زور سے جھنجھوڑنے، چیخنے لگتا ہے۔

" مر جانے دو، مر جانے دو" سوئے ہوئے جسم بے فکری سے کروٹ بدل لیتے ہیں" وہ اب نہیں بچے گا۔

نہیں ... نہیں۔ ایں ایں! بچہ چیختا ہوا بھاگ کر بوڑھے کے سرد بے جان ہاتھوں کو تھام لیتا ہے۔ بوڑھی انگلیاں بچے کے ہاتھ کو پکڑ کر دھڑکتے سینے پر رکھ لیتی ہیں اور پھر کمسن بچے کے سارے جسم پر سرسراتی ہوئی اس کے ہونٹوں کو چوم لیتی ہیں۔ تبھی دو سوکھی پپڑی جمے ہونٹ تھرتھراتے ہیں اور ایک لفظ جو سیکڑوں، ہزاروں لفظوں پر بھاری ہے۔ سنائی دیتا ہے۔

" نہیں ۔ ایں ۔ ایں ۔ ایں .... "

" نہیں، ہرگز نہیں "

کہتا ہے جیسے سارے کو پکارتا ہوا عزم سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے"۔ پھر بوڑھے کے تھکے ہوئے جہاں گرد پاؤں میں جنبش ہوتی ہے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا کوٹھری کے کونے تک جاتا ہے۔

بے آب آنکھیں خلا میں دیر تک کسی نامعلوم شے کی تلاش میں بھٹکتی رہتی ہیں۔ پھر آہستہ سے بند ہو جاتی ہیں۔ کنارے پر کسی دکھتی ہے مگر ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلتی، سکڑتی، سمٹتی ہے، پھر پھیل جاتی ہے۔ بوڑھا ہاتھ تھرتھراتا ہوا خمائل سے بھری بوتل کو پکڑ کر کمسن بچے کے نوخیز ہاتھوں کے حوالے کرتا ہے۔ بوڑھی آنکھیں نوخیز آنکھوں سے کچھ کہتی ہیں۔ نوخیز آنکھوں میں ایک خفیف سی چمک پیدا ہوتی ہے اور بچہ بوتل تھامے کوٹھری سے باہر نکل جاتا ہے۔

باہر جہاں تیز تیکھی دھوپ کی ہنوز حکمرانی ہے۔

بوڑھی ٹھنڈی نگاہیں ماحول کا جائزہ لینے کے لئے چاروں اور حرکت کرتی

ہیں اور آس پاس کی ساری بے جان چیزوں کے گدرتی دریچے سے باہر اجاڑ حزاں رسیدہ درخت کے بدرنگ خاکستری لباس کو سہلاتی گدھوں کو جھنجھوڑتی ہوئی، ہولی کے انتظار میں بے حسی کی بھاری چٹان کے نیچے بے سدھ پڑے نیم مردہ بیل کے کندھے کے مدگوشت کے سینکڑوں سوراخوں کو چومنے لگتی ہیں۔ موت اور مایوسی کا سایہ سا گذرتا ہے۔ مگر ذرا دیر میں آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

کم سن بچہ صائل کی بوتل لئے ذرا دیر کے لئے ٹھٹھک کر ادیر گدھوں کو دیکھتا ہے پھر ذہن کو جھٹک کر نیم مردہ بیل کے زخموں کو دیکھتا ہے جن سے سیاہی مائل پیپ آلود خون لگاتار بہہ رہا ہے۔

بچہ ذرا جھجھکتا ہے عین اسی وقت بوڑھی آنکھوں کی یاد آتی ہے۔
اس یقین کی یاد آتی ہے، جو آنکھوں کے کناروں پر ٹھہرا ہوا ہے اور وہ آگے بڑھ کر بیل کے مدگوشت پر کے سینکڑوں سوراخوں کے منہ پر فسائل کی بوتل انڈیل دیتا ہے۔
نیم مردہ بیل کے زخموں کے سینکڑوں پیپ سے تھماتے ہوئے سوراخوں میں کلبلاہٹ ہوتی ہے۔

اس کے ساکت نیم مردہ جسم میں جنبش ہوتی ہے، ہڈیوں سے لگی، مدرنگ کھال سہم سہم جاتی ہے۔

بوڑھی بے آب آنکھیں چمکتی ہیں۔ بہت دور گہرائیوں میں اتر کر سمے اندھیرے میں اتر جاتی ہیں — نوعمر آنکھوں میں بھی حیرت، مسرت اور امید کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔

ہولی کے انتظار میں پل پل لحہ لحہ موت کے اندھیرے میں اترتے بیل کے جسم میں دھیتا جان سی آجاتی ہے۔ یک بارگی وہ گردن کو جھٹکتا ہے۔ درد کی ٹیس اس کے سارے وجود کو دہلاتی ہے کہ ایک دم اسے سارے جسم کو زور سے فرش پر گرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا ہے لڑکھڑا لڑکھڑا تا ہے تماسہ بھاگتا ہے۔ اچھلتا ہے کودتا ہے تڑپتا ہے اور شدت درد میں حزاں رسیدہ درخت کے موٹے تنے سے ٹکرا جاتا ہے۔
درخت جڑوں سمیت دہل جاتا ہے اس کی خشک شاخوں پر بیٹھے ہوئے گدھوں کا غول گھبرا کر ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ آپس میں الجھ الجھ کر بدحواس ہو اٹھتے ہیں گرتے ہیں پڑتے ہیں۔ بھاگتے اچھلتے بیل کی ٹھوکروں سے چاروں سمت دھول ہی دھول دکھائی دیتی ہے، تبھی نومولود بچے کے رونے کی آواز دھول میں لت پت خاموشیوں، مایوسیوں اور بے رحم سناٹے کو چیرتی، چھیدتی، لرزتی، کانپتی تاریک آسمانوں پر سپید دودھیائی لکیر بناتی دور تک حتیٰ کہ جہاں توپوں لاریوں کی گھڑگھڑاہٹ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، پہنچتی ہے۔
بوڑھی ٹھنڈی بے آب آنکھیں جو لمحہ بھر میں اس کے چہرے سے ہوتے وجود کے ذرے ذرے کو اجالتی ساری کائنات کے محبوب سے خوب صورت جسم کو چومتی، چومتی، نوعمر آنکھوں میں ٹھہر جاتی ہیں۔

اس کی بوڑھی تھکی ہوئی اندھی سماعت نومولود آواز کے جگمگاتے چراغوں سے روشن ہو کر افق تا افق روشنی کا ہی روشنی، نور ہی نور، اجالا ہی اجالا پھیلاتی ہے۔
دھوپ گہری، تیکھی، تمام عالم سنگ و خشت، تپیدہ تپیدہ، موسم شعلہ بداماں ....

ہر سانس شمشیر برہنہ، کلیجے کو کاٹتی، چھیدتی، وجود کے بے برگ و گیاہ اندھیرے میں اترتی چلی جاتی ہے اور ننھے ننھے بے شمار چراغوں کی برات سجائے اندر ہی اندر ذرے ذرے کو اجالتی، چمکاتی نئے جہانوں کا پتہ دیتی ہے۔

▲▲

پاگل کتّے کی کھوج

احمد ہمیش

کچھ سال ہوئے ہمارے شہروں میں سے ایک شہر میں بظاہر ایک دن نکلا تھا یا محض اسے باور کرانے کے لئے ایک سویرا بھی ہوا تھا مگر کسی نے یہ فرض کر کے کہ وہ کوئی دن نہیں تھا یا وہ کسی دن کا سویرا نہیں تھا، شہر کے مرکزی ایریا میں ٹھیک چوراہے پر ایک بلیک بورڈ رکھ دیا تھا۔ اس پر ایک عبارت درج تھی جیاک سے لکھی ہوئی عبارت کے الفاظ بہت نمایاں تھے۔

یہ ایک کئی سال لمبی رات ہے اور اس رات کو ایک پاگل کتے نے کاٹ لیا ہے
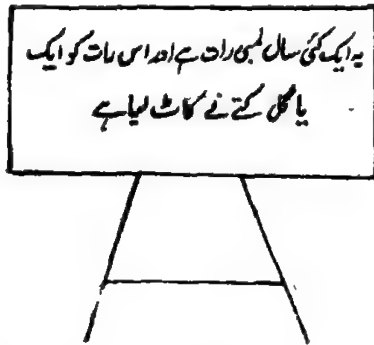
یہاں یہ یاد رہے کہ بلیک بورڈ کے پیچھے والی روڈ شہر کے میئر کی کوٹھی کی طرف جاتی تھی بلکہ اسی طرف اسپتالوں، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی کا ایریا تھا۔ اس کے دائیں طرف والی روڈ کی تختی سے گورنر ہاؤس، سکریٹریٹ اور چھوٹے بڑے سرکاری دفتروں یہاں تک کہ سپریم کلاس، اپر کلاس اور اپر مڈل کلاس والوں کی ہاؤسنگ سوسائٹی کی نشان دہی ہوتی تھی جب کہ بائیں طرف والی روڈ کے سطحی منظر سے ملحق مڈل کلاس والوں کی کالونیاں تھیں مگر ان سے بہت پیچھے غریب پس ماندہ اجاڑ بستیاں تھیں۔ البتہ بلیک بورڈ کے سامنے والی روڈ کے سطحی منظر میں دور دور تک اس میں ایک گھنی ہوئی گنجان مارکٹ، سپر مارکٹ، اسٹاک ایکسچنج، مختلف اقسام کے مال تیار کرنے والی فیکٹریوں، مال گودام، بینکوں اور بیمہ کمپنیوں پر مشتمل جگمگاتی تعمیرات تھیں۔ اجتماعی نظر سے دیکھنے کی کوشش میں پورا شہر ٹاؤن پلاننگ سے محروم بلکہ غیر معتدلہ تناسبات کا منحوس ڈھیر دکھائی دیتا تھا۔ آئے دن ٹریفک حادثوں سے گھائل ہونے اور مرنے والوں کے سیریل کے اوپر دھول سے اٹے ہوئے پیڑ تھے۔ ان سے بھی اوپر ان گنت کتے اڑ رہے تھے۔ اور سب سے اوپر یعنی شہر کے انتہائی اوپر آسمان اکثر گدلا دکھائی دیتا تھا۔ ایسے میں بڑی سے بڑی اطلاع سے بہتوں کا چونک جانا ممکن نہیں تھا لیکن جس دن سانجھ ڈھلے بائیں طرف والی روڈ کے بہت پیچھے کی ایک غریب بستی میں ایک پاگل کتے نے بہت سے بچوں، نوجوان لڑکے

[illegible]

بھی ہو گیا تو شہر کے چاروں طرف لوگ چونک اٹھے۔ کتے کے کاٹے کے فوری علاج کے لئے متاثروں کو اسپتال لے جایا گیا۔ یہ بھی سننے اور دیکھنے میں آیا انھیں بچانے کی کوشش کی جاتی رہی۔ اسپتال کا عملہ رات کی سیاہی سے لڑتا رہا مگر کسی کو بھی مرنے سے بچایا نہیں جا سکا۔ اسپتال کے آس پاس ایک ادھیڑ عورت چیختی چلاتی بین کرتی پھرتی تھی کیوں کہ مرنے والوں میں زیادہ تعداد اس کے متعلقین کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بین سے ہی متاثر ہو کے کسی ہمدرد نے شہر کے چوراہے پر وہ بلیک بورڈ رکھ دیا اور قیاس غالب ہے کہ اس پر اسی نے وہ دل دہلانے والی عبارت لکھی۔ اس پر جس کی نظر

جاتی وہ وہیں ٹھٹھک کے کھڑا ہو جاتا۔ دیکھتے دیکھتے ایک بہت بڑی بھیڑ جمع ہو گئی۔ سرکاری اور غیر سرکاری کارندے بھی آ پہنچے۔ ہمدرد لوگوں کی اپیل میں سب سے بڑا مطالبہ پاگل کتے کی کھوج تھی۔

کئی والنٹیر بے سہاروں سے تن سے ہمت توڑے ہوئے پاگل کتے کی کھوج شروع کی۔ بار بار کی گمنام گلیوں قصائی گھروں، پولیس دوج کے تحفظ میں چلائے جانے والے جنگلوں اور گٹروں کے اڈوں ٹھکانوں میں بھی کھوج لگائی گئی۔ مگر کچھ پتہ نہیں چلا۔ ہاں اسی درمیان یہ چلا کہ اسپتال میں کتے کے کاٹنے سے بچنے والی ویکسین سرے سے ہی نہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر حیران کر دینے والا انکشاف یہ تھا کہ پاگل کتے نے لوگوں کو کاٹنے سے پہلے اسپتال سے ویکسین چرائی اس کے بعد لوگوں کو کاٹا پھر غائب ہو گیا۔

کھوج میں نکلے بہادروں کی ٹولیاں ایک ایک کر کے مایوس لوٹ آئیں۔ ایک بوڑھے کے سہارے اس کے سوالیہ چہروں کو دیکھ کر بس یہی کہا جا سکتا تھا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ قسم کے تسلط کے جمود کے خلاف ہمیشہ سے پروٹسٹ کرنے والوں نے نعرے لگائے ـــــ پاگل کتا کہاں ہے، جواب دو جواب دو۔ ایک بپھرے ہوئے نوجوان نے تو اپنے ساتھیوں کے کندھوں پر کھڑے ہو کر بر ملا لفظوں میں کتے کو اس کے محافظوں سمیت گولی مارنے کا چیلنج دیا۔ وہ اسی تفصیل سے گذرنے کو آگے کر بندوق لاٹھی چارج، آنسو گیس، فائرنگ اور کرفیو کے اندیشوں نے آلیا تھا۔ جانے کس طرح سے بھیڑ کو چیرتے ہوئے اس کہانی کا مصنف آنکلا اور مورچے کے سامنے اس طرح کھڑا ہو گیا اس کا چہرہ بھیڑ کے درمیان نمایاں دکھائی دے رہا تھا البتہ پورے اچانک پیدا ہوئی کئی خود اعتمادی اور ہمت کا ملا جلا تاثر ظاہر تھا۔

وہ بھیڑ کو مخاطب کر کے بولا

"لوگو! میں جانتا ہوں کہ وہ پاگل کتا کہاں ہے؟ وہ کہیں غائب نہیں ہوا وہ یہیں کہیں موجود ہے لیکن اگر میں اس کی نشاندہی کر دوں تو سنسر لگ جائے گا۔"

▲▲

نوٹ: یہ کہانی کرناٹک کے ردیہ میں بھی ہے اس میں بہت سے لوگوں اور کرداروں کو غیر لسانی شدہ پروگرام یا اسکیم میں شامل ہونے کی آزادی ہے۔

سمندر مجھے بلاتا ہے (۱)

رشید امجد

مرشد نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور دعا مانگی "اے خدا مجھے احدیت کے سمندر کی گہرائیوں میں داخل کر۔"

اس نے تاسف سے سر ہلایا "لیکن میں تو ابھی دنیا کے سمندر میں بھی نہیں اتر سکا۔"

مرشد مسکرایا — "دنیا بھی تو وہی ہے۔"

اس نے پوچھا "اگر دنیا بھی وہی ہے تو میں الگ کیوں ہوں۔"

مرشد پھر مسکرایا — "تم الگ کہاں ہو سمندر تمھارے اندر بھی ہے اور باہر بھی۔"

اس نے اپنے آپ کو تولا — "لیکن میرے اندر تو خلا ہے اور باہر ایک سناٹا۔"

مرشد نے سر ہلایا — "یہ سب اس کی ادائیں ہیں۔"

اس نے پوچھا — "کیسی ادائیں — یہ ادا ہے تو مدعا کیا ہے؟"

مرشد نے کہا — "میں تمھیں ایک قصہ سناتا ہوں۔" ایک مرید نے اپنے شیخ سے کہا "اے شیخ! میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں جو تیرا بھی شیخ ہے۔"

شیخ نے ایک لمحہ تردد کیا پھر بولے — "تو جاؤ وہ جو بلند پہاڑ ہے وہ تمھیں اس کی چوٹی پر ملے گا۔" مرید کئی مسافتوں کی صعوبتیں سہتا چوٹی پر پہنچا تو دیکھا کچھ لوگ وضو کر رہے ہیں وہ بھی ان میں شامل ہو گیا۔ وضو کر کے لوگ کسی کا انتظار کرنے لگے۔ اس نے پوچھا —

"اے لوگو! تم کس کے منتظر ہو؟" وہ بولے — "اس کے جو شیخ ہی شیخ ہے۔ وہی یہاں امامت کراتا ہے۔ اتنے میں ایک شخص دائیں جانب سے نمودار ہوا۔ لوگ صفیں سیدھی کرنے لگے۔ آنے والا امام کی جگہ کھڑا ہو گیا۔ مرید نے بڑی کوشش کی کہ اسے دیکھے لیکن صفیں سیدھی ہو گئی تھیں اور وہ آخری صف میں تھا۔ نماز پڑھا کر جوں ہی امام سیدھا ہوا تو مرید نے دیکھا۔ وہ تو شیخ ہیں۔ دوڑ کر ان کے قریب گیا اور کہا — "شیخ اگر یہ آپ ہیں تو میرا سفر کس لئے؟"

شیخ مسکرائے — "بغیر جستجو کے شیخ بھی شیخ نہیں رہتا۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

مرشد نے پوچھا "کیا سوچ رہے ہو؟"

اس نے کہا۔ "معلوم نہیں تماشا کیا ہے اور شیخ کیا ہے؟"

مرشد ہنسا پھر اس نے اپنا داہنا ہاتھ پانی میں ڈال کر ایک زندہ مچھلی نکالی پھر بایاں ہاتھ جلتے تنور میں ڈال کر اس میں سے بھی زندہ مچھلی نکالی اور کہنے لگا — "پانی سے تو ہر کوئی زندہ مچھلی نکال سکتا ہے۔ آگ سے زندہ مچھلی نکالنا اصل کام ہے۔"

اس نے کندھے اچکائے — "لیکن میں کیا کروں میرے لئے تو پانی اور آگ میں کوئی فرق نہیں ہے کہ سمندر میرے اندر بھی ہے اور باہر بھی۔"

مرشد نے سر ہلایا — "سمندر تو آگ بھی ہے اور پانی بھی۔ بس انا البحر اور انا الحق کا تماشا ہے اور سارے راستے فنا کی طرف جاتے ہیں۔"

اس نے پوچھا — "فنا کیا ہے؟"

مرشد کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری — "فنا جا سا ہے

ور جانے کے سارے راستے میں لوگ کھڑے ہیں۔"

اس نے انگلیوں پر گنا ــــــ "بیس تو ہو ہی جائیں گے۔"

"تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے ــ" بیوی نے غصے سے کہا ــــ آخری تاریخوں میں بیس آدمیوں کی چائے کا بند و بست کیسے ہوگا؟"

"لیکن۔"

"لیکن کیا، اب یہ چونچلے چھوڑ دو ــــ دودھ سات روپے اور چینی آٹھ روپے کلو ہو گئی ہے۔ آخر اس کی ضرورت کیا ہے۔"

وہ ایک لمحہ چپ رہا۔ پھر بولا ــــ "ضرورت تو ہے۔ بڑا صاحب نیا نیا آیا ہے اسی سہلے پی۔ آر۔ ہو جائے گی نوکری کرنا ہے تو یہ سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

اور اسے خیال آیا اسی بہانے اسٹینو سے ملاقات کی صورت بھی نکل آئے گی

"آؤ گی نا۔"

"ابھی جاؤں تو کیا ــــ تمھارے ارد گرد تمھارے بیوی بچے ہوں گے۔ میں آؤں بھی تو کس کے لئے اندر ہی اندر سلگنے کے لئے؟"

مرشد کھلکھلا کر ہنسا ــــ "اندر ہی اندر سلگنے کا اپنا ہی ایک مزہ ہے۔"

"لیکن جب کوئی امید ہی نہ ہو؟"

مرشد نے اسے گھورا ــــ "امید اندھیرے میں کھویا ہوا راستہ ہے۔"

"لیکن صبح کب ہوگی؟" وہ بڑبڑایا۔

"ابو آپ ہمیشہ دیر کر دیتے ہیں، میڈم کہتی ہیں کہ اگر کل سے وقت پر نہ آئے تو کلاس میں نہیں بیٹھنے دوں گی۔"

بیوی نے ناشتہ رکھتے ہوئے بھویں سکوڑیں ــــ "رات کو جلد سوئیں تو صبح وقت پر آنکھ کھلے نا ــــ پتہ نہیں کیا کرتے رہتے ہیں کبھی ایک کمرے میں جاتے ہیں کبھی دوسرے میں۔ خدا جانے کیا بے چینی ہے؟"

"بے چینی روح کی طلب ہے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا ــــ اور جانے میں کسے ڈھونڈتا ہوں، مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں وہ ہے کہاں؟

"کہیں بھی نہیں اور ہر جگہ۔" مرشد نے آہستہ سے کہا ــــ "بس اپنی عینک کے شیشے ٹھیک کرو۔"

اسٹینو نوٹس لے کر جانے لگی تو اس نے کہا ــــ "آج مجھے عینک بدلوانا ہے۔ شام کو ملو تو کہیں بیٹھ کر چائے پی لیں۔"

وہ ایک لمحہ چپ رہی، کچھ سوچا، پھر شانے اچکائے ــــ "ٹھیک ہے۔"

خوشی نما بے فکرے پرندے کی طرح اس کے وجود کے آسمان پر لمبی پتلی لکیر بناتی کہیں خلا میں کھو گئی۔

"اسے پا بھی لیا تو کیا، نہ پایا تو کیا ــــ شاید زندگی پانے اور نہ پانے ہی کے راستوں میں کہیں کہیں کوئی چھوٹا سا وقفہ ہے۔ اس وقفہ سے جلدی سے گذر جانا ہی اچھا ہے۔"

"کیوں اتنی مایوسی بھی کیوں؟" وہ پیالی میں چمچ ہلاتے ہوئے اسے مسلسل دیکھے گئی۔

"یہ بھی کیا ملنا"، اس نے ٹھنڈی آہ بھری ــــ "تھوڑی سی خوشی بھر وہی گھڑی؟"

"تم اتنے بیزار کیوں ہو؟ وہاں تمھارے بیوی بچے ہیں؟"

"یہ تم کہہ رہی ہو؟"

"کبھی کبھی سوچتی ہوں یہ راستے بھی کتنے عجیب ہیں، کہاں کہاں سے گھوم کر پھر ایک دوسرے میں جا چھپتے ہیں۔"

"تمھارے رشتے کی بات کیا ہوئی؟"

"چل رہی ہے۔"

"پھر تو ــــ تم مجھ سے نہیں ملو گی۔"

"کتنا عجیب ہے ایک ایسی عورت جسے تم نہیں جانتے اور ایک ایسا مرد جسے میں نہیں جانتی ــــ لیکن ہم ایک دوسرے کو اپنی جھوٹی محبتوں کا یقین دلاتے رہیں گے۔"

"زندگی ایک جھوٹ ہی ہے، جس کا یقین دلاتے دلاتے عمر بیت جاتی ہے۔"

وہ خاموشی سے چائے پیتی رہی، پھر بولی ــــ "اب کوئی سی ملاقات آخری ہو سکتی ہے، شاید یہی۔"

اس نے سر اٹھایا۔

وہ ناخن سے میز کریدتے ہوئے بولی ــــ کیا معلوم وہ مجھے

نوکری بھی کرنے دیتے ہیں یا۔"

دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

دفعتاً وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا ــــ "یہ تو آخر ایک دن ہونا ہی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے ــــ "تم کتنی بے رحمی سے یہ بات کہہ رہے ہو۔ پھر ایک لمحہ چپ رہی ــــ "لیکن تم ٹھیک ہی کہتے ہو، یہ تو ایک دن ہونا ہی ہے۔"

کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر بولی ــــ "بیٹی کا اب کیا حال ہے؟"

"بخار تو اتر گیا، ــــ ارے یاد آیا مجھے اس کے لئے دوا لینی ہے۔"

بیوی نے دوا لیتے ہوئے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھا ــــ

"کیا بات ہے آج کل تم بہت الجھے الجھے ہو؟"

اس نے شانے اچکائے ــــ "دھند میں راستہ نہیں مل رہا۔"

مرشد مسکرایا ــــ "دھند اور روشنی اسی کے روپ ہیں اور راستہ گم ہو جائے تو نہ روشنی روشنی ہے نہ دھند دھند۔"

"لیکن میرے پاس تو اب کچھ بھی نہیں رہا ــــ وہ بھی نوکری چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

مرشد نے اس کے شانے کو تھپتھپایا ــــ "جب اپنے پاس کچھ نہیں ہوتا تو ساری چیزیں دور بھاگتی ہیں، جتنا ان کی طرف لپکو اور دور ہوتی جاتی ہیں، یہی تو اسے جانے کا مرحلہ ہے۔"

"جان ہی گیا تو کیا کروں گا۔" اس نے تاسف سے سر ہلایا۔

"میرا تو اپنا آپ بھی میرے لئے اجنبی ہوتا جا رہا ہے۔"

مرشد کے ہونٹوں پر ایک عجیب مسکراہٹ ابھری ــــ "اپنے آپ سے اجنبی ہونا سفر کا آغاز ہے۔ مبارک ہو تمہارا سفر شروع ہوا۔"

پھر اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے ــــ "اے خدا! مجھے احدیت کے سمندر کی گہرائیوں میں داخل کر۔"

اس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن کچھ کہہ نہ سکا، اسے ایسے لگا جیسے سمندر اس کے اندر بھی ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور باہر بھی، اور وہ تن تنہا اس کی وسعتوں میں بہتا چلا جارہا ہے، بس بہتا ہی چلا جارہا ہے۔

سمندر مجھے بلاتا ہے (۲)

رشید امجد

مرشد نے سسکاری بھری اور کہا ــــ "جب میں قبرستان میں داخل ہوتا ہوں تو مجھ پر اک عجب مسرت انگیز کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔"

اس نے پوچھا ــــ "کیسے؟"

مرشد نے کہا ــــ "مُردے مجھے خوش آمدید کہتے اور جلد لوٹنے کی بشارت دیتے ہیں۔"

اس نے کہا ــــ "لیکن مجھے نہ تو کچھ دکھائی دیتا ہے نہ سنائی۔ میں تو سمندر میں بھی اترا تھا، لیکن اس نے مجھے ہر کنارہ پر اچھال دیا۔"

مرشد ہنسا ــــ "سمندر غیر کو اپنے اندر نہیں سموتا، تم غیر بن کر گئے تھے۔"

اس نے پوچھا ــــ "اپنا کیسے بنا جا سکتا ہے؟"

مرشد کے تبسم میں ایک ٹھہراؤ آیا ــــ "کنارہ کی خواہش دل سے نکال دو، اور اس کی آواز سنو۔"

"لیکن کیسے؟" اس نے مایوسی سے سر ہلایا ــــ "کچھ سنائی دے بھی تو۔"

"دیکھنے اور سننے کے لئے حوصلہ چاہئے اور حوصلہ قدم قدم کی ریاضت کی وصول ہے۔ تم نے تو ابھی یہ سفر شروع ہی نہیں کیا۔"

اس نے پوچھا ــــ "سفر کیسے شروع ہوگا؟"

مرشد نے لمحہ بھر توقف کیا، پھر بولا ــــ "سفر شروع نہیں کیا جاتا، بس ہو جاتا ہے، ایک مرشد کی ضرورت ہے جو سفارش کرے۔"

اس نے کندھے جھٹکے ــــ "فی الحال تو میرا معاملہ اسٹیبلشمنٹ (ESTABLISHMENT DIVISON) میں اٹکا ہوا ہے، سینیارٹی ٹھیک ہو جائے تو پرموشن بھی ــــ چار پانچ سو کا ایک دم فائدہ۔"

مرشد نے نفی میں سر ہلایا ــــ "وہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں، اور یہ تو دنیاوی معاملہ ہے، میں تمہیں صرف مسرت انگیز کپکپی سے روشناس کرا سکتا ہوں۔"

اس نے سر ہلایا ــــ "پہلے جی تو لوں، پھر لوٹنے کی بات بھی کر لوں گا۔"

"تم کبھی لوٹنے کی بات نہیں کر سکو گے۔" مرشد نے تاسف کیا ــــ "تم بہتے دریا میں ایک کمزور تنکا ہو۔"

اس نے کہا ــــ "دریا کی یہ حالت ہو تو تنکا کر بھی کیا سکتا ہے۔"

مرشد نے سر ہلایا ــــ "ٹھیک کہتے ہو۔ جب رواں ایک سیلاب کی شکل اختیار کر جائے تو اسے چھوٹے چھوٹے پتھروں سے نہیں روکا جا سکتا، اس کے لئے ایک بڑی فکر اور بڑی دانش کی ضرورت ہوتی ہے، اور ہم تو اب ایک فکری خلاء میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔"

"لیکن فکر و دانش کو کیا ہوا؟"

"فکر و دانش کو تو کچھ نہیں ہوا۔ ہم ہی IMMUNE ہو گئے ہیں۔"

اس نے کہا ــــ "تو پھر ہم یہ مکالمہ کس لئے کر رہے ہیں؟"

مرشد مسکرایا ——— "چلتی ڈھلوان پر اپنے قدموں کے جمے ہونے کے احساس کو برقرار رکھنے کے لئے ——— لیکن پھسلتی ہوئی ڈھلوان اور اس کے پیچھے اندھی کھائی نہ کچھ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں، اور ہم لمحہ لمحہ اس میں گر رہے ہیں، یہی ہمارے عہد کا مقدر ہے۔"

وہ چند لمحے چپ رہا پھر بولا ——— "لیکن میں گرنے سے پہلے ڈھلوان کے منظروں کو دیکھنا چاہتا ہوں، دنیا کو اسی حوالے سے سمجھنا چاہتا ہوں۔"

"تم دنیا کو سمجھنے لگو تو مجھے اور کیا چاہئے۔" بیوی نے ہونٹ سکوڑے ———

"تمھاری پوسٹ والوں نے دو دو کوٹھیاں بنائی ہیں اور تم ابھی تک کرائے کے مکان میں پڑے ہو۔"

اس نے شانے سکوڑے ——— "کیا فرق پڑتا ہے، جنھوں نے کوٹھیاں بنالیں اور جو کرائے کے مکاں میں ہیں، زندگی تو سب ہی کی گزر رہی ہے۔"

بیوی نے غصہ سے سر ہلایا ——— "ایسی درویشی ہے تو کرائے کا مکان بھی کس لئے، فٹ پاتھ ہی کافی ہے، آخر وہاں بھی تو لوگ رہتے ہی ہیں۔"

اس نے ٹھنڈی آہ بھری ——— "کیا کروں ایسا درویش بھی نہیں، کاش کسی ایک طرف ہو جاتا ——— آدھا دل ایک طرف ہے اور آدھا دوسری طرف، بس یہ دل کا معاملہ ہی تو عجیب ہے۔"

بیوی چند لمحے اسے گھورتی رہی پھر دفعتاً بولی ——— "تمھاری سٹینو ملی تھی۔"

"کہاں ——— کیسی تھی؟" اس نے بیتابی سے پوچھا۔

"تمھیں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟"

اس نے بیوی کو غور سے دیکھا، ایک لمحہ کے لئے محسوس ہوا جیسے وہ سب کچھ جانتی ہے۔"

"ابو! انھوں نے مجھے اور بھائی کو ٹافیوں کا پیکٹ بھی لے کر دیا ہے۔"

"اچھا ——— لیکن وہ تم لوگوں کو ملی کہاں۔"

"مارکیٹ میں ——— اپنے میاں کے ساتھ۔"

"کیسا ہے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"بڑی خوبصورت جوڑی ہے۔" بیوی کی نظریں اس پر مسلسل جمی ہوئی تھیں، پھر اس نے ٹھنڈی آہ بھری ——— "کبھی تم بھی مجھے اسی طرح ساتھ لے جاتے تھے، کیا زمانہ تھا۔"

"ابو! انکل تو بہت اچھے ہیں، بڑے خوبصورت، ہے نا امی" بیٹی ٹافیوں کا پیکٹ دکھاتے ہوئے بولی۔

اسے لگا جیسے کوئی سیاہ چیز تیزی سے اس کے سارے چہرے پر پھیلتی چلی جارہی ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" بیوی کی آواز میں بڑی گہرائی تھی۔ اس نے غور سے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی لیکن سارے لفظ گڈمڈ تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

شاید وہ سب کچھ جانتی ہے؟ یا شاید کچھ بھی نہیں ——— خدا جانے۔

اس نے مذبذب میں سر ہلایا اور اپنے اندر کے گھنے جنگل میں اتر گیا۔ گھنے درختوں کی ہری خوشبو چاروں طرف پھیل گئی۔ اس کا بدن ہریالی کے ذائقہ سے یک دم جاگ اٹھا، ایک لمبی سانس ——— تنہائی بھی کیا چیز ہے آدمی چاہے تو بھرے مجمع میں تنہا ہو جائے، ساری آوازیں یک دم سکوت میں بدل جاتی ہیں۔ پاس ہی سے ایک پرندہ پھڑپھڑا کر نکلا اور دل کی آنگن میں ناچنے لگا۔ مرلی کی تان چاروں طرف بکھر گئی۔

وہ تانوں کی لہروں پر قدم رکھتی آہستگی سے قریب آئی۔

"تم تو خوش ہو۔ ———" اس نے آنسوؤں بھری آواز میں پوچھا۔

"تمھیں میری خوشی پسند نہیں۔" اس کا چہرہ بھی آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔

"تمھاری خوشی ———" وہ بڑبڑایا۔ میں کتنا کمینہ ہوں کہ تمھاری خوشی سے بھی جلتا ہوں۔"

اور اسے لگا سارا کچھ ایک دم بھڑکتی آگ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ وہ دونوں آگ کی موسیقی پر ناچ رہے ہیں اور شعلوں کی لپکتی ہوئی رباب کے تان چاروں طرف دھمال ڈال رہی ہیں۔

یک دم رقص تھم گیا، گہری خاموشی چھا گئی ——— موت جیسی خاموشی

اس نے گھبرا کر سر جھٹکا ——— "کیا ہوا؟"

"میں تو بول بول کے بھی تھک گئی۔ بیوی نے بے زاری سے کہا ——
"اب تو تم نے ہوں ہاں کرنا بھی بند کر دیا ہے"۔
چند لمحے وہ چپ رہی پھر بولی —— "سمجھ میں نہیں آتا تمھیں ہوا
کیا ہے —— کبھی تم ——" اس کا گلا رندھ گیا —— "اب تو آنکھ
اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔"

اسے اپنا آپ اجنبی سا لگا —— ٹھاٹھیں مارتا سمندر یک دم دور
چلا گیا، مرشد کی آواز دھیمی پڑ گئی —— اس نے سر اٹھا کر غور سے بیوی اور
بچوں کو دیکھا —— "واقعی مجھے کیا ہو گیا ہے —— یہ میں کس راستہ
پر آنکلا ہوں۔"

چاروں طرف ایک گہری دھند ہے جس میں اس کا اپنا آپ بھی سائے
کی طرح لگ رہا ہے —— پھسلتی ڈھلوان پر اکھڑے قدموں کا تکلیف دہ
احساس، وہ کسے آوازیں دے رہا ہے۔ سمندر تو اس کے اندر ہے، وہ باہر
کسے تلاش کر رہا ہے —— ؟

چاروں طرف دھند ہی دھند ہے۔
کچھ دکھائی نہیں دیتا۔
بس دور کہیں وہ ایک لمحہ ہے، پھسلتی ڈھلوان پر وہ ایک قدم
جمانے کا خوش گوار احساس، زوال کے اس منہ زور سیلاب کے سامنے ایک چھوٹا سا پتھر۔

'یہ کیسا راستہ ہے —— ، راستہ ہے بھی کہ نہیں ؟'
'ایک گہری دھند'۔

"کیا سوچ رہے ہو ؟" بیوی کی آواز دور کہیں سے محسوس ہوئی۔
دھند کے اندر جھانکنے کی کوشش۔

اور دھند —— اور دھند۔

چند لمحے یہی کیفیت رہی۔ پھر اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ بیوی کے
کندھے پر رکھا اور بولا — کچھ بھی نہیں، بس ایک دو اہم مائلیں پینڈنگ
(PANDING) ہیں، ان ہی میں الجھا ہوا ہوں۔"

بیوی نے یقین اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں اس کی طرف دیکھا
—— "بچے آج کل آپ کو بہت یاد کر رہے ہیں، آج انھیں ایوب پارک
لے جائیں گے نا۔"

اس نے لمحہ بھر سوچا —— دھند میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر
دیکھنے کی آخری سعی کی، کچھ دکھائی نہ دیا تو چند لمحے چپ رہنے کے بعد بولا
—— "ٹھیک ہے"۔

بچوں نے بیک وقت ایک پرمسرت کلکاری ماری۔
— مرشد کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ یہی مسرت انگیز کیفیت وہ چھپا ہوا
لمحہ ہے جسے تلاش کرتے عمریں بیت جاتی ہیں۔"

اور اسے لگا جیسے مسرت انگیز کلکاری نے چاروں طرف پھیلی دھند
میں دراڑ سی ڈال دی ہے، ایک چھوٹا سا دروازہ کھول دیا ہے، تازہ ہوا
اور خوشبودار روشنی کا چھوٹا سا دروازہ۔ جس سے آگے چند ہی قدموں
پر سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

▲▲

سمندر مجھے بلاتا ہے (۳)

رشید امجد

اس نے ایک لمحہ توقف کیا پھر بولا ـــــ "یہ کہانی بہت الجھی ہوئی ہے، اس لئے اسے کسی ترتیب سے سنانا ممکن نہیں"۔

مرشد مسکرایا ـــــ "زندگی تو خود ایک بے ترتیب کہانی ہے، ہم سارا وقت اسے ترتیب دینے میں گزار دیتے ہیں اور ہم نے سنا ہیں، جب چیزوں میں ضرورت سے زیادہ ترتیب پیدا ہو جائے تو وہ ٹوٹ جاتی ہیں"۔

اس نے پوچھا ـــــ "تو پھر میں کہانی کہاں سے شروع کروں؟"

مرشد ہنسا ـــــ "کہانی شروع ہے۔ ہم اور تم اس کے چھوٹے چھوٹے کردار ہیں، جو اپنی مرضی سے نہ شروع کر سکتے ہیں نہ ختم"۔

اس نے کہا ـــــ "اگر ہم اتنے بے بس ہیں تو یہ کیسی کہانی اور کیسے کردار"۔

مرشد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا ـــــ "آؤ میں تمھیں اس کہانی کے شہر میں لے چلوں"۔

وہ شہر میں داخل ہوئے تو مرشد یکدم کہیں غائب ہو گیا، شہر اس کے سامنے تھا اور وہ اکیلا"۔

سامنے ایک کھلا میدان تھا، وہ آہستہ آہستہ میدان کے قریب پہنچا، دیکھا کہ میدان کے درمیان میں ایک صلیب گڑی ہے جس پر کوئی ٹنگا ہوا ہے، وہ گھبرا کر تیز تیز چلتا قریب پہنچا، صلیب پر ٹنگے نے اس کی چاپ سن کر آنکھیں کھولیں اور مسکرا کر بولا ـــــ "تم بھی پتھر مارنے آئے ہو"۔

اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھ آگے کئے ـــــ "میرے تو ہاتھ ہی خالی ہیں اور پھر میں کیوں پتھر ماروں گا؟"

صلیب والا ہنسا ـــــ "یہاں پتھر مارنے کے لئے کسی وجہ کا ہونا ضروری نہیں، ایک کو دیکھ کر دوسرا بھی شروع ہو جاتا ہے"۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا ـــــ "لیکن یہاں تو کوئی نہیں، لوگ کدھر چلے گئے"۔

صلیب والا چپ رہا پھر بولا ـــــ "وہ سارے واش بیسنوں کے سامنے کھڑے ہاتھ دھو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اس فیصلہ میں ان کا ہاتھ نہیں"۔

اس نے پوچھا ـــــ "کس فیصلہ میں؟"

"مجھے مصلوب کرنے کا فیصلہ"۔

"ان کا ہاتھ نہیں تو پھر یہ فیصلہ کس نے کیا ہے؟"

"انھوں نے ہی لیکن اپنی مرضی سے نہیں، بس ایک دوسرے کو دیکھ کر انھوں نے اپنے ہاتھ کھڑے کئے تھے۔ یہاں یہی ہوتا ہے، یہاں کسی کو معلوم نہیں وہ کیا کر رہا ہے، بس جو دوسرے کر رہے ہیں وہ بھی وہی کرتا ہے"۔

پھر اس نے آسمان کی طرف نظریں کیں ـــــ "اے خدا! ان کے کھیتوں میں فصلیں سرسبز اور لہلہاتی رہیں۔ ان کے دریاؤں میں پانی موجیں مارے اور ـــــ"

وہ دعا کے باقی لفظ سنے بغیر ہی وہاں سے بھاگ نکلا اور دوڑتا

ہوا سڑک پر آ گیا۔

لوگ ہر کام کرنے سے پہلے دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں، اسے لگا وہ سارے کسی پر اسرار شے کی گرفت میں ہیں۔ کیا یہ جادو کا شہر ہے؟ اور یہ سارے لوگ، لوگ ہیں بھی یا جادو کے پتلے ہیں، اگر یہ سارا کچھ جادو ہے تو سامری کہاں ہے؟

اس نے اپنے آپ کو ٹٹولا ——— "یہ جواب تو نہیں"۔

"اگر جواب ہے تو کتنا طویل اور اکتا دینے والا کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا"۔

یہاں ہر شخص نے استری کیا ہوا لباس پہنا ہوا ہے، لیکن اندر شکنیں ہی شکنیں۔

وہ آہستہ آہستہ شہر کے چوک میں ایستادہ مجسمہ کے سامنے پہنچ گیا۔

مجسمہ جگہ جگہ سے تڑخا ہوا تھا اور اب اس کا ہیولہ ہی باقی رہ گیا تھا۔

وہ دیر تک اس ہیولہ کے سامنے کھڑا رہا پھر اس نے پاس سے گزرتے ایک شخص سے پوچھا ——— "یہ مجسمہ کب ٹوٹا تھا" اس شخص نے کچھ سوچا ——— "یاد نہیں، مدت سے یوں ہی ہے"۔

اس نے پوچھا ——— "لیکن یہ تو تمھارا ہیرو تھا"۔

"شاید، ہاں ——— لیکن ہمارا عہد بغیر ہیرو کا عہد ہے"۔

"بغیر ہیرو کا عہد"۔

"ہمارا ہیرو مدت ہوئی مر چکا، ہم نے اسے مار دیا، اب نئے ہیرو کے جنم لینے کا انتظار کر رہے ہیں"۔

"لیکن وہ کب جنم لے گا"؟

"کون جانے جنم لے گا بھی کہ نہیں"۔ اس نے کندھے اچکائے اور آگے بڑھ گیا۔

وہ وہیں ہیولہ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

عجب شہر ہے ——— ہر چیز کو اوپر سے چمکایا جا رہا ہے اور اندر سے وہ تڑختی چلی جا رہی ہے۔

یہاں ہر شخص کا اپنا ایک جہنم ہے جس کا انتخاب اس نے خود کیا ہوا ہے۔

مرشد نے ہیولہ کے پیچھے سے سر نکالا ——— "یہ بیماروں کا شہر ہے۔ لیکن ہر شخص خود کو تندرست سمجھتا ہے"

اس نے مرشد کا ہاتھ پکڑ لیا ——— "اس شہر بے دوا میں مجھے اکیلا مت چھوڑ دو"۔

مرشد نے اس کا کندھا تھپتھپایا ——— "میں تو تمھارے ساتھ تھا، ہر لمحہ۔"

اس نے کہا ——— "لیکن مجھے دکھائی کیوں نہیں دیئے۔"

مرشد ہنسا ——— "یہی تو اس شہر کی خصوصیت ہے، یہاں کسی کو اپنا آپ دکھائی نہیں دیتا، سارے دوسروں کو دیکھتے ہیں"۔

اس نے کہا ——— "تو پھر میں اس شہر سے نکلتا ہوں"۔

مرشد نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس شہر سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں"۔

"کوئی راستہ نہیں"؟ وہ خوف زدہ آواز میں بولا۔

مرشد لمحہ بھر چپ رہا۔ پھر بولا ——— "صرف ایک راستہ ہے"۔

"وہ کیا؟"

"وہ جو صلیب پر ٹنگا ہے اُسے صلیب سے اتار دیا جائے اور اس کی جگہ کسی دوسرے کو مصلوب کیا جائے"۔

"لیکن کسے"؟

"جو شہر سے نکلنا چاہتا ہے"۔

"یعنی ——— "اس نے خوف سے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا ——— "لیکن میں مصلوب نہیں ہونا چاہتا"۔

مرشد نے اس کا کندھا دبایا ——— "تو پھر جو کر رہے ہو اسے کرتے رہو"۔

اس نے ایک لمبی سانس لی اور قلم اٹھایا۔ سیکشن آفیسر نے فائل آگے کھسکاتے ہوئے کہا ——— "سر سکریٹری صاحب دوبار فون کر چکے ہیں میں نے ان کی مرضی کے مطابق نوٹ بنا دیا ہے"۔

اس نے سر ہلایا اور نوٹ کے نیچے دستخط کر دیئے ——— "ٹھیک ہے یہ فائل ابھی ان کے پاس بھیج دو"۔

پھر فوراً ہی اسے کچھ خیال آیا ——— "نہیں ٹھہرو، میں خود ہی لے جاتا ہوں، آج صبح سے انھیں سلام کرنے نہیں جا سکا۔"

شکستی

سلیم اختر

کنول کے پھول اور تھالیوں جیسے چوڑے پتے ہٹا کر پانی میں چہرہ دیکھا تو حیرت سے آنکھوں کو پھیلتے پایا۔ یہ میں ہوں ؟ اس کی آنکھوں نے اپنی آنکھوں کے دریچوں میں جھانکا تو وہاں کمزوری کی پرچھائیاں لرزتی دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے ؟ ہوا کی سلوٹوں کے بغیر پانی سفید چادر کی مانند تھا۔ سفید اور سرخ کنول کے پھولوں اور گہرے سبز پتوں والی چادر میں اس کا نڈھال چہرہ کسی اور ہی شاخ کا زرد پھول تھا وہ اور اس کا سایہ ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ خوف کن آنکھوں میں زیادہ تھا۔ اس کی یا اس نے کی ؟ بالوں پر ہاتھ پھیرا تو مردہ بیلیں چھونے کے احساس نے جسم میں کراہت کی لہر دوڑا دی۔ ان کی سیاہ چمک کس نے چرالی، وہ ریشم کہاں گیا جو کنواریوں کے سہلانے کے لئے تھا۔ اس نے بے چارگی سے بالوں کو ٹٹولا تو ایک گچھا ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر انھیں یوں پھینک دیا گویا ہاتھ میں مکڑی کا جالا آ گیا ہو۔ بازو ٹٹولے تو پتھریلا گوشت انگلیوں سے دبتا چلا گیا۔ سینے پر ہاتھ دھرا تو دھڑکن یوں ٹھٹکی گویا دل اپنا نہ تھا یا ہاتھ پرایا تھا۔ درخت کے تنے جیسی مضبوط رانیں گویا بکھر چکی تھیں۔ نگاہ نیچے سرکی، ہاتھ ٹھٹکا اس کی شکن کا جھولا تو سا پھل تھا کہ بھرم پھول ؟

حالی حالی آنکھوں سے بے شکن پانی میں چہرے کی شکنوں کا جائزہ لیا۔ اور لرز گیا۔ خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا، سوچتا رہا۔ ذہن جیسے گزرے لمحے کی لہروں پر ڈوبتے ہوئے بلبلے کی مانند تھا۔ جو ہوا کی گرہ پر زندہ ہو مگر جس ہوا کی زندگی کی گانٹھ کا اور چھور نہ ہو۔ اس نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنا چاہا مگر ٹانگوں نے جسم سنبھالنے سے انکار کر دیا۔ ٹھنڈی ہوائیں جنگل کی باس کو گویا تھپکیاں دے رہی تھیں۔ پرندوں کی چہچہاہٹ گھل مل کر گویا لوری بن گئی۔

سامنے پانی کے آئینہ میں اس نے آنکھوں پر جھریوں کو گرتے دیکھا تو سر جھٹک کر آنکھوں کو سہلاتی انگلیوں کو گویا جھٹک دیا مگر اسے یہ بھی اگو لرزتا جی چاہا پانی کنارے ان پودوں کی شگفتگی میں وہ بھی زمین میں پاؤں جمائے بیٹھا رہے، بیٹھا رہے، حتیٰ کہ سر کی بیلوں میں چڑیا آرام کرے۔ شفق شام میں گھل کر درختوں کو سرخ کر رہی تھی۔ پرندوں کی ہماہمی سے جنگل گونج رہا تھا۔ اس کے قریب جھاڑیوں سے ایک ہرن نے گردن نکالی دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو ہرن کی سرمئی آنکھ میں اس کی تصویر ابھری اس نے کانوں کو ہلا کر سنا تو کہیں کوئی مشکوک آواز نہ تھی۔ تب اس نے اطمینان سے گردن جھکائی اور پانی پینے لگا مگر ابھی پیاس ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ کان ہلائے، بے چین آنکھوں سے اسے دیکھا تو بھیگے ہونٹوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اگلے لمحے اس نے جو کڑی بھری اور پیلے سایوں کی دھند میں چھپ گیا۔ تب اس نے سفید اور سرخ کنول کے پھولوں اور گہرے سبز پتوں والی چادر پر اس کا عکس ابھرتے دیکھا۔ پانی میں دونوں کی آنکھیں ملیں تو وہ مسکرایا۔

گردن اٹھا کر دیکھا، عجب مسکراہٹ تھی کہ آنکھوں میں تھی مگر ہونٹوں پر نہ تھی۔

مرد نے کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹوں کے کنارے کپکپا کر رہ گئے۔ عورت کے سر پر بالوں کا جنگل تھا۔ اور اسی جنگل نے جسم کا شہر ڈھانپ لیا تھا۔ اس نے اس شہر کی یاترا کی تھی۔ ایسی یاترا کہ ہر تیرتھ پر پہنچا، ہر گھاٹ دیکھا اور ہر ادوٹ کا اشنان کیا وہ ایسی یاترا تھی کہ پل جگ میں تبدیل ہو جائے۔ اور ایسا جگ کہ ہونٹوں کا ادب دھارے۔ تو اب تھا یا خیال تھا کیا تھا۔ ؟ —— گرری لذت کی کیکپی نے گھنڈ رجسم کی بنیادیں بھونچال برپا کر دیا۔

وہ اس کے سامنے کھڑی تھی، خاموش، ساکت صرف آنکھیں تکے جا رہی تھیں پلک جھپکائے بغیر ابتدا میں ان آنکھوں کی مسکراہٹ برقرار تھی۔ اس نے زور لگا کر اٹھنا چاہا۔ اس عورت کی خاطر، اپنی خاطر اٹھنا چاہا مگر وہ نہ اٹھ سکا۔ تب نگاہ اپنے پاؤں پر پڑی جن میں کہری نیوٹیوں اور سیاہ چیونٹیوں کی قطاریں گھسی جا رہی تھیں۔ چیخنے کو منہ کھولا مگر آواز نہ نکلی۔ مرد نے مدد کے لئے عورت کی جانب ہاتھ بڑھانا چاہا مگر آنکھوں کی مسکراہٹ دیکھ کر ٹھٹکا، ہاتھ نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔

عورت نے دھکا دیا تو کٹے ہوئے تنے کی مانند ڈھے گیا۔ شفق اور شام ہاتھ پکڑے رات کی جانب دوڑی جا رہی تھیں۔ عورت جب جھکی تو مرد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جن میں اب مسکراہٹ کی بجائے جنگل کی شام کے سائے سمٹ آئے تھے۔ وہ اور جھکی تو بال دونوں پر جنگل بن کر چھا گئے اور تب مرد کی دہشت سے پھٹی آنکھوں نے عورت کی کھلتی مٹھی دیکھی۔ اس کی انگلیاں دیکھیں، اس کے ناخن دیکھے۔ اس نے تو کبھی یہ ہاتھ نہ دیکھا تھا، اس نے کبھی یہ انگلیاں نہ دیکھی تھیں۔ اس نے تو کبھی یہ ناخن نہ دیکھے تھے۔ اس نے اسے روکنا چاہا مگر اب جیسے جسم کا کھوکھلا تنا چیونٹیوں اور چیونٹوں کا شہر بن چکا تھا۔ ادھر عورت کے ناخن ریتی بن کر مرد کا سینہ چیر رہے تھے وہ نہایت اطمینان سے یہ کام کر رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کھال کو دونوں جانب کھینچا۔ پسلیوں کے پنجرے میں پھڑپھڑ دل بے قرار پایا۔ وہ گہرے انہماک سے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں اب جگنو تھے اور نیم وا ہونٹوں سے سانس بھاپ بن کر خارج ہو رہی تھی۔ پسلیوں کا پنجرہ ٹوٹا تو عورت کے ہاتھوں میں دل نے آخری پھڑپھڑاہٹ لی اب وہ خاموش بکھیرو تھا۔ وہ ہاتھوں میں لئے اسے دیکھتی رہی۔ وہ کھلونا تھا یا پھل؟ محبت تھی کہ زندگی بتیا ہی بن سفید دانت چمکے اس نے گرم دل کی ہموار سطح پر رگڑ کر دانت تیز کئے اور پھر اس نے دانت دل میں اتار دیئے۔ جیسے جیسے دل چبائی گئی لہو میں گرمی بڑھتی گئی اور خون کی گردش میں جیسے بھنور پڑنے لگے۔ تب اس نے مرد کا پھل توڑا جو بہترین ہے اور اسی لئے لذیذ تر بھی! مردکی شکتی اس کی رگوں میں، پٹھوں میں، مفصلوں میں ماس اور مسام میں، ناخنوں اور بالوں میں۔ تمام جسم میں جوالا مکھی جگا رہی تھی۔

ہوا ساکت تھی۔ بجلی سے جلے منڈ منڈ درخت پر الو خاموش تھا۔ اڑتی چمگادڑیں بھی فضا میں ٹھہری ٹھہری لٹک رہی تھیں۔ جنگل چاندنی کی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔

عورت کام ختم کر کے جب مرد کے جسم پر سے اٹھی تو گویا اٹھتی ہی چلی گئی۔ آنکھوں کے جگنو اب شعلوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اٹھے پر نئی جوانی کی لو بھی تو ہونٹوں پر سرخی کا تاج! اس نے بھرپور انگڑائی لی تو محسوس کیا کہ وہ سارا جنگل اپنے بازوؤں میں لے کر مروڑ سکتی ہے۔ اوپر چاند دیکھا تو سوچا جب چاہے اسے توڑ کر پھینک سکتی ہے۔

—— وہ شکتی وان تھی!

وہ صدیوں سے سفر میں تھی، سفر کی صدیاں شکتی کے بغیر کیسے کٹ سکتی تھیں، بالکل اسی طرح جیسے آنے والی صدیوں کا سفر شکتی کے بغیر طے کرنا ممکن نہ تھا۔

اور تب جسم اچانک کمان کی طرح تن گیا۔ حساس کانوں نے آوازیں سنی تھیں جوان مردوں کی آوازیں، ایک مرد کی آواز —— مردانگی کے نشے ڈوبی گونجیلی آواز —— وہ ادھر ہی آ رہے تھے اور پھر وہ سب ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے سامنے درخت کے تنے سے لپٹی بیل اوڑھے سفید نار کھڑی تھی جس نے جھکا سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں کی ڈوران میں سے ایک کو باندھ چکی تھی۔

▲▲

اوپر جانے والا

منشا یاد

توتے نے کہا۔۔۔

ان کا ایسا بھی قریب قریب یہی حال ہے مگر بابو جو سب سے چھوٹا اور کمزور ہے بھوک کی شدت سے بری طرح نڈھال نظر آتا اور بار بار بے ہوش ہو جاتا ہے۔

وہ کئی روز سے اس پراسرار اور بے آب و گیاہ جزیرے میں بھٹک رہے ہیں جس کا سمندر مچھلیوں سے اور ساحل درختوں اور پرندوں سے خالی ہے ان کے پاس خوراک بچی کسی تھی کہ ساتھ دیتی صرف پانی کی ایک چھاگل رہ گئی ہے جس میں تھوڑا سا پانی ہے جسے وہ قطروں کے حساب سے استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔

وہ دن بھر خوراک کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں۔ شاید کہیں کوئی شکار یا پھل دار درخت نظر آ جائے جس سے وہ اپنی بھوک مٹا سکیں اور کسی کی امداد یا کشتی کی آمد تک زندہ رہ سکیں مگر انھیں اب تک ہر طرف سے مایوسی ہوئی ہے تاہم امید کی ایک کرن جو تھی اور آخری سمت کے سفر کی صورت اٹھی جاتی ہے۔ کیا پتہ وہاں کسی قسم کی حیوانی یا نباتی خوراک مل ہی جائے مگر بابو اس قدر نڈھال ہے کہ دو قدم چل نہیں سکتا یوں اس کا ایک حل یہ بھی ہے کہ وہ اس کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ انھیں موت سے زیادہ تاریک دنوں کے ساتھیوں سے یاد کیے جانے سے ڈر لگتا ہے

کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد وہ ایک جھلنگے میں ڈال لیتے ہیں اور اسے چادر کونوں سے پکڑ کر اپنے ساتھ اٹھائے اٹھائے پھرنے لگتے ہیں تھکاوٹ غالب آ جاتی ہے تو کچھ دیر سستا لیتے ہیں پھر رہی سہی طاقت جمع کر کے دوبارہ چلنے لگتے ہیں۔ انھوں نے انتہائی احتیاط سے اپنی پانی پینے کی مقدار اور گھٹا دی ہے اور اپنے حصے کی بوندیں بھی جھلنگے میں پڑے نیم بے ہوش بابو کے حلق میں ٹپکاتے رہتے ہیں۔

چلتے چلتے دوپہر ہو جاتی ہے۔ سورج پوری شدت سے چمکنے لگتا ہے اور پاؤں تلے کی بھربھری ریت اور مٹی دہکنے لگتی ہے مگر وہ ہمت نہیں ہارتے ـــــ کیا پتہ چوٹی کھوٹ کھائے پیے کو کچھ مل ہی جائے

ان کے پاؤں میں آبلے پڑ جاتے ہیں اور بدن جھلس کر سیاہ ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ اسے اٹھائے گرتے پڑتے چلتے رہتے ہیں تب اچانک ان کی نظر ایک ہرے بھرے درخت پر پڑتی ہے جو دور سے مالٹے کا پیڑ نظر آتا ہے۔ اس لیے جب چھاگل میں بہت تھوڑا پانی اور بدن میں برائے نام طاقت رہ گئی ہے وہ پرانے ہیں اکیلا کھڑا یہ ہرا بھرا درخت انھیں ایک بڑے نخلستان کی طرح معلوم ہوتا ہے مارے خوشی کے وہ چھاگل کی بچی کھچی ساری بوندیں بے ہوش پڑے بابو کے حلق میں ٹپکا دیتے ہیں جس سے وہ نہ صرف ہوش میں آ جاتا ہے مگر اس میں

اتنی توانائی آ جاتی ہے کہ اٹھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے

ناریل کے پیڑ کی طرح نظر آنے والے اس درخت کا پھل بھی ناریل جیسا نظر آتا ہے۔ لذیذ، خوش ذائقہ اور رس سے بھرا ہوا۔ لگتا ہے بڑے بڑے گچھوں کے چند پھل نظر آتے ہیں۔ اور اس پر چڑھنا اور پھل توڑ کر لانا تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ پریشان ہو کر وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگتے ہیں مگر پانچواں جو ان سب سے زیادہ توانا اور حاذق دکھائی پڑتا ہے، آگے بڑھ کر کہتا ہے۔

"میں اوپر جاؤں گا اور سب کے لئے پھل توڑ کر لاؤں گا۔"

"نہیں تم نہیں" دوسرا بزرگانہ شفقت سے کہتا ہے۔ "تم چھوٹے اور کمزور ہو۔ میں خود اوپر جاؤں گا۔"

"اگر تم چاہو تو میں جاتا ہوں" تیسرا کہتا ہے

"شاید تم لوگ بھول گئے" پانچواں کہتا ہے۔ "ایسے درختوں پر چڑھنے کی مجھے تربیت دی گئی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے" پانچواں کہتا ہے۔ "مگر تم چھوٹے اور نحیف ہو ہم ڈرتے ہیں تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچے ہم واپس جا کر کیا منہ دکھائیں گے"

"تم بالکل فکر نہ کرو" پانچواں گلہری کی طرح کھڑے درخت کے چکنے اور گول تنے کا جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے۔ "بس مجھے کسی طرح پہلی ڈال تک پہنچا دو۔ اس کے بعد اوپر جانا آسان ہو جائے گا"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔" چوتھا کہتا ہے "اگر ہم چاروں ایک دوسرے کے اوپر کھڑے ہو کر ایک سیڑھی سی بنا دیں تو پانچواں آسانی سے پہلی ڈال تک پہنچ سکتا ہے"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے بہت اچھی ترکیب ہے مگر ہم میں سے کس میں اتنی ہمت ہے کہ سب کا بوجھ سہارنے کے لئے پہلے سب سے نیچے کھڑا ہو۔"

سارے چپ ہو جاتے ہیں۔

"قرعہ اندازی کر لیں"

"قرعہ اندازی کی نہیں۔ یہ تو ہمت اور حوصلے کی بات ہے"

"میں نیچے کھڑا ہوں گا" پہلا پیش کش کرتا ہے۔

"اس کے بعد میں" دوسرا کہتا ہے۔

"اس کے بعد میرا نمبر ہوگا" تیسرا کہتا ہے۔

"ظاہر ہے اس کے بعد میرا" چوتھا کہتا ہے۔

ایک دوسرے کی ہمت بڑھاتے اور خصوصاً پہلے کو داد شجاعت دیتے ہوئے وہ رہی سہی طاقت جمع کر کے پیڑ کے تنے سے لگ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے اوپر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

پانچواں جھاڑی کو پکڑ کر حلق تر کرتا اور نہایت پھرتی سے ان کی کمروں اور کندھوں پر پاؤں جماتا اوپر چڑھنے لگتا اور دیکھتے ہی دیکھتے پہلی ڈال تک جا پہنچتا ہے۔ پہلی سے دوسری اور پھر تیسری ڈال پر قدم رکھتا وہ بلند ہوتا جاتا ہے۔

وہ ایک دوسرے کے کندھے سے اتر کر اپنے اپنے کندھے اور پسلیاں سہلاتے اور پانچویں کے چوٹی پر پہنچنے کا انتظار کرنے لگتے ہیں مگر پہلا ابھی تک جھکا درخت کے تنے کے ساتھ لگا کھڑا ہے۔ اور پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیتا شاید اس لئے کہ وہ کسی کے کندھے پر سوار نہیں ہوا کہ کوئی اسے اپنا کندھا جھٹک کر نیچے اترنے کو کہتا وہ زمین پر کھڑا ہے اور زمین کبھی کندھا جھٹک کر نہیں گراتی آدمی خود گر جائے تو بھی اسے پناہ دیتی ہے سو زمین نے اسے پناہ دی۔

وہ خوف اور صدمہ سے ایک عجیب وحشت ناک منظر دیکھتے ہیں پہلا گھٹنوں تک زمین کے اندر دھنسا ہوا ہے اور اب اسے اوپر سے پھینکے جانے والے پھل کا انتظار ہے نہ اس کا ذائقہ جاننے کی آرزو۔

وہ پریشانی میں تھوڑی دیر کے لئے اوپر والے کو بھول جاتے ہیں۔ پہلے کو مٹی سے باہر نکالتے اور پھر مٹی ہی میں دبا دیتے ہیں۔ اس کی شجاعت اور ایثار کو سراہتے اور اس کی نیکیوں کو یاد کرتے ہیں پھر دوسرا سر اوپر کر کے دکھ بھرے لہجے میں کہتا ہے "وہ جس نے ہم سب کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھایا۔ اب ہم میں نہیں رہا۔"

"ہاں۔ اب ہم تین رہ گئے ہیں۔ ہم بھوک سے نڈھال اور پیاس سے بے حال ہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے۔"

مگر پانچواں کوئی جواب نہیں دیتا۔

اسی لمحے کوئی چیز نیچے گرتی ہے وہ بیتابی سے لپکتے ہیں مگر یہ دیکھ کر ان کے مرجھائے ہوئے چہرے اور مرجھا جاتے ہیں کہ وہ ناریل ایسے پھل کا لکڑی کی طرح خشک اور سخت چھلکا ہے۔

اوپر سے گرائے جانے والے پھل کا انتظار کرتے کرتے شام ہو جاتی ہے اور سمندر کی طرف سے ہولناک اندھیرا امنڈنے لگتا ہے مگر پانچواں محض چھلکے نیچے گراتا ہے۔ ان کی کسی بات کا جواب دیتا ہے۔ اور دیکھ دیکھ کر ان کی آنکھیں اور گردنیں تھک جاتی ہیں۔ اور پکار پکار کر ان کے گلے خشک ہو جاتے ہیں۔

"کہیں بھرے ہوش نہ ہو گیا ہو۔"

"پھل زہریلا بھی تو ہو سکتا ہے اسے کچھ ہو نہ گیا ہو۔"

"کیا پتہ پیٹ بھر کھا پی لینے سے اسے نیند آگئی ہو۔ گذشتہ کئی دنوں سے مارے بھوک اور پریشانی کے ہم میں سے کوئی سویا بھی تو نہیں اور پھر نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔"

اسی لمحے لکڑی کی طرح سخت اور خشک چھلکے پھر ان کے قریب گرتے ہیں جنھیں وہ چکھ اور سونگھ کر پھینک دیتے ہیں۔

"وہ خود کھا پی رہا ہے"

"کھا لینے دو ـــ اس میں طاقت اور توانائی آئے گی۔ تبھی وہ ہمارے لئے پھل توڑ سکے گا۔"

"ہاں اس کی طاقت ہماری طاقت ہے۔"

"مجھے تو شک ہے۔" دوسرا کہتا ہے۔

"کس بات کا؟" تیسرا پوچھتا ہے مگر دوسرا کوئی جواب نہیں دیتا۔ اس پر غشی طاری ہو جاتی ہے۔

وہ اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ ہوش میں نہیں آتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک جاتی ہے۔

تیسرا اور چوتھا خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھتے ہیں پھر اسے کھینچ کر پہلے کی قبر کے پاس ڈال دیتے ہیں۔ شاید اب ان میں قبر کھودنے کی بھی ہمت نہیں رہی پھر چوتھا گھبرا اور گڑگڑا کر اوپر والے کو اطلاع دیتا ہے۔

"سنو اب اگر ہم دو رہ گئے ہیں اگر تم نے جلدی نہیں کی تو ہم بھی نہیں بچ سکیں گے۔"

"تم ٹھیک تو ہو پانچویں؟" تیسرا پوچھتا ہے۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں" پہلی بار اوپر سے پانچویں کی آواز سنائی دیتی ہے۔

وہ خوشی اور امید بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ تیسرا کہتا ہے۔

"اگر تم ٹھیک ہو تو ہمارے لئے کچھ پھینکتے کیوں نہیں ہو؟"

"پھل بہت تھوڑے اور دور دور ہیں ان کا توڑنا بہت مشکل ہے میں صبح کوشش کروں گا۔"

"ہم میں صبح تک انتظار کرنے کی ہمت نہیں۔ پانچویں۔ خدا کے لئے جلدی کچھ کرو۔"

"کیا تم چاہتے ہو؟" پانچواں خفگی سے کہتا ہے۔ "اندھیرے میں پھل توڑنے کی کوشش میں میں پھسل کر نیچے گر جاؤں۔"

"نہیں" چوتھا کہتا ہے۔ "تمھاری سلامتی ہماری سلامتی ہے۔ تم کوئی خطرہ مول نہ لو ـــ ہم صبح ہونے کا انتظار کریں گے۔"

"کچھ فائدہ نہیں۔" تیسرا سرگوشی کرتا ہے۔ "اس کی نیت اوپر پہنچتے ہی خراب ہو گئی ہے اب یہ حیلے بہانوں سے ہمیں یونہی ٹالتا اور ہمارے مرنے کا انتظار کرتا رہے گا۔ دیکھ لینا۔"

"آہستہ بولو۔" چوتھا کہتا ہے۔ "اس نے سن لیا تو برا مان جائے گا اب ہم اس کے رحم و کرم پر ہیں۔"

"اس سے بھی کچھ فرق نہیں پڑے گا۔"

مجھے معلوم ہے لیکن ہمیں عقل سے کام لینا چاہئے اور اسے ناراض نہیں کرنا چاہئے۔ کیا پتہ؟"

"کیا تمھیں یاد ہے کہ وہ لمبی دوڑوں میں حصہ لیتا رہا ہے۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے لیکن لمبی دوڑوں کا اس وقت کیا ذکر؟"

"لمبی دوڑ جیتنے کا ایک گر یہ بھی ہے کہ مقابلے کے آخری لمحوں یا چکر کے لئے کچھ توانائی بچا کر رکھی جائے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جب ہم سب بے ہوش اور نڈھال سمجھ کر جھلنگے میں ڈال کر اٹھائے پھر رہے تھے تو اس نے آخری چکر کے لئے ایسی توانائی بچا لی۔"

"تمھارا خیال ہے وہ اس وقت نڈھال اور بے ہوش نہیں تھا۔"

"ہاں۔ یہ اس کی چالاکی تھی۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو مجھے یاد آرہا ہے جب ہم بڑے ٹیلے کے پاس ہم اسے لیٹا کر گئے تھے۔ میں نے اسے کن انکھیوں سے اپنی طرف دیکھتے دیکھا تھا۔ مگر اس وقت مجھے بالکل خیال نہیں آیا تھا۔ وہ بے ہوش ہونے کی اداکاری کر رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے درخت پر لگے ہوئے پھل ہی امدادی جہاز یا کشتی کے آنے میں زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔ اسی خیال سے پانچویں کی نیت میں فتور آگیا ہے اور اب یقیناً اکیلا امدادی جہاز کا استقبال کر سکے گا۔"

"پھر کیا کریں گے؟"

"پہلے سی ہمت اور حوصلے کو بحال کریں اور مایوس نہ ہوں کیا پتہ وہ صبح کو اپنا وعدہ پورا کر دے۔"

"ہاں اس کے سوا ہم بھی کیا سکتے ہیں؟"

تیسرا اور چوتھا ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر قریب لیٹ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے کی نبض یا سانس ٹٹول لیتے ہیں۔ لحظہ لحظہ رات ڈھلتی اور صدیوں بعد صبح طلوع ہوتی ہے۔"

"تیسرے تم کیسے ہو"

"میں ٹھیک ہوں اور تم"

"میں بھی ٹھیک ہی ہوں۔"

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"سوچ رہا ہوں اگر آج بھی اس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو ہم بھی جلد ہی۔"

"سنو" تیسرا کہتا ہے "شاید وہ پھل توڑ رہا ہے۔"

"ہاں" چوتھا کہتا ہے۔ "تم اسے آواز دو۔"

"نہیں وہ تمھاری بات مانے گا" تیسرا کہتا ہے "تم اسے آواز دو۔"

"پانچویں!" چوتھا آواز دیتا ہے۔ "صبح ہو گئی اپنا وعدہ پورا کرو۔"

"پھل تھوڑے ہیں۔ ہمیں کفایت سے کام لینا ہوگا۔" پانچویں کی آواز سنائی دیتی ہے "بس تم شام تک انتظار کرو۔"

شام کا نام سن کر وہ دونوں دہل جاتے ہیں۔ پھر ایک کہتا ہے۔

"شام تک ہم مر چکے ہوں گے پانچویں ــــ ہم پر رحم کھاؤ۔"

"میں شام تک اپنا وعدہ پورا کر دوں گا۔ مجھے پریشان نہ کرو۔"

"اول تو ہم شام تک زندہ نہیں ہوں گے۔" تیسرا کہتا ہے "اور اگر زندہ بچ بھی گئے تو بھی یہ اپنا وعدہ پورا نہیں کرے گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" چوتھا کہتا ہے "اس کی نیت واقعی خراب ہے۔ آہ ہم اسے اٹھائے اٹھائے پھرے۔ اسے اپنے حصے کا پانی پلاتے اور اپنی رہی سہی توانائی خرچ کرتے رہے۔ اسے کندھوں پر سوار کر کے اوپر پہنچایا اور اب وہ ہمیں سسک سسک کر مرتے دیکھ رہا ہے۔"

"طوطا چشم!" تیسرا کہتا ہے۔

"میں سن رہا ہوں۔" پانچویں کی آواز سنائی دیتی ہے "تم مجھے برا بھلا کیوں کہہ رہے ہو؟"

"میں تمھارا خون پی جاؤں گا" تیسرا اب تک غصے میں ہے۔

"پاگل کے بچو!" پانچواں کہتا ہے "اگر تم مجھے گالی نہ دیتے تو شاید مجھے تم پر ترس آجاتا مگر تم خود ہی مرنا چاہتے ہو۔"

"ایسا نہ کہو!" چوتھا کہتا ہے "اسے معاف کر دو۔ بھوک پیاس کی شدت اور موت کے خوف سے واقعی ہم پاگل ہو رہے ہیں۔"

"معافی مانگو" تیسرا معافی مانگتا ہے۔

"ایسے نہیں" پانچواں کہتا ہے "ناک رگڑ کر"

"مجھ میں ناک رگڑنے کی سکت نہیں" تیسرا کہتا ہے "دیکھو میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔"

"اگر تم ناک سے لکیریں نہیں نکال سکتے تو مجھے افسوس ہے میں تم کو بھی تمہارے لئے کچھ۔ کچھ کر سکوں گا۔"

"میں کوشش کرتا ہوں" تیسرا زمین پر ناک رگڑنے کے لئے جھکتا ہے۔

"ایسا نہ کرو" چوتھا کہتا ہے "پہلے کی شجاعت کو یاد کرو۔ اس نے جان دینے تک اُف تک نہیں کی تھی۔

بھوک اور پیاس نے میری ہمت کو پست کر دیا ہے۔ مجھے پستی اور بلندی میں کوئی فرق محسوس نہیں ہو رہا۔"

"یہ زوال ہے" چوتھا کہتا ہے مگر تیسرا جھکتا چلا جاتا ہے۔ جھکنے سے تیسرے کی پھٹی ہوئی۔ جیب سے کوئی چیز باہر آ گرتی ہے۔

"ارے یہ تو چاقو ہے۔ چوتھا خوشی سے کہتا ہے" ٹھہر جاؤ ناک رگڑنے کی ضرورت نہیں۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" تیسرا ڈر کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

"ڈرو نہیں۔ ہم اس سے درخت کو کاٹیں گے۔"

"اتنے چھوٹے سے چاقو سے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اتنا بڑا درخت کاٹ کر گرا دیں۔"

"ہاں یہ مشکل اور صبر آزما کام ہے لیکن تم نے کبھی ہُد ہُد کو دیکھا ہے۔ جو اپنی چونچ سے"

"ہاں یہ دیکھا ہے۔"

"یہ تو پھر چاقو ہے۔ لوہے کا بنا ہوا اور آدمی کے ہاتھ میں ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ پھر ہمارا مقصد محض درخت کو گرانا نہیں۔"

"پھر؟"

"کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم ناک یا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی بجائے امدادی جہاز یا کسی اور موت کے آنے تک اپنی جدوجہد جاری رکھیں

اور نہیں تو اوپر والا ہم سے ناکیں تو نہیں رگڑوا سکے گا اور تب تک پنجرے کی نیند تو نہیں سو سکے گا۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ ایسے حالات میں پستی سے بچنے کے لئے اب یہی ایک راستہ رہ گیا ہے۔"

"مگر میں سوچتا ہوں تیسرے۔ ایسا کرنے سے ہمارے اور پانچویں میں کیا فرق رہ رہ جائے گا؟"

وہی جو توتے اور ہد ہد میں ہوتا ہے۔

نہیں۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔" چوتھا کہتا ہے "ورنہ ہم تاریخ کو اور پہلے کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

"پھر؟"

"پھر ہمیں انتظار کرنا ہو گا جب تک کر سکیں کہ یہی ہمارا مقدر ہے۔"

"پھر کیا ہوا میاں مٹھو"، میں پوچھتا ہوں۔

مگر توتا میری بات کا جواب دیے بغیر اڑ کر ایک اونچے ڈال پر جا بیٹھتا ہے اور پھل کتر کتر کر کھانے لگتا ہے۔

۵۵

سُؤروں کے حق میں ایک کہانی

اسد محمد خاں

بہت بلندی سے ایک پہاڑی اترتی ہے۔

جس طرح مسجد جامع کی دھلی دھلائی سیڑھیاں تماس کے ساتھ ساتھی
شہر کے مانوس دھوپ میں سوئی نیچے عامۃ الناس کی دھواں لپٹی دنیا میں اتر رہی ہوں۔

ٹھیک اسی طرح ایک پہاڑی اترتی ہے۔

ساون کے چھینٹے میں اور کبھی دھند میں شاید کسی نکھٹ کی بلندی سے
اس پہاڑی کبھی ہلکے کبھی گہرے بادلوں والے آسمان سے ساون کی روشنی میں ستمبر
ستمبر کی اجلی نکھار قدم قدم اترتی ہے اور تال کے سارے کنارے جا سکتی ہے اور
ساون کا جلوس جب لنگا کھلا جائے اور کوشش کرکے بیٹھو تو ان کنگاؤں کی
تعداد ہزاروں پہاڑی کی دو تین سو سے اوپر پہنچ جاتی ہے۔ گر ساون میں گن کون سکتا
ہے یہ تو بے حسابی کی رت ہے

تو یہ کسی سوگ کی کمی کے سبب کہ ایک سارہ ماسی تال ساتی ہیں جس کی سطح
سنگھاڑے کی بیلوں سے اور جل کھمبی سے اور تین قسم کے کنول سے ڈھکی رہتی ہے۔
اس جھیل میں بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹاپو ہیں جو آدمی کے قد جتنی اونچی گہرے ہرے
رنگ کی گھنی نے ڈنٹھل، ان ان گھاس پیچ رہے ہیں۔ اس گھاس کے ڈنٹھل
اس کے جتنے اپنے آپ وار رکھا ہے۔ جس کو لگتا ہے اسے دو آرائش کرنے والوں
کی سہولت کے سال سے بعض موسمی بیلوں سے بنایا گیا ہے اور یہ کوئی بہت
... سپسل قسم کی آرائشی چیز ہے۔ کبھی لگتا ہے کہ یہ ڈنٹھل کسی سخت گیر اسکول
ماسٹر نے ہری ہری پھریاں پیرس کے سروں پر ماسٹر نے سجا دی کے لئے چار چار
پانچ پانچ شاخوں والے طرے لگا رکھے ہیں ان شاخوں سے پور پور برابر پتلی
لوز تجیر کی شکل کی سخت ہری پتیاں جھکی ہوتی ہیں جیسے کھکھوروں کے بدن سے اس کی
ہزاروں بے جس ٹانگیں جھکی ہوں۔ اور جس وقت یہ آبی گھاس بھیگی ہوئی ہوا کے
ساتھ لہرا رہی ہوتی ہے تو بے خیالی میں یادیں اس کی تمام لہروں کے خطوط حرکت کو
ذہن پر نقش کر لیتی ہیں اور پتہ بھی نہیں چلتا اور تیس چالیس برس گزر جاتے ہیں۔
پھر اچانک ایک ایک لہر اقلیدسی اشکال میں خود کو دہراتی ہوئی آتی ہے اور آنکھوں
کی پتلیوں کے پیچھے بجلیاں سی کوندنے لگتی ہیں۔

تو یہ سارے ٹاپو اس آبی گھاس سے اٹے پڑے ہیں اور یہ آبی گھاس کبھی
پیلی نہیں پڑتی صدا ہری بھری رہتی ہے۔ اس لئے کہ ساون رہے نہ رہے تال کے
اس دور دراز حصے میں بھی کمر کمر پانی تو سارے سال ہی رہتا ہے پھر یہ ہری ہری پتیاں
اور ہرے ہرے ڈنٹھل کاہے کو پیلے پڑنے لگے۔ سارے سارے سال ٹاپوؤں کی یہ
ماسٹر ٹرک پر چلنے والے اکا دکا مسافر کو جھڑیاں لہرا لہرا کر دھمکاتے رہتے ہیں—
کہ گھن گرج کے ساتھ دوبارہ ساون آجاتا ہے۔ ساون میں یہ ٹاپو ایک دم گھونٹ
دینے والی تیز سبز بو اچھالتے ہیں جو مچھلیوں کے جیتے جیتے سرخ گلپھڑوں سے گزرتی
ہوئی ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے اور قریب کے راہگیروں کو (ڈبے میں بیٹھے ہوئے
تمباکو ریچھوں کی طرح) شرابور کر دیتی ہے۔

شام گہری ہوتے ادھر سے کم ہی لوگ گزرتے ہیں۔ وہ شاید گہرے ہرے
رنگ کے اس اندھیرے سے ہول کھاتے ہوں گے یا شاید وہ اسی یاد دن کو یاد؟

سو دوسری چیزوں سے کٹنا نہیں چاہتے۔ وہ ہلکے پھلکے رہتے ہوئے جینا چاہتے ہیں۔
مگر کیا ہلکے پھلکے رہتے ہوئے جینا ممکن ہے؟

میں نے تال کنارے ایک اجڑی ہوئی امرائی کو پھر نیو سادن میں بھی سب
قصبوں، قصبیوں، سب چیزوں سے الگ تھلگ پڑے دیکھا ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا
کہ ہلکے پھلکے رہتے ہوئے جینا کیسے ممکن ہے۔ یہ امرائی، تال میں اور تال کے آس پاس
اور پہاڑی پر جو کچھ ہو رہا ہے اس سے الگ تھلگ اور اس کے بیچوں بیچ موجود ہے۔
اور دھیرے دھیرے مرتی جا رہی ہے۔

یوں ہے کہ تال کے بائیں کنارے سے جو ایک چھوٹی سی مسکین پہاڑی اٹھتی
ہے اور ساون گنگاؤں والی پہاڑی کی دوسری تہہ کے خیال سے کچھ دور چلتی ہوئی پھر
ہموار سطح مرتفع میں گم ہو جاتی ہے، (جیسے سیاہ میں آئے ہوئے بزرگ سی دعا سلام
کے بعد رشتے ناتے والوں سے ذرا ہٹ کر ایک طرف کو جا بیٹھیں) تو اسی پہاڑی کی
گود میں یہ چھوٹی سی امرائی پڑی ہے اور یہ دھیرے دھیرے مرتی جا رہی ہے۔ سو، دو سو
برس پہلے یہاں آم کے گنتی پیڑوں پر بے حساب جھولے اور کوئلیں اکٹھا ہوتے اور
پکارا کرتے تھے، اب سناٹا رہتا ہے۔ گنتی کے دس بیس بوڑھے گچھے درخت مکڑیوں کے
ریوڑ سنبھالے بظاہر سکوں سے کھڑے رہتے ہیں۔ جہاں ان ٹہنیوں کی چھات کبھی ہے
کبھی مست مہک والے آموں کا بور فرش کئے رہتا تھا اور درختوں تلے اگی ہوئی کمزور
ہری گھاس پر چمکیلے دھاری دار گاؤں سے گلہریاں دوڑ لگاتی تھیں، کھورے
کوٹ والے لنگور ادھم کرتے تھے اور چالاک گرگٹ پل پل میں لباس بدلتے تھے۔
سب اب اوپر چلے گئے ہیں کہ اوپر اب بھی سیتا پھلوں کے ٹیڑھے میڑھے درختوں کے
بیچ میٹھے کروندوں اور اچاروں کی جھاڑیاں ہیں اور تیز بسنتی رنگ میں رنگے ہوئے
شہد بھرے گچھوں کے جھالے ڈھلائے تیندو کے درخت کھڑے ہیں اور بیل کے تناور
پیڑ ہیں جو میٹھی مٹی کے میٹھے پھلوں کے درمیان سنتریوں کی طرح اپنی موجودگی کا یقین
دلاتے ہوئے چھوٹی پہاڑی پر چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور پھولوں میں املتاس ہے
اور ٹیسو ہے اور گیندے کی جھاڑیاں ہیں اور اس چھوٹی پہاڑی پر بکھرے ہوئے
برسہا برس کی دھوپ کھائے گرد آلود برساتیں جھیلے ٹیڑھے ترچھے پتھروں کو
سرکا سرکا کر قیمتی ایلوویئل مٹی نے پیوند لگائے ہیں جہاں کسی بھی وقت کچھ بھی اگنے
لگتا ہے۔ جہاں جہاں مٹی کا جسم کمزور پڑ جاتا ہے وہاں بھربھری مٹی میں خرگوشوں
کے قبیلے سرنگیں کھود لیتے ہیں اور سیہہ کا اکا دکا خاندان اپنا بھٹ بنا لیتا ہے
اور رات گئے اپنی سیلولائٹ کی زرہ بکتر پہن کر گھومنے نکلتا ہے تو اپنے نشانات
چھوڑ جاتا ہے۔ پھر سطح مرتفع پر بنے ہوئے گھروں سے بھیگی ہوئی ہوا میں سوں سوں
کرتے ہوئے بہت سے بچے اترتے ہیں اور یہ سیلولائیڈ کی نلکیاں اکٹھی کرتے ہیں اور انہیں
اپنے دفتی کے ڈبوں میں سنبھال کر رکھ دیتے ہیں کہ تیس چالیس برس بعد وہ انہیں
اپنی پلکوں سے چنیں گے اور تیس چالیس برس پرانی بھیگی ہوئی ہوا میں سوں سوں
کریں گے۔

اور سیاہ ایلوویئل مٹی کے پیوندوں میں گرمچی کے کم قد درخت [illegible]
مالاؤں کے سیاہ و سرخ ناسعتہ منکے بکھیرتے رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس سبز
ہرے گرد و پیش میں ان کا لایا ہوا سرخ اور ان کا لایا ہوا سیاہ ہی چمکتا رہے
تو بے شمار چمکیلے رنگوں کا یہ طوطا چھوٹی سی سبز پہاڑی پر آیا ہوا ہے
جس کی گود میں سب سے بے تعلق یہ مرتی ہوئی امرائی پڑی ہے اور جو چھوٹی مسکین
پہاڑی ساون گنگاؤں والی وشال پہاڑی کی بازگشت ہے۔ اس کے سموت
آکار کہتی ہوئی اٹھی ہے۔ اور اس آکار کو گلہریاں [illegible]
قبیلے اور سیہہ کا اکا دکا خاندان اور بھیگی ہوئی ہوا میں سوں سوں کرتے ہوئے
بچے ہی سن سکتے ہیں۔ اور ساون گنگاؤں والی پہاڑی کی [illegible]۔ اور سیکڑوں
کے پرشور رتھ میں جتے ہوئے گھوڑوں کی گردنوں کو چومتا ہوا جب دامن
کا کونا لشکتا ہے تو یہی وشال پہاڑی ایک [illegible] راکھی ہے جیسے
رو گئے کھڑے کراہے والی وحشی مسرت کے ساتھ تال کے گدلے پانی میں کھڑا
ہوا یہ آدمی سن رہا ہے۔

یہ سنتا جاتا ہے کہ اس کی سدا آنکھوں کی پتلیوں [illegible]
کی بجلیاں کوند رہی ہیں۔

تو یہ آدمی بے شعور نہیں ہے

سو اس آدمی کو ہاتھ پکڑ کر ایلوویئل کی سنگت سے اور سنگھاڑے کی بیلوں
اور جل کمبھی کی سنگت سے اور ریشمیں تنے کی کنول کی سنگت سے کھینچ لو۔
کہ سننے والوں اور سوروں کے درمیان ہم ایسا فیصلہ سا چکے ہو۔
سو اسے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لو اور رات دوسرے کو اس سور کے ترنم [illegible]

جو ناک پر رومال رکھے اس میں دستہ بیٹھا ہے۔ ۔ دوسرے ٹی ڈور اور
ارتھ موور کلہاڑے اور چھینیاں لے کر آئے گا اور مین سو پیر بھروں کو روک
دے گا، ایک نقلی آبشار بنائے گا اور تال کنارے ٹاپوؤں کی ہری ہری گھاس
کھینچ کر وہاں سیمنٹ کے سلاک جڑ دے گا۔ اور کرائے کے موٹر بوٹ چلائے گا۔
یہ سنگھاڑے کی بیلوں پر اور جل کمبھی پر اور تین قسم کے کنول پر سگریٹوں کے بٹ
کاغذ کے گندے رومال اور استعمال شدہ RUBBER ربر پھینکے جائیں گے۔
اور چھوٹی مسکین پہاڑی پر جو رہے سہے نقشے سما تر درج ہوں گے اور گلہریاں
اور لنگور اور رنگین لباسوں والے گرگٹ اور روئی کے دھبے جیسے خرگوش اور
سیہ اور سوں سوں کرتے ہوئے سب کے سب پہاڑی سے چلے جائیں گے۔ اور چمکیلے
رنگوں والی پہاڑی کی آکار ڈور جائے گی۔ بس ملتی ٹیکوں کی عراسیں رہ
جائیں گی ۔۔ کر ٹرمپٹ کی آخری سانسوں تک سسی جا سکیں گی۔

▲▲

انتظار گاہ

مرزا حامد بیگ

میں جہاں ہوں، اس آبادی کی بیشتر بڑی بوڑھیوں کا معمول ہے کہ ہر شام چادروں اور سفید برقعوں میں لپٹی لپٹائی اپنے گھروں سے نکلتی ہیں، اور گرتی پڑتی مشرق کی جانب کھڑی ترائی میں اتر جانے والی ڈھلکی تک آ کر پہروں چپ چاپ بیٹھی رہتی ہیں۔ اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں پر دونوں ہتھیلیوں کے سائبان لیے نیچے ترائی میں جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ پوچھو تو مطلق نہیں اور یوں ہی پہروں منتظر بیٹھ کر واپس ہو لیتی ہیں۔

نیچے ترائی میں آبادی سے کوس بھر کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے پتھریلے میدان کو سرخ اینٹوں کی چنی ہوئی قدِ آدم دیوار نے چاروں اطراف سے گھیر رکھا ہے اور بس۔ اس سنگی حصار کا آبادی کے رخ پر ایک ہی بڑا دروازہ ہے جو ہر دم کھلا رہتا ہے اور اس چہار دیواری میں سے باہر نکلتے میں نے کبھی کسی کو نہیں دیکھا۔

ایک رسالہ تھا جو اس چہار دیواری کے اندرونی معاملات کی نگہداشت اور آبادی کے رخ پر اس میں جڑے ہوئے آہنی دروازے کو کھولنے اور بھیڑنے کی خاطر کئی افراد پر مشتمل باقاعدہ ایک عملہ مامور تھا۔

اس سنگی حصار میں قید جنگلی سؤروں کا ایک ریوڑ تھا، جسے کسی پل چین نہ تھا۔ وہ کھروں سے پتھریلے میدان کو ادھیڑتے دکھتے تھے۔ البتہ اپنے مدِ مقابل کے انتظار میں گھلتے ہوئے سؤروں کے ریوڑ کی بے چینی نے ساری بستی کا سکون لوٹ رکھا تھا۔ اس بھری پری آبادی میں کوئی بھی تو ایسا نہیں تھا جسے مقابلے کے دن اور تاریخ کا علم ہوتا۔

اس پتھریلی چہار دیواری پر مامور عملے کا جب کوئی رکن اپنے خچر پر خالی بورا سنبھالے بستی سے سودا سلف سمیٹنے کی خاطر آبادی کا رخ کرتا تو اسے مشرقی ڈھلکی چڑھتے ہی بچے گھیر لیتے اور مقابلے کا دن اور تاریخ دریافت کرتے، دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گرد لوگوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ جم جاتا، یہاں تک کہ خچر سوار کو اپنے چاروں اطراف میں چابک لہرا لہرا کر بازاروں سے گزرتے کا راستہ بنانا پڑتا۔ وہ ہر سوال کے جواب میں چپ رہتا اور اپنے کام سے غرض رکھتا۔

یہ کیفیت اس وقت تک رہتی جب تک کہ وہ بازار میں گھوم پھر کر اپنے لدے پھندے خچر کی باگیں تھامے ڈھلکی نہ اتر جاتا۔ شاید سؤروں کے ریوڑ کی نگہداشت پر مامور عملے کے فرائضِ منصبی میں چپ رہنا بھی شامل تھا۔ سو وہ آتے، بے چین ہجوم کے سوالات کے جواب میں خاموشی کے ساتھ سودا سلف سمیٹتے، چابک لہراتے لدے پھندے خچر کے آگے جا کر قدم رکھتے ترائی میں اتر جاتے۔

عجب بات تھی کہ جس دن خچر سوار آبادی کی طرف پھیرا لگاتا اس کے اگلے روز آبادی میں سے پانچ جوان لاپتہ ہو جاتے۔ لیکن مشکل تو یہ تھی کہ مقابلے کے مخصوص دن سے پہلے کسی ذی نفس کو اس سنگی حصار کا رخ کرنے کی اجازت نہیں تھی، اور اس مخصوص دن کا پوری آبادی میں کسی کو علم نہیں تھا۔

ان کے ڈھلکی چڑھنے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا اس لئے آبادی کے لوگ دھان کوٹنے، بان کی پچھیاں بنانے، چاک گھما کر کوزے تراشنے، کولھو میں سرسوں پیلنے اور کپاس کاتنے والی کھڈیوں کو متحرک رکھنے میں جٹے رہتے اور بے کار اور ناکارہ بڈھے

دن بھر بیٹھے تمباکو پیتے رہتے۔ لے دے کر یہی رہ جاتے تھے جو آبادی میں مکین ہونے کے سبب مشرقی ڈھلوان پر منڈلاتے رہتے اور جب خالی بورا سنبھالے خچر سوار آبادی کا رخ کرتا تو اسے گھیر لیتے۔ تب "سڑ سڑ" ان کے سروں پر چابک لہراتا اور وہ بچ بچ جاتے۔

یہ سب کیا تھا، اس راز کی حقیقت جاننے کی خاطر میں نے اپنے بچپن اور لڑکپن کا بیشتر وقت روتے اور احتجاج کرتے گزار دیا۔

میں سخت شرمسار ہوں کہ میرا بچپن اور لڑکپن اس سنگی حصار کی اصل حقیقت کو جانے بغیر بیت گیا اور باقی وقت میں سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے چپ رہا۔ لیکن مجھے اس بات کا فخر بھی حاصل ہے کہ اس بھری پری آبادی کے سال خوردہ افراد میں سے شاید ایک میں ہی ایسا بڈھا بچا ہوں جسے اس سنگی حصار میں اپنے کھروں سے زمیں ادھیڑتے سؤروں کے ریوڑ کی اصل حقیقت معلوم ہے۔ میں اس خطرے کے پیش نظر کہ آج ہوں اور کل نہیں رہوں گا، آپ کو اپنے اس راز میں شریک کر رہا ہوں۔

یہ درحقیقت ایک ایسی شام کا قصہ ہے جب میں اور میرے دو بچپن کے ساتھی فیکا اور کیما ماہر کوٹ والوں کی شادی کی رونق دیکھنے کے بہانے سب کو جل دے کر چھپتے چھپاتے اس سنگی حصار کی جانب اتر گئے تھے۔ ہم نے ترائی اترنے سے پہلے اپنی چپلیں اتار چھوڑی تھیں اور بغیر کوئی آواز پیدا کئے اندھیرے میں اترتے چلے گئے تھے۔

وہ غضب کی رات تھی۔ آسمان پر چھدرے بادلوں کی آوارہ ٹکڑیاں چاند کے چہرے کو کبھی تو پوری طرح ڈھانپ دیتیں اور کبھی دور سے سہج سہج اس کی طرف بڑھتے ہوئے محض اپنے دامن کو اس کی جانب لہرا کر پرے نکل جاتیں۔

پھاگن کی کیا تاریخ تھی ٹھیک طرح یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ جب ہم تینوں اندر کوٹ کے شہید بابا کے مزار پر اکٹھے ہوئے تھے اور ترائی اترنے کا منصوبہ بنایا تھا تو ہم تینوں کے جبڑے سردی سے کھٹ کھٹ بج رہے تھے اور ٹھیک طرح بات منہ سے نکلتی نہیں تھی۔

ترائی اتر کر اس سنگی حصار تک کوس بھر کا سفر ہم نے منٹوں میں طے کر لیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب ہم ہوا میں تیرتے ہوئے ایک کے بعد ایک اس سرخ اینٹوں کی قد آدم دیوار تک پہنچے تھے تو موٹی اون کے سویٹر اور گاڑھے کے شلوار کرتوں میں ہم تینوں پسینے میں نہائے ہوئے تھے اور دل سینے میں سماتا نہیں تھا۔

ماہر کوٹ والوں کی شادی پر مجرے کی محفل جمی تھی اور ہمیں جانے کیوں یہ یقین سا تھا کہ سنگی حصار پر مامور پورے کا پورا عملہ وہاں سے غیر حاضر ہے۔ یہ خیال ہمارے ذہنوں میں شاید اس لئے سمایا کہ ہمیں ترائی اترتے اور سرخ اینٹوں کی دیوار تک آتے کسی نے روکا نہ تھا۔

ہم نے اس خیال خام میں خاصی لاپروائی برتی۔ ایک موقع پر فیکے کا پیر رپٹ گیا اور وہ اوندھے منہ نیچے آ رہا۔ اس غلطی کی سنگینی کا احساس اس وقت ہوا جب سرد اندھیرے کو چیرتی ہوئی کسی بندوق کی دو گولیاں فیکے اور میرے سروں پر سے گزر گئیں۔ خیر اس میں گذری کہ اس وقت بدلیوں نے چاند کے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا اور وہ پھاگن کی ایسی سرد رات تھی جس میں سنگی حصار کے کارندوں نے پڑتال کو ضروری نہ سمجھا یا شاید ایک دن ایسا ہونا ہی تھا، ورنہ آج میں یہ کچھ تحریر کیا چھوڑ کر مرتا، کیمے اور فیکے کی طرح اس راز کو سینے میں سنبھالے اپنی گور اتر جاتا۔

خیر، بندوق داغنے کے بعد دیر تک ڈیوٹی پر موجود کارندے ایک دوسرے سے باآواز بلند پوچھ گچھ کرتے رہے اور پھر چپ کی بھاری چادر تن گئی۔ ہم دیوار کی اوٹ میں دم سادھے پڑے رہے تھے۔ ایسے میں یوں محسوس ہوا جیسے کئی موسم آئے اور بیت گئے۔ ہم میں اٹھنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔

رات کے دوسرے پہر میں اس سنگی حصار کے اندر یک لخت بھگدڑ کی کیفیت پیدا ہوئی اور ہمیں گھٹی گھٹی انسانی چیخیں سنائی دیں۔ لیکن یہ سب کچھ تھوڑی دیر ہی کے لئے تھا۔ اس کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے اندر کی حیوانی مخلوق کو سرکاری کارندے ہانکنے میں لگ گئے اور یہ عمل بہت دیر تک جاری رہا۔

رات کا آخری پہر ہو گا جب میں نے ہمت کر کے کیمے اور فیکے کے سہارے اس سنگی حصار کے اندر جھانک کر دیکھا۔

آسمان پر رواں بدلیوں میں سے چاند کی چھدری روشنی میں سنگی حصار پر مامور عملہ سؤروں کے ریوڑ کو حصار کے دوسرے نصف میں ہانکنے کے بعد کٹے پھٹے انسانی اجسام کو ٹانگوں میں رسیاں باندھ کر کھینچنے کے لئے جا رہا تھا۔ ان بے طرح ادھڑے ہوئے لاشوں کو وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے گھسیٹ لے گئے۔ اس وقت روندے جانے

جانے والوں کی پہچان مشکل تھی، لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ کٹے پھٹے اجسام تعداد میں پانچ تھے۔

اس وقت میں کیمے اور فیکے کے سہارے کھڑا تھا اور میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دیوار کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا، لیکن میں نے جو کچھ دیکھا اس نے میرے ہاتھ پاؤں شل کر دیئے اور میں سیکے کی سمت ڈھیتا چلا گیا۔ اس وقت کیمے اور فیکے نے بغیر کوئی آواز پیدا کئے بڑی ہمت کے ساتھ مجھے نیچے اتارا۔

اگلے روز فیکا اور کیما حب میرا پتا کرنے میرے گھر آئے تو میں بخار میں بری طرح پھنک رہا تھا اور ان کے آنے سے قبل بے ہوشی کے عالم میں رات کا مشاہدہ اپنی ماں کو سنا چکا تھا۔

وہ نیک بخت فیکے اور کیمے کو اندر میرے پاس لے آئی اور ہم تینوں سے اپنی قسم دے کر یہ وعدہ لیا کہ ہم رات والی بات کسی سے نہیں کریں گے۔ شکر الحمدللہ کہ ہم تینوں نے اس کے جیتے جی اپنا وعدہ نبھایا۔ لیکن اس شرمندگی کا کیا کروں جس نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ لیا۔

میں نے جو کچھ دیکھا اور سادہ سی دعا سپردِ قلم کر دیا۔ جانتا ہوں کہ بیں اور عبارت آرائی سے کبھی دلچسپی نہیں رہی اور سچ پوچھیں تو بات سے بات پیدا کرنے کی اس فقیر کو توفیق ہی نہیں ملی۔

آبادی کے رخ پر کھلنے والے اس بھاری آہنی دروازے کو کھولنے اور بھیڑنے والا عملہ رہا، حجر پر حالی بورا سنبھالے "سرڑ سرڑ" چابک لہرانے اور ڈھلکی چڑھنے والے رہے۔ لوہا کوٹنے اور چاک پر کورے تراشنے والے مٹی میں مٹی ہوئے۔ اب تو سرسوں کی جگہ جلانے کیا کچھ چل نکلا اور کھڈیوں کی جگہ بڑے بڑے کارخانوں نے لے لی ہے۔ لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ اس بستی آبادی کے آتا میرے کہے کی تصدیق کرتے ہیں اور ہماری بڑی بوڑھیاں اپنی آنکھوں پر دونوں ہتھیلیوں کے سائبان لئے اپنے جگر گوشوں کی راہ تکتی ہیں۔

▲▲

چپ رہنے والا کون

حسین الحق

"ماں کے مار ۔۔۔ شاید دیکھ لیا سالوں نے۔" ایک نے ناک اور منہ پر پڑی مٹی کی بوچھار سے گھبرا کر کہا۔

"چلو چلو کھسکو یہاں سے۔" دوسرے نے سرگوشی میں کہا اور کھسکنے لگا

"کھسکنا تو پڑے گا ہی۔ سالے یہ نہیں کہ کیا دشمنی نکال رہے ہیں۔" پہلے نے تیکھے لہجے میں کہا اور دوسرے کے ساتھ کھسکنے لگا۔

"دشمنی نہیں ضرورت۔" دوسرا پیٹ کے بل رینگتا ہوا بدبدایا۔

"ضرورت کی ماں کی ۔۔۔" پہلا پیچھے پیچھے رینگتا ہوا جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یہ جگہ وہاں سے زیادہ محفوظ ہے، یہیں ٹھہر جاؤ۔" کچھ دور چل کر دوسرا رک گیا۔

"مگر یہاں تو سڑاند سے دماغ پھٹا جا رہا ہے۔"

"ہاں ۔۔۔ شاید آس پاس کہیں۔ پاخانے کی ٹنکی رکھی ہوئی ہے۔"

"شاید"، پہلا پھر جھلایا۔ "سالے اتنے اطمینان سے کہہ رہے ہو جیسے پاخانے کی ٹنکی کا نہیں گلاب کے ٹوکرے کا تذکرہ ہو۔ اس سالے گڑھے کی مہک تو چار گھنٹے سے برداشت کرنی ہی پڑ رہی ہے ۔۔۔ اب اس پر پاخانے کی ٹنکی ۔۔۔ اس سے بہتر تھی وہ سالی گولی ۔۔۔ وہ بھینچود بھی گڑھے کے منہ تک آ کر رک گئی ۔۔۔ چاٹ ہی جاتی کہ چین آ جاتا ۔۔۔"

دوسرا ہلکے سے ہنسا اور چپ ہو گیا۔

"دیکھتے ہو ۔۔۔ دیکھتے ہو سالوں کو ۔۔۔ کس طرح آگ لگاتے پھر رہے ہیں۔" پہلا دوسرے کو تقریباً جھنجھوڑتا ہوا بولا۔

"آہستہ، خدا کے لئے آہستہ بولو۔" دوسرے نے اس کا ہاتھ اپنے بازوؤں پر سے الگ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔

"ارے تم تو سالے بھوت ہو۔" پہلا جھلاہٹ میں اور تو کچھ نہ کر سکا۔ اس کو چھوڑ کر ذرا سا پرے ہٹ کر بیٹھ گیا اور سامنے دیکھنے لگا ۔۔۔ چند ساعت چپکا بیٹھا رہا پھر اچانک تیکھے کے انداز میں بولا ۔۔۔ ارے دیکھو ۔۔۔ دیکھو ان حرامیوں کو ۔۔۔ اسی لئے بجھائی ہوئی تھی ال کی، اس غریب نے ذرا سا دریچے سے جھانکا تھا ۔۔۔ اور گولی مار دی ان ملعونوں نے ۔۔۔"

"سو جاؤ ۔۔۔ تم بھی ان کو گولی مار دو۔" دوسرا ذرا تیکھے لہجے میں بولا۔ "وہ جو کر رہے ہیں اس صورت حال میں انہیں اس سے کون روک سکتا ہے؟"

"ہاں ہاں ۔۔۔" پہلا دوسرے کے منہ کے آگے ہاتھ نچا کر بولا ۔۔۔ "اس صورت حال میں کچھ کر نہیں سکتے ہیں ۔۔۔ اور جب یہ صورت حال گزر جائے گی تو کمیشن اپنی رپورٹ میں لکھے گا۔ "حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مارے گئے۔""

"جو طریقہ ہے وہی نا اپنایا جائے گا؟"

"طریقے کی ۔۔۔" پہلا انتہائی جھلاہٹ میں انتہائی غلیظ گالی بکتا ہے اور غصے کی شدت کے باعث اپنے دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگتا ہے ۔۔۔ اور سامنے دیکھنے لگتا ہے۔

سامنے چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے' لوگ بلبلا بلبلا کر گھروں سے نکل رہے ہیں اور جدھر سینگ سما رہی ہے بھاگ رہے ہیں ـــــ اور بھاگنے والوں کو گھیر گھیر کر ایک بڑے میدان میں جمع کیا جا رہا ہے ـــــ اور جو ذرا ادھر ادھر چھپ کر یا بچ کر نکلنا چاہتے ہیں اور نکل نہیں پاتے، انھیں بوٹوں سے روندا جا رہا ہے

یہ افتاد جس علاقے پر پڑی ہے' اس علاقے میں خام مکانات کی بہتات ہے، گلیوں میں چاروں طرف گندگی جمع ہے' شاید برسوں سے میونسپلٹی والوں کو یہ علاقہ یاد نہیں آیا ـــــ یا شاید اس علاقے والے صفائی اور گندگی کی حد امتیاز سے ذہنی طور پر بہت آگے نکل چکے ہیں ـــ

یہ سب کچھ شروع ہونے سے پہلے ـــــ کچھ دیر پہلے تک، محلے کے نوجوان ایک جگہ بیٹھے افواہوں کا طومار باندھنے میں مشغول تھے' بچے گلی میں اشا اور گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے اور بے سوچے سمجھے ایسے ہی ماں جائے کو ماں کی گالیاں بک رہے تھے' بوڑھے کسی خام مکان کے مٹی کے چبوترے پر بیٹھے آزادی کا نعرہ حال کر رہے تھے کہ اچانک یہ افتاد آن پڑی ـــ

اب انھیں گھیر گھیر کر ایک بڑے میدان میں جمع کیا جا رہا ہے۔

اور انہیں گھیرے جانے والوں میں سے یہ دو، جانے کیسے' کیسے کھاتے اس گڑھ میں آن پڑے ہیں۔ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور حیران ہو رہے ہیں ـــــ دونوں حیران ہو رہے ہیں۔ بولنے والا بھی ـــــ اور چپ رہنے والا بھی ـــــ"

اچانک چپ رہنے والا بولنے والے کا کندھا اتنی زور سے دباتا ہے کہ وہ تلملا کر گالیاں دیتا ہوا مڑ جاتا ہے ـــ"

اور چپ رہنے والے کو دیکھ کر ـــــ چونک کر چپ ہو جاتا ہے ـــ"

چپ رہنے والے کا چہرہ اس طرح سرخ ہو رہا ہے جیسے رخساروں کو کسی نے دہکتی ہوئی بھٹی میں ڈال دیا ہو ـــــ شاید سارے جسم کا خون چہرے کی طرف چلا آیا ہے ـــــ آنکھیں دہکتے انگاروں کی تمثیل ـــــ کھٹی پھٹی' وحشت ناک' جلتے تپتے ریگستان میں اٹھتے بگولوں کے رقص کا استعارہ ـــــ دانتوں تلے اتنی شدت سے دبا ہونٹ کہ شاید ہونٹ کٹ گیا ـــــ خون بہہ بہہ کر ٹھوڑی پر آ رہا ہے۔ مگر وہ نے خون سے بے خبر ـــــ یا خون کی لذت سے ناچ ـــــ کسی اندرونی نامعلوم کیفیت کی انتہائی شدت کے باعث پورے بدن میں لرزہ ـــــ کانپتا

تھرتھراتا اور اپنے وجود کو ایسے ہی داخلی اذیت پسندانہ رویے کی صیقل شدہ تلوار سے کاٹتا اور زخمی کرتا ـــــ سامنے کی طرف بس آہستہ آہستہ تکتا ـــــ

چپ رہنے والا!

"کیا بات ہے؟" بولنے والا سہما تا ہے۔

چپ رہنے والا نظریں نہیں ہٹاتا ـــــ بس ایک بھاری آواز ـــــ جیسے ہزارہا ہزار چٹانوں کے نیچے دبا کوئی بول رہا ہو ـــــ دبی دبی کبھی کبھی گریہ کے بے تھاہ سمندر میں ہچکولے کھاتی ـــــ سیاہ بے حس مٹی کی مجبور تماشائی ـــــ ایسا تماشائی جس کے ہاتھ سر با معذور کوئی تشدد پسند کے دہانے پر رکھ آیا ہو ـــــ جس کی صورت و صدا کی ہر ہر لہر کے سینے پر رقیب جھومتی جا رہی ہوں ـــــ ایک دبی دبی ـــــ کبھی کبھی ـــــ بھاری گھمبیر ـــــ اور ہر سانس میں ٹوٹتی آواز ـــــ "آ ـــــ یا" ـــــ"

بولنے والا چونک کر سامنے دیکھتا ہے، اور ٹھٹک ٹھٹک کر رہ جاتا ہے اور سامنے ـــــ گھیرے جانے والے مجمع سے پرے ـــــ ایک ہی فاختہ ـــــ ستمگاری کی قید میں ـــــ"

"نہیں ـــــ ایک فاختہ نہیں ـــــ سیکڑوں فاختائیں' بلبلیں اور مور ـــــ اور سب سہمے ـــــ سب اسیر ـــــ"

بولنے والا رو رہا ہے ـــــ اور چپ رہنے والا بس ایک جملہ بول کر چپ ہے۔

"مگر چہرہ ـــــ مگر آنکھیں ـــــ مگر ـــــ"

"ہے ہے ـــــ ہے ہے ـــــ ہے ہے ہے ـــــ ہے ہے ـــــ ہی ہی ـــــ ہا ہا ـــــ آئے ہائے ہائے ہائے ـــــ" بولنے والا مچھلی کی طرح تڑپتا ہے اور طرح طرح کی آوازیں نکال کر رونے لگتا ہے ـــ

"کیا ہوا؟" چپ رہنے والا بھاری' گھمبیر اور سرگوشی کے انداز میں پوچھتا ہے اور پوچھتے ہی چونک پڑتا ہے ـــ

بولنے والا گویا، چپ رہنے کی آواز سن کر چونکا ہے ـــــ اور اب مڑ کر سامنے دیکھ رہا ہے ـــــ"

سامنے ایک بڑے میدان میں بستی کے سارے لوگ سنگینوں کی نوک پر

اکٹھا کئے گئے ہیں ـــــ اور اب ـــــ چاروں طرف سے اٹھتی ہوئی رائفلوں
سے نکلی ہوئی گولیوں کی بوچھار ایک ایک مرتبہ میں سیکڑوں کو زمیں بوس کر رہی
ہے ـــــ راؤنڈ پر راؤنڈ فائرنگ جاری ہے ـــــ اور بے بس روحوں کی
ہر التجا، ہر بھیک، ہر فریاد زمیں چاٹ رہی ہے ـــــ دل دوز چیخیں ـــــ
سسکیاں ـــــ بلبلاہٹیں ـــــ دم توڑتے گریہ کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔
بولنے والا روتے روتے بے ہوش ہو چکا ہے ـــــ اور چپ رہنے والا
بھیانک چہرہ لئے سب کچھ دیکھ رہا ہے ـــ

آہستہ آہستہ سب سناٹا ـــ گہری سیاہ اندھیری رات کا
اتھاہ سکوت !

رائفل بردار اپنی اپنی رائفلیں صاف کر رہے ہیں۔
اور چپ رہنے والا بھیانک چہرہ ـــــ بس ایک ٹک سامنے دیکھے
جا رہا ہے ـــــ"

اچانک چونک پڑتا ہے۔
سر ذرا اوپر کر کے غور سے دیکھتا ہے ـــ
چہرے کا تناؤ ذرا کم ہوتا ہے ـــ ہونٹوں پر تبسم کھیلتا ہے ـــ پھر
ہنستا ہے ـــ پھر قہقہے لگانے لگتا ہے۔
اٹھو، اٹھو ـــــ دیکھو، دیکھو! قہقہے لگاتے لگاتے وہ بولنے والے
کو جھنجھوڑتا ہے، جو اب ہوش میں آ چکا ہے۔
"کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟" بولنے والا الجھن میں پڑا ہوا ہے۔
"دیکھو، دیکھو ـــ سامنے دیکھو ـــ" چپ رہنے والا بول رہا ہے
اور ہنس رہا ہے۔
"کیا سامنے دیکھوں ـــ خاک ـــ" بولنے والا پھر بڑبڑانے
لگتا ہے، "سب تو مر چکے اور تم ہنس رہے ہو؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟"
وہ اپنی سسکیوں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔
"ارے گھبرا مت پیارے ـــ دیکھ سامنے ـــ میں بالکل ٹھیک
ہوں ـــ سامنے دیکھ ـــ اس سفید مکان کے بائیں سمت والے گوشے پر
نظریں جما ـــ" چپ رہنے والے کے لہجے سے خوشی چھلکی پڑ رہی ہے۔

بولنے والا گردن گھما کر سفید مکان کے صحن کے بائیں سمت والے گوشے پر نظر جما دیتا ہے
بہت دیر تک دیکھتا رہتا ہے اور پھر اپنی سوالیہ نظریں چپ رہنے والے پر مرکوز کر دیتا ہے
"اور ادھر دیکھ"، چپ رہنے والا بولنے والے کی گردن دائیں طرف موڑ دیتا ہے
بولنے والا کچھ دیر تک غور سے دائیں طرف دیکھتا رہتا ہے، پھر کچھ نہ کچھ سمجھ کر
جھلا جاتا ہے: "مطلب کیا ہوا؟"
"بورکہ"، چپ رہنے والا مسرت آمیز لہجے میں پیار سے اُس کے شانے پر ہاتھ مار کر
ہنستا ہے اور ہنستے ہنستے کہتا ہے ـــــ"
"مطلب کیا پوچھتا ہے پیارے، اب کوئی غم نہیں ـــ دھوکا کھا گئے سالے ـــ
جھک گئے بیوقوف ـــ دشمن ہار گیا ـــ دیکھ پیارے دیکھ ـــ آگے دیکھ ـــ"
وہ خوشی میں ناچ ناچ جا رہا ہے، اور بار بار آنکھوں کی نمی دامن میں جذب کر رہا ہے۔"
اور بار بار سامنے دیکھ رہا ہے ـــــ جہاں ـــــ"
سیکڑوں لاشیں میداں میں پڑی ہوئی ہیں ـــ
رائفل بردار علاقہ چھوڑ کر دائیں سمت مارچ کر رہے ہیں۔
اور سفید مکان کے صحن کی بائیں سمت والے گوشے میں ایک سال چھ مہینے کا بچہ
قلقاریاں بھر رہا ہے ـــ"
چپ رہنے والا دیکھ رہا ہے اور ہنس رہا ہے۔
اور بولنے والا چپ ہے ـــ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے۔
اچانک چپ رہنے والا ایک چھلانگ میں گڑھے سے باہر آ جاتا ہے ـــ
اور گڑھے سے باہر آ کر اس زور دار قہقہہ لگاتا ہے کہ رائفل بردار جاتے جاتے
چونک کر مڑتے ہیں ـــــ رائفل بردار مڑتے ہیں اور ـــــ"
چپ رہنے والا گولی کھا کر اچھلا اور پھر گڑھے میں گر گیا ـــــ
پل بھر میں رائفل برداروں نے پورے علاقے کو اپنے حصار میں لے لیا۔"
اس طرح حصار میں لیا کہ اس علاقے کی شاید ایک چیونٹی بھی ان کی نگاہوں
سے اوجھل نہ ہو سکی ہوگی۔
جوانوں نے گڑھے میں اتر کر چپ رہنے والے کی لاش باہر نکالی اور ٹکڑے
ٹکڑے کر ڈالی۔
بولنے والا کون تھا ـــــ؟؟

برکت والی قبریں

علی تنہا

سامنے سے بطخوں کی ٹیڑھی قطار میں وہ پھر نظر آگیا۔ مگر اب کے اس کی گردن میں زنجیر کی بجائے رسی کا ٹکڑا تھا۔ بطخیں تو قطار توڑ کر آس پاس کے کونے کھدروں میں تیتری ہو لیں اور تالاب کے پاس جو ٹوٹا ہوا چوبی دروانہ پڑا ہے۔ اسے سونگھنے کے بعد ٹانگ اٹھا کر موتنے پر اسے پھٹکار پڑی ہے' تو کتے نے مڑ کر دیکھا۔ مگر سائیں کے ہاتھ خالی تھے۔ بڑے آرام سے اس نے دروازے پر جست لگائی اور گم ہو گیا۔ سائیں جو بیچارگی کے ساتھ اسے دیکھتا رہا تھا۔ ایک لمبی انگڑائی لے کر جوتے گانٹھنے والے لڑکے سے بولا — تم نے تو بتایا تھا۔ یہ وہی کتا ہے۔"

ہے تو وہی مگر سائیں یہ تو کوئی بدنسل لگتا ہے۔ ورنہ۔ . "

" ہاں ہاں" سائیں نے لڑکے کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ایک تو اس کی ذات پات کا ٹھیک نہیں پھر اسے ہڑک اٹھتی ہے۔"

" شک والی بات ہے"۔ لڑکے نے ہولے ہولے سر سے اس کی بھاری کھردری ہتھیلی کو ہٹایا۔" سائیں اس کے پکڑنے کو ہاتھ بھر کا کلیجہ چاہیے۔"

" کیا کہا۔؟"

" یہ بڑے بڑوں کے ہاتھ نہیں لگا تم تو سائیں ہڑک کی کہتے ہو۔ میں نے کہا نا بدنسل کتے سے بچنا چاہیے۔

" ہاں سچ کہتے ہو۔ آدمی اور کتے کی ذات کا اعتبار نہیں" لڑکا دیر تک آپ ہی آپ ہنستا رہا اور سائیں جو تالاب کے کنارے بیٹھ کر اپنی سیخ رنگی داڑھی میں انگلی پھیرنے لگا تھا اس لمحے ایک دم سے گا و دی لگا، اس کے جی میں آئی، اٹھے اور سائیں کو پیچھے سے کمر میں لات مار کر تالاب میں ڈوبتا کرے عین اسی وقت مور علی شاہ کی موت کا اعلان لاؤڈ اسپیکر سے سن کر گھبرایا، سائیں جو اونچی آواز سننے کو مبہوت اٹھ بیٹھا تھا۔ لڑکے کی آواز پر پہلے تو دھیان نہیں دیا مگر لڑکا جوتی کے تلوے کو ہاتھ میں اٹھائے اس کے برابر آیا۔

" سنا نہیں تم نے حاکم علی نے کیا کہا ہے؟"

کیا کہا ہے؟'

" تم سے جانا ہے اس کے ساتھ قبر کھودنے" "میں بھول گیا تھا تمھیں بتانا"

" کتیا کے جنے" تمھیں اعلان سن کے سب یاد آیا، میں نے کہا نا کتے اور آدمی کی ذات کا کچھ ٹھیک نہیں"۔

لڑکے نے سائیں کے ہاتھ میں ہوا میں اٹھے ہاتھ کو اپنے کمزور ہاتھوں سے پکڑا۔ "میں بھول گیا تھا سائیں، خدا کی قسم بھول گیا تھا" اس نے ہاتھوں کی پناہ سے سائیں کے ہاتھ روکنے چاہے لیکن سائیں نے ایک نہیں سنی۔ مکہ پوری شدت سے لڑکے کی کمر پر جا پڑا۔

"سکتے کوئی کام بندروں والا بھی کرتے ہو یا زمین پر اینڈتے کو بنے ہو؟"
لڑکا دہرا ہو کر کمر پہ ہاتھ رکھے اب دوسرے کتے کے انتظار میں تھا۔
سائیں نے گالیوں کے طومار میں اس کے چوتڑ پر لات ماری اور بڑبڑاتا
ہوا چل پڑا "دھسا کیا ہے لونڈے نے میلی دری جس پر اس کا سامان بکھرا تھا،
کمر لگائی اور بولا "تو ایسا کمینہ اور کون ہوگا! ایسا خبیث اور کہاں پیدا
ہوگا ہائے میری کمر تو دہری ہو گئی۔"

وہ دیر تک جوتوں کے ڈھیر پر پاؤں رکھے بیٹھا رہا۔ حتٰی کہ میاں اپنے پالک
لڑکے کو سائیکل کے کیریئر پر بٹھائے گذر گیا۔ اس بڑے میاں کی جوتیاں یاد آگئیں۔ یہ
سنسنا سینڈل میاں بیوی کے تھے۔ پشاوری جوتی اس کے چھوٹے بھائی کی۔
اور ایک جوڑا زری جوتی کا میاں جی کا اپنا تھا۔ سعید سینڈل اٹھا کر دیکھا کیا
... میاں کی بیوی کے ہولی کی طرح سعید پاؤں جیسے نرم و نازک تھے شاید
... پیا کے پیر تھی۔

وہ میاں اور بڑے پالک لڑکے کے گھنگھریالے بالوں کو سائیکل پر اڑتے
دیکھتا رہا۔ سائیکل شفاف آئینے کی طرح چمکتی سڑک پر اڑتی رہی۔ دوبارہ
... مکان کے پاس جھکی ہے تو سائیں اور حاکم علی کو سڑک پر دیکھتے ہی اس کا جی
دھک سے بیٹھ گیا۔ دونوں کدالیں اٹھائے اسی کی طرف آرہے تھے جلدی
میں سعید سینڈل کو پانی میں بھگو کر بکسے کو تلاش کرنے لگا بکسوا نہیں ملا۔
تو وہ پالش والی بڑی بوتل ہاتھ میں پکڑ کے سائیں کے ڈولتے قدموں کی اور
چور نظروں سے دیکھنے لگا۔ دونوں کاندھوں پر چادریں ڈالے باتیں کرتے
آرہے تھے شیشم کے ایک خم کھائے بڑے درخت کے نیچے کھڑے دونوں کتے
کو دیکھ کر ایک دوسرے سے لپٹتے رہے دیر تک۔ کتے کو سڑک کے کنارے
... گدھے کی طرف مسکا کر سائیں اونچی آواز میں لڑکے سے کہنے لگا۔

"مرا آیا حرام زادے موچی کے تخم۔"

وہ بیچارگی کے ساتھ دونوں کی تنگی کالیوں کو بس کر لوٹل سکا
ڈھکا چھوٹم چھوٹ کھولنے لگا۔ حاکم علی نے سائیں کی کدال کندھے پر لہرا کر کہا
"پھر ایسی غلطی نہ کرنا موچی کی اولاد نہیں تو قبر میں تمھیں زندہ
زندہ دفن کر دوں گا۔ جانتے ہو میرا نام کیا ہے۔ حاکم علی عرف جابر جنگ۔"

لڑکا خاموش آنکھیں جلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سائیں نے
حاکم علی کو قبرستان کے زرد ٹیلے کی طرف مڑتے دیکھ کر آواز دی۔ مگر
حاکم علی نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

"ایک بات ہے حاکم علی اگر تم مان لو۔"

وہ رکا مگر حاکم علی ٹیلے پر تقریباً دوڑتا ہوا چڑھ رہا تھا،
سائیں نے ہانپ کر اپنی کدال دوسرے کاندھے پر رکھی۔

"بڑھاپا بڑا ہے یار، ورنہ تمھیں یاد ہے نہ جس سال مولوی
فقیر محمد شہید کو دفنایا تھا کیسی تابڑ توڑ بارش برسا کی۔ کچھ مٹی ہو کے گھٹنوں
دھنستے چلے جائیں۔ میں بولوں اس ٹھنڈ میں تو شہادت نصیب آئی گر
ہے۔ سائیں تم اندازہ نہیں کرنے کے سب کہیں پٹی کر گئے۔ میں بولوں بڈاتو!
آج تمھاری مائی مرگئی ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔

"آج دل ہے کچھ کرنے کا۔"

"اب میرے سامنے ڈینگیں مارنے نہیں بیٹھ جاؤ۔ چوبیس کلو گوشت اور
پانچ روپے کلو چھاں دودھ بکتا ہو تو سب سہانے خواب اڑنچھو نہ ہوں۔"
لیکن تمھاری مٹی کچھ سخت ہے سائیں بہت ہی سخت۔

"قبر کی جگہ دیکھی تم نے؟"

"نہیں۔"

"ہاں بڑھ کے دائیں طرف حضرت پیر کی قبر کے سیدھے ہاتھ۔"

وہ چیخا "ارے ارے۔"

"کیا ہو گیا تمھیں؟" حاکم علی نے حیرت سے دیدے پھاڑے۔

"تمھاری بات بھا گئی ہے مجھے خدا کی قسم بھا گئی ہے۔"

"کلموہے تمھیں سوجھی کہاں کی ہے،" ہیں بولا لب۔"

"یہ جو بادل ہیں دیکھا تم نے، دھیمی ہو کر پورے سورج تک کو
چھپا لیتے ہیں یہ برسے کو آئیں تو میں کیا اور تو کیا، مُردوں کے سب اگلے پچھلے
دھل جائیں۔ ایک تم ہو کہ تمھارے پیٹ میں کبھی بات بے کسی اور اکلا پچھی
رہتی ہے۔ سال کے سال کہاں دن کے دن۔"

وہ دھاڑا۔ "پھر وہی بات تمھاری تو کتے کی زبان ہے۔ ہر وقت ہڑک

اٹھتی ہے۔ نہ بھوکو تو تمہارے پیٹ کی تہوں میں کائی نکل آئے۔"

سائیں نے کدال زمین پر پھینک، حاکم علی کے ہاتھ سے کدال چھڑا لی۔ دونوں زمین کھودتے کھودتے ایک نظر آسمان پر ڈال اطمینان کر لیتے۔ البتہ سائیں کے دل میں شک بادلوں کی وجہ سے اور پک گیا۔ کدال زمین پر رکھ کر اس نے جنوب میں بادلوں کے دل کے دل دیکھ کر کہا "لگتا ہے آج مینہ ہو کے ہی رہے۔"

"ہاں ہاں تم ضرور اپنی گندی زبان چلاتے جانا۔ نہیں تو اسے زنگ لگ جائے گا، گل سڑ جائے گی۔ لیکن سن لو بارش آج نہیں ہونے کی۔"

"خدا خیر کرے۔"

اس نے حاکم علی کو ہانپتے کدال نیچے رکھ کر پوچھا "یار اب جنگ بھی نہیں ہوتی۔"؟

"ہاں۔ یہ بہت برا ہے۔ کمائی کے دن تو جنگ میں ہوتے ہیں یار۔ یہ جنگ کہاں ہوتی ہے؟ اب اپنی طرف کوئی نہ دیکھے تو اپنا مقدر، لیکن سائیں آج اگر بارش نہیں ہوتی تو کیا برا ہے؟"

"پھر بارش کوئی ....؟"

اس نے گالی دے کر بھی حاکم علی کے سامنے اپنے آپ کو سیانا جان کر جواب دیا۔

"مینہ ہونہ ہو۔ اپنے تو پیسے کھرے ہیں۔"

"تم خاں کے ادھوٹوں میں شامل ہو، میری بات تمہاری سمجھ سے دور دا صل ہے۔"

"نہیں یار، بات میں کہاں بھولا ہوں۔" ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کے ساتھ ہی حاکم علی بجھ گیا۔ یہ بارش کی پہلی چتاؤنی تھی۔ دونوں تازہ کھدی ہوئی قبر کے سرہانے کدالیں ہاتھ میں لئے کھڑے ہو گئے۔ اور بے بسی کے ساتھ بادلوں کو حو آن کی آن میں آسمان کو چھپا رہے تھے دیکھتے رہے۔ ہوا کے ساتھ ساتھ حاکم علی چکنے گھڑے کی طرح چک پھیریاں کھاتا رہا۔ سائیں اور حاکم علی ایک دوسرے کو ویران دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

"ایک بات ہے۔ سائیں عبدالرؤف کے باپ کو دفناتے وقت مجھے خوف ہی آ گیا تھا ایک بار۔"

"نہیں، میں نہیں مانتا بالکل۔"

حاکم علی تازہ سوندھی مٹی پر کدال مار کر بولا "نہیں یار میں سچ کہتا ہوں۔ رات کو سونے کے دانت اتارنا عذاب ہے۔ حضرت نور الشاہ کی قبر سے تو آوازیں آتی رہیں مگر میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ اب تک گدھوں سے تو کھیت چروایا نہیں۔ ڈر کس بات کا۔"

"حاکم علی ہوا میں پانی کا بوجھ ہے۔ بارش کہیں نازل نہ ہو جائے۔"

"بارش، بارش کیا ہو گی۔ اب مجھے تو اپنا سر کاٹنے لگا ہے۔"

"کیوں جی کہاں گئی آپ کی دلاوری؟ بڑے طوفان سے چلے تھے"

سائیں نے اسے قبرستان کی سیلن زدہ زمین میں بادلوں کی طرح تیز تیز باتیں کرتے سن کر ہاتھوں کا چھاتا بنا بادلوں سے بھرے آسمان کو تاکا وہ اس سڑی آدمی کو جو جنازہ دیکھ کے پاگلوں کی طرح قبروں کے بیچ بیچ بھاگ رہا تھا۔ اسی طرح آتے دیکھ کر درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ کیکر کے پیلے پھولوں سے لدے درخت پر سے گدھ کو اڑا کر اس نے حاکم علی کو آواز دی مگر وہ قبرستان کی ٹوٹی ہوئی کچی دیوار پر کھڑا جنازے کی طرف دیکھے جاتا تھا۔ سائیں نے ایک نظر کیکر کے پیلے بلانے پر ڈال کر اپنے آپ سے پوچھا تو سہی لیکن اس کا سارا جتن دہل گیا۔ رات کو اگر بارش ہوتی ہے تو پورے کا پورا قبرستان کالا پانی بن جائے گا۔ اور کالے پانی کی قید خدا کی پناہ۔ وہ کیکر کے کالے تنے پر ہاتھ دھر کر قبرستان میں داخل ہوتے جنازے کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔ حاکم علی نے جنازہ کو کندھا دینے والوں کے برابر میں آ کے سائیں کو اشارہ کیا۔ "سائیں جنازے میں جھنجھناتی اور عجیب خواب میں بولتی آوازوں کے ساتھ بہتا بہتا نماز جنازہ میں کھڑے حاکم علی کو بد دعائیں دیتا رہا، اسے تو مردوں کی بددعا ہے۔ اتنے برے موسم میں رات کو یہاں آنا کون آسان کام ہے، اندھیری رات میں لالٹین سے تنا بھی کیا، بارش شروع ہو گئی تو؟"

وہ اپنے آپ میں قبر مکمل ہونے پر ادھورا سا ہو کے حاکم علی کے ہو کے پر بولا۔

"یار میں نے بڑے بڑے لوگ دفنائے ہیں لیکن آج کی رات قبر کھودنا۔"

"تم اور قبر کھودنا، میاں تم تو بس مال کے حصہ دار بننے میں ماہر ہو۔"

گھبراؤ نہیں۔ رات میں آؤں گا۔ آدھ تولہ سونے کے دانت نکالنے ......

یہ بھی کوئی کام ہے۔ میں نے تو مردوں کے پیٹ سے .....

"پھر سائیں، آج بارش یقینی ہے۔ اتنی رات میں نئی قبر کو پھر سے کھودنا اور بند کرنا دیو کے ساتھ لڑائی ہے۔ پیر جی نے کتنی بار کہا ہے ......"

"تم تو پاگل ہوگئے ہو نپٹ پاگل"۔

وہ چلایا۔ "یہ کوئی نئی بات ہوئی۔ پیر جی نے ہی تو۔ لیکن حاکم علی میرے دل میں شک پیدا ہو چلا ہے"۔

"نہیں نہیں"۔

"ہاں شک پیدا ہو جائے تو کہاں کوئی بچتا ہے۔ جہنم میں جاؤ تم اور تمھارا شک"۔

"سائیں، کتے پالنے والوں کو سونے کی قدر معلوم ہے؟"

"کس کی قدر ہے"

قریب سے گزرتے ہوئے مولوی عبداللہ شاہ نے حاکم علی کو ٹہوکا دیا۔

"پکی قبر کی یا حضرت"۔

"ہاں ہاں"۔

مولوی نے آسمان کی سمت شہادت کی انگلی اٹھائی۔

"ہاں ہاں پکی قبر کی بڑی برکت ہے۔ خدا گواہ۔ بڑی برکت ہے..."

▲▲

ادھورے انسان کی کہانی

محسن شمسی

تجربہ مکمل نہ تھا۔

اندھیرے پانی کو چاک کر کے وہ نکلا۔ اپنی آواز پہلی دفعہ سنی۔ اپنے وجود کو پہچانا۔ پھر جستجو کی ایک زنجیر تھی جس کے حلقے میں اس کا ذہن آ گیا۔ اس گرفت سے چھٹکارا پائے یہ اس نے کبھی نہ سوچا۔ وہ تو اپنی مرضی کا قیدی تکمیل کا خواہش مند تھا۔

چل نکلا کہہ کر "دماغ کو روشن کر دینے والی تجلی کی قسم۔ انتہا چاہتا ہوں امکان کی۔ صلاحیتوں کی۔ آرزو کی۔ اس تجربے کی جو میری زندگی ہے۔" وہاں جا رہا تھا وہ جہاں ہر چیز کا حل ہے۔

وہ راستے میں آئی۔ بولی "چند گھڑیاں ہیں۔ آؤ جی بہلائیں۔ وقت کے اس ٹکڑے کا فائدہ اٹھائیں۔" اس کا جسم ایسا کہ دیکھنے والی نگاہیں بھٹک جائیں اور چہرہ کہ بھلایا نہ جا سکے۔ وہ دیکھتا رہ گیا۔ نزدیک آئے تو جسم کی گرمی سے روحوں کے مسام کھل گئے۔ اور وہ قربت کی بوندوں سے شرابور ہو گئے۔" نازاں وہ خوش تھا کہ رات کا اکیلا پن دور ہوا۔ بولا "میرے ساتھ چلو۔ منزل یہ اب ہم دونوں کی ہے۔"

آسودہ وہ کھل اٹھی کہ ساتھی ملا۔ سمجھی اب جڑیں زمین پکڑ لیں گی۔

بولی "جانا کہاں اب میرے ساتھ رہو۔ گھر یہ ہم دونوں کا ہے۔"

بولا "میں تو نہ رک سکوں گا۔ مجھے تکمیل کی منزل پر پہنچنا ہے۔ تم میرا ساتھ دو۔"

بولی "یہ رشتے ہمارے آپس کے۔ اور ملن کی گھڑیوں میں جھومنے والے درختوں سے۔ ان کے پھلوں سے۔ پھولوں سے۔ اس مٹی سے جس میں اپنی خوشبو مل کر۔ اس اوٹ سے جس کے پیچھے لمحے بکر۔ جسم نے روحوں کو جانا۔ کیا ان رشتوں کا تم کو کچھ پاس نہیں؟ انھیں توڑ کر کہاں جاتے ہو؟ میری سنو۔ ان رشتوں کی ارتقا ہی کی تکمیل ہے۔"

بولا "گھاس اور پھول اور قدرت کی سب بڑھنے گھٹنے والی چیزیں مجھ سے کم تر ہیں۔ ان سے میرا کیا رشتہ۔ بے عقل ہو تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ تکمیل عمل سے ہے۔" پھر چلنے لگا۔ وہ پیچھے پیچھے دوڑی۔

واسطہ ہے تمھیں رابطے کے اس لمحے کی یاد کا جو مجھ میں مدغم ہے۔ میری شریانوں کے خون سے اس کی پرورش ہو گی۔ کیا تمھارا دل نہیں چاہتا کہ اسے اپنے نت نئے رنگ روپ میں بڑھتا پھولتا پھلتا دیکھو؟ اسے نظرانداز کرنا کون سی تکمیل ہے؟ کیسے ہو تم۔ دل نہیں تمھارا سرخ اینٹ ہے ایک۔"

پتہ نہیں اس نے سنا بھی یا نہیں۔ وہ تو چلتا ہی رہا اور چلا گیا۔

چلتے چلتے خیال کی چوٹ لگائی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا رکنا رہ گیا۔ یہ اس کی یاد تھی۔

بولا "کیسی وفادار تھی۔ کاش وہ ساتھ ہوتی۔ وہ چہرہ اس کا کہ بھلایا نہ جا سکے۔ کیا کبھی مجھے بھی یاد کرتی ہو گی۔"

لوٹ جانے کو مڑا پر قدم نہ اٹھے۔ بولا "میں تو اپنی اور اس دنیا کی جو میرے دل میں بسی تھی تکمیل کرنے چلا تھا قرنوں سے بس یہی جستجو دماغ میں بسائے مصروف۔ اب ساری ریاضت کو کیا ایک عورت کی گرمی سے آگ لگا دوں؟ — لیکن — لیکن وہ اس کے بدن کی سیپ میں پروان چڑھتے لذت کے گیلے موتی — کیا ان کی یاد بھلا دوں؟"

ارادے نے اس کی یاد کو کرکرا کر ڈالا۔ اور یادوں نے اس کے ارادے کو پیس ڈالا۔

وہ وہیں رکا رہ گیا۔

تجربہ مکمل نہ تھا۔

اماوس کا پہلا پہر

غالب حسنین

اس کا پر نور چہرہ کچھ اداس ہو گیا۔ حزن و ملال سے چہرہ تن گیا، پیشانی جو کسی ماہتاب ضیا باریاں کرتا تھا شکنوں سے پر ہو گیا اور آنکھیں جھلملا گئیں۔ کچھ کہنے کی کوشش میں اس کے لب زخمی طائر کی طرح پھڑپھڑانے لگے۔ یاس و غم انگیز لہجہ میں رک رک کر الفاظ اس کے منہ سے نکلے "کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ تمھارے سروں پر ننگی تلوار نہ لٹکے، تم ان شکنجوں میں نہ جکڑے جاؤ جو ازل سے ناپسندیدہ رہا ہے اور ابد تک ناپسندیدہ رہے گا۔ تمھارے دست و پا تمھارے دل و دماغ اور سوچ و فکر تمھارے اپنے ہوں اور آفت ناگہاں کی طرح نازل کوئی قصہ پرور مداری ڈگڈگی بجا بجا کر بندر ناچ نچائے، کوئی تمھاری تمام قوت کو سمیٹ کر کاہی پنجرے میں جکڑ دے اور ایک خبیث و نزار رنگ ماسٹر چابک کے اشارے پر قوت و مردانگی اور جاہ و جلال کے پیکر کو کٹھ پتلی بنائے۔"

اس کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھے ہوئے تمام لوگ بے چینی سے پہلو بدلنے لگے۔ اور عالم اضطراب میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ایسا عالم اضطراب انھیں بہت کم دیکھنے کو ملا تھا۔ وہ تمام اشخاص الجھے الجھے سے ایک دوسرے سے خاموش نگاہوں سے الجھا الجھا سوال کر رہے تھے ___ صرف سوال؛ کسی سے جواب نہ بن پڑتا تھا۔ ہر شخص سوال ہی بن گیا تھا، مجسم سوال ___ انتہائی کرب کا سوال۔ مات۔ نہ کبھی کہ اس حلقہ بگوشوں میں تدبر نہ تھا فکر کی گیرائی و گہرائی یعنی درایت سے نا آشنا تھے اور یہی بات تھی کہ سیاہ پردوں کے پیچھے ہو رہے ڈرامے کو دیکھنے کی بصارت سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ پھر بھی ان کے درمیان کھلبلی مچ گئی، ایک خاموش و گمنام کھلبلی جو عموماً طوفان کی آمد سے پیشتر رونما ہوتا ہے۔ یہ کھلبلی بدستور قائم رہی اور سب نے اپنی نگاہیں ایک دوسرے سے گذارتے ہوئے واپس کر لیں۔ نظریں گذارتے وقت چند عجیب سی حالتے جب حیرانی و پریشانی انتہا کو پہونچ گئی، الجھن ناگ بن کر چہار طرف سے ڈسنے لگی اور سب ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے کے قریب پہونچنے لگے تو اس شخص لامحدود کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں جس کے چہرے پر حزن و ملال ابھی ابھی بن برسات کے بادل کی طرح محیط ہو گیا تھا۔ ہمہ تن گوش ہو گئے کہ اب کیا ارشاد ہوتا ہے۔

اس نے حلقہ بگوشوں کو رحم بھری نظروں سے دیکھا، بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا، لمبی سانس لی اور پلکیں بند کیں کہ بند پلکوں سے اس گوشے میں بھی جھانک کر دیکھا جا سکتا ہے جہاں کھلی پلکوں کی پرواز کسی صورت ممکن نہیں۔ اس کے لب ہلے اور حلقہ بگوش آپس میں سمٹنے لگے . اور سمٹ گئے۔ اتنے سمٹ گئے، ایسا لگتا تھا کہ ایک جزو ہوئے جاتے ہیں اور سانسیں روکے، پلکیں جھپکائے بنا اسے یک ٹک دیکھنے لگے۔

اس نے بھرپور نظر حلقہ بگوشوں پر ڈالی اور پھر نظروں کا رخ زمین کی جانب موڑ دیا اور مٹی کریدنے لگا۔ دفعتاً اس کے لب ہلے "نہیں ... نہیں ... ایسا کبھی نہیں ہو سکتا میرے دوستو! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، میرے ساتھیو! تمھارے سروں پر ننگی تلوار لٹکے گی ... کوئی ننگی تلوار نہ لٹکے گی۔ کوئی ایسی تلوار نہ لٹکے گی جو تمھارا اٹھائے ہوئے ہو اور تمھاری تمکنت کو چاٹ رہی ہو۔ وہ ساعت ہرگز نہ آئے گی کہ تم پیچ

سو دیئے دیتے شانوں سے لٹکائے، اپنے گٹھڑ سروں پر لادے جیب و گھیرے بیابانوں میں پناہ گزیں ہو جاؤ، جہاں ہیبت و دہشت تمھارا سائبان ہو، جہاں آفتاب بھی سعیِ بسیار کے باوجود اپنی شعاعوں سے تاریکیوں کو شق کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور جہاں کہ خاردار جھاڑیاں تمھارے دامنوں سے الجھ پڑیں، تمھارا قبا تار تار ہو جائے، دستِ دعا بغیر کسی منفعت کے لاحاصل خون آلود ہو جائیں، تمھارے بچے سہم جائیں اور ان کی آنکھوں سے خوف جھانک جھانک کر ایک دوسرے کو مزید خوف زدہ کریں ——— اور منزل کا پتہ دینے والے، مارگ درشن دینے والے خود راہوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو جائیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا ..... ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

——— کیونکہ ایسا ہو جانا تمھاری موت ہے۔

——— کیونکہ ایسا ہو جانا تمھارے زندہ درگور ہونے کے مترادف ہے۔

——— کیونکہ ایسا ہو جانا تمھاری عالی ہمتی کو کھلا چیلنج ہے۔

——— کیونکہ ایسا ہو جانا تمھاری شجاعت کا اشمشان گھاٹ ہے۔

——— کیونکہ ایسا ہو جانا تمھاری سخاوت، بھیک منگے کا کشکول ہے۔

——— ایسا ہو جانا، تمھارا اخلاق، اخلاص اور اخوت ——— فریب کاری ہے۔

——— ایسا ہو جانا ... تمھارا میر کارواں ہونا ایک افترا ہے۔

اور ——— ایسا ہو جانا، تمھارا قافلۂ سالار ہونا ایک فریب ہے

اس لئے ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ شمس و قمر کے ٹکڑے ہو جائیں تو ہوں، مگر ایسی شکل نہ ابھرنی چاہیے۔

سب کے سب گوش بر آواز تھے اور اس اندازِ تخاطب پر حیران و پریشان بھی کیوں کہ آج یہ شخص انھیں ایسی باتیں نہ سنا رہا تھا جس کے سننے سے چہرے خوشی سے کھل اٹھیں، دل و دماغ باغ باغ ہو جائے اور طبیعت مسرت و شادمانی کے ہنگوڑے میں جھولنے لگے۔ حالاں کہ وقت شاہد ہے کہ اس نے کتنی بار ایسی باتیں کہی تھیں جس سے دن میں تارے نظر آ جاتے، آنکھوں کے قریب سیاہی پھیل جاتی، نوکیلے خنجر جسموں میں پیوست ہو جاتے اور خون رسنے لگتا۔ بدنوں کے گرد آگ کی لپٹیں اٹھنے لگتیں اور جونک کی طرح چمٹ کر جسموں

جانے لگتیں۔ وقت شاہد ہے کہ اس نے ایسی طوفاں بدوش باتیں کہی تھیں جو غم انگیز اور درد و کسک سے عبارت تھیں جس کا ایک ایک حرف چوٹیں مارنے لگتا، رواں رواں کانپ جاتا، جسم سہم جاتا، ذہن لرز اٹھتا اور آنکھوں کے حلقوں میں آنسوؤں کے بلبلے اٹھتے اور تپش سے سوکھ جاتے۔

وقت شاہد ہے کہ اس نے مسکراہٹوں کے درمیان ایسا طرب انگیز اور روح افزا پیغام سنایا ہے کہ سامعین کے چہرے گلاب ہو گئے، آنکھیں مخمور ہو گئیں اور دل بلیوں اچھلنے لگا ہے۔ سب نے ایک دوسرے کو مسکراتے ہوئے دیکھا ہے اور بے اختیاریوں کے درمیان سے توصیف کے بیش بہا کلمات فضاؤں کو معطر بیز اور ماحول کو قوس و قزح کے نور سے بھر دیتے اور استحالی کاسۂ سرِ سجدۂ شکر و احسان مندی میں چلے جاتے اور گھٹنوں رگڑ رگڑ کر سورہ تاماں کرتے۔

——— مگر آج متکلم کا پہلے کی طرح وہ اندازِ تخاطب نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ متکلم کے خیالات خود بخود بکھر رہے ہیں اور وہ بکھرے خیالات کو چن چن کر یکجا کرنے کی کوششیں کر رہا ہے۔ عجب کیفیت ہے اس کی، کبھی خلا کو گھورتا ہے، کبھی زمیں کریدتا ہے، اور کبھی ہواؤں میں دائرے بناتا ہے۔

——— اور دونوں ہاتھ کشکول کی صورت آگے پھیل جاتے ہیں۔

پھٹا ہوا اور پیوند زدہ کمبل جو اس کے شانے سے سرک کر نیچے آ گیا تھا درست کیا اور پھر شانہ پر رکھا، پلکیں سد کیں، کہا، "اگر ایسا ہونا اٹل ہے تو ہو کر رہے گا، اسے کوئی نہیں ٹال سکتا، یہ سب کچھ ریاضی کے حساب کی طرح ہے۔ دو اور دو کبھی تین نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ چار ہونا یہی ہے۔

ان میں سے ایک نے اچانک کہا، "دخل اندازی کی گستاخی کی معذرت کے ساتھ .... مگر یہ دو اور دو تین ہونے کی بات ہے۔"

"اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو . . . . .

وَمَنۡ یُّبَدِّلۡ نِعۡمَۃَ اللّٰہِ ۔۔۔ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ۝

(جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمت کو بدلتا ہے۔ بیشک اللہ اسے سخت سزا دیتے ہیں)

ان میں سے کوئی بول پڑے ہمارے بیٹے اور بیٹیوں کے لئے بڑی اندھناک جبر ہے اور پھر ہم ذمہ دار بھی ٹھہرائے جائیں گے کہ ہم نے کیا پس انداز کیا۔ ہم نے اتنے بڑے بڑے اور خوب صورت باغ لگائے ہیں اور

ان باغوں میں انواع و اقسام کے پیڑ پودے، پھل دار درخت میوہ جات اور مختلف رنگوں و خوشبوؤں کے پھولوں کی کیاریاں سجائی ہیں۔ اونچے اونچے مضبوط قلعے تعمیر کیے اور ان دیواروں پر حسین تر نقش و نگار اور بیل بوٹے بنائے ہیں ـــــ کیا ان باغوں سے پھل تو کجا اُس کی سوکھی لکڑیاں بھی انھیں نصیب نہ ہوں گی؟ ان پھولوں کی سوگندھ ان کے نتھنوں میں دُر گندھ بن کر گھسے گی اور اونچے محلات کے دیوار کے سائے بھی ان کے حصے میں نہ آئیں گے؟"

ان میں ایک جو زیادہ عمر دراز تھا اور چہرے پر جھریاں بھی تھیں، جسم کو ایک پھٹی چادر سے لپیٹے ہوئے تھا، کہا "جب سے ہوش سنبھالا سخت جسمانی محنت کرتا ہوں۔ دو روٹیوں کی بھوک ایک روٹی ہی سے مٹاتا ہوں اس لئے کہ دوسرے جاندار بھی اپنا حق مانگنے آجاتے ہیں اور پہاڑی کے درے سے دو کوس کی دوری پر ایک تالاب سے پانی پی کر سیراب ہو جاتا ہوں۔ مجھے یاد نہیں کہ کتنے سالوں سے ..... بہت سال ہو گئے کہ یہ ایک روٹی بھی دو وقت کی نہ رہی، ایک وقت کی ہو گئی۔ جسمانی محنت و مشقت بھی بڑھ گئی، گو کہ خود بڑھ میں بے از خود بڑھالی ــــ تو کیا میں نے جو اسی روٹیاں جمع کی ہیں ان میں سے ایک بھی ہمارے بیٹے بیٹیوں کو نہ ملے گی ـ ؟"

ان میں سے ایک اور شخص نے کچھ کہنے کے لئے لب وا کیا کہ اس شخص نے جو سب کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

" یا اولی الالباب "! یا اولی الابصار، تم نے جو یہ باغات لگائے ہیں، پھولوں کی کیاریاں سجائی ہیں، محلات اور ان دیواروں پر نقش و نگار بنائے ہیں یہ سب اس کے کام آویں گے۔ تم نے جو ایک ایک کر کے روٹیاں جمع کی ہیں یہ سب اس کے کام آویں گی۔ تم سب خوش قسمت ٹھہرائے جاؤ گے کہ کتنی بڑی دولت بس اسی کی ہے۔ مگر یہ دولت تبھی معرض میں آئے گی اور اس کی اہمیت باقی رہے گی کہ اس میں اور اضافہ کیا جائے۔ اگر اس میں اضافہ نہ کیا گیا اور سب نے مل کر اضافہ نہ کیا تو یقیناً فاصلہ بڑھتا جائے گا اور ایسا طوفان آئے گا کہ سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا تم پر ستا ہو جاؤ گے کہ نشان تو رہے گا مگر وہ نشان اصل نشان سے بالکل مختلف، گھٹا ٹوپ تاریکی میں بند کمرے کے اندر منہ چھپائے نظروں پر پپوٹوں کے غلاف چڑھائے، سیاہ آئینوں سے ہم کلام ہو گے تو ورطۂ حیرت میں پڑ جاؤ گے اور آنسو کے دھارے باوجودے کہ تیزی سے نکل رہے ہوں مگر حلقہ سے باہر آنے سے پہلے تمھارے احساس کی تپش سے جل جائیں گے ....

اور .... اور ..... یہ سب افتراق کے باعث ہوگا۔

وہ شخص کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر چپ ہو گیا۔ حلقہ بگوشوں کو سناٹا چبھ گیا۔ . . .... ہاں تو احساس کی تپش سے جل جائیں گے

اور ...."

اس نے کہا "...... اور کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تمھارے سروں پر ننگی تلوار لٹک سکتی ہے اور تمھیں ختم بھی کر سکتی ہے۔ ۔ تمھارے ہم تم سے چھین کر بے نام بھی کر سکتی ہے ــــــ اور کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے" ناموافق۔

" تو پھر اس کے تدارک کے لئے کیا کیا پیشگی تدابیر اختیار کی جائیں؟"

"ایک اونچا مینار بنواؤ ، بہت اونچا کہ سب کی نظروں میں رہے۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ

وہ شخص دل گرفتہ اٹھا، کمبل کو اپنے بدن کے گرد دوبارہ لپیٹا اور اس کمرے میں چلا گیا جہاں کا فرش اس کے آنسوؤں سے تر رہا کرتا تھا۔ اور یہ تمام لوگ بھی افتاں و خیزاں رفتہ رفتہ ایک ایک کر کے واپس چلے گئے۔

▲▲

افسانہ

فاروق راہب

وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایسا ہو، لیکن وہ جانتے تھے کہ ایسا ہی ہوگا!

اس کے فیصلوں کو آج تک کون بدل سکا تھا؟

ماضی کا ہر لمحہ پیش نظر تھا۔

لیکن وہ دکھی تھے کہ یہ سوچ کر کہ اس کے بعد ان کا کیا ہوگا؟

برباد کر دینے والے اندھیرے ان کے گرد ڈیرا ڈال چکے تھے۔

اور وہ اس قیامت کے منتظر تھے جو ان پر ٹوٹنے والی تھی۔

جب شہر پست و نابود کے دہانے پر تھا تو اس نے عقیدت مندوں کی مدد سے اس وقت کے قائد کو تہہ تیغ کرنے کے بعد اپنی سربراہی کا اعلان کیا۔

—— اور ایسا ہوتے ہی شہر پریشاں کا ہر شخص خود کو فنا کی قید میں سمجھ رہا تھا۔

اس کے نام کی دہشت چہار طرف گشت کر رہی تھی اور ہر فرد اپنی بے پناہی سے خود کو کسی گوشے میں روپوش کر دینے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

اس نے ظلم و بربریت کے سپاہیوں کو دوڑایا اور ان باغیوں کو موت کی گہرائیوں میں سلا دیا جو اس کی سربراہی تسلیم کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ پھر اس نے ان آدمی نما اژدہوں کے سر کچلے جن کے گھیرے میں کمزور جسم ٹوٹ رہے تھے۔ اس نے شہر کے غداروں کو بھی درست کیا۔

سب طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد اس نے شہر میں نئے قوانین نافذ کئے جس کے ذریعہ ہر شخص مساوات کے دھاگے میں بندھ گیا اور تمام لوگ اپنے مطلب کو بھول کر صرف شہر کی ترقی و خوشحالی میں جٹ گئے۔

انہیں حیرت ضرور تھی۔ وہ اسے کیا سمجھے تھے اور کیا نکل آیا۔ اس کا ظاہر دیکھنے میں جتنا سخت اور شر پسند لگتا تھا، باطن اتنا ہی نرم اور انصاف پسند تھا۔

اب تو وہ اس سے کافی مانوس ہو گئے تھے اور اس کے قدم سے قدم ملا کر اپنے مقاصد کے حصول کے لئے بڑھتے جا رہے تھے۔

لیکن ان کے بڑھنے کا سلسلہ ایک دن اچانک ہی ٹوٹ گیا اور وہ ایک بار پھر استعجاب کے ساتھ غم میں ڈوب گئے۔

انہیں معلوم تھا کہ وہ قول و فعل میں یکساں ہیں اس لئے اس کا ارادہ نہیں بدلے گا۔

انہیں وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو زنا بالجبر کے جرم میں، لوگوں کے احتجاج کے باوجود، کھلے عام گولی مار دی تھی اور اس صدمے کی تاب نہ لا کر اس کی شریک زندگی بھی اس سے منہ موڑ گئی تھی —— مگر اس کا چہرہ برابر بے شکن رہا۔

لیکن آج معاملہ برعکس تھا۔ خود ان کا سربراہ موت کے جبڑے میں جا رہا تھا۔ انہیں بے حد قلق ہو رہا تھا۔ اس لئے وہ بالکل بے گناہ تھا۔ وہ اس جرم میں کہیں بھی ملوث نہیں تھا —— لیکن اس کے فیصلے نے، جو خود اس سے

اپنے لئے کیا تھا، انھیں حیران کرنے سے زیادہ رنج و غم میں مبتلا کر دیا تھا۔

وہ اپنے اس نڈر، بے باک اور انصاف رہنما کو کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتے تھے۔

لیکن وہ اس سے اچھی طرح واقف تھے۔

جو گا وہی جو وہ چاہ رہا تھا

وہ اس منحوس دن کو کوس رہے تھے جس کی وجہ سے انھیں یہ یکہ ست گھڑی نصیب میں ملی۔

اس کے چار فوجی جوانوں نے ایک لڑکی کی عزت لوٹی تھی۔

اس سانحہ سے پورے شہر میں طوفان سا آگیا اور سربراہ کے ابرو پر بل پڑگئے۔

انھیں پورا یقین تھا کہ گنہ گاروں کو موت کی سزا ملے گی!

لیکن انھیں حیرانی کے کھڈ میں گرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا، جب اس نے خود اپنے لئے ہی سزائے موت کا حکم سنایا اور اس پر غضب یہ کہ وہی چاروں روسیاہ اُسے گولی کا نشانہ بنائیں۔

ہر سمت سے پر زور صدائے احتجاج ابھری۔ اس کے اس سنگین فیصلے کی سخت مخالفت کی گئی مگر۔۔۔!

"خاموش رہو" وہ چیخ پڑا۔ "نگہبانی میں مجھ سے ضرور کوتاہی ہوئی ہے۔ اس لئے میں اپنے آپ کو بھی اس جرم میں برابر کا شریک سمجھتا ہوں ——— ایسے سربراہ کو جینے کا کوئی حق نہیں جو اپنے فرض سے ذرا بھی چشم پوشی کرے۔"

باشندگانِ شہر صرف کفِ افسوس مل رہے تھے۔

پورا شہر موت کے میدان میں اتر آیا۔ انھیں اس میدان میں جمع ہونے کا کئی بار موقع ملا تھا۔ اس لئے موت کی سزا اکثر اسی میدان میں دی جاتی ہے۔ تماشائی بڑے ذوق و شوق سے دیکھتے ——— لیکن آج ان کا کلیجہ منھ کو آرہا تھا۔ چہرے سوگوار تھے اور آنکھوں میں غم کے بادل منڈلا رہے تھے۔

وقتِ معینہ سے چند ساعت پیشتر وہ ہویدا ہوا اور مجمع موت کے سناٹے میں آگیا۔

پُر وقار قدموں سے چلتا ہوا وہ اونچے چبوترے پر کھڑا ہوا۔ اس کے سامنے ہی اس سے کچھ فاصلے پر چاروں مجرم فوجی رائفل کے ساتھ ایستادہ تھے۔

"فائر کرنے کا آرڈر بھی دوں گا۔"

اس کا جملہ جیسے ہی ختم ہوا، ایک ضعیف بھیڑ سے باہر نکل کر اس کے قریب آیا۔

"جنرل! اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرو۔"

"واپس جاؤ۔" اس کی گرج دار آواز منتشر ہوئی اور وہ بوڑھا گھبرا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "یہ جنرل حیات کی حیات کے لئے اس کے ضمیر کی عدالت کا فیصلہ ہے جو اٹل ہے۔"

"سنو!" وہ ہجوم سے مخاطب ہوا۔ "تمھیں تمھارے شہر کی قسم۔ گواہ رہنا کہ میں نے کبھی تم سے یا تمھارے شہر سے بے ایمانی نہیں کی۔ اپنے فرائض سے غافل نہ رہا ——— مگر اب میری ضرورت شاید ختم ہو چکی ہے اس لئے تمھارا شہر تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ خدا حافظ!"

اب وہ فوجیوں کی طرف مڑا۔ پہلے خود سادھان ہوا، پھر انھیں سادھان کیا اور انھیں فائرنگ پوزیشن میں لا کر فائرنگ کرنے کا آرڈر دیا ——— چار گولیاں ایک ساتھ چلیں ——— مگر مجمع جو سکتے میں تھا پہلے تو اس پر حیرتوں کے پہاڑ گرے پھر میدان حشر جوشی کے نعروں سے گونج اٹھا۔

"جنرل حیات زندہ باد۔ ہمارا سربراہ پائندہ باد۔"

چاروں فوجیوں نے اپنے آپ کو گولیاں مار لی تھیں۔

▲▲

افسانہ

پرویز شہریار

——— یکایک جو فضا بدلی تو ایک انجماد کی سی کیفیت اور
ان کہی صورت حال، میرے وجود پر طاری ہو گئی۔ میرے آس پاس ہر چیز تھم گئی
لیکن ———

سنگی گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

میں دیہاتی۔

پہاڑ جنگل گاؤں کا رہنے والا۔

خود رہا مت سرحد پر کھڑا، رجانے حوت کی دبیز چادر میں جیسے ساکت بنا
رہا ——— میں حرصۂ سکوت میں ستون ہو گیا۔

وہ راہ لوہے کی چادر سے سد تھی۔

ریلوے کراس، پھاٹک اور شہر میری نگاہوں میں گڈمڈ تھے۔ ہم اس منزل
پر کھڑے تھے، جہاں ہمارے ماضی کی دھند اور حال کا عکس دونوں گلے مل رہے تھے۔
میں نے ذرا پیچھے نگاہ کی تو دیکھا ——— وہ تن درست بیل اور ہل، شاداب
درخت اور پھل، ہری سبزیاں اور کھیت، لکڑیاں اور پہاڑ، پتیاں اور جنگل، کیڑیاں
اور چرواہے، مچھلیاں اور تالاب، کھلا آسمان اور پھیلی ہوئی زمین اور سلسلۂ کوہسار
کی سرحد نہیں تھی۔ یہاں تو بس ایک ہی سرحد تھی۔ شہروں کے سب پر ——— پھاٹک
پھاٹک کے اس پار ہم، اس پار "وہ" ——— ریل کو کسی ہیکل دیو نے ڈھکیل
دیا تھا، وہ مسلسل پھسلتی جا رہی تھی، گذر گئی، ایک ریلے کی سوا تر آوازوں کا ڈھیر
اپنی پیٹھ پر لئے جو پیچھے پیچھے گرتی بھی جا رہی تھی۔

..... سارا ماحول دھواں، دھواں، گرد گرد سیاہ سیاہ ——— ا
میں نے اپنی آنکھوں کے علاوہ جھکا لئے ... ایک ذرہ بھی نہیں داخل ہو سکتا
تھا۔ علاوہ اٹھے تو پورا منظر دراتی میں مشغول رہا تھا۔ میں سر پر پاؤں رکھ کر شہر
میں داخل ہو گیا ——— خواہشات لامحدود تھیں۔

میں نے بھاگتے ہوئے دیکھا، بہت سارے ریچھ پسینہ میں ڈوبے ہوئے ریل
کے دوزخ میں بے تحاشا کالا پتھر جھونک رہے تھے، ان کے دونوں ہاتھوں میں بوتلیں
تھیں، جن میں انگور کی بیٹی مچل رہی تھی اور جسے وہ وقفے وقفے سے منھ لگاتے جاتے تھے۔
شمسی شعاعوں نے اپنے نیزے کو معرتک چبھونا شروع کر دیا۔ بینائی کو
چھید کر جب پسینہ نے باہر دیکھا تو میں دوسری دنیا کی خواہش لئے، اپنے دل کے نہ جانے
میں چھپائے دیوانہ وار آگے بھاگا۔

میں نے سوچا کوہستانی تمثال ہے ——— جب ملک دوس عمارتوں
اے گھنے جنگل سے رینگتی ہوئی سڑک کو پہلی سطر میں دیکھا۔ جابجا اونچی اونچی سنگ
اور دم گھٹتی ہوئی یونانی قبریں تھیں، جنھیں دیکھ کر ہی سانس رکنے لگیں، میرے
سا کوئی کہہ رہا تھا۔ یہ گلیاں بڑی کارآمد ہیں۔ یہ نہ ہوں تو شہر میں دم ہی
گھٹ کر رہ جائے۔ میں نے مڑ کر دیکھا کتے بات کر رہے تھے۔

.. نیکس، میرے پلّے۔ ڈری!

سنگی گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

میں دیہاتی۔

یہ پہاڑ، جنگل، اُگانے والا۔

یکایک خوف نے شمشیر بدست ہوکر میرا تعاقب کیا۔ پھر میں نے دیکھا یہاں
بے بس انسان اپنے کندھوں پر بھینس کا سر ڈھوئے پھر رہے تھے۔ محلّے کے بڑے گوداموں
اور دکانوں میں بڑی توند والے لوگ مرے مرے سے ٹانگ سکوڑے ہاتھ پھیلائے سپید
کرسیوں میں دھنسے بیٹھے تھے۔ وہ جگالی کر رہے تھے۔ آنکھوں کی نالیوں سے غلاظت بہہ
رہی تھی جیسے سیاہ بھجنگ کوّے اسی نوکیلی چونچ سے کھود کھود کر کھا رہے تھے۔
دو ایک جیبوں گردن سے لٹکے ہوئے جوس رہے تھے۔ وہ اپنے غباروں پر مسلسل ہاتھ
پھیرتے اور مسلسل جگالی کرتے جاتے تھے ــــ بس جگالی، جگالی۔ چیدہ کتے
کے تھوتھنی والے منہ سے رال چو رہے تھے۔ ان کے سامنے دم ہلا رہے تھے۔ میں آگے
بڑھ گیا۔

سکی گھوڑے سر پر دوڑ رہے تھے۔

شمسی شعاعوں نے اپنے نیزے کو پیٹھ پر چبھونا شروع کر دیا۔

میرا جسم ان نیزوں سے چھلنی چھلنی ہونے لگا۔ میری پیٹھ اور کمر سفید لہو
سے رنگنے لگی۔ میرے برہنہ تلووں کو سیاہ انگارے چاٹنے لگے ــ ــ میں
تاب نہ لاکر بلند عمارتوں کی اوٹ میں پناہ ڈھونڈنے لگا۔ دفعتاً ایک نیا منظر چراغ
کر گیا۔

چند دیکھ کو لہو کے بیلوں کو ہل میں جوت رہے تھے۔ بلند عمارتیں ــــ
دور تک سایہ ــــ ایک طرف، بلند ارفع و اعلیٰ ایوانوں کے قدم چومتے سایوں
کا اجارہ ہے تو دوسری طرف ــ ــ دور، بہت دور ــ ــ مٹھی بھر سائے کو
ترستی ہوئی لنڈ منڈ اور ننگی جھونپڑیاں جو کسی عصمت دری کی شکار دوشیزہ کی طرح
اپنے نیم عریاں جسم کو چیتھڑے سے ڈھانپنے کی ناکام کوششوں میں الجھی ہوئی
تھیں ــــ شاید اندھی فطرت اس طرف نہ گئی ہے .. حد نگاہ تک سنگ
ہی سنگ ــ جس پیلگوں سیاہی مائل جام اور سرکائی رنگ جٹائیں سنگلاخ
زمین کے حدلی دحولی سینہ پیٹتے ہوئے پیل ــ جھلستے سینے سے اٹھتا
ہوا دھواں اور قطرہ قطرہ لہو کو ترستا ہوا فگار سینہ ارض ــــ خشاخ خشاخ
ــ ــ ایک طرح کی جھنجھناہٹ دار کے ساتھ بکھرتے ہوئے پارۂ سنگ ــ سنگریزے
میں کراہ اٹھا۔ انسانی کھوپڑیاں اپنے پیچھے جبل کا بدن گھسیٹ رہی ہیں۔ اور ہیر

لیکن نزدیک ہی گدھوں کا ایک جھنڈ اپنی آنکھوں کو اپنے مخروطی سروں کے
آگے سجائے رقصاں ہے ... منڈلا رہا ہے۔ بیلوں کی آنکھوں پر کالی پٹی
ہے۔ ان کے بدن لہو لہو ہو رہے ہیں ــــ کوڑے کی چوٹ سے جب
کوئی بیل چلتے چلتے زخموں کی تاب نہ لاکر بیٹھ جاتا ہے تو دوسرے ہی لمحہ
تعینات رکھیوں کے کوڑے کی موسلادھار بارش تیز ہو جاتی ہے۔
وہ اٹھ جاتا ہے۔

یہ منظر ــــ میرے اندر اندر کچھ سلگنے لگا۔ کوئی سسکنے
لگا، کوئی چیخ اٹھا۔ [کمینہ بدذات] یہ دیکھ مڑتے ہی
میری طرف اپنی انگاروں بھری سرخ آنکھیں اچھال دیتے ہیں۔

میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ میرے نصیب میں اس کے سوا تھا ہی
کیا؟ [ــــ احمق جون پور کا قاضی ــــ] چلنا میرا مقدر
کہ حرکت زندگی ہے ــــ بس میرے سر پر تو ایک ہی بھوت سوار ہے۔
مطالعہ، مشاہدہ ــــ مشاہدہ، مطالعہ؛ اور خواہشات لامحدود اور
ان کا مصدر بھی معلوم ــــ

سکی گھوڑے سر پر دوڑ رہے تھے۔

شمسی شعاعوں نے اپنے نیزے کو پشت پر چبھونا شروع کر دیا۔

میں تلملا کر سوئمنگ پل پر چڑھ گیا۔ بلند و بالا عمارتوں کا گھنگھور
جنگل، مادِ جہنم، ہر چہار جانب متحرک اژدہام۔ بینکوں میں تھانے میں ڈاکہ۔
میں ریڈیو اسٹیشن میں ٹی۔وی ٹاور اور اسپتالوں میں رینگتی ہوئی بھیڑ
ــــ میں نے کورنیا پر دباؤ ڈالا تاکہ لینس کا سنٹر آن کر دیکھ کم ہو جائے۔
اور اپنی آنکھوں سے دوربینی شروع کر دی۔ میری نگاہ ایک عمارت سے دوسری
عمارت پر چوکڑیاں بھرنے لگی؛ اس نے پیام بھیجا۔ ان تنظیموں اور اداروں پر
لوزیوں، بیموں اور بندروں کا قبضہ ہے ..... بندر اکثر سپید لباس میں
ملبوس تھے اور یہ کہ ان کی دمیں نہیں جو شاید کسی گذشتہ نسل کے ساتھ
معدوم ہو چکی تھیں ــــ کام میں منہمک ــــ کسی سے زیادہ باتیں نہیں
کرتے تھے۔ کاش، خدانخواستہ میں ہی بندر ہوتا تو ان ہی دم گھٹتی فضاؤں
کا اسیر ہوتا۔ میرے دل نے تنقید کی ــ کام زیادہ، باتیں کم ــ میں وہاں

سے کھسکنا ہی چاہتا ہوں (کیونکہ سوئمنگ پل پر بیٹھے بیٹھے میرے دونوں
ران کٹ گئے ہیں) کہ چند بندر اور بوزیہ میری طرف لپکے ـــــــ اور
میں وہاں سے ایک بار پھر بھاگ کھڑا ہوا۔

میں دیہاتی ۔

پہاڑ جنگل گاؤں کا رہنے والا۔

"

- ـــــــ .....

آخری بار آئینے کے بعد میں نے دیکھا تھا ـــــــ میرے پیش رو
ـــــــ عنکبوت کا تازہ جال ہے۔ کالے رنگ کا جال، اپنے مصنوعی چھنے کا،
اپنے موٹے پتلے خد و خال کا 'بذریعہ نمائش' اعلان کر رہا ہے۔ غور کیا تو اس پر
گاہے گاہے کالی کالی جوئیں رینگنے لگیں ... جلے حروف کے نیچے ٹائلس اور
روڈس دبے ہوئے ہیں اور عنکبوت کے تازہ جال میں قید ـــــ سائی
ووسٹ ـــــ میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی مٹھی کے پوروں کو ہٹا کر پیچھے
ہٹتے منظر کو نکال کر اس پر جمی ہوئی گرد کی تہہ کو صاف کیا۔ پھر کھرپڑی
کے جوتی کو زمین میں ڈال کر بند کر دیا ـــــ تب جو احساس جاگا تو تماشا
یہ تھا کہ ایک کشادہ تسلے میں چھوٹی ٹری سوکھی ہوئی تارکول کی سوئیاں آڑی
ترچھی اڑی کھڑی پڑی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے تسلہ زوروں سے جکرانے لگا
اور سوکھی سوئیاں ساکت ـــــ ان کی جگہ گھٹا ٹوپ اندھیرے
نے لے لیا۔ اچانک غیر متوقع طور پر گہری اسپارکنگ ہوئی ـــــ میں
چونک گیا۔ میرے عقب میں کوئی شئے محوِ رقص ہے۔ شاید ـــــ پرچھائیں
کے حوالی نا حسن ؟؟ یا ـــــ ذات !!

فی الفور میں وہاں پانی ہو گیا۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے .. رفتہ رفتہ .. منظر منظر ..
بیس بین .. .

دور کھڑی میرے ادراک کی دوشیزہ مسکرا رہی تھی، وہ مجھ سے روٹھ
چکی تھی ـــــ میرا طرفِ فہم صدا دے رہا تھا۔ مغز کی انگلیوں نے تھک
کر باہنوں کو چشم التجا کے سہارے ٹٹولا اور دماغ نے خوشامد میں باہنیں
پھیلا دیں لیکن کم بخت ہر بار پھسل پھسل گئی۔ تنگ آکر پنجوں نے اسے دبوچنا چاہا

.... اور وہ تتلی بن گئی۔ تعاقب کیا .. چھپا بن گئی۔ پکڑنے کے لئے دوڑا تو
... طویل چوکڑیاں بھرنے لگی ـــــ غزال بن گئی۔ تب ہی کچھ ایسا
واقعہ پیش آیا کہ میں آگے وہ پیچھے ـــــ وہ آگے میں پیچھے
اندھیرے میں ہم دونوں دوڑ رہے تھے۔

سنکی گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے

ـــــ اور میں ساکت و ششدر

ابھی درخت کے گاڑھے سائے میں؛ یہاں سے وہاں تک، قطار در قطار
چبوترے کے اوپر فضا میں، جوق در جوق مختلف خد و خال کی آنکھیں معلق ہیں۔
خشک آنکھیں، گیلی آنکھیں، روشن آنکھیں، بجھتی آنکھیں، ادھ کھلی آنکھیں،
ڈبڈبائی آنکھیں، بہتی آنکھیں ـــــ ایک، دوڑتی ہوئی، کریہہ پھنکار
ـــــ ایک سمت تکتی ہوئی STIMULATE آنکھیں .... اور پھر دفعتاً
تنگ اور سنگلاخ راہ سے سرخ خونخوار آنکھوں والے فولادی اژدہے کی آمد۔
فولادی جسم والے اژدہے کے جابجا عمودی واقعی مستطیل نما حلاؤں سے اجنبی آنکھوں
کی برآمدی اور تھکی ماندی آنکھوں کا ایک بار پوری قوت سے حوصلہ باندھ کر
مستطیلوں کے حلاؤں کو پاٹ کر اژدہے کے جسم کے اندر پیوست ہونے کا منظر
ـــــ معداراں بھینس کے سر والے آدمیوں، بیل کے بدن والی انسانی
کھوپڑیوں، ریچھوں، کتوں اور بندروں کی مختلف معاون ندیوں کا بہتا
ہوا مہہ زور پانی، جو اسٹار کر تارکول کی پھیلی شاہراہ پر گنگا کا سیلاب بن
چکا ہے۔
مخصوص مزاحمت والے مقام پر بھینس کے سر والے نے مجھے دیکھ کر عجیب غضب ناک
انداز سے سینگ گھمایا اور میری روح فنا ہو گئی اور میں سیل رواں کے خلاف
ہاتھ پیر مارنے لگا۔ تیرتے تیرتے میرے تمام عضو شل ہو گئے۔

میں دیہاتی

پہاڑ جنگل گاؤں کا رہنے والا۔

سمٹتا گھٹتا ازدہام پھیلا لگتا اب میں گول چکر پر براجمان ہو گیا ہوں
اس گول چکر سے مختلف شاخیں پھوٹی تھیں؛ ایک بازار کی طرف، ایک
اسپتال اور پولیس چھاؤنی کی طرف، ایک کارخانے کی طرف اور ایک ندی

اور انجینیرنگ کالج کی طرف ـــــ شہر کا تہہ سڑکوں پر اتر آیا تھا۔
بے شمار سروں کی متحرک قطاریں فضا میں معلق تھیں۔ ان کا ایک ہجوم عظیم تھا
جو سیلاب کی طرح امڈتا ہی چلا آتا تھا۔ ہر طرف بے رخی کے سائے رواں
دواں ... کوئی نہیں پوچھتا ـــــ تمہارے منہ میں کتنے دانت
ہیں اور تم کہاں جاتے ہو؟ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر روشنی کے دودھیا
سمندر میں غرق ہو کر جگ مگ جگ مگ کرنے لگا۔ بے پناہ روشنی میں آنکھیں
چوندھیانے لگی ہیں۔ میں آہستہ سے نیم روشن ـــــ یا نیم تاریک گلیوں میں
داخل ہو گیا۔

سنگی گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

شمسی شعاعوں نے اپنے نیزے کو کسی عمیق کھائی میں اتار دیا تھا۔

ـــــ سورج پرانے حرارت اژدہے نے نگل لیا تھا ـــــ اب سے بہت
پہلے ہی ـــــ

میں اندھیرا پھلانگتا ہوا آگے بڑھ رہا ہوں۔ ہر ایک قدم کے
بعد دوسرا قدم رکھتے ہوئے۔ یہ قدم کھائی میں جا رہا ہے اور تنے ہوئے
رستے پر چلتے چلتے میں ایک دم منہ کے بل گر پڑتا، لیکن وہاں کھائی کی جگہ خندقیں
نہیں ہوتیں۔ اس وقت سامنے جو کچھ بھی میں نے دیکھا پایا سا، وہ مجھے جامد
کر دینے کے لئے کافی تھے۔ کانچ کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ کی دھن پر پرچھائیوں
کے تیرہ تیرہ ہاتھ رقصاں تھے ..... ساتوں سر اپنی پوری جوانی سے گونجتے
تھے۔ میں نے اپنی وِتسا دلی اور اندھی دشاؤں میں بے تحاشہ بھاگنے لگا۔ دفعتاً
کسی گیلے گیلے وجود سے جا ٹکرایا ـــــ ایک انوکھے قسم کی گداز ہیت کا
... میں کہاں پھنس گیا؟ پھر تو خود میں نے پرچھائیوں کے
... میں خود کو گھرا پایا۔ پرچھائیوں کی رنگینیں میرے ماردوں پر پریشاں
ہو رہی تھیں۔ میں انھیں سراپا سوالیہ نگاہوں سے ٹٹولنے لگا۔ "یہ دنیا ـــــ ا
ہم ... دنیا آباد کرتے ہیں۔ تم جاگتے لمحوں میں سے کچھ حصے میرے نام کر دو۔
. یہ ان تاریکیوں کا ازلی حق ہے ـــــ . اور رحلے
... میں ان ماروں میں ـــــ ایک ایک کر کے اترتا رہا۔

سنگی گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

میں دیہاتی۔

پہاڑ، جنگل، گاؤں کا رہنے والا۔

گذشتہ واقعات کو لے کر بھینس کے سر والے سے الجھ پڑا!

[ـــــ شیطان مدھو ـــــ] دیکھتے ہی دیکھتے
اس کا چہرہ لال چیونٹیوں سے ڈھنپ گیا ہے۔ دانت کی چکی پسنے لگی، اور
نتھنوں سے جھاگ نکلنے لگی۔ میں نے دیکھا: معاملہ گمبھیر ہے۔ میں نے چپکے سے
سیدھی راہ اختیار کی۔

پھاٹک کھلا تو پورا منظر ذرات میں جھول رہا تھا۔

دفعتاً اور ناگہانی امڈتے ہوئے طبقاتی ہجوم نے مجھے بری طرح کھدیڑ
دیا ـــــ اس پار ـــــ پھاٹک سے پھاٹک کے اس پار ہم ـــــ
"اُس پار" وہ ـــــ

میں دیہاتی۔

پہاڑ، جنگل گاؤں کا رہنے والا۔

اپنے وجود کا بوجھ کاندھوں پر لئے متانت سے ڈھونڈ رہا ہوں
[ـــــ جاہل اجڈ ـــــ] لیکن ہوا سے باتیں کرتا ہوا اے
آمانی خطۂ ارض کا کئی کئی چکر کاٹ آتا ہوں .. برگد کی گھنی اور جھولتی
ہوئی شاخوں میں چھپ کر اس خطۂ ارض کو دیکھتا ہوں اور حیران رہ جاتا ہوں
سارا کا سارا گاؤں بلند چمنیوں سے دھواں بن کر اڑ گیا ہے۔
اور کہیں دیہات کا دیہات بھٹیوں کے دوزخ میں جھونک دئے گئے تھے
جہاں یہ شعلے بن کر لہک رہے تھے۔ کھبک رہے تھے سلگ رہے
تھے ... جنگل تھے ... ملوں اور فیکٹریوں کے جنگل ـــــ پہاڑ
کی شاداب بستانوں کو چیر کر کالج کے ہنگامے اور ریلی ٹوریم کی پرسکوں آبادی
میں سراسیمہ رہ گیا ہوں۔ انھیں کیا سمجھوں ضروری اور غیر ضروری اشیاء کے
درمیان کون سا خط امتیاز کھینچوں۔ پنگھٹ پر پانی بھرنے والی پاریں کی جھنکار
اب کہاں گئیں؟ اور برگد کے نیچے چوپال کی بیٹھک اتنی ویران کیوں ہے؟
شاخیں بار بار آنکھوں پر جھول جاتی ہیں اور مجھے کوفت ہونے لگی ہے ـــــ
پھاٹک کے اس پار بھی راتوں رات ملوں، فیکٹریوں، بنگلوں، آفسوں

ہسپتالوں، تعلیمی اداروں، سینما گھروں، ریلوے اسٹیشنوں، ٹی۔ وی ٹاور، بڑے گوداموں اور دکانوں پر وہی بھینس کے سر والے آدمیوں، بیل کے منہ والی انسانی کھوپڑیوں، ریچھوں، کتوں، بوزنوں، میموتوں، بندروں، موکنوں، گدھوں اور پرچھائیوں کا عکس ثبت ہو چکا ہے۔

یکایک، چند کتوں کے ایک غول نے مجھ پر حملہ بول دیا۔ چاروں طرف کتوں کے سر ہی سر نظر آ رہے ہیں۔ میں نے بے تحاشا بھاگتے ہوئے آنکھیں پشت پر رکھ کر دیکھا۔ وہ دیوانہ وار میرا تعاقب کر رہے ہیں میں ہوا میں اڑ رہا ہوں ....میں مسلسل بھاگ رہا ہوں ....بھاگتے بھاگتے میرے اعصاب کٹ گئے ہیں ــــ جسم لہو لہان ہو گیا حتیٰ کہ نوبت ہانپنے کی آگئی ہے ــــ یکایک اک مقام پر رک گیا ہوں، وہ کتے معاً میرے گرد جمع ہو گئے ہیں۔ خونی آنکھیں، لالچی آنکھیں، بھوکی آنکھیں، ہیئی آنکھیں مجھے عجیب انداز سے گھورنے لگی ہیں۔ [ــــ ہو حق الحق الذی ــــ] میں نے خود کو ناچار پا کر ہفت منزلہ کا لفٹ دبا دیا ہے ــــ کتوں سے نجات ملی۔ یہ بینک ہے۔ میں نے برانچ منیجر کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے سوچا۔

"اب میں محفوظ ہوں۔"

کاغذ کے ایک ٹکڑے پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے میری نگاہیں۔ جانے کیسے آئینے سے ٹکرا گئیں۔

.... اور میں دنگ رہ گیا۔

میری صورت .... رفتہ رفتہ .... بندر کی ہو گئی ــــ

نیم کے پیڑ سے برآمد شدہ شہد

محمود شاہد

ہم دونوں کے درمیان برسوں سے ہمدردی کا رشتہ قائم ہے۔ اس کے باوجود ہم دونوں یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم جو شہد پی رہے ہیں وہ خالص نہیں ہے بلکہ اس میں کوئی ایسی شے ملی ہے جو شہد کے ذائقہ کو زائل کر دیتی ہے اور ایک تلخ سیال میں بدل دیتی ہے۔

وہ میرے گھر آتا ہے تو یہ اندیشہ اس کے دامن گیر ہو جاتا ہے کہ کہیں گھر کی چھت اس پر ٹوٹ نہ گرے۔ وہ اکثر میرے گھر آتا ہے اور میں بھی اس کے گھر جایا کرتا ہوں۔ میں اس کی بیوی کی بہت عزت کرتا ہوں۔ وہ ایک بہت کشادہ دل، شگفتہ رو عورت ہے اور وہ میرے بچوں سے بہت پیار کرتا ہے خصوصاً وہ میرے دوسرے لڑکے کو بہت چاہتا ہے۔ میری بیوی کہتی ہے کہ ہمارا دوسرا لڑکا اس پر گیا ہے۔ شاید اسی لئے وہ اسے اس قدر چاہتا ہے ——

وہ جب بھی میرے گھر آتا ہے بچوں کے لئے ٹافیاں، چاکلیٹ، کھلونے وغیرہ ضرور لاتا ہے۔ اور ایک ایک چیز کو ملا کر اپنے ہاتھوں سے ان میں تقسیم کرتا ہے۔ لیکن — لیکن . . . میں اسے ایسا کرنے سے باز رکھنا چاہتا ہوں۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں بچے ٹافیاں اور چاکلیٹ کھا کر چوہوں کی طرح ڈھیر نہ ہو جائیں تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیں۔ بچے ٹافیاں اور چاکلیٹ بڑی خوشی سے کھاتے ہوئے کھیلنے کے لئے باہر چلے جاتے ہیں۔ دوسرا لڑکا جو اس کی [illegible] کا ہے اس کی گود میں آ بیٹھتا ہے اور اپنی میٹھی سی زبان میں کہنے لگتا ہے ——

انکل —— انکل ——، ایک اور چاکلیٹ دیجئے نا!

کتنی معصوم اور شیریں آواز ہے اس کی جو سارے وجود میں رس گھول دیتی ہے۔ لیکن وہ چاکلیٹ کھا کر مر جائے تو میں اس کی میٹھی میٹھی آواز کیسے سن سکوں گا۔ نہیں، نہیں، میں اسے چاکلیٹ کھانے نہیں دوں گا۔

وہ اس کے ہاتھ میں دو چار چاکلیٹ اور تھما دیتا ہے اور وہ اپنے چھوٹے سے منہ میں ایک ساتھ دو دو چار چار چاکلیٹ ٹھونس لیتا ہے۔

میری بے چین حالت دیکھ کر وہ سمجھ جاتا ہے کہ مجھے اس کی یہ حرکت پسند نہیں ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں اسے ایسا کرنے سے روک بھی نہیں سکوں گا۔

اسے میری بیوی کے ہاتھ سے بنائی ہوئی چائے بے حد پسند ہے۔ وہ ایک پیالی چائے پی کر میری بیوی کی اتنی تعریف کرتا ہے کہ میری بیوی سب کچھ بھول کر اس کی تعریف میں کھو جاتی ہے گویا وہ اس کی تعریف کے سہارے ہی زندہ ہے۔ وہ چائے مزے لے لے کر پیتا ہے۔ لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ چائے کی چسکیاں لیتے وقت اطمینان [illegible] کیفیت سے گزر رہا ہے۔ جیسے چائے اس کی حلق کو جلاتی ہوئی اس کے جگر کو کاٹ کر اندر پہنچ رہی ہو۔ وہ گھونٹ گھونٹ چائے ایسے پیتا ہے جیسے اسے سیال آتشیں پینے پر مجبور کیا گیا ہو۔ وہ اپنی اس کیفیت کو چھپانے کے لئے سگریٹ پر سگریٹ پھونکنے لگتا ہے اور مجھے بھی سگریٹ پیش کرتا ہے۔

اس کا دیا ہوا سگریٹ جب میں ہونٹوں میں دبا کر اس کے لگائے سرکے

جلتی ہوئی ماچس کی تیلی سے چھوتا ہوں تو میرے اندر ایک انجانا خوف جاگ
اٹھتا ہے کہ اس سگریٹ ایک دھماکے کے ساتھ اڑ جائے گا اور میرے وجود کو جلا کر
راکھ کر دے گا۔ ہر کش کے ساتھ خوف کی ایک نئی لہر مجھے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔
اس پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں اس کا ساتھ دے رہا ہوں۔ جلدی جلدی
دو چار کش لگا کر سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیتا ہوں۔ ہر چند کہ میرا اندرونی
خوف اس سے چھپ نہیں پاتا اور وہ میرے اس رویہ کو بھانپ لیتا ہے
اور مسکراتا ہوا مجھے سگریٹ پر سگریٹ پیش کرتا ہے

اس کی شادی میں میں سب سے پیش پیش رہا تھا۔ تصویریں کھینچنے کا کام
بھی میرے ہی ذمہ تھا۔ میں ایک کیمرہ اپنے گلے میں لٹکائے موقع بے موقع تصویریں
کھینچنے لگا۔ فلیش کی تیز روشنی سے چونک کر سارے مہمان میری طرف متوجہ ہو جاتے تھے
اور ہر کوئی مجھ سے فرمائش کرتا کہ میں اس کی تصویر اتار دوں۔ لیکن میں دیکھ
رہا تھا کہ جب بھی میں کیمرہ کی آنکھ اس پر جماتا وہ سہم سا جاتا تھا اور
اس کا چہرہ سخت تناؤ کا شکار ہو جاتا اور اس پر دہشت کی پرچھائیاں
چھا جاتیں۔ میں اس سے مسکرانے کے لئے کہتا لیکن اس کا پژمردہ چہرہ
جیسے مسکرانا بھول گیا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود مسکرانے میں ناکام رہتا۔
مجھے معلوم تھا وہ یقیناً سوچ رہا تھا کہ کیمرہ کی آنکھ سے کوئی شعاع نکل کر
اس کے وجود کو کوئلہ نہ بنا دے۔ وہ حتی الامکان کیمرہ کی آنکھ سے بچتا رہا۔
اور میں اسے کیمرہ کی زد میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔ تصویریں دیکھ کر
سب نے یہ محسوس کیا کہ اس کی کوئی تصویر صاف نہیں آئی ہے۔ کسی میں وہ
اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے۔ کسی میں اس نے اپنا چہرہ موڑ لیا ہے۔ کسی
میں کسی مہمان کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ کسی میں اس نے دلہن کو آگے کر دیا ہے۔
یہ بات ہے کہ تصویریں دیکھ کر میری فوٹو گرافی کی تعریف کی تھی۔ وہ تو کئی
دنوں تک تصویریں اپنی دلہن کو دکھا دکھا کر میری تعریفیں کرتا رہا۔ میں
جانتا ہوں کہ اس کی یہ تعریفیں اس بات کی پردہ پوشی کا ایک بہانہ تھیں
کہ وہ میرے کیمرہ کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتا رہا۔

ایک دن وہ میرے گھر ایک خوبصورت باکس لے آیا۔ اور میری
بیوی سے کہنے لگا ___

بھابی! ___ جلدی سے ایک کپ چائے بنا دیجئے۔ دیکھئے میں
آپ کے لئے کیا لایا ہوں۔

میری بیوی جلدی سے اس کے لئے چائے بنا لائی۔ اور اس نے وہ
باکس میری بیوی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ میری بیوی نے کھول کر دیکھا تو۔
ایک قیمتی میک اپ باکس تھا۔ اس میں آرائش اور زیبائش کی ہر چیز
موجود تھی۔

دوسرے روز صبح صبح میری بیوی غسل سے فارغ ہو کر میک اپ بکس
لے کر قد آدم آئینہ کے روبرو بیٹھ گئی اور اپنی آرائش میں مصروف ہو گئی۔
دل دھڑک اٹھا کہیں میک اپ باکس کی [illegible]
شادابی اور تازگی چھین نہ لے۔ [illegible]
نمودار نہ ہو جائیں۔ کاجل سے اس کی روشن آنکھوں کی [illegible] ہو جائے
میں اسے میک اپ کرنے سے روک دینا چاہتا تھا۔ لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔
وہ میک اپ کر کے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی تو اس کے چہرے کے حسن و جمال
سے میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اتنی حسین وہ مجھے اس سے پہلے کبھی نظر
نہیں آئی تھی۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا اور وہ مسکرانے لگی۔

اس کو شجر کاری کا بہت شوق ہے۔ اس کا باغ انواع و اقسام
کے رنگ برنگے خوشنما پھولوں اور پودوں سے آباد ہے۔ اس وقت وہ باغ
میں ایک نیا پودا لگا رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ زمین کھود
کر مٹی میں کھاد وغیرہ ملائی گئی اور پھر پودا نصب کیا گیا۔ اور میں نے پودے
کو پانی دیا۔ میں پودے کو پانی دے رہا تھا تو اس کی حالت غیر تھی۔ شاید وہ
یہ سوچ رہا تھا کہ میرے پانی دینے سے پودا سوکھ جائے گا اور اس کے پتے
اور شاخیں خشک ہو کر جھڑ جائیں گی۔

اس کی بیوی ہمارے لئے ناشتہ تیار کر چکی تھی۔ ہم پودا لگا کر منہ ہاتھ
دھو کر ناشتہ کے لئے میز پر آ بیٹھے۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا کہ مجھے اس کے خیالات کا علم
ہو گیا ہے اور وہ میری بات کو دوسری طرف منتقل کرنے کے لئے کہنے لگا کہ
میں بھی اپنے گھر کے احاطے میں ایک باغ لگا دوں۔ ہم پیڑ سے کٹے جا رہے ہیں
باغ لگا کر ہم پیڑ سے اس طرح استفادہ کر سکتے ہیں۔ ماحول میں پیدا شدہ

کثافتوں، آلودگیوں اور زہریلی ہواؤں کو پاک کرنے کا فطری طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے گھروں میں باغات لگائیں اور ارد گرد ہرے بھرے شجر اگائیں۔

ناشتہ کرنے کے دوران اس کی پریشانی حسب دستور برقرار تھی۔ وہ اپنے ذہن میں ابھی تک اس پودے کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کو میں نے پانی دیا تھا۔

وہ حسب معمول شام کو میرے گھر آیا۔ اور اپنے ساتھ بچوں کے لئے ٹافیاں اور چاکلیٹ بھی لے آیا۔ گھر میں آتے ہی بچوں نے اُسے گھیر لیا۔ اور میں نے اس کے ہاتھ سے ٹافیاں اور چاکلیٹ لے لئے اور بچوں کو ڈانٹ کر باہر بھگا دیا۔ بچے ٹافیوں اور چاکلیٹ کے لئے اصرار کرتے رہے۔ وہ خاموشی سے میری اس حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ اور میں نے ، انستہ اس سے ایک اہم معاملہ پر گفتگو چھیڑ دی ہم دونوں مالی اشتراک سے زمین خریدنے تھے جس پر ہم گنّے کی کاشت کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ کیونکہ حکومت یہاں شکر کی فیکٹری قائم کرلینا چاہتی ہے۔ ان امور پر ہمارے درمیان کافی دیر تک بات ہوتی رہی اور پھر وہ چلا گیا مجھے خیال آیا کہ وہ چلتے ہوئے بغیر چائے پئے چلا گیا تھا جو میری بیوی خصوصاً اس کے لئے بنا لائی تھی۔

میں سوچتا ہوں کہ ہم دونوں ایسی شہد پی رہے ہیں جس میں ہیم کے پیڑ کا رس بھی ملا ہوا ہے۔

▲▲

شمس الرحمٰن فاروقی

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے — دعویٰ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

وزن : فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

بحر : رمل مثمن محذوف

طباطبائی کہتے ہیں: "توالیِ اضافات اور رکیک تکلفات اس شعر میں بھرے ہوئے ہیں۔ 'شوخیِ دنداں' نہایت مکروہ لفظ ہے۔ مصنف کی شوخیِ طبیعت نے "خوبی" کو سامنے کا لفظ سمجھ کر چھوڑ دیا ورنہ وہ بہتر تھا۔" توالیِ اضافت (یعنی دو سے زیادہ الفاظ کو اضافت کے ساتھ استعمال کرنا یا کئی کئی اضافتیں استعمال کرنا) کو انیسویں صدی کے آخری زمانے میں بعض لکھنوی اساتذہ نے قبیح قرار دیا ہے، لیکن کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے، بجز اس کے کہ یہ مخلِ فصاحت ہے۔ ایک خیال شاید یہ بھی رہا ہو کہ ایرانی یا فارسی شعرا نے توالیِ اضافات کو مکروہ سمجھا ہے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ کوئی بھی چیز جو زبان کے جوہر کے مطابق ہو، مخلِ فصاحت نہیں ہو سکتی۔ اگر کسرۂ اضافت کا استعمال یا فارسی ترکیبوں کا استعمال اردو زبان کے جوہر کے خلاف پڑتا تو زبان اسے کبھی نہ اختیار کرتی۔ عربی کی اضافت جو الف لام لگا کر بنتی ہے، اردو میں کبھی اس طرح مقبول نہ ہوئی جس طرح فارسی اضافت مقبول ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہی ہے کہ الف لام والی اضافت ہماری زبان کے مزاج سے متغائر ہے اور کسرہ والی اضافت اس کے موافق ہے۔ رہا یہ تصور کہ فارسی میں اضافت متوالی نہیں آتی، تو یہ بالکل غلط ہے۔ حافظ کا کلام بہت سلیس سمجھا جاتا ہے، لیکن ان کے یہاں بھی توالیِ اضافات کی مثالیں موجود ہیں۔ طباطبائی نے ان "رکیک تکلفات" کی کوئی مثال نہیں دی ہے جن سے یہ شعر بھرا ہوا ہے۔ مثال کی عدم موجودگی میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں طباطبائی کی سخن فہمی سے زیادہ ان کا تعصب کام کر رہا ہے۔ شعر میں ایسے الفاظ استعمال کرنا جو آپس میں مناسبت رکھتے ہوں، مہارت کی دلیل ہے۔ اس کو "رکیک تکلفات" وہی کہہ سکتا ہے جو زبان کا جوہر شناس نہ ہو یا جان بوجھ کر زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہو۔ لطف یہ ہے کہ خود طباطبائی نے غالب کے یہاں مناسبتِ الفاظ اور تازگیِ لفظ کی جگہ داد بھی دی ہے۔ ممکن ہے کہ طباطبائی نے سوچا ہو کہ غیر جانب داری کا مطلب یہی ہے کہ اگر داد دینی ہو تو دل کھول کر دیں، اور اگر تنقیص کرنی ہو تو وہ بھی دل آمادگی کے لہجے میں کریں۔ بہرحال طباطبائی کا بظاہر سب سے زیادہ وزنی اعتراض "شوخیِ دنداں" پر ہے۔ اس فقرے کو وہ "نہایت مکروہ" قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ غالب نے شوخیِ طبیعت کی بنا پر "خوبیِ دنداں" کو ترک کیا، حالانکہ "خوبیِ دنداں" ہی مناسب تھا۔ طباطبائی شاید بھول گئے تھے کہ "دنداں" کو "برق" سے تشبیہ دیتے ہیں، اور "برق" کی ایک صفت "شوخی" بھی ہے۔ خود طباطبائی کو اس بات کا دھندلا سا احساس تھا، چنانچہ وہ کہتے ہیں: "ہنسی کے وقت آبدار دانتوں سے چھوٹ سی پڑتی ہے، بجلی سی کوندھ جاتی ہے۔" لیکن نے خود نے بھی تشبیہ کی بنیادی مماثلت کی طرف توجہ نہ دلائی، اور نہ یہ بتایا کہ "شوخ" کے ایک معنی "خوبصورت" بھی ہوتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو اسٹائینگاس۔) لہٰذا "شوخیِ دنداں" نہ صرف صحیح ہے، بلکہ مکروہ ہونے کی جگہ مستحسن اور تازہ ہے۔

اب شعر کے معنی پر غور کیجئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شعر میں معنی بہت نہیں ہیں، اور اگر طباطبائی کی ناراضگی دراصل اس بنا پر تھی تو ایک حد تک درست بھی تھی۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ شعر میں معنی کا قحط ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شارحین نے لفظ "ناز" پر پورا غور نہیں کیا۔ "ناز" کے اصل معنی ہیں "معشوق کا وہ استغنا جس کے ذریعہ وہ عاشق کے شوق کو مزید برانگیختہ کرتا ہے" (بُرہانِ قاطع)، یعنی

ناز محض غرور یا عدم التفات نہیں بلکہ وہ ادا ہے جس میں غرور اور عدم التفات
سے آتش شوق کو تیز تر کرتے ہیں۔" ناز کے دوسرے معنی " نفاست خوش حالی
(استغنا، تغافل) ناز کشتن عاشق (شمس اللغات) بھی ہمارے مفید مطلب ہیں۔
لہذا پہلے مصرعے کا مفہوم یہ ہوا کہ دانتوں کی خوبصورتی جب ناز کا اظہار کرتی ہے
تو اس لئے کہ لوگ خوش ہوں یعنی معشوق کو مسکراتے دیکھ کر لوگ بھی مسکرا دیں
ان کے دلوں میں معشوق کے لئے مزید کشش پیدا ہو۔ یعنی معشوق جب انداز استغنا
کے ساتھ مسکراتا ہے تو بھی لوگ خوشی سے ہنس دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ مار
خالی از علت نہیں بلکہ ہمارے لئے ہے۔ دوسرے مصرعے میں بظاہر غیر متعلق بات
کہی گئی ہے کہ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ دوستوں میں جمعیت (یعنی یگانگت اور یک جائی
ہے) تو یہ محض ہنسی کی بات ہے یعنی قابل اعتبار نہیں۔ کیوں کہ معشوق کی ہنسی
سب کے لئے ناز کا سامان پیدا کرتی ہے۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ یہ ہنسی میرے لئے ہے۔
ایسی صورت میں یہ دعویٰ کرنا کہ سب دوست یک جا اور مجتمع ہیں محض لغو ہے حقیقت
یہ ہے کہ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔

تقریباً تمام شراح نے لکھا ہے کہ دانتوں کو جمعیت احباب سے تشبیہ دیتے
ہیں لہٰذا شعر کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح دانت آخر کار ہل کر الگ الگ ہو جاتے ہیں
اور گر جاتے ہیں، اسی طرح دوست بھی آخر کار درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا
معشوق اپنے دانتوں کی نمائش کر کے یہ بتاتا ہے کہ جس طرح یہ دانت عارضی ہیں
اسی طرح جمع احباب بھی عارضی ہے۔ دانتوں کو جمعیت احباب سے تشبیہ دینا میرے
علم میں نہیں ہے اور معشوق کا اپنی ہنسی کے ذریعہ اخلاقی سبق پڑھانا غزل کے
مزاج کے منافی معلوم ہوتا ہے لیکن اگر "عرض ناز شوخی دندان" کے معشوق کا عمل
نہ فرض کیا جائے۔ بلکہ ایک عام بیان سمجھا جائے تو یہ مشکل رفع ہو سکتی ہے۔ حسرت
موہانی نے مجملاً اور سہا مجددی نے وضاحتاً ایسا ہی کیا ہے۔ سہا نے "ناز"
کے معنی جو لی بتلائے ہیں جو درست ہیں۔ بحیثیت مجموعی سہا مجددی کا مفہوم
قابل قبول ہے، لیکن جو مفہوم میں نے بیان کیا ہے وہ شعر کے تمام پہلوؤں
کا احاطہ کرتا ہے۔

یکم مارچ ۱۹۸۶

کتابیں

وضاحتی کتابیات • جلد دوم • مرتبہ۔ گوپی چند نارنگ، مظفر حنفی • ترقی اردو بیورو نئی دہلی • تینتالیس روپے •

اردو کتابوں کے ناشرین عام طور سے فہرست کتب شائع کرتے ہیں۔ اب تک کسی ناشر نے کوئی ایسی فہرست کتب شائع نہیں کی جس میں کسی مخصوص سنہ کی تمام مطبوعہ کتابوں کی فہرست کے ساتھ ان کتابوں کا مختصر تعارف بھی شامل ہو۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی، محمد مرزا سجاد بیگ، ابوالکلام آزاد اور عبدالحق کی کوششیں مثلاً "الفہرست"، "قاموس الکتب" وغیرہ کی شکل میں قابل ذکر ہیں۔ لیکن اول الذکر سلسلہ جاری نہ رہ سکا، آخرالذکر میں صرف مذہبی کتابوں کی فہرست ہے۔

ترقی اردو بیورو، جناب گوپی چند نارنگ اور مظفر حنفی قابل تحسین ہیں کہ انھوں نے اس نہایت اہم کام کی ابتدا اور سرپرستی کی اور "وضاحتی کتابیات" کا سلسلہ شروع کیا جس میں اردو کی تمام کتابوں کو شامل کیا گیا خواہ وہ کسی بھی علم یا ادب سے تعلق رکھتی ہوں۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی جس میں ۱۹۷۹ء کی تمام مطبوعہ اردو کتابوں کو شامل کیا گیا۔ "کتاب نما" شمارہ نمبر ۱۲ میں اس پر پہلے ہی تبصرہ شائع کیا جا چکا ہے۔

دوسری جلد پر سنہ اشاعت ۱۹۸۳ء درج ہے۔ دونوں جلدوں کی اشاعت میں چار پانچ سال کا وقفہ لگ گیا۔ کتابت اور طباعت کے مسئلوں کی وجہ سے اردو کتابوں کی اشاعت میں ویسے ہی خاصا وقت لگ جاتا ہے۔ وضاحتی کتابیات کی اشاعت میں اس سے زیادہ وقت لگنا ضروری امر ہے کیوں کہ پورے ملک کی مطبوعہ اردو کتابوں کو کتب خانوں میں تلاش کرنے اور ان کا سرسری طور پر ہی سہی مطالعہ کرنے کے لئے مزید وقت درکار ہوتا ہے۔ اگر ہندوستان کے تمام ناشرین اور مصنفین اپنی اپنی کتابوں کی ایک ایک جلد مرتبین کو عنایت کر دیں تو اس کام میں آسانی بھی ہو اور وقت بھی کم لگے۔

وضاحتی کتابیات کی دوسری جلد میں ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۰ء کی مطبوعہ اردو کتابوں کی فہرست اور تعارف شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور سترہ ابواب (ادبی تنقید و تحقیق، شاعری، ناول، افسانے، ڈرامے، انشائیہ، سفرنامہ، مکتوبات، زبان، لسانیات، سماجی علوم، تعلیم، صنعت و حرفت، سائنس، مذہبیات، بچوں کا ادب، سوانح اور متفرقات) پر منقسم ہے۔ ہر باب میں شامل کتابوں کے نام، حروف تہجی کے اعتبار سے دئے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ کے تحت کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام بھی الگ الگ حروف تہجی کے اعتبار سے دئے گئے ہیں۔

مندرجہ بالا تمام ابواب کے تحت تقریباً گیارہ سو کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے پہلی جلد میں تقریباً پونے چار سو کتابیں ہی شامل تھیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ اردو کتابوں کی اشاعت کس رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ یعنی ۱۹۷۹ء کے مقابلے میں ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۱ء میں تقریباً ۹۰ فی صد کتابوں کا اضافہ ہوا۔ ہو سکتا ہے کچھ کتابیں شامل ہونے سے رہ بھی گئی ہوں۔ اگر ایسا ہے تو ان کے مصنفین یا ناشرین کو چاہئے کہ بیورو یا مرتبین کے علم میں لائیں تاکہ ضمیمہ کی شکل میں یہ کتابیں شامل اشاعت ہو سکیں۔

اس کتابیات میں صرف ایک بات کھٹکتی ہے اور وہ یہ کہ کچھ اہم کتابوں کے تعارف پر کم اور کچھ معمولی کتابوں پر زیادہ لکھا گیا ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ اچھی کتابوں پر زیادہ اور معمولی کتابوں پر کم لکھا جائے۔ بہرحال یہ "وضاحتی کتابیات" ہندوستان میں ہر سال شائع ہونے والی کتابوں کے ریکارڈ کے ساتھ ساتھ محققین کے لئے دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس لئے بھی اہم ہے کہ اکثر کتابیں مستقبل کے محققین کے ذریعہ رد کی جا سکتی ہیں لیکن اس کتابیات کی اہمیت مستقبل میں آج سے بھی زیادہ ہو گی۔

کتابت طباعت اور گٹ اپ عمدہ ہے

——— سید ارشاد حیدر

کہتی ہے خلق خدا

● ڈاکٹر نارنگ کا مضمون نثری نظم کی شناخت بہت بھرپور، جامع اور فکر انگیز ہے۔

حیدرآباد — گمان چند

● گوپی چند نارنگ کا مضمون معلوماتی ہے۔ شعری تخلیقات بھی جاندار ہیں۔ جوگندر پال کے لطیفے تو میں نے ازبر کرلئے ہیں، ہوٹلوں میں چائے کے دوران ہندی صحافیوں اور کباڑی کاروں کو سنا سنا کر ہنساتا رہتا ہوں۔ محمد اعظم اور ظفر صیان اپنی اپنی جگہ درست، لیکن شمس الرحمٰن فاروقی جیسی قدآور شخصیت کے لئے صفائی کی چنداں ضرورت نہیں تھی، رفیعہ شبنم عابدی کا خط اور ادارہ شب خون کا جواب بھی دیکھا۔ خلیل تنویر کے اس مصرعے کے بارے میں ادارہ 'شب خون' کا کیا خیال ہے ع

اک عمر بعد انھیں معتبر بھی کرتا ہے

پٹنہ — میر سلطی

● سقوط عین کا رواج کلاسیکی شعرا اور قدیم (یعنی دکنی) اردو شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ ہمارے زمانے میں بھی یہ اسا کم یاب نہیں، چنانچہ فیض کا مشہور مصرع ہے۔

ع دیوار شب اور عکس رخ یار سامنے

اس تھوڑی سی آزادی پر چیں بجبیں ہونے کی ضرورت نہیں۔

الٰہ آباد — شب خون

● سب سے پہلے شبلا متھرسن کیمپس کے حوالے سے اٹھایا گیا سوال سامنے آیا۔ نہ۔ میرا افسانے میں پلاٹ کے فقدان کی بحث واقعی پرانی پڑ گئی تھی۔ لہٰذا "بیانیہ سے کردار کا اخراج" کی بحث کی ابتدا کرکے آپ نے جہاں اردو میں ایک نئے مسئلے پر غور و فکر کا باب کھولا ہے۔ وہیں ہمارے نقادوں کو مصروف رکھنے کے کار نیک کو ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ ویسے میری ناچیز اور مختصر ترین رائے میں بیانیہ میں کردار کی حیثیت "لسا" کے نون کی سی ہے۔

"نثری نظم کی شناخت" نارنگ صاحب کا بڑا ہی فکر انگیز اور پر از معلومات مقالہ ہے میری طرف سے ان سے عرض کر دیجئے کہ بحر، ردیف اور قافیہ کی پابندیوں سے گھبرا کر ہمارے تساہل پسند ذہنوں نے نثری نظم کو اپنایا تھا۔ ان کے مضمون کو پڑھ کر احساس ہوا کہ بے چارہ آج کا شاعر بڑے دھوکے میں ہے۔ یعنی "عروض" کے آسمان سے گرا تو "لسانیات" کے کھجور میں اٹک گیا۔ برائے خدا کچھ دن تو ہمارے شعرا کو بے فکر ہو کر نثری نظمیں اور کہہ لینے دیں۔ انجام تو یوں بھی ظاہر ہے۔ آپ "طول" "مل" اور "سر لہر" کے کستر بجا کر ان عربیوں کے تھکنے سے پہلے ہی میدان چھڑوا دیں گے۔

فاروقی صاحب "میریات" اور "غالبیات" میں گراں قدر اضافے کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "شب خون" کے ایک شمارے کے مطالعے کے بعد آئندہ شمارے کا جب خیال آتا ہے تو اس کے نام کے پہلے ہی حرف (ش) سے ایک ساتھ دونوں ہی نام ذہن میں آجاتے ہیں۔ ان کے مضامین پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ صرف استفادہ کرتا ہوں۔

کتھا نگر کے حوالے سے کچھ عرصے بعد پڑھنے کو ملے گا کہ جوگندر پال اردو کے خلیل جبران ہیں۔ کیا خیال ہے؟ منظومات وغیرہ کے انتخاب کے سلسلے میں آپ کا یہ انداز اچھا ہے کہ آپ ایک ہی شاعر کی کئی تخلیقات شائع کرتے ہیں۔ اس طرح اس کے اسلوب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

مکتوبات کا حصہ بھی بھرپور اور دلچسپ ہے۔

ٹونک — صابر حسن رئیس

شب خون نمبر ۱۳۹ میں پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا طویل عالمانہ مضمون "نثری نظم کی شناخت" پڑھنے کے بعد آپ کا قاری سوچتا ہے کہ ایسی بصیرت کے حامل ناقد اب اردو میں کتنے رہ گئے ہیں؟

پروفیسر نارنگ نے کشور ناہید کی خوبصورت نظم "گھاس تو مجھ جیسی ہے" نقل کی ہے اور بہت صحیح لکھا ہے کہ کشور ناہید نے نسوانی احساس اور عورت کے درد کے اظہار سے اردو شاعری میں ایک نئی طرز کی بنیاد ڈالی تھی

اتفاق سے اسی شمارے میں رفیعہ شبنم کا ایک خط چھپا ہے۔ رفیعہ شبنم کو شاعری میں بھی عورت، خاص طور پر ہندوستانی عورت نسوانی جذبات و احساسات کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ کہیں کہیں مردانہ وار نسوانیت بھی جھلکتی ہے

پچھلے ڈیڑھ دو برس سے کرناٹک کی ایک نئی شاعرہ کا طلوع ہماری توجہ کا مرکز رہا ہے۔ شائستہ یوسف دوسرے رسائل کے علاوہ شب خون میں بھی چھپ چکی ہیں۔ پہلا مجموعہ چند ماہ پہلے شائع ہوا ہے "گل خود رو" کی بنگلوری شاعرہ نے نثری نظمیں زیادہ لکھی ہیں، پابند شعر کم کہے ہیں۔ شائستہ بھی دورِ جدید کی نسائی آواز ہے۔ اپنی انفرادیت کھوئے بغیر یہ آواز مجھے کشور ناہید کی آواز کی توسیع معلوم ہوتی ہے۔

شائستہ یوسف کی نثری نظموں سے چونکا دینے والے شذرات اور مصرعے نقل کرنے کو جی چاہتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لئے صفحات درکار ہیں۔

محمود ایاز کی پہلی غزل کے پانچوں شعر بہت اچھے، بہت خوب صورت ہیں۔ دوسری غزل میں وہ خود کو دہراتے دکھائی دیتے ہیں۔ دو برس پہلے شب خون میں چھپی ہوئی ان کی غزلوں سے تقابل کر کے دیکھ لیا جائے۔ ایاز صاحب بے حد ذہین آدمی ہیں۔ اچھی، بصیرت والی نظر رکھتے ہیں۔ انگریزی ادب کا مطالعہ بھی ان کا بہت وسیع ہے۔ خود کو دہرانے کا عمل کسی صورت مناسب نہیں ہے۔

فاروقی صاحب کا مضمون "میر کے کلام میں عاشق کا کردار" میرے خیال میں تلاش گم شدہ کی کامیاب سعی بھی ہے۔ فاروقی صاحب اس سلسلے کو جاری رکھیں۔ بہتوں کا، ہم سب کا بھلا ہوگا۔

یادگیر (کرناٹک)   کرم الثاقب تسمنہ

گوپی چند نارنگ صاحب کا مضمون بلا شبہ پسند کیا جائے گا۔ میں نے اسے 'اوراق' کے سال نامے میں بھی پڑھا تھا۔ جوگندر پال صاحب کے 'اسارے' اور 'کتھا نگر' کسی ہندوستانی سرکاری پرچہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ پرچے کا نام تو یاد نہیں۔ لیکن یہ وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ یہ بھی پڑھا ہوا تھا۔ اسعد بدایونی کی غزل ع

دریچے، طاقچے سننے کا لطف اٹھاتے ہوئے

بھی اوراق کے سال نامہ میں شامل ہے لیکن یہ وہ تخلیقات ہیں جنھیں بار بار پڑھنے میں ہی لطف ہے پھر پاکستانی رسائل تک کتنے ہندوستانی قارئین کی رسائی ہے۔

شمارہ ۱۳۹ غزلوں کے لحاظ سے بڑا متنوع ہے۔ محمود ایاز، ظفر اقبال، شہزاد احمد اور اسعد بدایونی ایک ہی پرچے میں دستیاب ہیں۔ یہ کیا کم ہے؟ منصور سبزواری کی غزلیں بھی اپنی مخصوص فضا برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کے یہاں ایک انجانا سا آسیبی خوف اور دہشت نظر آتی ہے۔ سید ارشاد حیدر صاحب کے تبصروں کی کمی البتہ کھٹکتی ہے۔ ظفر عباس صاحب شاید آپ کے جواب سے مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ محامد حیدر صاحب کا اکلوتا افسانہ پھیکا پھیکا سا لگا۔

دہرہ دون   راشد جمال فاروقی

شمارہ نمبر ۱۳۹ میں جوگیندر پال صاحب کے افسانچے پڑھ کر کوفت ہوئی۔ کوفت یوں ہوئی کہ پال صاحب کو اپنا وقت جو اچھے افسانے لکھنے میں صرف کرنا چاہئے تھا ان چٹکلے نما چیزیں لکھنے میں برباد کر رہے ہیں۔ شاید پال صاحب نے کچھ نیا کر دکھانے کی خواہش میں اس راہ کا تعین کیا ہے۔ حالانکہ (میرے خیال میں) اس میں کچھ نیا ہے اور نہ معنی خیز۔ ان افسانچوں کے شروع میں "اشارے" کے عنوان سے پال صاحب کا جو مختصر سا مضمون شائع ہوا ہے اس میں پال صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں "فن کاروں کا یہ اصرار بڑا معنی خیز ہے کہ بوبوست دکھاؤ"۔ بات صحیح ہے لیکن اتنا کم بھی نہ دکھاؤ کہ ہم پورے طور سے کسی چیز کی ماہیت سمجھ سکیں اور نہ اس سے دیر تک لطف اٹھا سکیں۔ (افسانچہ یعنی افسانے کی دُم۔ اور دم بھی وہ جس کا شروع اور آخر کاٹ کر ہمارے سامنے رکھ دیا جائے۔ اب ہم دیکھتے رہیں کہ آخر یہ کیا چیز ہے) اس کے باوجود ہم اسے غور سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کیوں کہ یہ جوگیندر پال کی ہتھیلی پر رکھی ہوتی ہے۔

لکھنؤ   محسن خاں

شب خون ۱۳۹ میں "کتھا نگر" کی کہانیاں پسند آئیں۔ ان کہانیوں میں "مرحوم" اور "آسیب زدہ قوم" بے حد پسند آئیں۔ یہ تخلیقات گراں قدر ہیں۔ کہانی "مرحوم" انسان دوستی کے موضوع پر بہت اچھی کہانی ہے۔ فن کار کے اس اشارے کو شب خون کے تمام قاری بھی عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں تو تخلیقی کرب سے آزاد ہوتے وقت صرف ہونے والا خون جگر رائگاں نہیں جائے گا۔

ورنہ تخلیق کار کی کاوش تمام لوگوں کے ہاتھوں تو کیسا کی زینت ہی بنتی ہے۔
میری رائے میں ایسی کہانیوں کو ہندوستان کی دوسری بڑی زبانوں کے قاری تک بھی پہنچایا جانا چاہیے۔

"آسیب زدہ قوم" میں جن لوگوں کا ذکر شاہ سواروں کے پیچھے چلتے جانے کا ہے۔ وہ کسی دیومالا کے لوگ نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کے لوگ ہیں اور انسان ہی ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں بھی ان لوگوں میں سے ایک ہوں جو یہ جانتے ہیں کہ ان کا شاہ سواروں کی راہ نمائی نہیں کر رہا ہے۔ پھر بھی نہ جانے کس نشے میں وہ دنبالہ بنے ہوئے ہیں۔

ایسی کہانیاں تخلیق کرنے پر مال صاحب کو مبارک باد دی جانی چاہیے۔ میں ان کے قلم کی سلامتی کے لئے دعا گو ہوں۔

بھاگلپور

قنبر علی خاں

ظفر اقبال اور شہزاد احمد کی غزلیں بہت دنوں (بلکہ سالوں) کے بعد پڑھنے کو ملیں۔ بظاہر ان حضرات کی غزلیں ہلکی پھلکی ہیں لیکن غور کیجئے تو کھلتا ہے کہ ان کے اسلوب میں ابھی وہی کاٹ ہے جس کے سبب انھیں معاصرین پر برتری حاصل ہے۔ محمود ایاز، مسعود سبزدلوی، سہیل احمد زیدی، حسن عزیز، خلیل تنویر اور اسعد بدایونی نے بھی اپنی غزلوں سے جی خوش کر دیا۔ جہاں تک نثری تخلیقات کا سوال ہے، زیر نظر شمارہ پچھلے کئی شماروں سے بہت آگے ہے۔ اتنی اچھی تخلیقات پیش کرنے پر آپ مبارک باد قبول فرمائیں۔

لکھنؤ

سعید زیدی

سید ارشاد حیدر کے اردو تبصروں میں تھوڑا ڈھیلا پن محسوس ہو رہا ہے۔ پہلے ان کے تبصرے پڑھ کر احساس ہوتا تھا کہ تبصرے تو ان ہی کے ہیں۔

گریڈیہہ

قیصر رہاں

میری غزلوں میں آپ کے کاتب صاحب نے دو تین فاش غلطیاں کی ہیں۔ دوسری غزل کے آخری مصرع میں لفظ قیمت کی جگہ قسمت چھپا ہے۔ اصل مصرع اس طرح ہے۔ ع

وہی آنسو ہمارے تن کی قیمت ہو گئے ہوں گے

آخری غزل کا پہلا اور دوسرا شعر بھی غلط شائع ہوا ہے۔ صحیح شعر اس طرح ہیں ؎

جلے چراغ بھلا کیسے تا سحر کوئی
ہوا کے پاس نہیں دوسرا ہنر کوئی

کسی سوال کا چہرہ کسی خیال کا پھول
لواحِ جاں میں کہاں حرف معتبر کوئی

خط کشیدہ الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ لکھے گئے ہیں۔

علی گڑھ

اسعد بدایونی

▲▲

شمارہ نمبر ۱۳۸ میں گیان چند جین صاحب کا مضمون تحقیقی ہے اور طلبہ کے لئے بہت کار آمد ہے۔ اس طرح کے مضامین کی اشاعت سے ادب کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا مضمون "میر کا لسانی کارنامہ" تخلیقی تنقید کی عمدہ مثال ہے۔ موصوف نے میر کا مقام متعین کرنے میں میر کی شاعری کے جن گوشوں پر روشنی ڈالی ہے انھیں پڑھ کر دل و دماغ روشن ہو گئے۔ میر و غالب کے مقامات اس انداز سے متعین کئے گئے ہیں کہ کسی کی شاعرانہ حیثیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یہ فاروقی صاحب کے قلم کا کمال ہے۔

دھساد

نجم عثمانی

▲▲

اخبار و اذکار

● غیاث احمد گدی جتنی خاموشی سے جیے، اتنی ہی خاموشی سے مرگئے۔ ادیبوں شاعروں کی قوم عام طور پر باتونی یا کم از کم گفتگو کی شوقین ہوتی ہے۔ اسے یہ بھی فکر رہتی ہے کہ محفل میں اپنی گفتگو اور شخصیت کا رنگ جمے، لوگ متوجہ ہوں، ہماری باتیں سنیں، لطف اندوز ہوں۔ غیاث احمد گدی ان چیزوں سے بالکل بیگانہ تھے۔ ان کی تحریر میں جتنی گہرائی تھی، ان کی شخصیت میں اسی قدر سکون اور سکوت تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے اور کم بولتے تھے۔ لکھتے بھی وہ بہت کم تھے، لیکن ان کا افسانہ اس قدر سڈول اور مانکا نکلتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندگی بھر اپنے دل میں اسی افسانے کو لکھتے رہے ہیں۔ غیاث کے یہاں علامتی اسرار اور انسانی تعلقات دونوں کا غیر معمولی احساس تھا۔ شاید وہ انسانی تعلقات کو بھی علامتی اسرار کے طور پر دیکھتے تھے۔ ان کا مکالمہ مختصر لیکن چبھنے والا ہوتا تھا۔ ان کی فن کاری ایک چھوٹے سے چمن کا تاثر پیدا کرتی تھی، ایسا چمن جس کی ہر ہر پتی کو باغباں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہو۔

افسوس کہ اردو افسانے کا منفرد اور تہ دار فن کار ہم سے اس قدر جلد جدا ہو گیا۔ ان کی عمر صرف ۵۰ برس کی تھی۔ ابھی ان میں تخلیقی امکانات سے بھرپور کئی برس باقی تھے۔ کاش وہ کچھ دن اور زندہ رہتے۔ غیاث احمد گدی نے شہرت کی نہ پروا کی اور نہ تمنا۔ انھیں اس کی فکر بھی نہ تھی کہ کوئی نقاد یا مداح ان پر مضمون لکھے، ان کا ذکر کرے۔ وہ فقط بھرپور افسانہ نگار تھے۔ ان کی شہرت شاید اسی لیے محدود رہ سکی۔ لیکن ان کی زندگی میں لوگوں کو اتنا احساس تو تھا ہی کہ وہ ہمارے جدید افسانے کی ایک معتبر اور بے حد منفرد آواز ہیں۔ ان کی شہرت انھیں بنیادوں پر قائم رہے گی۔

اس بزم میں

● انتظار حسین کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "علامتوں کا زوال" مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

بلراج کومل کے مضامین کا مجموعہ "ادب کی تلاش" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

● پرویز شہریار جمشید پور کے نئے افسانہ نگار ہیں۔

● شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ مضمون مطبوعہ ہے لیکن چوں کہ شب خون کے پچھلے شمارے میں صرف افسانے ہی شامل اشاعت کیے گئے تھے، ہمیں قارئین کے خطوط موصول ہوئے کہ افسانہ پر شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک مضمون بھی شائع کیا جائے۔ اس شمارے میں بھی صرف افسانے ہی شائع کیے جا رہے ہیں اور قارئین شب خون کی فرمائش پر نیاز فتح پوری، سیدی اور قرۃ العین حیدر پر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ مضمون بھی یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔

● علی تنہا کے افسانوں کا مجموعہ "کئی دنوں کا دن" لاہور سے جلد ہی شائع ہوگا۔

● مرحوم غیاث احمد گدی کے افسانوں کا مجموعہ "سارا دن دھوپ" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

▲▲

شب خون

June, July, Aug

142

Rs. 4-00

فکشن میں واقعات کی ترتیب کی اہمیت

زندگی کے برخلاف ادب میں حسبِ ذیل طرح کے سوالات اٹھانا نہ صرف فائدہ مند بلکہ ضروری بھی ہے (کیوں کہ ان سوالات کے جواب کی روشنی میں فن پارے کی تفہیم اور اس کا تجزیہ ممکن ہوجاتا ہے۔) (۱) کیا وجہ ہے کہ کسی ناول یا افسانے میں واقعات کا ایک مخصوص سلسلہ یا جھرمٹ پہلے پیش کیا گیا اور کوئی اور مخصوص جھرمٹ بعد میں پیش کیا گیا۔ (۲) کیا وجہ ہے کہ کسی کردار کا ایک مخصوص پہلو پہلے پیش کیا گیا اور کوئی اور پہلو بعد میں پیش کیا گیا ؟ (۳) کیا وجہ ہے کہ کوئی اطلاع (لفظی عمل یا پلاٹ سے متعلق، وضعیاتی، یا نفسیاتی) کسی مخصوص لمحے یا قصے کی کسی مخصوص منزل پر ہی پیش کی گئی یا نہیں پیش کی گئی یا مبہم طور پر بیان کی گئی ؟ اور ان سوالوں کی چھان بین بالخصوص اس وقت زیادہ اہم ہوجاتی ہے۔ جب ناول یا افسانے میں مذکور اطلاعاتی مواد (یعنی SUJET) کی ترتیب رسومیاتی یا پہلے سے قائم کردہ قماش و تنظیم (مثلاً واقعات کی زمانی ترتیب) سے مختلف ہو۔ اطلاعاتی مواد اور واقعات کو پیش کرنے میں ارادی تاخیر، واقعات کی (مختلف ابواب اور مواقع میں تقسیم) اور ان کی تنظیم کو بیانیہ دلچسپی پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لئے تو استعمال کیا ہی جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ذریعہ قاری اور واقعات کے درمیان طرح طرح کے روابط مثلاً فاصلہ، جواب، فیصلہ کو حرکیاتی طور پر قابو میں رکھنے کا کام بھی اس سے لے سکتے ہیں (یعنی ان کے ذریعہ ناول نگار اپنے قاری کو ان نتائج کی طرف لے جاتا ہے جن کی طرف لے جانا ناول نگار کو مقصود ہوتا ہے۔) مزید براں ان طریقوں کو کام میں لاکر ناول نگار اور بھی کئی طرح معروضاتی قاری کے ذہن میں پیدا کر سکتا ہے جو مندرجہ بالا نتائج سے کم اخلاقی یا جذباتی رنگ کے حامل ہوں۔ (یعنی وہ قاری کو کسی کردار یا واقعے کی اصل و عیب کے بارے میں گومگو میں مبتلا کر سکتا ہے۔) سچ تو یہ ہے کہ ادبی متن کا کوئی بھی حصہ کوئی بھی طرح (PATTERN) یہاں تک کہ ایک لفظ واحد کے معنی یا فن پارے کی مختلف اکائیوں کے درمیان ربط مکانی، کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر مندرجہ بالا نوع کی زمانی تقلیب یا پیچ (TWIST) کا عمل نہ ہو سکے۔۔۔ بیانیہ اور ڈراما کے پاس شاعری کے مقابلے میں زیادہ بدیعیاتی وسائل (RHETONICAL DEVICES) ہوتے ہیں، کیوں کہ بیانیہ اور ڈراما فی نفسہٖ کسی زمانی صورت حال و عمل کو پیش کرتے ہیں، نہ کہ کسی غیر متحرک شے کو یا کسی ذہنی صورت حال کو (جیسا کہ شاعری میں ہوتا ہے۔)

مائر سٹرن برگ

۱۹۷۸

جون، جولائی، ۱۹۸۶ء

مدیر، پرنٹر، پبلشر: عقیلہ شاہین ٹیلی فون: ۳۴۹۶، ۵۳۵۵۰ جلد: ۱۹ شمارہ: ۱۴۲
مطبع: تاج آفسٹ پریس الہ آباد سرورق: خطاط: فیاض احمد
بارہ شمارے: ۴۵ روپے فی شمارہ: چار روپے دفتر: ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد

ترتیب و تہذیب

شمس الرحمٰن فاروقی

آخری ملاقات

بلراج کومل

ملاقاتوں کا کیا سلسلہ تھا
آتے جاتے موسموں میں
روز و شب کی سرحدوں میں
چاندنی میں
تیز جلتی دھوپ میں
محفل میں
سیل ہاؤ ہو میں
بند کمروں میں
پروں کو کھولتی پرنم فضاؤں میں
کبھی تم صرف چہرہ تھیں
فقط انوار چشم و لب
سلگتی بولتی تنہائیوں میں
دور کا بہتی سمندر کا کوئی نغمہ
کوئی جلتا ہوا شہر فروزاں
یا کوئی روشن شگفتہ پیرہن
زیر زمیں
آواز دینا
مرگ آسا، احبی
سرگوشیاں کرتا جہنم
جسم صرف ایک جسم
سرتاپا برہنہ
سرتاپا

دائم ترنم
تیرگی میں تیز بارش
ساعت کاذب میں رفتہ رفتہ گرتی نرم شبنم
سب تمہارے عکس تھے
تم سا مگر کوئی نہ تھا

میں اسیر زلف تھا
یا صید خوشبو
یا تمہارا نقش پا تھا
فیصلہ کرتے میں مجھ کو
عمر گذری

سب ملاقاتیں ادھوری تھیں
وہ شاید آخری تھی
وہ ملاقات منور
کیا عجب یہ حادثہ تھا
وقت رخصت تم نظر آئیں مکمل
میں ہزاروں آئینوں میں گھر گیا تھا
رہ گذر پر
روشنی میں
دور تک

غزل

ظفر اقبال

مات کی ابتدا غنیمت ہے
بلکہ یہ تو بسا غنیمت ہے

فیصلہ تو دیا عدالت نے
جرم دل کی سزا غنیمت ہے

سانس تو چل رہی ہے اس کے طفیل
یہ ہوس، یہ ہوا غنیمت ہے

حسرت اس کی بھی ہے جو ہو نہ سکا
اور جو ہو گیا غنیمت ہے

جو بھی کچھ ہے، اسے کبھی کم نہ سمجھ
یہ بہت ہے، بڑا غنیمت ہے

سرمۂ چشم دل ہے خاکِ وطن
یہ فلک یہ فضا غنیمت ہے

میں نے جو بھی کہا، بہت نہ سہی
اس نے جو سن لیا، غنیمت ہے

اب تو کچھ بھی پتہ نہیں چلتا
کیا ہیں، اور، کیا غنیمت ہے

کہیں بنتی ہے مارگوشش ظفر
اور کہیں یہ صدا غنیمت ہے

غزل

ظفر اقبال

اب تو یہ انتظام رکھا ہے
کام سے اپنے کام رکھنا ہے

نشہ ان خواب خواب آنکھوں کا
اپنے اوپر حرام رکھنا ہے

وہ بھی ہیں رکھ رکھاؤ کے قائل
ہم کو بھی احترام رکھنا ہے

مستقل ہے یہ یادوں کا چکر
اب سفر میں قیام رکھنا ہے

اس کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے
طبع کو ہم نے خام رکھنا ہے

اس کا مقصد اسیر کرنا نہیں
اک ذرا زیر دام رکھنا ہے

یہی میرا مقام ہے جو مجھے
اس نے یوں بے مقام رکھنا ہے

اس نے پیدا کیا سوال ظفر
میں نے اب اس کا نام رکھنا ہے

غزل

شہزاد احمد

تمھارے بعد ان پھولوں کو کھلنا کیوں نہیں آیا
وہی دھرتی، وہی سورج، سویرا کیوں نہیں آیا

وہی برسات کا موسم، وہی چھائے ہوئے بادل
وہی رت لوٹ آئی ہے، وہ لمحہ کیوں نہیں آیا

ملاقاتیں ہوئیں، باتیں ہوئیں، گھل مل گئے دونوں
مگر دل میں اتر جانے کا موقع کیوں نہیں آیا

سفر جتنا بھی تھا، دریا کے الٹے رخ کیا ہم نے
ہمیں موج بلا کے ساتھ چلنا کیوں نہیں آیا

فلک پر چاند بھی، سورج بھی، سیارے بھی آئے ہیں
میں جس کا منتظر تھا وہ ستارہ کیوں نہیں آیا

حصار وقت کے توڑے ہیں دیوار و در ہم نے
ہمیں اس خول سے باہر نکلنا کیوں نہیں آیا

مرے دل میں سفر کرنے کی خواہش کیوں نہیں جاگی
مری جاں تری خوشبو کا جھونکا کیوں نہیں آیا

افق پر شام کی سرخی ہزاروں بار پھیلی ہے
مگر بھولے ہوئے کو گھر کا رستہ کیوں نہیں آیا

کئی بھولے ہوئے قصے کئی بسری ہوئی باتیں
بہت کچھ ساتھ لے آیا وہ تنہا کیوں نہیں آیا

غزل

شہزاد احمد

پل میں جگ، پر جگ بیتا، جب نکلی بات سے بات
وصل کی شب اور ایسی لمبی، جیسے ہجر کی رات

دیکھے نہیں جاتے تھے مجھ سے مانگنے والے ہاتھ
اب کے برس تو آنکھیں ہی میں نے کر دیں خیرات

دستک دیتے جاؤ لیکن سننے والا کون؟
کہنے کو تو اس بستی کے دروازے ہیں سات

میرے سمیت زمیں پر کوئی چاروں اور نہیں
خاموشی ہے، تنہائی ہے اور خدا کی ذات

کبھی کبھی فرزانے پن کو اچھا لگتا ہے
جان بوجھ کر سر ٹکرانا دیواروں کے ساتھ

ممکن ہے میں ڈوب ہی جاؤں دن دریا چڑھنے تک
قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے میرے دل میں رات

جتنے بند تھے، اک اک کر کے سارے ٹوٹ بہے
اب کے ایسا برسا پانی ڈوب چلی برسات

تو ہے اڑتے پل جیسا، تیز آندھی تیری باندی
میں ذرہ تری راہ کا پیارے میری کیا اوقات

گھر سے تو میں سب دیواریں ڈھانے نکلا تھا
اب آرام سے بیٹھ گیا ہوں توڑ کے دونوں ہات

یہ بھی درست کہ اس کو بھلانا بس کی بات نہیں
لیکن یاد کریں گے اس کی کون کون سی بات

سب کا دکھ سہنے والا دل تو نے دان کیا
ہر شے چھونے والی آنکھیں دیکھنے والے ہات

جعفر شیرازی

جب آنکھوں میں طوفان بکھرنے کو
نکلا دریا میں چاند اترنے کو

آئے دل اب صحرا کو ہی اپنا لیں
گلشن میں تو جگہ نہیں تل دھرنے کو

چاند، ستارے سارے میں نے جمع کئے
جی چاہا تھا اس کی باتیں کرنے کو

ریزہ ریزہ میں تو ایسا بکھر گیا
دیکھ لیا تھا ان زلفوں کے سنورنے کو

آؤ جعفر دل کو لہو لہان کریں
کب تک دیکھیں ہم زخموں کے بھرنے کو

دل کو خوشبو روح کو رنگیں زمانے دیجئے
پھول ہوں کچھ دن مجھے بھی مسکرانے دیجئے

ہو ذرا لوگوں کو بھی میری مسرت کا گماں
روشنی کچھ تو مری آنکھوں میں آنے دیجئے

زیست نے کن کن حسیں وقتوں کو اس میں چن دیا
آندھیوں کو وحشت کی دیوار ڈھانے دیجئے

اس قدر بے اعتنائی، اس قدر ہم سے گریز
کھول سو جاتی ہے انسانوں سے جانے دیجئے

کیا کرو گے اس طلسم خامشی کو توڑ کر
پیار کا سودا مرے سر میں سمانے دیجئے

ہیں لکھی آنکھوں میں جعفر رات کی بیداریاں
خواب اگر دن کو نظر آتے ہیں آنے دیجئے

تری وفا کے کبھی خود کو سبز باغ دکھاؤں
کبھی تو مل کہ تجھے اپنے دل کے داغ دکھاؤں

کروں میں اس سے کسی اور رت کی بات تو کیا
جو آفتاب ہے اس کو میں کیا چراغ دکھاؤں

تو میرے ساتھ ذرا کوچۂ حبیب میں چل
غم زمانہ تجھے گوشۂ فراغ دکھاؤں

یہاں تو میری طرح جام ہیں تہی سب کے
میں ایسی بزم میں خالی کسے ایاغ دکھاؤں

کسی کے عشق نے جادو عجب کیا جعفر
کہیں ملے تو اسے میں دل و دماغ دکھاؤں

سیر سے سیالکوٹ

(زیر تصنیف سوانح حیات "روداد اقبال" کا ایک غیر مطبوعہ باب)

جگن ناتھ آزاد

اس بات کا صحیح طور پر تعین کرنا دشوار ہے کہ علامہ اقبال کے خاندان نے کشمیر سے کب ہجرت کی لیکن تحقیق سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ غالباً اٹھارہویں صدی کے آخر میں شیخ جمال الدین نے جو اقبال کے پردادا تھے بیوی بچوں سمیت کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ کو اپنا مسکن بنایا ہو گا۔

اس ضمن میں عبدالمجید سالک لکھتے ہیں: "۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے ختم ہونے کے بعد بابا صالح[1] اولاد کشمیر کے حکمرانوں کی سخت گیری کے باعث دوسرے بے شمار کشمیری خاندانوں کی طرح ہجرت کر کے سیالکوٹ میں مقیم ہوئی۔ معتبر حضرات کا بیان ہے کہ پہلے پہل علامہ اقبال کے دادا نے یہاں سکونت اختیار کی۔ ان کا نام شیخ محمد رفیق تھا۔"[2]

نقیر سید محمد وحید الدین کا کہنا ہے کہ "اٹھارہویں صدی کے آخر میں یا انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں یہ ہجرت ہوئی ہو گی اور ہجرت کرنے والے بزرگ یا تو علامہ کے دادا کے باپ شیخ جمال الدین تھے یا ان کے چار بیٹے جن کے نام شیخ عبدالرحمٰن، شیخ محمد رمضان، شیخ محمد رفیق، اور شیخ محمد عبداللہ تھے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ شیخ جمال الدین نے اپنے چاروں بیٹوں کو ساتھ لے کر ترک وطن کیا ہو۔ بہرحال یہ تو ثابت ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں یہ چاروں بھائی سیالکوٹ میں سکونت پذیر تھے۔ ان میں سے اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق اور ان کے دو بھائی شیخ عبدالرحمٰن اور شیخ محمد رمضان تو سیالکوٹ میں رہتے تھے اور تیسرے بھائی شیخ عبداللہ موضع جیٹھی کے میں۔ ان چاروں بھائیوں کی اولاد آج تک شہر سیالکوٹ اور موضع جیٹھی کے میں آباد ہے۔"[1] ابھی اس تحریر سے قبل فقیر سید وحید الدین مولانا عبدالمجید سالک کے موجودہ بیان پر ان الفاظ میں تبصرہ بھی کر چکے تھے۔ "کتاب مذکور[2] میں لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ہنگامہ جب فرو ہو گیا تو اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کے بزرگ کشمیر کے حکمرانوں کی سخت گیری کے باعث دوسرے بہت سے کشمیری خاندانوں کی طرح ہجرت کر کے سیالکوٹ پہنچے —— ترک وطن کی وجہ ممکن ہے یہی ہو لیکن یہ درست نہیں ہے کہ اس خاندان نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے فرو ہونے پر کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں اقامت اختیار کی۔ سالک صاحب کے مذکورہ بیان پر مر

---

[1] یہ روایت کہ علامہ اقبال کے جد امجد کا نام بابا صالح تھا اب غلط قرار دی جا چکی ہے۔ جیسا کہ گذشتہ باب میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ علامہ کے جد امجد کا نام لول حج یا لولی حاجی تھا اور انھوں نے پندرھویں صدی میں اسلام قبول کیا۔

[2] "ذکر اقبال" (مولانا عبدالمجید سالک) مطبوعہ بزم اقبال نرسنگ داس گارڈن کلب روڈ لاہور

---

[1] روزگار فقیر (جلد دوم) لائن آرٹ پریس فریئر روڈ کراچی (۱۹۶۴ء) صفحہ ۱۱۵، ۱۱۶

[2] ذکر اقبال (مولانا عبدالمجید سالک)

[3] روزگار فقیر جلد اول (نقش دوم) صفحہ ۲۳۹۔

مزید تبصرہ کرتے ہوئے فقیر صاحب لکھتے ہیں ۔ "اس واقعے کی غلطی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے والد شیخ نور محمد سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے اور یہ پیدائش ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کی تھی۔ شیخ نور محمد کی پیدائش سے قبل ان کے والدین کے یہاں دس لڑکے یکے بعد دیگرے پیدا ہو کر فوت ہو گئے۔ شیخ نور محمد اپنے گھر کے لوگوں سے ذکر کیا کرتے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے وقت میں گبرو جوان تھا۔ ۱۸۵۹ء میں ان کے یہاں بڑے لڑکے شیخ عطا محمد پیدا ہوئے۔ شیخ نور محمد کا انتقال ۱۹۳۰ء میں ۱۷ اگست کو ہوا۔ شیخ عطا محمد نے جو یادداشت تحریر کی، اس میں اپنے والد شیخ نور محمد کی عمر جو ڈاکٹر اقبال کے بھی والد ہیں ۹۳ سال بتائی ہے۔ اس اعتبار سے ان کا سن پیدائش ۱۸۳۷ء ہونا چاہیے۔ اس تفصیل کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے آباو اجداد ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کشمیر کو خیرباد کہہ کر سیالکوٹ میں قیام گزیں ہو چکے تھے[1]

سالک صاحب کے بیان کی تردید ان کے فرزند ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے ان الفاظ میں کی ہے" اور چونکہ ترک وطن اٹھارویں صدی کے اواخر یا انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ہوا۔ اس لیے بعض سوانح نگاروں کا یہ اندازہ نادرست ہے کہ اس خاندان کے افراد نے ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد ترک وطن کیا۔"[2]

اس مسئلے پر قطعی طور سے سید نذیر نیازی بھی روشنی نہیں ڈال سکے، چنانچہ وہ خاندان اقبال کے ترک وطن کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: "شیخ نور محمد کے آباو اجداد نے ترک وطن کیا، کشمیر سے پنجاب آئے، معلوم نہیں کب۔ قیاساً محمد اقبال کی پیدائش سے سوا ڈیڑھ سو برس پہلے۔ یہ شاید ان کے دادا شیخ جمال الدین تھے جنھوں نے اول اول سیالکوٹ میں سکونت اختیار کی۔ نادر اور

---

[1] روزگار فقیر جلد اول (نقش ثانی) ۱۹۶۳ء

[2] سرگزشت اقبال (ڈاکٹر عبدالسلام خورشید) اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۷۷ء

[3] ہمیں معلوم نہیں یہ طباعت کی غلطی ہے یا یہ غلطی سید نذیر نیازی سے سرزد ہوئی ہے کیونکہ اقبال کے دادا کا نام شیخ جمال الدین نہیں تھا بلکہ شیخ محمد رفیق تھا۔ غالباً سید نذیر نیازی نے "پردادا" لکھا ہوگا اور طباعت کی غلطی سے یہ لفظ "دادا" بن گیا۔

ابدالیوں کی ترک تازیوں کے بعد جب سکھ گردی کا دور آیا، کشمیر کا رشتہ دولتِ مغلیہ سے کٹ گیا۔ کشمیر افغانوں کے قبضے میں آ گیا۔ افغانوں نے سکھوں سے ہزیمت اٹھائی تو لوٹ کھسوٹ اور بدنظمی کے اس دور میں کشمیری مسلمانوں کے لیے امن و عافیت کے ساتھ کسب معاش کی راہیں بھی مسدود ہو گئیں۔ اس پرآشوب زمانے میں اکثر و بیشتر خاندانوں نے پنجاب کا رخ کیا۔[1]

ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی اس معاملے میں قرائن ہی پر نظر رکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "انسان کے لیے ترک وطن کرنا بھی آسان نہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کے بزرگوں نے کشمیر سے کیوں ہجرت کی۔ اس کا کوئی واضح جواب ہمارے پاس موجود نہیں۔ بقول فوق جب اقبال کے بزرگ کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آئے تو کشمیر افغانوں کے ماتحت تھا۔ اگر یہ ہجرت اٹھارویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ہوئی تو تب کشمیر میں افغانوں کا زوال آ رہا تھا اور سکھ اس پر قابض ہو رہے تھے۔ فوق لکھتے ہیں کہ کشمیر سے ہجرت کرتے وقت بزرگانِ اقبال کی سکونت تحصیل کولگام کے علاقے میں تھی۔ ہمیں معلوم نہیں کہ فوق نے یہ اطلاع کہاں سے حاصل کی۔[2]

---

[1] دانائے راز (سید نذیر نیازی) اقبال اکادمی، لاہور ۱۹۷۹ء صفحہ ۴۔

[2] یہی اس تحریر کے حاشیے میں ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں: "دیکھیے "نقوش" لاہور، آپ بیتی نمبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۲) اقبال کا بیان ہے کہ ان کے آباو اجداد برہمن تھے انھوں نے اپنی عمریں اس سوچ میں گزار دیں کہ خدا کیا ہے اور میں اس سوچ میں گرفتار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے اور یہ کہ کشمیر میں ان کے خاندان کی رہائش موضع چکو پرگنہ آدون (تحصیل کولگام) میں تھی۔ موضع چکو پرگنہ آدون کا ذکر تو بابا لول حج کے وطن کے سلسلے میں آتا ہے اور بابا لول حج کا قیام پندرھویں صدی میں کیا گیا ہے۔ کیا بابا لول حج کی اولاد کئی صدیوں تک یہیں آباد رہی اور اقبال کے آباو اجداد تحصیل کولگام سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آئے؟ یہ ممکن تو ہے یہ بھی ممکن ہے کہ فوق کی اس اطلاع کا ذریعہ اقبال کے والد یا اقبال خود ہوں۔"

ڈاکٹر جاوید اقبال کے اس سوال کے متعلق کہ کیا بابا لول حج کی اولاد کئی صدیوں تک یہیں آباد رہی۔ غلام نبی ناظر نے "شیرازہ" سری نگر (اپریل، مئی ۱۹۸۲ء شمارہ ۴۵) میں مفصل بحث کی ہے (اگرچہ اپنا سیر حاصل مقالہ لکھتے وقت ان کے سامنے ڈاکٹر جاوید اقبال کا مذکورہ سوال نہیں تھا) اس مقالے کے طویل اقتباسات جن میں ڈاکٹر اقبال کے سوال کا جواب موجود ہے، زیر نظر کتاب کے پہلے باب "متدان خاندان اور آبائی گاؤں" میں پیش کر دیے گئے ہیں۔

البتہ ان کا یہ قیاس درست ہو سکتا ہے کہ وہ ماہیال سے گذر کر جموں کے راستے سیال کوٹ آئے۔"[1]

سیال کوٹ

بکرماجیت سے رنجیت سنگھ تک

سیال کوٹ جموں اور پاکستانی پنجاب کی سرحد پر ایک قدیم اور بارونق شہر ہے جس میں یکتائے روزگار علمی اور ادبی شخصیتوں نے جنم لیا ہے۔ جدید دور کے مامور اردو شاعر فیض احمد فیض اور ہندوستان کے مشہور صحافی کلدیپ نیر اسی سیال کوٹ کی سرزمین سے آئے ہیں۔ جہاں تک قدیم ہند و تاریخ کا تعلق ہے راجہ شالباہن اور ان کے بیٹے پورن بھگت کا شہر بھی یہی سیال کوٹ ہے۔ سیال کوٹ سے چار میل شمال میں موضع کرول کا تاریخی کنڈال آج بھی پورن بھگت کی یادگار کے طور پر موجود ہے۔

سیال کوٹ ایک بہت ہی قدیم شہر ہے۔ مختلف اوقات میں اس کے مختلف نام رہے ہیں مثلاً شلکوٹ، سلکوٹ، سال کوٹ۔ ایک زمانے میں سکل کوٹ اور اس سے قبل سادھی نگری بھی کہتے تھے۔ راجہ شالباہن کا بسایا ہوا یہ پانچ ہزار سال پرانا شہر کبھی پنجاب کا دارالحکومت بھی رہ چکا ہے۔ گردش ایام کے ساتھ ساتھ یہ شہر بستا اور اجڑتا رہا۔ لاہور کے اجڑنے کے بعد مہاراجہ بکرماجیت کے زمانے میں یہ پنجاب کا دارالحکومت رہا۔ مہاراجہ بکرماجیت نے رائے اندر سنگھ کو جو پنجاب ہی کا رہنے والا تھا لاہور میں اپنی حکومت کا گورنر مقرر کیا۔ مہاراجہ بکرماجیت کے انتقال کے بعد بھی رائے اندر سنگھ اور اس کا بیٹا راج کنور لاہور کی حکومت کو کامیابی کے ساتھ چلاتے رہے۔

کچھ مدت بعد راجہ سالباہن جنوبی علاقوں پر قبضہ کرتا ہوا پنجاب پہنچا اور ادھر ملتان فتح کرنے کے بعد اس نے لاہور میں تاخت و تاراج کا بازار گرم کیا۔ اس نے لاہور میں اندر سنگھ کے بیٹے راج کنور کو

---

[1] رود کوثر (جلد اول) صفحہ ۱۲۔

امور سلطنت سے بے دخل کر دیا اور سیال کوٹ کو اپنا مستقر بنایا۔ سیال کوٹ کو اپنی راجدھانی بنانے کے بعد اس شہر میں اس نے متعدد نئی عمارتیں بنوائیں۔ گنیش داس اپنی فارسی تاریخ "چار باغ پنجاب" میں لکھتے ہیں کہ سالباہن کے بنوائے ہوئے ٹھاکر دوارے کی ایک کوٹھری ابھی تک سیال کوٹ میں موجود ہے۔

مرور ایام کے ساتھ سرہند کے راجوں نے پنجاب پر قبضہ کر کے سیال کوٹ کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ سرہند کے حاکم راجہ جس پال نے اپنے بھائی رائے سہن پال کو جس نے سالباہن دوم کا لقب اختیار کر لیا تھا سیال کوٹ کا گورنر مقرر کیا۔ اس نے شہر کے متصل اینٹوں اور پتھروں کا ایک نیا قلعہ بنا کر شہر کی عظمت میں اضافہ کیا لیکن اسی زمانے میں[1] "کفار کے خلاف جہاد کرنے کے لئے" امام[2] علی الحق فوج لے کر عرب سے سیال کوٹ پہنچا جہاں سالباہن کی فوجوں کے ساتھ اس کی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں امام علی الحق نے شکست کھائی اور اپنے متعدد سپاہیوں کے ساتھ مارا گیا۔[3] اس کے فوراً بعد ناصر الدین سبکتگین نے غزنی سے چل کر ۳۸۱ھ میں سیال کوٹ پر چڑھائی کی۔ "چار باغ پنجاب" کا مصنف لکھتا ہے کہ امام علی الحق کی موت کا بدلہ لینے کے لئے اس نے سیال کوٹ کے تمام شہریوں کو تہ تیغ کر دیا۔ شہر سیال کوٹ کو لوٹ لیا اور قلعے کی مضبوط دیواروں کو مسمار کر دیا۔

سلطان شہاب الدین غوری نے خسرو شاہ کو شکست دینے کے لئے لاہور کا محاصرہ کیا لیکن شہر پر قبضہ نہ کر سکا۔ اپنی پوزیشن کو مستحکم بنانے کے لئے اس نے ۵۸۰ھ میں سیال کوٹ کے تباہ شدہ شہر کو دوبارہ تعمیر کرایا اور

---

[1] بعض تاریخ دانوں کے نزدیک ۳۵۵ھ اور بعض کے نزدیک ۶۲۰ھ۔

[2] چار باغ پنجاب (گنیش داس)

[3] ڈاکٹر جاوید اقبال نے محمد دین فوق کے حوالے سے لکھا ہے کہ بالآخر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور قلعہ سر ہو گیا لیکن "چار باغ پنجاب" میں گنیش داس نے وہی عبارت لکھی ہے جس کا ترجمہ راقم الحروف نے اوپر درج کیا ہے گویا بقول فوق سید امام علی الحق نے سیال کوٹ کی ہندو حکومت کا خاتمہ کیا اور بقول گنیش داس یہ کام ناصر الدین سبکتگین نے انجام دیا

اسے اپنا فوجی مرکز بنایا لیکن شہر کی آبادی میں اضافہ نہ ہو سکا۔ دوسرے سال
اس نے محکم ارادے کے ساتھ پھر لاہور پر حملہ کر کے اُسے فتح کر لیا اور اُسے
جموں کے راجہ کے حوالے کر دیا۔ راجگان جموں کے دور میں سیال کوٹ کی آبادی
میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ سلطان بہلول لودھی کے زمانے میں جموں کے حاکم
راجہ بیرم دیو کی کوششوں سے جسرتھ کھوکھر کو قتل کرنے کے لئے سیال کوٹ
انعام کے طور پر جاگیر میں ملا تھا۔ سیال کوٹ کی آبادی میں مزید اضافہ ہوا۔
جب اکبر کی طرف سے راجہ مان سنگھ جموں کے سارے پہاڑی علاقے کا ناظم اور
سیال کوٹ کا جاگیردار مقرر ہو کر آیا، اس نے قلعے کی دوبارہ تعمیر کرائی اور
شہر کو کافی وسعت دی۔ جہانگیر کے زمانے میں منصب دار [illegible] نے بھی شہر کو
وسعت دینے اور اس کی آبادی کو بڑھانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔

احمد شاہ ابدالی کے زمانے میں اُس وقت حالات نے پلٹا کھایا جب
سکھوں نے بغاوت کی اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس وقت اس کی
بڑی بڑی عالی شان عمارتیں خاک کا ڈھیر بن کر رہ گئیں۔ لوگ ادھر ادھر
بھاگ نکلے اور مکان مکینوں کو ترستے رہ گئے۔

کچھ مدت بعد سردار جیون سنگھ، صاحب سنگھ، نتھا سنگھ شہید اور
مہر سنگھ (اٹاری والے) نے مل کر سیال کوٹ پر قبضہ کر لیا اور اسے چار حصوں
میں تقسیم کر کے اس پر حکومت کرنے لگے۔ اس دور میں بھاگے ہوئے لوگ
پھر اپنے گھروں کو واپس آ گئے۔

سمت ۱۸۶۵ ([illegible]) میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سیال کوٹ
پر حملہ کیا اور اسے [illegible] یہ شہر [illegible] چار حاکموں
کے ہاتھ سے نکل کر رنجیت سنگھ کے ہاتھوں میں آ گیا۔ رنجیت سنگھ کے دور میں
اس شہر کی کھوئی ہوئی شوکت پھر واپس آنا شروع ہوئی۔ [illegible]
[illegible] حاکم [illegible] اور [illegible] نتھا سنگھ نے [illegible] لگا کر شہر کے حسن
[illegible] دیوان [illegible] رائے [illegible]
ایک خوبصورت شوالہ تعمیر کرایا۔ راجہ تیج سنگھ نے [illegible] کے لئے [illegible]
کا [illegible] بنوایا۔

[illegible] مہاراجہ رنجیت سنگھ کے [illegible] حکومت [illegible]

سکھ حکمرانوں کے زمانے میں سیال کوٹ کشمیر کے مقابلے میں ایک گہوارۂ
امن تھا اور اسی دور میں علامہ اقبال کے پردادا شیخ جمال الدین یا
دادا شیخ محمد رفیق نے کشمیر سے ہجرت کر کے سیال کوٹ کو اپنا وطن بنا لیا۔

(۳)
شیخ نور محمد

شیخ جمال الدین کے فرزند شیخ محمد رفیق جو کشمیری رواج کے مطابق
رفیقا کے نام سے مشہور تھے، کشمیری دھسّوں کی تجارت کرتے تھے۔ محلہ کھٹیکاں
میں وہ مقیم تھے۔ ان کے تین صاحبزادے تھے ــــ شیخ نور محمد، شیخ غلام قادر
اور شیخ غلام محمد۔ اقبال جن کی داستان حیات ان اوراق میں سنائی جا رہی ہے
شیخ نور محمد کے فرزند تھے۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اقبال کے والد شیخ نور محمد کی ولادت
سے قبل ان کے دس بھائی یکے بعد دیگرے پیدا ہو کر فوت ہو گئے تھے۔ شیخ نور محمد
اپنے والدین کی گیارھویں اولاد تھے۔ ان کی پیدائش پر گھر کے لوگوں نے
منتیں مانیں، دعائیں کیں اور دعاؤں کے لئے پیروں فقیروں سے بھی
رجوع کیا۔ [illegible] کی یہ دعائیں سنی گئیں اور شیخ نور محمد نے بفضلِ
ایزدی ایک طویل زندگی بسر کی۔ انھوں نے ۹۳ برس کی عمر پائی اور اپنے بیٹے
کی عزت، شہرت، مقبولیت اور علمی و ادبی مرتبے کا عروج دیکھ کر اس دنیا سے
رخصت ہوئے۔ ان کا انتقال علامہ اقبال کے انتقال سے آٹھ برس قبل ۷ اگست
۱۹۳۰ء کو سیال کوٹ میں ہوا۔ ان کی وفات حسرت آیات پر اقبال نے مندرجہ ذیل
قطعہ کہہ کر دو تاریخیں نکالیں ؎

پدر و مرشد و اقبال ازیں عالم رفت	ما ہمہ راہرواں، منزل ما ملک ابد
ہاتف از حضرتِ حق خواست دو تاریخ رحیل	آمد آواز "اثرِ رحمت" و "آغوشِ لحد"[1]
	۱۳۴۹ھ ۱۳۴۹ھ

---

[1] اقبال کے والد اور مرشد اس عالم سے رخصت ہو گئے۔
ہم سب مسافر ہیں اور ہماری منزل ملکِ ابد ہے
ہاتف نے حضرتِ حق (خداوند کریم) سے رحلت کی دو تاریخیں مانگیں
(جواب میں) آواز آئی۔ اثرِ رحمت اور آغوشِ لحد

شیخ نور محمد کے انتقال پر اس قطعہ تاریخ کے علاوہ اقبال کی کوئی نظم نہیں ملتی لیکن بعض حضرات کا خیال ہے کہ "ضرب کلیم" میں "مرد بزرگ" کے عنوان سے جو اشعار شامل ہیں وہ اقبال نے غالباً اپنے والد محترم کے انتقال ہی پر کہے ہیں۔ وہ اشعار یہ ہیں : ؎

اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق
قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق
اس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیران طریق

شیخ نور محمد کے بعد بھی ان کے والدین کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا ذکر کرتے ہوئے سید فقیر وحید الدین لکھتے ہیں : "علامہ کے والد کی پیدائش کے بعد ان کے والدین کے یہاں ایک اور لڑکا بھی پیدا ہوا۔ ان کا نام غلام محمد تھا۔ وہ محکمہ نہر میں اوورسیر تھے اور روپڑ ضلع انبالہ میں متعین تھے۔ شیخ محمد رفیق اپنے بیٹے سے ملنے کے لئے روپڑ گئے ہوئے تھے کہ وہیں ہیضہ ہوا اور اسی مرض میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ روپڑ ہی میں وہ دفن ہوئے۔ شیخ غلام محمد نرینہ اولاد سے محروم تھے۔ وفات کے وقت ان کی دو لڑکیاں حیات تھیں، جن کی اولاد شہر سیالکوٹ میں آج تک آباد ہے۔"[3]

شیخ نور محمد زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن مذہبی علوم خصوصاً تصوف سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور اپنا زیادہ تر وقت عالموں اور فاضلوں کی صحبت میں بسر کرتے تھے۔ غور و فکر کرتے رہنا ان کی طبیعت ثانوی تھی

[3] روزگار فقیر جلد دوم نومبر ۱۹۶۳ء کراچی ایڈیشن صفحہ ۱۱۶، ۱۱۷

اور لوگ اکثر علمی مسائل کی تشریح کے لئے ان سے رجوع کرتے تھے۔ اس علمی اور فلسفیانہ شغف کی بنا پر وہ اپنے دوستوں میں "ان پڑھ فلسفی" کے طور پر مشہور تھے۔ فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں کہ شیخ نور محمد کو "ان پڑھ اور فلسفی کا خطاب شمس العلماء مولوی سید میر حسن نے دیا تھا۔

شیخ نور محمد نے طبیعت بھی موزوں پائی تھی۔ جب ان کی بیگم یعنی اقبال کی والدہ محترمہ بیگم امام بی بی کا انتقال ہوا تو انھوں نے ان کی وفات پر چند درد بھرے اشعار کہے تھے۔

مولانا عبدالمجید سالک سید ذکی شاہ خلف جناب مولانا میر حسن کی روایت سے بیان کرتے ہیں کہ "شیخ نور محمد نہایت وجیہ اور شکیل بزرگ تھے۔ رنگ سرخ، داڑھی سفید، لباس سادہ بہت کم گو تھے۔ چھڑی ہاتھ میں لے کر نکلتے تھے۔ نظر ہر وقت سامنے رکھتے تھے۔ ادھر ادھر نہ دیکھتے تھے۔ نہایت متین، ذی عقل، سنجیدہ مزاج بزرگ تھے اور قصبے میں خاص عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔"[1] فقیر سید وحید الدین ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "ڈاکٹر محمد اقبال کا جب بھی کوئی نیا مجموعہ کلام شائع ہوتا تھا تو سعادت مند بیٹے کی زبان سے پیام حق سن کر بارگاہِ خداوندی میں سجدۂ شکر بجالاتے اور جذب و معرفت کے مضامین خاص طور سے مثنوی اسرار خودی پڑھ کر بے چین ہو جاتے۔ یہاں تک کہ زار و قطار رونے لگتے۔ یہ آنسو تشکر کے آنسو بھی تھے اور محبت کے بھی۔ آخری عمر میں یہ کیفیت ان کی اور زیادہ شدید ہو گئی تھی۔"[2]

شیخ نور محمد کا مزاج روحانیت کی جانب مائل تھا۔ اس سلسلے میں ان کی زندگی کا ایک واقعہ جو زیر نظر کتاب کے صفحہ پر درج کیا گیا ہے ان کی اس مزاجی کیفیت پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔

عبدالمجید سالک "ذکر اقبال" میں لکھتے ہیں "سیالکوٹ میں ایک صاحب ڈپٹی وزیر علی بلگرامی مدتوں مقیم رہے۔ ان کے نام سے ایک محلہ بھی

[1] ذکر اقبال صفحہ ۸

[2] "روزگار فقیر" جلد اول نقش ثانی ۱۹۶۳ء لاہور ایڈیشن صفحہ ۱۹۵

موسوم ہوا۔ انھوں نے ایک باغ لگایا جو ڈپٹی کے باغ کے نام سے مشہور ہوا۔ رفاہ عام کے لئے ایک حوض بھی بنوایا۔ بسنت کے موقع پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ میلہ بھی ڈپٹی وزیر علی ہی نے جاری کیا تھا۔ شیخ نور محمد کو سب سے پہلے انہی ڈپٹی صاحب نے اپنے یہاں پارچہ دوزی پر ملازم رکھا تھا۔ اور سنگر سینے کی مشین منگوا کر دی تھی جو اس زمانے میں نادر چیز تھی۔ معتبر حضرات کا بیان ہے کہ شیخ نور محمد کی اہلیہ (والدۂ علامہ) ان کی تنخواہ میں سے ایک حبہ نہیں لیتی تھیں کیوں کہ ان کے نزدیک ڈپٹی وزیر علی کی آمدنی کا غالب حصہ شرعاً جائز نہ تھا۔ چنانچہ تھوڑی مدت کے بعد شیخ نور محمد نے ملازمت ترک کر دی اور برقعوں کی ٹوپیاں سینے لگے۔ یہ ٹوپیاں اتنی خوشنما اور مضبوط ہوتی تھیں کہ قلیل مدت کے اندر بے حد مقبول عام ہو گئیں۔ یہاں تک کہ شیخ صاحب کو متعدد خیاط ملازم رکھنے پڑے۔ شیخ صاحب کے ضعیف ہو جانے پر یہ دوکان اُن کے داماد غلام محمد نے سنبھالی لیکن کچھ مدت بعد وہ بھی الگ ہو گئے اور دوکان بند ہو گئی۔“ [1]

مدت ہوئی محترمہ قرۃ العین حیدر نے ایک ملاقات کے دوران مجھے بتایا تھا کہ علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد ان کے پرنانا میر مظہر علی کے یہاں ملازم تھے۔ میں نے ”ذکر اقبال“ کا مذکورہ بالا حوالہ دیتے ہوئے انھیں بتایا کہ سالک صاحب نے اس ضمن میں میر مظہر علی نہیں بلکہ سید وزیر علی بلگرامی لکھا ہے۔ قرۃ العین نے مجھ سے سالک صاحب کا اقتباس بھیجنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ میں نے ”ذکر اقبال“ سے مذکورہ بالا اقتباس نقل کر کے انھیں بھیج دیا جس کے جواب میں انھوں نے مجھے لکھا

ممبئی ۲۸ جون ۱۹۸۶ء

محترمی و مکرمی تسلیم!

مولانا سالک کا اقتباس اور اقبال سے متعلق مٹیریل مل گیا۔ بہت بہت دلی شکریہ۔ سالک نے میرے خیال میں نام میں غلطی کی ہے یا ممکن ہے کوئی ڈپٹی وزیر علی بلگرامی بھی سیالکوٹ میں رہے ہوں جنھوں نے سب سے پہلے شیخ نور محمد کو ملازم رکھا۔ والدۂ مرحومہ اور حسنین ماموں مرحوم وغیرہ ہمیشہ بتلاتے تھے کہ ان کے دادا میر مظہر علی (جو سیالکوٹ میں EA (?) تھے) کے ہاں پانچ روپے ماہوار پر (جو ان دنوں بہت خاصی رقم تھی) کپڑے سینے پر ملازم تھے۔ میر مظہر علی نے سیالکوٹ میں باغ بھی لگوایا تھا۔ ان کا انتقال جب ہوا اماں تین یا چار برس کی تھیں۔ انھوں نے اماں کے لئے لاڈ میں برقعہ سلوایا تھا۔ جو خلیفہ تھو نے سیا تھا۔ اماں کے والد خان بہادر نذر الباقر نے سب سے پہلے سیالکوٹ چھاؤنی میں سپلائی ایجنٹ کا کام شروع کیا اور MESS میں شراب بھی فراہم کرتے تھے۔ اس طرح آمدنی قطعاً ناجائز تھی۔ میں نے یہ ساری باتیں کتاب میں اس لئے نہیں لکھیں کہ گھٹیا پن سا معلوم ہوتا ہے۔ صرف یہ لکھا ہے کہ یہ مظہر علی شیخ نور محمد کے دوست تھے۔ بہرحال ان میں میر مظہر علی کے پوتے ONLY SURVIVINS GRANDSON سید ظہور العسکری کو بڑی خط لکھ رہی ہوں کہ مزید بتلائیں جو انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہو۔ ممکن ہے ڈپٹی وزیر علی بلگرامی کا نام بھی سنا ہو۔ ویسے یہ میر مظہر علی ماؤلی (یعنی ماون گاؤں والے) پنجاب میں کہلاتے تھے۔ ان کے والد خان بہادر میر قائم علی سی۔ آئی۔ ای نے ۱۸۷۵ء میں پنجاب کے REVENUE LAWS بنائے تھے جن کی مدد سے زمیندار کی زمین غیر زمیندار یعنی مہاجن گروی رکھ کر کسان کے قرضہ ادا نہ کر سکنے کی صورت میں ضبط نہیں کر سکتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ پنجاب کے کسانوں میں بہت مقبول ہوئے اور گوردا سپور میں ان کی وفات کے بعد ان کے مزار پر باقاعدہ عرس ہونے لگا۔ جس میں ہندو اور سکھ کسان بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ عرس ۱۹۴۷ء تک ہوتا رہا تھا۔ میر قائم علی لکھنؤ سے ۱۸۵۷ء میں تسخیر پنجاب کے بعد یوپی کے دوسرے افسروں

---

[1] ”ذکر اقبال“ صفحہ ۸، ۹

کے ساتھ بھجے گئے تھے۔ اور سب سے پہلے بڑی (کدا) دو آبہ کیسال گورداس پور کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے تھے۔ میر مظہر علی ان کے بیٹے (اور والدۂ مرحومہ کے دادا) تھے۔ وہ سیالکوٹ میں پہلے تحصیلدار اور بعد میں E. A. C رہے۔ بدوران ضلع ملتان میں انتقال ہوا۔ ان کی قبر پر بھی عرس ہوتا ہے۔ اماں نے ۱۹۲۰ء میں پردہ ترک کر دیا۔ اس وجہ سے علامہ اقبال ان سے بہت خفا تھے۔ اس سے قبل بڑی خصوصیت سے ملتے تھے۔ ابا اور اماں جان کے نام ان کے بہت سے خطوط ۱۹۳۲ء تک ہمارے ہاں محفوظ رہے۔ ابا جان کے ہندوستان ٹرانسفر ہونے کے بعد وہ کہیں ضائع ہو گئے۔

آپ نے جو کاغذات بھیجے ہیں، تصاویر اقبال کی فہرست سے، ان میں علی گڑھ ۱۹۲۹ء کی تصویر کے لئے خواجہ سجاد حسین لکھا ہے۔ خواجہ سجاد حسین خواجہ غلام السیدین کے غالباً چچا تھے۔ بہت ممکن ہے ان کی تصویر ہو۔ مگر یہ صرف بڑی تصویر دیکھنے پر معلوم ہو سکتا ہے اس لئے عنایت ہوگی اگر وہ تصویر کسی طرح دلی سے مجھے جولائی کے تیسرے ہفتے تک بھی بھجوا دیں۔ جو تصویر "نیرنگ ادارہ" میں چھپی ہے اس سے صاف ابا جان معلوم ہوتے ہیں جو ۱۹۲۶ء تک مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے ؎

آپ کی عنایت کا بہت بہت شکریہ۔ میرا بڑا کام ہو جائے گا۔ آدھی کتاب پریس میں جا چکی ہے۔ باقی کی کتابت ہو رہی ہے ۵؎

امید ہے آپ بخیر ہوں گے

خاکسار

عینی

مجھے اب یاد نہیں میں نے خط کے متعلقہ حصے کا کیا جواب دیا۔ جواب یعنی خط کی رسید شکریے کے ساتھ دی ہو گی یا ممکن ہے اسی موضوع پر کچھ اور بھی لکھا ہو۔

لیکن اس وقت محترمہ قرۃ العین کا ۲۴ فروری ۱۹۸۶ء کا خط میرے سامنے ہے جس کے ایک حصے میں تو وہی باتیں درج ہیں جو اوپر کے خط میں آ گئی ہیں۔ صرف مندرجہ ذیل حصہ نیا ہے۔

"میں اس سلسلے میں خواہ مخواہ کی CONTROVERSI ہرگز نہیں شروع کروانا چاہتی جو کافی DISTART FUL ہو سکتی ہے۔ میر مظہر علی اور شیخ نور محمد کے متعلق میں نے "کارِ جہاں دراز ہے" میں پورا ایک باب لکھا ہے۔"

میری ناقص رائے میں یہ ایک خالص علمی بحث ہے اور اس کے بارے میں تحقیق ضروری ہے۔ محترمہ قرۃ العین حیدر کا یہ اندیشہ کہ اس سے CONTROVERSY شروع ہو گی جو کافی DISTART FUL ہو سکتی ہے غالباً بے بنیاد ہے۔ انھوں نے مطالعۂ اقبالیات کے ایک اہم پہلو پر ایک بالکل ہی نئی بات ہم لوگوں کے سامنے رکھی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ اس تمام خط و کتابت کے باوجود صحیح صورت حال راقم التحریر کے سامنے نہیں آ سکی، کیونکہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ قرۃ العین حیدر کے بیان کا اصل راوی کون ہے۔ ان کے اس جملے سے "ان کا انتقال جب ہوا اماں تین یا چار برس کی تھیں"۔ قاری کا ذہن لامحالہ مذکورہ سوال کی جانب جاتا ہے۔ اب جب کہ قرۃ العین حیدر کے گرامی نامے میں روایت کا سلسلہ ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے تو گویا اس بات کی تحقیق ابھی باقی رہ جاتی ہے کہ شیخ نور محمد میر مظہر علی کے یہاں پارچہ دوزی کا کام کرتے تھے یا ڈپٹی وزیر علی بلگرامی کے یہاں یا یکے بعد دیگرے دونوں کے یہاں انھوں نے کام کیا۔

اس ضمن میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایک بالکل ہی نئی بات لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں "اقبال کے بعض سوانح نگار ملازمت ترک کرنے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ امام بی بی شیخ نور محمد کی تنخواہ کو ہاتھ تک نہ لگاتی تھیں کیونکہ انھیں شبہہ تھا کہ ڈپٹی وزیر علی کے بعض ذرائع آمدنی شرعاً ناجائز تھے۔ لیکن یہ فرضی روایت میاں کہہ کے بیچارے ڈپٹی صاحب پر ناواجب الزام تراشی کی گئی ہے۔ ملازمت ترک کرنے کی وجہ جو شیخ نور محمد نے اعجاز احمد کی موجودگی میں ایک عزیزہ سے بیان کی اس روایت سے بالکل مختلف ہے۔ شیخ اعجاز احمد کے بیان کے مطابق

۵؎ خط کا یہ حصہ اقبال نمائش (مرتبہ راقم التحریر) سے متعلق ہے۔

رزق حلال پر گفتگو کے دوران شیخ نور محمد نے بتایا کہ ڈپٹی وزیر علی کے ہاں ملازمت کے کچھ عرصہ بعد انھیں ذاتی تجربہ سے احساس ہوا کہ ڈپٹی صاحب کے ہاں پارچہ دوزی کا کام تو برائے نام تھا یا اتنا نہیں تھا کہ ایک ہمہ وقت خیاط کی ضرورت ہو، البتہ حاضر باشی اور مصاحبت کا کام زیادہ تھا۔ ڈپٹی صاحب کو تصوف سے لگاؤ تھا اور اپنی فرصت کے اوقات میں وہ اکثر شیخ نور محمد سے اس موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ اس بنا پر شیخ نور محمد کے دل میں یہ خلش رہتی تھی کہ ڈپٹی صاحب سے جو تنخواہ پارچہ دوزی کے لئے انھیں ملتی ہے اس کا بیشتر حصہ رزق حلال نہیں۔ دو ایک مرتبہ ڈپٹی صاحب سے ملازمت ترک کرنے کی اجازت چاہی مگر وہ بات کو ٹال جاتے۔ ایک دن شیخ نور محمد کے اصرار پر انھوں نے کہا کہ آپ کو ہمارے یہاں کوئی تکلیف ہے جو ملازمت چھوڑنا چاہتے ہیں۔ اگر تکلیف بیان کر دیں تو اس کا ازالہ کر دیا جائے۔ بہ عالم مجبوری شیخ نور محمد نے اپنی قلبی خلش کا اظہار کیا جسے سن کر وہ بہت متاثر ہوئے اور ترک ملازمت کی اجازت دے دی۔ جب شیخ نور محمد رخصت ہونے لگے تو انھوں نے ملازم کو حکم دیا کہ سلائی کی مشین جو انھوں نے اپنے خرچ سے منگوائی تھی، شیخ نور محمد کے یہاں پہنچا دی جائے۔ مشین آخران کی ملکیت تھی۔ اس لئے شیخ نور محمد نے عذر کیا۔ وہ کہنے لگے۔ مجھے تو اب اس کی ضرورت نہیں اور آپ کے کام کی چیز ہے۔ مزید براں آپ ہمارا کام بھی تو کیا ہی کریں گے شیخ نور محمد نے اپنے عزیز کو یہ بات سنانے کے بعد کہا کہ اگرچہ ملازمت کا تعلق تو ڈپٹی صاحب سے ختم ہو گیا لیکن دوستانہ روابط ان کی وفات تک قائم رہے۔[1]

ڈاکٹر سید عبداللہ چغتائی نے مولانا سید میر حسن مرحوم کے فرزند سید دکی شاہ کے حوالے سے یہ لکھا ہے۔

”ڈاکٹر اقبال کے والد شیخ نور محمد پہلے دھسوں کی تجارت کرتے تھے، پھر برقعوں کی ٹوپیاں بنانے لگے۔ ٹوپیاں ایسی عمدہ بناتے تھے کہ خاصے مشہور ہو گئے تھے اور کئی آدمی ملازم رکھ کر دکان چلائی۔ ان کے درزی کپڑے بھی سیتے تھے۔ بیچ میں وزیر علی مال افسر کے یہاں ملازم بھی ہو گئے تھے۔ دکان اس وقت چھوڑی جب ڈاکٹر بہت مشہور ہو گئے اور انھوں نے مجبور کیا کہ اب کام چھوڑ دیں اور آرام کریں۔“[1]

شیخ نور محمد کو گھر کے تمام لوگ میاں جی کہتے تھے۔ فقیر سید وحید الدین شیخ اعجاز احمد کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ میاں جی بلند قامت ہونے کے ساتھ وجیہ صورت بھی تھے۔ بڑھاپے میں بھی ان کا رنگ کندنی تھا۔ سفید ریش نے چہرے کو اور بھی نورانی بنا دیا تھا۔ میاں جی نے مرنجاں مرنج طبیعت اور صلح کل مزاج پایا تھا۔ ساتھ ہی عالی ظرف اور بردبار بھی تھے۔ ان کی زندگی میں کتنے ہی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ اپنے مخالفوں اور ناحق ایذا پہنچانے والوں کو انھوں نے معاف کر دیا اور انتقام نہیں لیا۔ وہ بڑے اصول پسند اور طبیعت کے نیک اور سادہ تھے۔

”علامہ کے والد میاں جی۔ نے کسی مکتب میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ بچپن میں وہ حرف شناس رہے ہوں گے، مگر ان کی وہبی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ اردو اور فارسی کی چھپی ہوئی کتابیں پڑھ سکتے تھے۔ علامہ اقبال کی جو تصانیف میاں جی کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں، وہ اکثر ان کے زیر مطالعہ رہتیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا کہ تنہائی میں کلام اقبال اونچی آواز میں پڑھ رہے ہیں اور روتے جاتے ہیں۔

”میاں جی شاعر تو نہ تھے مگر طبیعت موزوں پائی تھی۔ علامہ اقبال کی والدہ۔ یعنی بے جی ۔ کی وفات کا انھیں بہت صدمہ ہوا۔ ایک دن شیخ اعجاز احمد سے کاغذ اور قلم دوات لانے کے لئے کہا۔ وہ سمجھے کہ شاید علامہ کو خط لکھوائیں گے۔ فرمایا جو کچھ میں بولتا جاؤں اسے لکھتے جاؤ اور پھر میرے لکھے ہوئے کاغذ کو اپنے چچا کے پاس بھیج دو۔ میاں جی سوچ سوچ کر شعر لکھواتے جاتے تھے۔ غالباً دو نشستوں میں انھوں نے دس بارہ شعر قلم بند کرائے۔ ان اشعار کا کوئی مصرع بھی وزن سے خارج نہ تھا۔

---

[1] زندہ رود جلد اول (ڈاکٹر جاوید اقبال) ۱۹۷۹ء صفحہ ۵۷۰

[1] روایات اقبال (مرتبہ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی) مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔ طبع اول نومبر ۱۹۷۷ء۔ صفحہ ۲۲۔

ان شعروں میں بس یہ ایک شعر شیخ صاحب کو یاد رہ گیا ہے، ؎

یہ تنہا زندگی پیری میں نصف الموت ہوئی ہے
نہ کوئی ہم سخن اپنا نہ کوئی رازداں اپنا

"یہ اشعار اعجاز صاحب نے علامہ کو بھیج دیے۔ انھوں نے کچھ عرصہ بعد اپنی نظم "والدۂ مرحومہ کی یاد میں" کاتب سے خوشخط لکھوا کر میاں جی کے لیے ارسال کر دی۔ میاں جی اس نظم کو اکثر پڑھا کرتے تھے۔ اور پڑھنے میں گریہ طاری ہو جاتا اور زار و قطار روتے جاتے۔"[1]

کتابی شکل میں اشاعت کے وقت یہاں اپنے والد محترم کی خدمت میں ارسال کی ہوئی علامہ کی نظم کے صفحہ اول کا بلاک آئے گا اور اس کے بعد دو صفحات میں علامہ کی خود نوشت تشریح کا عکس۔

یہ اصل میٹیریل میرے پاس ہے جو طباعت کے وقت ناشر کے حوالے کیا جائے گا۔

یہ سارا میٹیریل کتاب کے تین صفحات پر آئے گا۔

اس کے بعد علامہ کے ہاتھ کی تشریح کاتب خود اپنے ہاتھ سے لکھے گا کیونکہ علامہ کی عبارت ہر شخص سے پڑھی نہیں جا سکے گی۔

(میں یہ عبارت خوش خط آئندہ کے صفحات میں لکھ رہا ہوں) [جگن ناتھ آزاد]

بند اول و دوم

نظامِ عالم کے قوانین اٹل ہیں۔ قوانینِ فطرت کی محکم زنجیر میں ہر شے جکڑی ہوئی اور مجبور ہے۔ اس واسطے جب انسان کو اس عالم گیر مجبوری کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے مصائب پر نالاں نہیں ہوتا بلکہ آنسوؤں کا سرچشمہ خشک ہو جاتا ہے۔ عالم کا دل گویا الماس کا ٹکڑا ہے، جس میں علم کی روشنی تو ہے مگر ساتھ ہی اس کے سختی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور سوز و گداز رخصت ہو جاتا ہے۔

بند سوم

شاعر اگرچہ حکمت سے متاثر ہونے کے باعث رونے سے [illegible] ہے تاہم محض تصویر کا نظارہ اس کے خوابیدہ تاثرات کو جگا دیتا ہے۔

بند چہارم

تاثر کی فضیلت عقل پر۔ ماں کی تصویر پر ایامِ طفلی کی یاد دلاتی ہے۔

بند پنجم

ماں کے احسانوں کو یاد کر کے روتا ہے۔

بند ششم

دنیا میں موت کی عمومیت اور کثرت۔ ہر جگہ اس کی حکمرانی ہے۔ کوئی مقام ایسا نہیں جہاں یہ انسانی تمناؤں کا خون نہ کرتی ہو۔ مگر یہ دنیا جہاں موت کی اتنی کثرت ہے، محض امتحان گاہ ہے اور کبھی نہ کبھی یہ امتحان ضرور ختم ہو جائے گا۔

بند ہفتم

زندگی کبھی فنا نہیں ہو سکتی اور خود موت کی کثرت ہی اس بات کی دلیل ہے کہ زندگی کو فنا نہیں ہے۔ قدرت اگر پیکرِ انسانی کو توڑ دیتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قدرت ظالم ہے، بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ قدرت کو اس بات پر کامل اعتماد ہے کہ وہ ہزاروں اچھے سے اچھے پیکر اور جسم بنا سکتی ہے۔ اس بات کو ہوا اور بلبلے کی مثال سے واضح کیا ہے۔

بند ہشتم

رات کے تارے جو اپنی چمک دمک کے لئے تاریکی کے محتاج ہیں اور جو محض روشنی کی چنگاریاں ہیں اُن کی عمر اس قدر لمبی ہے کہ انسانی عقل اس کا اندازہ کرنے سے قاصر ہے۔ پھر انسان جو قدرت کا روشن ترین ستارہ ہے کیا ایک عارضی زندگی رکھتا ہے اور روشنی کی آسمانی چنگاریوں سے بھی گیا گزرا ہے؟ نہیں اس کی عمر ستاروں کی عمر سے بدرجہا زیادہ ہے۔ یہ ایک نہ بجھنے والا اجرام ہے۔

---

[1] روزگار فقیر جلد دوم صفحہ ۱۲۵-۱۲۶۔

بند نہم

پھول کے بیج کی مثال سے قبر سے دوبارہ اٹھنے کو واضح کرتا ہے اور اس کے امکان پر استدلال کرتا ہے۔

بند دہم

آدمی اگر کچھ وقت کے بعد اپنے مصائب اور غم کو بھول جاتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وقت میں کوئی پوشیدہ قوت ہے جس سے وہ انسانی غموں کو پرانا کر کے متاثر کر دیتا ہے۔ ہم جو مرنے والوں کو فراموش کر دیتے ہیں تو یہ فراموشی وقت کے گزر جانے کا اثر نہیں بلکہ ہماری فطرت میں ایک احساس مخفی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مر کر فنا نہیں ہوتا۔ اس لطیف احساس کی وجہ سے ہمارا غم دور ہو جاتا ہے۔ پس گزرے ہوئے عزیزوں کی طرف سے بے پروائی اور گونہ غفلت روح کے اس مخفی احساس کی وجہ سے ہے کہ ہمارے عزیز زندہ موجود ہیں۔ اگر وہ حقیقت میں فنا ہو چکے ہوتے تو یقیناً ہمارا غم کبھی ختم نہ ہوتا۔ گویا اس بند میں اور اس سے پہلے کے بندوں میں چار ماخذوں سے حیات ما بعد الموت کا استدلال کیا ہے۔

(۱) موت کی عمومیت اور کثرت سے۔

(۲) رات کے تاروں سے۔

(۳) پھول کے بیج سے۔

(۴) انسان کی ظاہری فراموشی سے جو عام لوگوں کے نزدیک مرور زمانہ سے پیدا ہوتی ہے۔

بند یازدہم

عام فلسفۂ حیات اور دُعائیہ اشعار

شیخ اعجاز احمد نے اپنے دادا شیخ نور محمد کے حالات حاصی تفصیل سے سید نقیر وحید الدین کو بتائے اور فقیر صاحب نے ان سب کو قلم بند کر لیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں فقیر صاحب لکھتے ہیں: "علامہ اقبال کی بہن بڑی عابدہ زاہدہ تھیں۔ خاص طور سے اولیاء اللہ کی کرامات اور خرقِ عادت کی کتابیں بڑے ذوق و شوق سے پڑھتیں۔ انھوں نے

ایک دن شیخ اعجاز احمد سے کہا کہ میاں جی کو "اسم اعظم" معلوم ہے جسے وہ بھائی صاحب (علامہ اقبال) کو بتا چکے ہیں۔ علامہ لاہور سے سیالکوٹ تشریف لائے تو ایک روز اعجاز صاحب نے ان کے پاؤں دابتے ہوئے پوچھا کہ میں نے سنا ہے میاں جی نے آپ کو "اسم اعظم" بتا دیا ہے۔ فرمایا یہ بات تم میاں جی ہی سے پوچھنا۔ چنانچہ ایک دن اعجاز صاحب نے میاں جی سے "اسم اعظم" کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بولے مجھے جادو منتر اور ٹونے ٹوٹکے جیسا کوئی اسم اعظم معلوم نہیں ہے کہ اس کے پڑھتے ہی کچھ سے کچھ ہو جائے۔ ہاں اللہ تعالیٰ سے دعا مشکلوں کو حل کرتی ہے۔ اس لئے دعا ہی "اسم اعظم" ہے۔"[1]

"........ اعجاز صاحب بیان کرتے ہیں کہ چچا جان کی نظروں میں میاں جی کا مقام تو اس قطعہ تاریخ سے ظاہر ہے جو ان کے لوح مزار پر کندہ کرایا گیا اور جس میں انھیں پدر و مرشد اقبال کہا گیا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے میاں جی باقاعدہ بیعت لے کر کسی کو مرید نہیں بناتے تھے اس لئے یہ روایت کہ چچا جان اپنے والد سے بیعت تھے لفظاً تو نہیں ہاں معنوی رنگ میں درست ہو سکتی ہے کیونکہ ان کی نسبت میاں جی کا وہی مرتبہ تھا جو ایک مرید کی نظر میں مرشد کا ہوتا ہے۔ میاں جی کی طبیعت ناساز ہونے کی خبر سنتے تو روزانہ کیفیت لکھنے کی مجھے تاکید فرماتے۔ فرصت نکال کر انھیں دیکھنے خود بھی آتے۔ ان کی دوا اور غذا کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات کی خبر رکھتے۔

> "کھانے کے لئے انھیں ساگودانہ بلکہ بہتر ہے اراروٹ دیا جائے۔"

> "بھائی صاحب نے اس سے پہلے کسی خط میں آپ کے انتظام خوراک وغیرہ کے متعلق لکھا تھا۔ یہ طریق بہت اچھا ہے اور اسی کو دستور العمل بنایا جاوے۔"

> "میں نے یورپ کے ایک مشہور حکیم کی کتاب میں دیکھا ہے

---

[1] "روزگار فقیر" جلد دوم، صفحہ ۱۲۷

کو جو شخص ہر روز دہی کی لسی پیا کرے اُس کی عمر بڑھتی ہے۔ ترش لسی تو شاید آپ کے لئے مفید نہ ہو کہ آپ کا گلا خراب ہے۔ البتہ میٹھے دہی کی لسی اگر صبح پی لی جائے تو شاید مفید ہو۔ اس کا تجربہ بھی کرنا چاہیے۔"

"ڈاکٹر عبداللطیف نے آپ کے دانت بنائے تھے۔ اگر وہ خراب ہو گئے ہوں تو ان کو ڈاک میں بھیج دیجئے گا۔ پھر مرمت کرا دئے جائیں گے۔ اور اگر وہ قابل مرمت بھی نہ ہوں تو لکھئے۔ ڈاکٹر عبداللطیف کو سیالکوٹ بھیج دوں گا کہ وہاں جا کر آپ کے دانت بنا دے۔" [1]

غرضیکہ چھوٹی چھوٹی بات کا خیال رکھتے تھے۔

میاں جی اکثر ململ کا کرتہ پہنتے تھے۔ جان پہچان والے گھروں اور بعض اوقات اور ایسے گھروں اور خاندانوں میں، جن سے کوئی واقفیت نہ تھی، میاں جی کے استعمال کئے ہوئے کرتوں کی بڑی مانگ رہتی۔ یہ کرتا نومولود بچے کو پہنایا جاتا۔ بڑی بوڑھیوں کا کہنا یہ تھا کہ اس کرتے کی برکت سے بچہ میاں جی کی طرح سے نیک، صاحب نصیب اور بڑی عمر والا ہوگا۔ خیر یہ تو اعتقاد کی بات تھی۔ جب کرتے کی مانگ آتی اور گھر کی کوئی خاتون میاں جی سے تذکرہ کرتیں تو میاں جی اس پر ہنس کر فرماتے۔ "اچھا ایک اور شریک آگیا۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ" یہ کہہ کر وہ اپنا کرتہ دے دیتے۔" [2]

مندرجہ بالا اقتباسات تعداد میں کچھ زیادہ ہو گئے ہیں جس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں، لیکن چونکہ یہ شیخ اعجاز احمد کے اپنے دادا کے متعلق بیانات ہیں جن کو انھوں نے سالہا سال تک صرف دیکھا ہی نہیں تھا بلکہ ان کے سایۂ عاطفت میں زندگی کا ایک حصہ بسر کیا تھا اس لئے میں نے ان بیانات کے بہت کم حصے ہی محذوف کرنا مناسب سمجھا۔ شیخ اعجاز احمد کے اپنے بزرگوں کے متعلق دوسرے بیانات کو بھی میں نے بہت زیادہ مختصر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیوں کہ فقیر سید وحیدالدین کی زندگی تک یہ واقعات گویا سینہ بہ سینہ چلے اور فقیر صاحب نے انھیں اپنی کتاب "روزگارِ فقیر" میں قلم بند کیا جو اتفاق سے اب ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں بڑی حد تک کم یاب ہے۔

تو یہ وہ پاک نفس، پاک باز اور خدا ترس بزرگ تھے۔ شیخ نور محمد جن کے دامانِ شفقت میں علامہ اقبال نے پرورش پائی۔

(۴)

بیگم امام بی بی

اقبال اس معاملے میں بہت خوش قسمت تھے کہ انھیں ایسے والدین کی آغوشِ شفقت میسر آئی جو قناعت پسند تھے، درویشانہ مزاج رکھتے تھے، جنھیں اخلاقی دنیوی جاہ اور مرتبے کے مقابلے میں زیادہ عزیز تھیں اور مذہب اور روحانیت سے محبت جن کی گھٹی میں پڑی تھیں۔

اقبال کی والدۂ محترمہ بڑی نیک دل اور پاک سیرت خاتون تھیں۔ اکثر عبادت گزاری کے شغل میں معروف رہتی تھیں اور اگرچہ گھر میں کوئی روپے کی ریل پیل نہیں تھی لیکن اس کے باوجود وہ حتی الامکان غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کو تیار رہتی تھیں۔

اقبال کی شخصیت میں علم، عرفان، فکر، عمل، نیکی اور محبت کی جو خوبیاں جمع ہو گئی تھیں وہ اُس تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھیں جس سے وہ اپنے گھر کے ماحول میں فیض یاب ہوئے۔ جب اقبال کی والدۂ محترمہ کا انتقال ہوا تو اکبر الہ آبادی نے ایک نظم کہی جس میں واضح طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ اقبال کی شخصیت جو اس قدر خوبیوں کا مجموعہ تھی اصل میں ان کے والدین کی تعلیم و تربیت کی مرہونِ منت تھی۔ اس نظم میں اکبر الہ آبادی کہتے ہیں: ؎

حضرت اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو ان کے طرز کی شیدا ہوئیں

[1] "روزگارِ فقیر" جلد دوم صفحہ ۱۲۸، ۱۲۹۔
[2] روزگارِ فقیر جلد دوم صفحہ ۱۳۱، ۱۳۲۔

یہ حق آگاہی، یہ خوش گوئی یہ ذوقِ معرفت
یہ طریقِ دوستی، خودداری با تمکنت
اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
با خدا تھے، اہلِ دل تھے، صاحبِ اسرار تھے
جلوہ گر ان میں انھیں کا ہے یہ فیضِ تربیت
ہے ثمر اس باغ کا یہ طبعِ عالی منزلت
مادرِ مرحومۂ اقبال جنت کو گئیں
چشم تر ہے آنسوؤں سے قلب ہے اندوہگیں
روکنا مشکل ہے آہ و زاری و فریاد کو
نعمتِ عظمیٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو
اکبر اس غم میں شریکِ حضرتِ اقبال ہے
سالِ رحلت کا یہاں منظور اسے فی الحال ہے
واقعی مخدومہ رحلت تھیں وہ نیکو صفات
"رحلتِ مخدومہ" سے پیدا ہے تاریخِ وفات

اس نظم کے علاوہ اکبر الہ آبادی نے بیگم امام بی بی کے انتقال[1] پر مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ بھی کہا:

مادرِ مخدومۂ اقبال رفت — سوئے جنت زیں جہانِ بے ثبات
گفت اکبر با دلِ پُر درد و غم — "رحلتِ مخدومہ" تاریخِ وفات[2]
۱۳۳۳ھ

فقیر سید وحید الدین نے "روزگارِ فقیر" میں علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کے حوالے سے بیگم امام بی بی کے متعلق بہت تفصیل سے لکھا ہے کہ فقیر سید وحید الدین کی اس تحریرِ دل پذیر کے بغیر علامہ اقبال کی والدۂ محترمہ بیگم امام بی بی کا ذکر نامکمل رہے گا۔ وہ لکھتے ہیں " اعجاز صاحب بیان کرتے ہیں کہ میاں جی کی شادی موضع سموٹیال ضلع سیالکوٹ کے ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی تھی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ان کے سسرال والے بھی سیالکوٹ ہی میں آکر سکونت پذیر ہو گئے۔ دادی جی کو "بے جی" کہتے تھے۔ ان کے ایک ہی بھائی تھے۔ وہ کشمیری لوئیاں اور دھسّے مختلف شہروں میں لے جاکر فروخت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس سلسلے میں گئے تو پھر واپس نہ آئے۔ نہ ہی ان کے متعلق کوئی خبر آئی۔ بے جی کو عمر بھر بھائی کا غم رہا۔

"بے جی لکھنا پڑھنا بالکل نہ جانتی تھیں۔ صرف نماز آتی تھی جو باقاعدہ پڑھا کرتی تھیں۔ ناخواندہ ہونے کے باوجود بڑی زیرک، معاملہ فہم اور مدبر خاتون تھیں۔ خانہ داری کا سب انتظام وہ خود کرتی تھیں۔ میاں جی کبھی اس انتظام میں دخل نہ دیتے تھے۔ اپنے حسنِ سلوک سے محلے اور برادری کی مستورات میں بڑا رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ برادری کے گھرانوں کے اکثر جھگڑے فیصلے کے لئے ان کے پاس لائے جاتے تھے۔ اور وہ بڑی خوش اسلوبی سے صلح صفائی کرا دیتیں۔ اکثر مستورات ان کے پاس زیور نقدی امانت رکھوا جاتیں جن کو وہ علیحدہ علیحدہ سرخ رنگ کے کپڑے کی پوٹلیوں میں باندھ کر رکھا کریں۔

"بے جی نے غربت کے دن بھی دیکھے تھے، اس لئے حتی المقدور غربا کی امداد پر ہمیشہ آمادہ رہتیں۔ یہ ان کا نمایاں وصف تھا کہ مستورات کو خفیہ طور پر نقدی دیتی رہتیں۔ دینے اور لینے والے کے علاوہ کسی کو علم نہ تھا کہ کس کو اور کیا دیتی ہیں۔ میرے ابا جی مذاق میں ایسی امداد کو "گپت دان" کہا کرتے تھے۔ رخصت پر گھر آتے تو "گپت دان" کے لئے بے جی کو علیحدہ رقم دیا کرتے تھے۔

"بے جی کی امداد کرنے کا ایک اور طریقہ یہ تھا کہ محلے برادری کے غریب مگر شریف گھرانوں کی دس بارہ سال کی عمر کی تین چار لڑکیاں اپنے گھر لے آتیں اور ان کی کفیل ہو جاتیں۔ یہ لڑکیاں گھر کے کام کاج میں ہاتھ بھی بٹاتیں اور ہماری مستورات سے قرآن کریم، نماز اور معمولی دینی تعلیم، اردو پڑھنا لکھنا، کھانا پکانا، سینا پرونا سیکھتیں۔ تین چار سال بعد مناسب رشتہ تلاش کرکے ان کی شادی کر دی جاتی۔ جتنا عرصہ وہ ہمارے یہاں رہتیں،

۱۔ اقبال کی والدۂ مرحومہ اس جہانِ بے ثبات سے جنت کو روانہ ہو گئیں۔

۲۔ اکبر نے درد و غم سے بھرے دل کے ساتھ ان کی تاریخِ وفات کہی "رحلتِ مخدومہ" ۱۳۳۳ھ

ان کی غور و پرداخت بالکل ایسے ہی کرتیں جیسے گھر کی بیٹیوں کی اور شادی کے وقت بھی انھیں بیٹیوں کی طرح ہی رخصت کرتیں۔ شادی کے بعد بھی وہ لڑکیاں ہمارے ہاں اسی طرح آتیں، جس طرح لڑکیاں میکے آتی ہیں۔ اگرچہ ان لڑکیوں میں زیادہ محلے، برادری کی لڑکیاں ہوتیں، لیکن غیر برادری کے لوگ بھی اس سلوک سے مستثنیٰ نہ تھے"[1]

بیگم امام بی بی کا انتقال ۹، نومبر ۱۹۱۴ء کو ہوا۔ ان کی وفات حسرت آیات پر اقبال نے وہ معرکہ آرا نظم کہی جو "بانگ درا" میں "والدۂ مرحومہ کی یاد میں" کے عنوان سے شامل ہے اور جس کا شمار دنیا کے عظیم ترین مرثیوں میں ہوتا ہے۔ اس نظم کا مختصر سا ذکر شیخ نور محمد کے بیان میں آ چکا ہے۔

یہ نظم شروع میں ۸۹ اشعار پر مشتمل تھی۔ لیکن "بانگ درا" میں اس کے صرف ۸۶ اشعار شائع ہوئے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ علامہ نے اس نظم کو "بانگ درا" میں شامل کرتے وقت اس کے تین اشعار حذف کر دیے۔ صحیح صورت یہ ہے کہ جب علامہ نے یہ نظم خوش خط لکھوا کر اپنے والد محترم شیخ نور محمد کو بھیجی تو اس میں ۸۹ ہی اشعار تھے لیکن انھیں دنوں جب یہ ماہنامہ "صوفی" (منڈی بہاؤالدین) میں شائع ہوئی تو اس میں اشعار کی تعداد ۹۸ تھی۔ گویا "صوفی" کی مطبوعہ نظم میں ۹ اشعار ایسے تھے جو شیخ نور محمد کو بھجوائی ہوئی خوش خط نقل میں شامل نہیں تھے۔

جب علامہ نے اس نظم کو "بانگ درا" کے مسودے میں شامل کیا تو ۸۹ میں سے ۸ اشعار خارج کر دیے اور پانچ اشعار ان نو اشعار میں سے لے کے شامل کر دیے جو "صوفی" والی نظم میں شامل تھے۔ اس طرح سے "بانگ درا" میں ۸۶ اشعار پر مشتمل نظم شامل ہوئی۔ گویا بارہ[12] اشعار اس نظم کے ایسے ہیں جو "بانگ درا" کا مسودہ مرتب کرتے وقت خارج کر دیے گئے۔ ان بارہ اشعار میں سے گیارہ اشعار غلام رسول مہر اور صادق علی دلاوری کی مرتبہ کتاب "سرود رفتہ" میں شامل ہیں اور یہاں آگے درج کیے جا رہے ہیں۔

اپنی نادانی پہ انسان کس قدر آسودہ ہے
تہمت تاثیر سے موج نفس آسودہ ہے

زندگی کی رہ میں جب میں طفل نو رفتار تھا
جادۂ خوابیدہ ہر ہر گام پر دشوار تھا
قطع تیری ہمت افزائی سے یہ منزل ہوئی
میری کشتی بوسہ گستاخ لب ساحل ہوئی[1]

[1] میری نظر سے نظم کی وہ خوش خط نقل جو علامہ اقبال نے اپنے والد محترم کو بھجوائی نہیں گزری، نہ ہی "صوفی" (منڈی بہاؤالدین) کا وہ شمارہ میں نے دیکھا ہے جس میں ۹۸ اشعار پر مشتمل نظم شائع ہوئی اس لئے قطعیت کے ساتھ یہ کہنا تو دشوار ہے کہ علامہ کے یہ تین اشعار اصل نظم کے کس حصے میں شامل رہے ہوں گے۔ لیکن میرا اندازہ یہ ہے کہ ان اشعار کا مقام وہ بند ہے جس میں علامہ کہتے ہیں ؂

گریۂ سرشار سے بنیاد جاں پایندہ ہے
درد کے عرفاں سے عقل سنگ دل شرمندہ ہے
موج دود آہ سے آئینہ ہے روشن مرا
گنج آب آورد سے معمور ہے دامن مرا
حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا
رخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا
رفتہ و حاضر کو گویا پا بہ پا اس نے کیا
عہد طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا
جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جان ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں
اور اب چرچے ہیں جس کی شوخی گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشم گوہر بار کے

دراصل خود تنقیدی علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری کے ارتقاء کا ایک اہم پہلو ہے جس کا پوری طرح سے مطالعہ کئے بغیر علامہ کے فکری ارتقاء کا جائزہ ممکن نہیں۔ وہ جو انھوں نے فرمایا تھا کہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ میں کب پیدا ہوا اور میں نے فلاں امتحان کس سن

[1] "روزگار فقیر" صفحہ ۱۳۴ و ۱۳۵۔

وہ قومی فطرت کہ ہے جس کی طبیعت استوار
جس کے دل سے کانپتے ہیں حادثاتِ روزگار[1]

ہم سمجھتے ہیں ثباتِ زندگی پیکر سے ہے
پیکروں کی بے ثباتی دورِ پیکرگر سے ہے
خام فکری سے شفق خونِ سحر سمجھی گئی
صبح شبنم سے سیاہی چشمِ تر سمجھی گئی

ر گذشتہ صفحہ سے آگے) میں پاس کیا لکھ اصل کام یہ ہے کہ میرے
خیالات میں جو ارتقا و نما ہوا ہے اس کا جائزہ لیا جائے اور میری ذہنی
کش مکش کا سراغ لگایا جائے تو ان کے شاعرانہ ارتقا کو سمجھنے کے لئے ان
نکتے کو ہمیشہ نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ شعر کے اس اونچے معیار کو برقرار
رکھنے کے لئے جو ہمیشہ ان کے سامنے رہا انھوں نے اپنے کیسے کیسے آب دار
جواہر ریزوں کو نظر انداز کر دیا۔ چوں کہ راقم الحروف علامہ اقبال کی شخصیت
کے اس پہلو کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور علامہ اقبال کے فکری اور فنی
ارتقا کو سمجھنے کے لئے ان کی اس خود تنقیدی کو چراغِ راہ سمجھتا ہے۔
اس لئے ان کے اس فکر و فن کے پہلو پر ایک مکمل باب اس کتاب میں
مناسب جگہ پر وقف کیا جائے گا۔

[1] اس شعر میں اپنے بھائی عطا محمد کی طرف اشارہ ہے کہ اس شعر کا مقام نظم کا وہ بند
رہا ہوگا جس میں مندرجہ ذیل اشعار آئے ہیں ؎

وہ جواں قامت میں ہے جو صورتِ سروِ بلند
تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند
کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا
وہ محبت میں تری تصویر وہ بازو مرا
تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ
صبر سے نا آشنا صبح و مسا روتا ہے وہ
تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

دیکھنے میں گرچہ ہے منزل شرر کا داغ
خندہ زن ہے صرصرِ ایامِ پراں کا دماغ
کیسی حیرت خیز ہے ظلمت فروشی رات کی
دن کے ہنگاموں کا ہے مدفن خموشی رات کی
ظلمتِ آشفتہ کا کل وسعتِ عالم میں ہے
اشکِ انجم در گریباں رو رہے ماتم میں ہے
طفلکِ شش روزۂ کون و مکاں خاموش ہے
رات کے آغوش میں لپٹا ہوا بے ہوش ہے
آبِ دریا خفتہ ہے، موجِ ہوا غش کردہ ہے
پست ہر ہستی کے سازِ زندگی کا پردہ ہے[1]

---

[1] ان اشعار کے بارے میں راقم التحریر کا اندازہ یہ ہے کہ ان کا مقام مندرجہ ذیل
دو بندوں کے درمیان رہا ہوگا، کیوں کہ یہ اشعار ان دو مندرجہ ذیل
بندوں میں ایک طرح سے رابطے کی کڑی کا کام دے رہے ہیں۔

(۱)

آہ یہ دنیا یہ ماتم خانۂ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر
کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت
زلزلے ہیں بجلیاں ہیں، قحط ہیں آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں
کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موت کی آغوش میں
نے مجالِ شکوہ ہے نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے
([illegible])

گویا ان نوادر میں سے ایک گوہر آب دار ابھی تک نایاب ہے۔

(۵)

شیخ عطا محمد

شیخ نور محمد کے بیٹے شیخ عطا محمد کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔ عام طور سے شیخ نور محمد کی اولاد نرینہ کا ذکر ہوتا ہے تو صرف شیخ عطا محمد اور علامہ اقبال ہی کا نام لیا جاتا ہے لیکن ان کا ایک بیٹا اور بھی تھا جو پیدائش کے چند ماہ بعد فوت ہو گیا۔ بیٹیاں ان کی چار تھیں۔ گویا ان کے بچوں کی تعداد سات تھی۔ بیٹیوں کے نام یہ تھے۔ فاطمہ بی، طالع بی، کریم بی اور زینب بی۔ (مگر سید ذکی شاہ نے ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی سے بات چیت کرتے وقت بیٹیوں کی تعداد تین بتائی جن کے نام بقول سید ذکی شاہ یہ ہیں۔ مسماۃ جیونی، کریم بی بی اور زینب بی بی۔[1]

شیخ عطا محمد اپنے بھائی محمد اقبال سے عمر میں اٹھارہ برس بڑے تھے۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۸۵۹ء ہے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے سیالکوٹ میں اپنے گھر ہی پر حاصل کی۔ سیالکوٹ میں ابھی اس وقت تک اسکولوں یا کالجوں کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔

شیخ عطا محمد نے دو شادیاں کیں۔ ان کی پہلی شادی اٹھوروں کے خاندان میں ہوئی۔ اس بیوی کے ساتھ ان کے تعلقات طلاق پر ختم ہوئے۔ طلاق کا سبب یہ تھا کہ بیوی کو افیون کھانے کی عادت تھی۔ جب اس طلاق کا علم مولوی سید میر حسن کو ہوا تو وہ بہت رنجیدہ ہوئے اور انھوں نے شیخ صاحب سے فرمایا کہ "اگر تم کو افیون کی لت لگ جائے، تم نے ایک بے گناہ پر ظلم کیا ہے۔"[2] اب خدا کا کرنا دیکھئے کہ آخری عمر میں شیخ عطا محمد بھی افیون کھانے لگ گئے تھے۔ ان کی دوسری شادی کامیاب ہوئی۔ بیوی کا نام مہتاب تھا۔

شیخ عطا محمد کے پہلے سسرال والے فوجی پنشنر تھے۔ ان کی کوشش سے اور ساتھ ہی اس بنا پر کہ شیخ عطا محمد کی صحت اچھی تھی، قد لمبا، جسم ہر اعتبار سے متوازن تھا۔ شیخ صاحب فوج میں بھرتی ہو گئے۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا کیونکہ شیخ صاحب نے فوج کی ملازمت سے مستعفی ہو کر رڑکی کی انجینیرنگ اسکول میں داخلہ لے لیا اور امتحان پاس کرنے کے بعد ملٹری انجینیرنگ سروس میں اوورسیر ہو گئے۔ اس حیثیت میں وہ کوئٹہ، ایبٹ آباد، کیمبل پور، بارا، جمرود اور پشاور میں ملازم رہے۔ ۱۹۰۵ء میں علامہ اقبال جب اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ روانہ ہوئے تو شیخ عطا محمد اس وقت کیمبل پور میں اوورسیر تھے۔ اپنے چھوٹے بھائی اقبال سے انھیں بے حد محبت تھی اور شیخ عطا محمد ہی نے اپنے خرچ پر اقبال کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ بھیجا۔

(گذشتہ صفحہ سے آگے)

قافلے میں غیر فریادِ درا کچھ بھی نہیں
اک متاعِ دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

(۲)

ختم ہو جائے گا لیکن امتحاں کا دور بھی
ہیں پسِ نہ پردۂ گردوں ابھی دور اور بھی
جھاڑیاں جن کے قفس میں قید ہے آہِ خزاں
سبز کر دے گی انھیں بادِ بہارِ جاوداں
خفتہ خاکِ پے سپر میں ہے شرار اپنا تو کیا
عارضی محمل ہے مشتِ غبار اپنا تو کیا
زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

---

[1] روایاتِ اقبال (مرتبہ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی) مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور نومبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۲۲۔
[2] "شمس العلماء مولوی سید میر حسن" از ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین۔ صفحہ ۹۴۔

اقبال بھی اپنے بھائی کا بے حد احترام کرتے تھے۔ یورپ روانہ ہوتے وقت دہلی میں جب حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر پہنچ کر اقبال نے دعا مانگی تو اپنے بھائی شیخ عطا محمد کا ذکر ان الفاظ میں کیا :

وہ میرا یوسفِ ثانی وہ شمعِ محفلِ عشق
ہوئی ہے جس کی اخوت قرارِ جاں مجھ کو
جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو
ہوائے عیش میں پالا کیا جواں مجھ کو
ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

اقبال کی نظم "والدۂ مرحومہ کی یاد میں" کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ اس میں والدۂ محترمہ کے انتقال پر شیخ عطا محمد کے درد و اندوہ کا ذکر اقبال نے ان الفاظ میں کیا ہے ؎

وہ جواں قامت میں ہے جو صورتِ سروِ بلند
تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند
کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا
وہ محبت میں تری تصویر وہ بازو مرا
تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ
صبر سے ناآشنا صبح و مسا روتا ہے وہ

مولانا عبدالمجید سالک شیخ عطا محمد کی زندگی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے شیخ عطاء اللہ کی کتاب "اقبال نامہ" کے حوالے سے لکھتے ہیں :

"۱۹۰۳ء میں اقبال کو ایک شدید پریشانی سے سابقہ پڑا۔ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد اس زمانے میں بلوچستان کی سرحد پر سب ڈویژنل آفیسر ملٹری ورکس تھے۔ بعض مخالفین نے سازش کر کے ان کے خلاف ایک فوج داری مقدمہ کھڑا کر دیا جس میں عزت کے علاوہ جان کے بھی لالے پڑ گئے۔ اقبال کو اس سلسلے میں فورٹ سنڈیمن جانا پڑا۔ آخر بڑی جد و جہد اور لارڈ کرزن وائسرائے سے ذاتی اپیل کے بعد یہ قضیہ ختم ہوا۔ خاندان بھر نے بے حد پریشانی اٹھائی۔ زرِ کثیر صرف ہوا۔ لیکن شیخ عطا محمد باعزت رہا ہوئے اور ملازمت پر بھی آنچ نہ آئی۔ حالانکہ بلوچستان ایجنسی کے کارفرما شیخ صاحب کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے تھے۔"[1]

اس تحریر پر سید فقیر وحید الدین نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے :۔

"بعض اوقات تذکروں اور سوانح عمریوں میں کسی واقعے کا ذکر اس قدر اجمال و اختصار کے ساتھ مبہم پیرائے میں کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والے واقعے سے کوئی اچھا اثر قبول نہیں کرتے۔ ایک سادہ سی بات غلط فہمی کا سبب بن جاتی ہے۔ بزمِ اقبال لاہور کی مطبوعہ کتاب "ذکرِ اقبال" میں علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب پر ۱۹۰۳ء میں ایک فوجداری مقدمہ دائر ہونے کا جو ذکر کیا گیا ہے، اس کا یہی حال ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے —

"۔۔۔ آخر بڑی جد و جہد اور لارڈ کرزن سے اقبال کی ذاتی اپیل کے بعد یہ قضیہ ختم ہوا۔"

"ان الفاظ سے قاری کے ذہن میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے بڑے بھائی کو فوج داری مقدمے سے بچانے کی خاطر لارڈ کرزن وائسرائے ہند سے سفارش کر کے اس قضیے کو ختم کرایا، حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ شیخ عطا محمد جو بلوچستان میں اوورسیر تھے اور فنِ تعمیر میں خاص مہارت رکھتے تھے ایک سازش کا شکار ہو گئے۔ ان کے دو غیر مسلم ساتھیوں نے انگریز افسر سے مل کر شیخ صاحب کے خلاف سازش کی۔ یہاں تک کہ ان کے خلاف ایک فوج داری مقدمہ کھڑا کر دیا۔

"شیخ صاحب کو اندیشہ تھا کہ ان کے مخالف افسرِ عدالت اور گواہوں کو متاثر کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے شیخ صاحب نے اس بات کی تگ و دو کی یا تو مقدمہ کسی دوسرے ضلعے کی عدالت میں

---

[1] ذکرِ اقبال صفحہ ۲۳۔

منتقل ہو جائے یا ان ایک دو عہدہ داروں کا تبادلہ کر دیا جائے مگر بلوچستان پولیٹیکل ایجنسی کے کرتا دھرتا ان دو میں سے کسی پر آمادہ نہ ہوئے۔ مجبور ہو کر علامہ اقبال نے وائسرائے ہند کو تمام حالات سے مطلع کیا۔

"یہ اُس زمانے کی بات ہے جب علامہ اقبال کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ سرکاری حلقوں میں نہ تو ان کی رسائی تھی اور نہ کوئی اثر ورسوخ تھا۔ ان کی شاعرانہ شہرت پر ابھی شباب کہاں آیا تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وائسرائے ہند نے انگریزی انصاف کی ساکھ باقی رکھنے کے لئے واقعات کی تحقیق کرائی ہو گی اور اطمینان ہو جانے کے بعد ان افسروں کا جن کی شیخ صاحب سے جھڑپ اور بدمزگی ہو گئی تھی، تبادلہ کر دیا جس کی وجہ سے وہ مقدمہ بھی بے جان اور کمزور ہو گیا۔ علامہ اقبال نے ۶ ؍ اگست ۱۹۰۳ء کو نواب صدر یار جنگ کو جو خط لکھا اس میں اس واقعے کی اشارہ کیا ہے۔

"...... میرے بڑے بھائی جان بلوچستان کی سرحد پر سب ڈویژنل افسر ملٹری ورکس تھے۔ ان کے مخالفین نے ایک خوفناک فوجداری مقدمہ بنا دیا تھا لیکن الحمد للہ کہ دشمنوں کے منہ میں خاک پڑی ..... بلوچستان ایجنسی والے تو ہمارے ساتھ نا انصافی کرنے پر آمادہ تھے مگر خدا لارڈ کرزن کا بھلا کرے کہ میرے لکھنے پر معاملہ دگرگوں ہو گیا۔" [1]

---

[1] یہاں فقیر سید وحید الدین نے علامہ اقبال کا مکمل خط درج نہیں کیا صرف اقتباس ہی پر اکتفا کی ہے۔ علامہ کا مکمل خط درج ذیل ہے:-

از شہر سیالکوٹ

۶ ؍ اگست ۱۹۰۳ء

مخدوم و مکرم جناب قبلہ خان صاحب السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ کل شام ملا۔ الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ خدا کے

علامہ اقبال کی دعائیہ نظم "برگ گل" کے اس شعر میں ــــ ۵

کیا کروں اور وں سے کہ اے امیر ملک فقر!

دشمنی میں بڑھ گئے اہلِ وطن اغیار سے [1]

دشمنوں کی اسی سازش کی طرف اشارہ ہے، جس میں علامہ کے بڑے بھائی کے خلاف محکمے کے دو غیر مسلم عہدے دار خاص طور سے شریک تھے۔

یہ نظم علامہ اقبال نے اسی اضطراب کے عالم میں کہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا سن لی۔ شیخ عطا محمد باعزت طور پر بری ہو گئے۔ عدالت کے فیصلۂ بریت کے علاوہ محکمہ نے ان کی سروس بک میں یہ ریمارک دیا (ریمارک)

NOT GUILTY FALL OF SUSPICION

"شیخ اعجاز احمد جو اس پورے واقعے کے راوی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ان کی پھوپھی صاحبہ نے بیان کیا کہ اسی مقدمے کے بعد علامہ اقبال نے بیرسٹری پاس کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ [2] ۵

جب ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی حالات اقبال کی تلاش میں علامہ

بہ فضل سے اس تشویش کا خاتمہ ہوا۔ میرے بڑے بھائی جان پر جو بلوچستان کی سرحد پر سب ڈویژنل آفیسر ملٹری ورکس تھے، ان کے مخالفین نے ایک خوفناک فوجداری مقدمہ بنا دیا تھا۔ لیکن الحمد للہ کہ دشمنوں کے منہ میں خاک پڑی۔ بھائی صاحب بری ہوئے۔ اگرچہ روپیہ کثیر صرف ہوا تاہم شکر ہے کہ ہماری مصیبت کا خاتمہ ہوا۔ ہم باقی رہ گئے اور ہماری مصیبت دشمنوں کی تلاش میں پھر بلوچستان کی طرف عود کر گئی۔ بلوچستان ایجنسی والے تو ہمارے ساتھ نا انصافی کرنے پر آمادہ تھے مگر خدا لارڈ کرزن کا بھلا کرے کہ میرے لکھنے پر معاملہ دگرگوں ہو گیا۔ والسلام

آپ کا مخلص محمد اقبال

[1] علامہ اقبال کی یہ نظم جوان کے متروک کلام کا حصہ ہے۔ زیر نظر کتاب کے اس باب میں جو علامہ مرحوم کے متروک کلام پر مشتمل ہے۔ اپنی مکمل صورت میں شامل کی جا رہی ہے۔

[2] "روزگار فقیر" جلد دوم صفحہ ۱۴۸

علامہ اقبال کے احباب اور بزرگوں سے ملاقاتیں کر رہے تھے تو وہ اسی سلسلے میں پروفیسر منظور احمد ایم۔اے (ہمشیرہ زادۂ علامہ مرحوم) سے بھی ملے۔ پروفیسر منظور احمد نے انھیں اقبال کے علاوہ شیخ عطا محمد کے بارے میں بھی دو ایک نئی باتیں بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ حضرت علامہ مرحوم اور ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کی طبیعتوں میں بعد المشرقین تھا۔ علامہ مرحوم بے حد علم دوست تھے جب کہ شیخ عطا محمد کو علم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ معمولی تعلیم حاصل کر کے رسالے میں سپاہی بھرتی ہو گئے۔ پھر انجینیرنگ کا کام سیکھ لیا اور محکمۂ فوج میں اوورسیر OVERSEER ہو گئے۔ اگرچہ تعلیم زیادہ نہ تھی مگر اوورسیری کے کام میں مہارت تامہ رکھتے تھے جس سے بہت روپیہ کمایا۔ ان کی تعمیر کردہ دو تین عمارتیں فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ سمجھی جاتی ہیں۔ حضرت علامہ کی کوٹھی بھی انھوں نے اپنی نگرانی میں بنوائی تھی۔ چوں کہ انھیں علم سے کوئی مس نہ تھا اس لئے وہ حضرت علامہ کو ولایت بھیجنے کے حق میں نہ تھے۔ مولوی میر حسن کے اصرار نے راضی کیا۔ وہ بار بار کہتے کہ تو نہیں جانتا اقبال کیا ہے۔ میں جانتا ہوں۔ بس اس وقت سے تعلیم کی ذمہ داری اٹھائی اور پورا خرچ دیا۔" [1]

انھی پروفیسر منظور احمد کا کہنا ہے کہ "شیخ عطا محمد بڑے جابر آدمی تھے۔ ایک دفعہ بازی بد کر تاش کھیل رہے تھے کہ پولیس آگئی۔ انھوں نے اطمینان سے دروازہ کھولا اور پولیس والے کو دھکا دے کر صاف نکل گئے۔ اپنے بچوں یا علامہ اقبال کے کسی بچے سے کوئی غلط بات سرزد ہو جاتی تو سخت سزا دیتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے بیٹے امتیاز نے شرارت کی، پھر خوف کے مارے مسجد میں جا کر چھپ گیا۔ شیخ عطا محمد نے بار بار بلایا لیکن وہ نہ آیا۔ پھر اپنے والد صاحب سے اس کا ذکر کیا کہ آخر وہ آتا کیوں نہیں۔ والد صاحب نے کہا کہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم مسجد میں قدم نہیں رکھو گے۔ پھر اس سے بہتر اس کے چھپنے کی آخر کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔" [2]

"شیخ منظور احمد نے بتایا کہ میرے ہم جماعت اکرام نامی ہیں۔

---

[1] ، [2] روایاتِ اقبال۔ صفحہ ۱۷۹، ۱۸۰

ان کے والد اور چچا صحاف تھے اور کاغذ بھی بناتے تھے۔ اب وہ فوت ہو چکے ہیں۔ اکرام کا بیان ہے کہ حضرت علامہ مرحوم اور شیخ عطا محمد اکرام کے گھر کاغذ کوٹا کرتے تھے اور وہاں سے روٹی کھانے کو مل جاتی تھی۔ یہ اس خاندان کی انتہائی غریبی کا زمانہ تھا۔ پھر شیخ عطا محمد رسالے میں ملازم ہو گئے تو آمدنی کا سہارا پیدا ہوا۔ اس زمانے میں حضرت علامہ کی تعلیم بھی رک گئی تھی مگر شیخ عطا محمد کی ملازمت نے پھر ایک اچھی صورت پیدا کر دی۔" [1]

راقم التحریر کو شیخ منظور احمد کے اس آخری بیان کی صداقت میں شبہ ہے کیونکہ تمام قرائن سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ شیخ نور محمد کے گھر میں روپے کی ریل پیل نہیں تھی لیکن ان کا کاروبار ہمیشہ اچھی طرح چلتا رہا اور اس کے پیشِ نظر یہ بات قرینِ قیاس نہیں ہے کہ شیخ عطا محمد اور محمد اقبال کو کسی کے گھر جا کر کاغذ کوٹنے کی نوبت آئی ہو اور وہاں سے انھیں کھانے کو روٹی مل جاتی ہو۔

اقبال کے دل میں اپنے بڑے بھائی کے لئے عزت و محبت اس وقت بھی برقرار رہی جب اقبال احمدی خیالات ترک کر چکے تھے اور شیخ عطا محمد ابھی تک احمدی عقیدے پر قائم تھے۔ اس ضمن میں مجھے میرے والد محترم مرحوم صاحب نے ایک واقعہ سنایا تھا جس کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔ انھوں نے بتایا کہ اقبال کو یورپ سے واپس آئے ہوئے دو تین برس ہی ہوئے ہوں گے میں ایک کام کے سلسلے میں لاہور گیا تو ایک دوست کے ہمراہ اقبال سے ملنے کے لئے بھی ان کے گھر پہنچا۔ اقبال اس زمانے میں انارکلی والے مکان میں رہتے تھے۔ باتوں باتوں میں میں نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! ہے تو گستاخی لیکن میں نے آج تک آپ کی زبان سے آپ کا کلام نہیں سنا۔ آپ کے لحن داؤدی کی میں نے بڑی تعریف سنی ہے۔ مجھے اس سے محروم نہ رکھیے۔" اقبال نے جواب میں کہا۔ "میں آپ کی بات نہ ٹالتا لیکن اس وقت ساتھ کے کمرے میں بھائی صاحب موجود

---

[1] روایاتِ اقبال صفحہ ۱۸۱۔

ہیں اور ان کی موجودگی میں یہ جسارت میں نہیں کر سکتا۔ اگر آپ کسی ایسے وقت آئیں جب بھائی صاحب گھر پر نہ ہوں تو میں ضرور آپ کی خواہش پوری کروں گا۔"

یہاں یہ بیان کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ جو لوگ محض اپنی وجاہت کی بنا پر اقبال کا کلام سننے کے آرزومند ہوتے تھے اقبال ان سے دو ٹوک طریقے پر انکار کر دیتے تھے، لیکن اپنے سے چھوٹوں اور احباب کو بے تکلفی کے ساتھ اپنے کلام سے نوازتے تھے۔ میرے والد چونکہ اقبال کے سامنے ہر اعتبار سے خُرد تھے اس لئے اقبال ان کو ضرور اپنا کلام سنا دیتے اگر مذکورہ رکاوٹ نہ ہوتی۔

والد محترم یہ کہتے تھے کہ اس سفر میں دوبارہ اقبال کے گھر جانے کا موقع مجھے نہ مل سکا اور بہت بعد میں بریڈلا ہال کے ایک مشاعرے میں اقبال کا کلام اقبال کی زبانی سننے کا مجھے شرف حاصل ہوا۔

اپنے بڑے بھائی کے لئے اقبال کے بھرپور جذبۂ احترام کی تائید ڈاکٹر جاوید اقبال کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے دونوں بھائیوں کی باہمی محبت کا ذکر کرتے ہوئے "زندہ رود" میں لکھے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:۔ "اقبال ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور ان کے مداح تھے۔ ان کا بے حد ادب کرتے تھے اور کبھی ان کے سامنے نہ بولتے تھے"[سه]

لیکن غالباً دونوں بھائیوں کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب یہ دونوں ایک دوسرے سے قدرے دور ہوگئے۔ اس ضمن میں سید سلطان محمود حسین لکھتے ہیں:۔ "اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد ہی نے اقبال کو اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا تھا۔ آخری عمر میں دونوں بھائیوں میں کس قدر اجنبیت پیدا ہوگئی تھی۔ میر صاحب نے ایک مرتبہ اقبال سے کہا: "بھئی عطا محمد نے تمھاری بڑی خدمت کی ہے، اس خدمت کا حق ادا کرتے رہو"۔ اقبال نے جواب دیا: "جی میں نے اصل مع سود ادا کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ جدی مکان میں بھی حصہ چھوڑ دیا ہے"۔[ہه]

[سه] "زندہ رود"۔ ڈاکٹر جاوید اقبال جلد اوّل صفحہ ۲۰
[ہه] مولوی سید میر حسن (حیات و افکار) مصنفہ ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین۔ صفحہ [illegible]

اپنے چھوٹے بھائی اقبال کے ساتھ شیخ عطا محمد کی محبت کا یہ عالم تھا کہ جب ۱۹۳۸ء میں جب علامہ اقبال کا انتقال ہوا تو شیخ عطا محمد پر گویا غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ان کی یہ حالت ہوگئی جیسے اپنے بیٹے کے مرنے پر کسی کی ہو جاتی ہے۔ اقبال کی موت کے بعد شیخ عطا محمد نڈھال ہوگئے۔ ہمیشہ خاموش اور افسردہ رہتے تھے۔ دراصل اقبال کے انتقال کا غم انھیں اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے چلا رہا تھا۔ چنانچہ دو سال بعد ہی ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو وہ اسی اندوہ اور افسردگی کے عالم میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے ——— ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

انتقال کے وقت شیخ عطا محمد کی عمر ۸۱ برس کی تھی۔ ان کے فرزندوں کے نام شیخ اعجاز احمد، شیخ امتیاز احمد اور شیخ ممتاز احمد ہیں۔ ان تینوں فرزندوں میں شیخ اعجاز احمد کا نام علمی اور ادبی دنیا میں بہت معروف ہے۔ اگرچہ انھوں نے علامہ اقبال کے متعلق کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن اگر انھیں حیات اقبال کے تعلق سے ایک چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا سمجھا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ شیخ اعجاز احمد نے جیسے ہی ہوش سنبھالا اپنے چچا علامہ اقبال کی زندگی، شخصیت اور شاعری کے ساتھ بے پایاں محبت کی بنا پر ان کے حالات زندگی، ان کی نظمیں اور ان کے خطوط کی نقول اپنی بیاضوں میں درج کرنا شروع کر دیں ——— اور آج کی مذکورہ بیاضوں کا حوالہ دئے بغیر اقبال کی زندگی یا فکر و فن کے تعلق کوئی کتاب مکمل نہیں سمجھی جا سکتی۔ فقیر سید وحید الدین نے جب اپنی لازوال کتاب "روزگار فقیر" [illegible] شیخ اعجاز احمد کی مذکورہ یادداشتوں کو اپنے لئے مشعل راہ بنایا اور شیخ اعجاز احمد کے اس گراں بہا کام کا نہایت فراخ دلی کے ساتھ ان لفظوں میں اعتراف کیا: "علامہ [illegible] شیخ اعجاز احمد بڑے مخلص پابند وضع بزرگ ہیں۔ علامہ مرحوم کی جو شفقت اور قرب انھیں حاصل رہا ہے اُس کی بدولت اپنے خاندان، علامہ کی زندگی کے حالات اور ملفوظات و نوادر کا بڑا ذخیرہ ان کے پاس سالہا سال سے محفوظ چلا آتا ہے۔"

"راقم الحروف تیرہ چودہ سال تک انھیں توجہ دلاتا رہا کہ یہ سرمایہ کتابی صورت میں قوم تک پہنچا دیا جائے لیکن شیخ صاحب اس کام کے لئے موقع اور فرصت کے منتظر رہے۔ یہاں تک کہ میں نے جب "روزگار فقیر" کے نقش اول کی ترتیب کا آغاز کیا تو شیخ صاحب نے بڑے خلوص کے ساتھ اپنے تعاون سے نوازا اور جب جلد دوم مرتب ہونے لگی تو انھوں نے نہایت فیاضی اور فراخ دلی کے ساتھ احوال و وقائع کا نام گراں قدر سرمایہ میرے سامنے رکھ دیا۔

راقم التحریر نے اپنی استطاعت کی حد تک امکانی کوشش کی ہے کہ شیخ صاحب کی روایت، بیان اور یادداشت کی ترجمانی نفس مفہوم کے مطابق ہو سکے۔ صاحب موصوف نے روایت و بیان میں بڑی احتیاط اور ذمہ داری کو ملحوظ رکھا ہے۔" [1]

راقم الحروف ذاتی طور پر شیخ اعجاز احمد کا ممنون احسان ہے کہ اس نے جب اپنی کتاب "مرقع اقبال" مرتب کی اور اس میں بابا صالح کو اقبال کا جد امجد قرار دیا تو شیخ اعجاز احمد نے راقم الحروف کو ایک خط لکھا جس میں "مرقع اقبال" کی اس غلطی کی نشان دہی کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ ہمارے جد امجد کا اسم گرامی بابا صالح نہیں بابا لول حج ہے۔

شیخ اعجاز احمد نے علامہ اقبال کے مشورے ہی سے لا کالج میں داخلہ لیا اور ایل ایل۔ بی کا امتحان پاس کرنے کے بعد لاہور ہی میں وکالت شروع کی۔ کچھ مدت تک انھوں نے انکم ٹیکس کے محکمے میں بھی کام کیا۔ بعد میں سب جج بنے اور اس حیثیت سے وہ دہلی حافظ آباد اور دوسری جگہوں میں متعین رہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہوا تو وہ حکومت ہند کے محکمہ عدالت میں تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی منتقل ہو گئے۔ اور حکومت پاکستان کے ممتاز عہدوں پر کام کرنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔

(۶)
مولوی سید میر حسن

علامہ اقبال کے اساتذہ کا جب ذکر ہوتا ہے تو ہم لوگ اس ضمن میں بڑے فخر کے ساتھ ٹامس آرنلڈ، وھائٹ ہیڈ، میکٹیگرٹ، سورئیل، نکلسن، مس ویگے ناسٹ، فراؤلین لین، فراؤلین [illegible]، فراؤلین سینے شال اور نواب مرزا داغ کا ذکر کرتے ہیں۔ جیسے اقبال کو اقبال انہی لوگوں نے بنایا ہو۔ اقبال کی شخصیت کو بنانے میں ان تمام اساتذہ کا جو فیضان شامل رہا اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ تمام اساتذہ اقبال کی زندگی میں اس وقت داخل ہوئے جب اقبال کی صلاحیتیں خاصی حد تک اجاگر ہو چکی تھیں۔ مولوی سید میر حسن نے کچی مٹی کو ہاتھ میں لیا تھا اور اقبال کی جبلی صلاحیتوں کو جو ابھی تک پردۂ اخفا میں تھیں اس طرح جلا دی کہ وہ مٹی خالص سونا بن گئی۔

کسی شخصیت کے بڑا بننے میں جہاں خود اس کی ذہانت اور محنت کا ہاتھ ہوتا ہے وہاں قدرت بھی بعض دفعہ ایسے انتظامات کرتی رہتی ہے جنھیں سمجھنا ذہن انسانی کی رسائی سے باہر ہے۔ ایسا ہی انتظام قدرت اقبال کے لئے بھی کر رہی تھی۔

شروع شروع میں اقبال کے والد نے اقبال کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے مولانا غلام حسین کی درس گاہ میں داخل کرایا۔ یہ درس گاہ محلہ شوالہ تیجا سنگھ کی مسجد میں تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے اقبال درس گاہ میں بیٹھے سبق یاد کر رہے تھے کہ مولوی سید میر حسن شاہ وہاں آ نکلے۔ اقبال کی شکل و صورت اور ذہانت سے وہ بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے پوچھا یہ کس کا بیٹا ہے۔ جواب ملا۔ شیخ نور محمد کا۔ بولے اس لڑکے کو میں پڑھاؤں گا۔ یہ کل سے میرے مدرسے میں آئے گا۔ چنانچہ اقبال کے والد نے اقبال کو دوسرے دن مولوی میر حسن شاہ کے مدرسے میں داخل کرا دیا اور استاد اور شاگرد میں وہ تعلق پیدا ہوا جو صرف یہی نہیں کہ عمر بھر قائم رہا بلکہ استاد اور شاگرد دونوں آخر تک ایک دوسرے پر ناز کرتے رہے۔

مولوی میر حسن عجیب و غریب انسان تھے۔ انھیں بچوں کی تعلیم و تربیت سے کس قدر دل چسپی تھی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعے سے لگایا جا سکتا ہے جو فقیر سید وحید الدین نے "روزگار فقیر"

[1] روزگار فقیر ... ص ۱۱۳

میں بیان کیا ہے۔ فقیر وحید الدین لکھتے ہیں: "اسکول کا ایک طالب علم حاکم رائے اکثر غیر حاضر رہتا تھا۔ شاہ صاحب نے سبب پوچھا تو پتہ چلا کہ لڑکا پڑھنے سے جی چراتا ہے۔ اور کھیل کود کا بہت شوقین ہے۔ شاہ صاحب اس لڑکے کے پاس گئے تو دیکھا کہ اُبلے ہوئے چنوں کا خوانچہ لگائے بیٹھا ہے۔ اسکول نہ آنے کا سبب پوچھا تو دل گرفتہ انداز میں بولا: 'ہمارا استاد بڑا ظالم ہے۔ بات بات پر بے تحاشا پیٹتا ہے۔ شاہ صاحب نے شفقت سے کہا 'میں نیا استاد ہو کر اس اسکول میں آیا ہوں۔ پڑھاتا ہوں۔ مارتا پیٹتا نہیں ہوں۔ تم اب ضرور اسکول آیا کرو۔ حاکم رائے نے یہ بات مان لی اور پھر اسی طرح اسکول آنا شروع کر دیا — تعلیم مکمل ہونے پر ڈاک کے محکمے میں ملازمت کی اور یہی حاکم رائے دوبارہ سیالکوٹ میں پوسٹ ماسٹر ہو کر آئے۔ شاگرد حاکم رائے کے دل میں اپنے استاد مولوی میر حسن کی اس قدر عزت تھی کہ جب کبھی استاد سے ملنے آتے تو جوتے دروازے پر اتار دیتے تھے اور استاد کے بیٹھنے کی جگہ سے ننگے پاؤں واپس جاتے تھے۔" یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فقیر صاحب لکھتے ہیں:-

"اس چھوٹی سی بات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شفیق اور لائق استاد کس طرح شاگردوں کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیتے ہیں اور انھیں مایوسی اور ناکامی کے ویرانوں سے نکال کر کامیابی کی منزلوں تک لے جاتے ہیں۔"[1] یہ طالب علم حاکم رائے پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔

تو اقبال اس معیار کے شفیق اور عالم باعمل استاد کے قدموں میں بیٹھ کر علم حاصل کرتے رہے۔

سید میر حسن ایک تو اقبال کے والد شیخ نور محمد کے دوست تھے۔ دوسرے اقبال خود بہت ہی ذہین اور طباع تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ صاحب نے اقبال کی طرف خاص توجہ کرنا شروع کی۔ شاہ صاحب کے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ شاگرد میں خالص علمی اور ادبی مذاق پیدا کر دیتے تھے اور جب اقبال ایسی استعداد رکھنے والا طالب علم ان کے سامنے موجود ہو تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال اس عالم بے بدل کے قدموں میں بیٹھ کے کیا سے کیا بنتے چلے گئے ہوں گے۔

انھی دنوں شاہ صاحب اسکاچ مشن ہائی اسکول میں مدرس مقرر ہو گئے۔ انھوں نے اقبال کو بھی وہیں داخل کرلوا دیا۔ اب اقبال اسکول میں تو مولوی میر حسن سے درسی کتب پڑھتے تھے اور اس کے بعد ان سے دینیات کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اقبال مولوی میر حسن کا شاگرد ہونے کے باعث اپنے آپ کو کس قدر خوش نصیب خیال کرتے تھے اس کا اندازہ ان کے ان دعائیہ اشعار سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے یورپ جاتے ہوئے دہلی میں حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کی درگاہ پر کہے تھے ؎

وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کی کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

ایک اور شعر میں اپنے استاد کی خدمت میں یوں ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں ؎

مجھے اقبال اس سیّد کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

اقبال اپنے استاد مولوی میر حسن کا کس قدر احترام کرتے تھے اس کا اندازہ کئی واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں جب حکومت برطانیہ کی طرف سے پنجاب کے گورنر سر ایڈورڈ میکلیگن نے اقبال کو بتایا کہ حکومت برطانیہ انھیں سر کا خطاب دینا چاہتی ہے تو انھوں نے یہ شرط عاید کر دی کہ جب تک میرے استاد کو شمس العلماء کا خطاب نہیں ملے گا میں سر کا خطاب قبول نہیں کروں گا۔ سر ایڈورڈ میکلیگن اس جواب سے بہت پریشان ہوئے اور بولے کہ مولوی میر حسن نے تو کوئی کتاب نہیں لکھی۔ ان کے لئے خطاب کی سفارش کیونکر ہو سکتی ہے۔ اقبال نے کہا کہ ان کی

[1] "روزگار فقیر" جلد دوم صفحہ ۱۳۶

زندہ تصنیف میں ہوں۔ اقبال کا جواب میکلیگن نے حکومت برطانیہ تک پہنچایا۔ چنانچہ جب اقبال کو حکومت نے سر کا خطاب دیا تو ساتھ ہی مولوی میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب دیا۔

" بانگ درا" کے ظریفانہ کلام میں علامہ اقبال کا ایک قطعہ ہے۔

تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجیے

اس قطعے کے پہلے شعر کا اطلاق مولوی سید میر حسن کے انداز درس و تدریس پر ہوتا ہے۔ صرف اقبال ہی نہیں اگر دنیا کی دوسری نامور شخصیتوں کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح ہمارے سامنے آئے گی کہ ان نامور شخصیتوں کی زندگی کو اس قدر عظیم بنانے میں بڑی حد تک ان کے اساتذہ کا ہاتھ ہے۔

مدت ہوئی سپریم کورٹ پاکستان کے سابق چیف جسٹس، مسٹر جسٹس کارنیلیس نے پاکستانی ٹیلی ویژن پر بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا۔

IQBAL WOULD HAVE BECOME A GREAT A MAN, A CHIEF JUITKE APRIVY COUNCILLEUR, BUT NEVER IQBAL, HAD H [illegible] MEER HASAN AS HIS [illegible]ACHER.[1]

مولوی سید میر حسن کا سلسلہ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک جا ملتا ہے۔ سیالکوٹ کے ایک علمی گھرانے کے اس چشم و چراغ نے ۱۸ اپریل ۱۸۴۴ء کو اپنے ننھیال موضع فیروز والا ضلع گوجرانوالہ میں جنم لیا۔[2] ان کے والد سید میر محمد شاہ ایک پابند مذہب بزرگ تھے۔ سارے شہر سیالکوٹ میں بڑی عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ایک دفعہ بازار سے مسور کی دال خرید کر لائے۔ گھر پہنچے تو دال میں سے ایک پیسہ نکل آیا۔ دکان دار کے پاس واپس گئے اور پیسہ واپس کرتے ہوئے کہا "یہ تمہارا حق ہے۔ اس کے وزن کے برابر مجھے دال دے دو جو میرا حق ہے"[1]

تو سید میر حسن ایک ایسے ہی عظیم المرتبت بزرگ کے فرزند تھے جنہوں نے ہمیشہ اکل حلال ہی کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

مولوی سید میر حسن کا تاریخی نام رونق بخش (۱۲۵۸ھ) ہے۔ لڑکپن میں آپ کو کلام پاک حفظ ہو گیا تھا۔ "ایک روز آپ کے والد ماجد نے آپ کو قرآن پاک کا درس دیا۔ بعد میں میر صاحب کو سنانے کے لئے کہا تو آپ نے فرمایا " دیکھ کر سناؤں یا زبانی سناؤں" پھر آپ نے کلام پاک کا سبق زبانی سنا دیا۔"[2]

حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مولوی میر حسن نے اس دور کے علماء مولانا شیر محمد، مولانا محبوب عالم اور مولانا بشیر احمد سے عربی اور فارسی کا علم حاصل کیا اور سولہ سترہ برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے آپ بڑی حد تک عربی اور فارسی علوم پر حاوی ہو چکے تھے۔

فقیر سید وحید الدین مولوی سید میر حسن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "مولوی سید میر حسن جب تعلیم سے فراغت پا چکے تو ان کے والد نے چاہا کہ اپنے آبائی پیشہ، طب یونانی پر توجہ دیں اور اس فن میں ناموری حاصل کریں۔ آمدنی کے لحاظ سے بھی یہ پیشہ بہت منفعت بخش تھا مگر مولوی صاحب کو اس پیشے سے طبعاً لگاؤ نہ تھا۔ وہ [illegible] لیکن فطرت کے نباض تھے، انسانی اجسام کے نباض نہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد روزگار کے لئے کچھ دیکھ تو کرنا تھا چنانچہ ایک مسجد میں امام مقرر ہوئے اور دن گزرنے کے بعد

---

[1] اقبال ایک بڑے آدمی بن گئے ہوتے، چیف جسٹس بن گئے ہوتے، پریوی کونسلر بن گئے ہوتے لیکن اگر انھیں مولوی میر حسن ایسا [illegible] تو وہ اقبال نہیں بن سکتے تھے۔

[2] یہ روایت صحیح نہیں ہے کہ سید میر حسن سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔

[1] شمس العلماء مولوی سید میر حسن "حیات و افکار" (ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین) مطبوعہ اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور ۱۹۸۱ء صفحہ ۱۸۔

[2] ایضاً - ص ۲۰

جب ایک شخص کھانا لے کر آیا" مولوی میر حسن نے کھانا لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ احساس خودداری اور غیرت سادات نے ان پر ایسی کیفیت طاری کردی کہ بے ہوش ہو کر مسجد کے صحن میں گر پڑے۔ بس یہ واقعہ مسجد کی امامت کا دراپ سین تھا۔"[1]

مسجد کی امامت سے فارغ ہونے کے بعد پھر قوت لایموت کا مسئلہ سامنے آیا۔ چنانچہ انھوں نے اسی ضلع اسکول میں جہاں سے وہ فارغ التحصیل ہوئے تھے ملازمت کی درخواست دی۔ یہ ۱۸۶۱ء کی بات ہے۔ یہاں انھیں نو روپے ماہانہ کی ملازمت ملی لیکن یہاں کا ماحول انھیں راس نہ آیا۔ لہٰذا اگلے برس انھوں نے اسکاچ مشن اسکول میں ملازمت کی درخواست دے دی۔ اس اسکول کے انچارج ایک پادری تھے۔ ان کی زیرِ ہدایت ایک فارسی داں نے مولوی میر حسن کا انٹرویو لیا۔ اور ان کی قابلیت سے اتنا متاثر ہوا کہ پادری نے فوراً پندرہ روپیہ ماہانہ پر اسکول میں ان کا تقرر کر دیا۔ لیکن اس زبانی تقرر کے فوراً بعد جب پادری نے اُن سے پوچھا کہ آپ کو کسی اسکول میں پڑھانے کا تجربہ بھی ہے تو آپ نے صدق مقال کے پیش نظر نفی میں جواب دیا تو پادری نے اپنے پہلے حکم پر خط تنسیخ کھینچتے ہوئے ان کی تنخواہ پندرہ سے دس روپے ماہانہ کر دی ——— اور اسی دس روپے ماہانہ سے اس نابغہ کی باقاعدہ ملازمت کا آغاز ہوا۔ لیکن اسی تقرر کے ساتھ ہی مولوی صاحب کا تبادلہ وزیر آباد کر دیا گیا۔ جہاں وہ چھ سال تک کام کرتے رہے۔ ۱۸۶۸ء میں اسکاٹ مشن نے ان کا تبادلہ اسکاٹ مشن مڈل اسکول سیالکوٹ میں کر دیا جسے ستی کا سکول بھی کہتے تھے۔ اس اسکول کی ۱۸۶۹ء کی رپورٹ میں لکھا ہے

ESPECIALLY IN THE VERNACULAR DEPARTMENT WE LACKED ENERGY BUT I HOPE THAT AS A NEW TEACHER AND MOST EXCELENT SCHOLAR IN ARABIC AND PERSIAN HAS BEEN

[1] روزگار فقیر جلد اول صفحہ ۳۰۵

APPOINTED A GREAT CHANGE MAY SOON TAKE PLACE.[1]

اسی طرح ۱۸۷۰ء کی رپورٹ میں آپ کی علمی اور تدریسی قابلیت کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے۔

THE RULE TO WHICH I REFERED IN NOTICING THE SADAR BAZAR SCHOOL, AS OBTAINING WITH RESPECT TO THE STUDY OF VERNACULAR, IS EVEN MORE RIGIDLY OBSERVED IN THE MAIN SCHOOL, OUR ORIENTAL LITERATURE CLASSES UNDER MOLVÉ MEER HASAN, WE ARE I THINK JUSTLY PROUD OF HE IS BY FAR THE BEST AND MOST THOROUGH TEACHER I EVER MET, WITH, AND IT IS NOT LONG BEFORE THE PUPILS CATCH HIS ENTHUSIASM FOR ARABIC PHILOSOPHY AND PERSIAN POETRY[2]

[1] شمس العلماء مولوی میر حسن - حیات و افکار - ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین صفحہ ۳۸، ۳۹ بالخصوص ہمارے ورنیکلر ڈیپارٹمنٹ میں سرگرمی اور مستعدی کی کمی تھی لیکن مجھے امید ہے کہ اب جبکہ ایک نئے استاد کا جو عربی اور فارسی کے ایک جید عالم ہیں تقرر کر دیا گیا ہے (اس سبب سے) ایک بڑی تبدیلی نمایاں ہو سکتی ہے۔

[2] شمس العلماء مولوی میر حسن - حیات افکار - ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین صفحہ ۳۸، ۳۹۔

صدر بازار اسکول کو دیکھنے کے بعد میں نے ورنیکلر کی تعلیم کے باعتراف

تو گویا سنے محمد اقبال کو ایسے نابغۂ عصر کا شاگرد بننے کا شرف حاصل ہوا جس کی نگاہ فیض سے سونا کندن بن گیا۔

اقبال کے علاوہ بھی اردو فارسی اور عربی کے علماء کی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے موجود ہے جن میں مولوی سید میر حسن کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ اس طویل فہرست میں چند نام یہ ہیں رائے بہادر جسٹس کنور سین، سر اکھرک سنگھ، مولوی ظفر احسان، آغا صفدر، مولوی محمد ابراہیم میر اور سید حامد شاہ۔ باقی حضرات کا ذکر اسی باب میں کسی اور جگہ آئے گا۔

مرے کالج میگزین 'سیالکوٹ' کے مختلف شماروں میں مولوی میر حسن کے متعلق ان کے ہمعصروں اور شاگردوں کی متعدد تحریریں موجود ہیں جن میں انھوں نے دل کھول کر مولوی صاحب کے علم و فضل کی تعریف کی ہے۔ اس وقت جب کہ میں جموں میں بیٹھ کے یہ کتاب لکھ رہا ہوں میرے سامنے پروفیسر جی ایل گپتا پرنس آف ویلز کالج جموں کی ایک تحریر ہے جس میں وہ لکھتے ہیں

'HE WAS A GIANT OF LEARNING AND HIS ERUDITION IN ARABIC LITERATURE WAS UNRIVALLED'[1]

پروفیسر جی ایل گپتا کی یہ تحریر ۱۴-۱۹۱۳ء کی ہے جو کہ کالج میگزین سیال کوٹ کے ۳۹-۱۹۳۸ء کے شمارے میں صفحہ نمبر ۱۲ پر شائع ہوئی ہے۔

مولوی سید میر حسن اس طرح کے عالم نہیں تھے کہ ہر وقت علم کو اپنے اوپر مسلط کئے رکھیں اور ساری زندگی خشک وعظ و پند کی نذر کر دیں بلکہ مولانا روم کے اس شعر کے مصرع دوم کے مصداق ؎

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

علم ان کا یار تھا یا دوسرے لفظوں میں علم ان کا جزو مزاج اور جزو زندگی تھا اور اسی علم کی بدولت وہ اپنی گفتگو میں ایسے نازک اور لطیف علمی نکتے پیدا کرتے تھے کہ کبھی تو محفل احباب زعفران زار بن جاتی تھی اور کبھی سننے والوں کے ذہنوں میں جلا پیدا ہو جاتی تھی۔ ان کے چند ایک لطائف جو علمی نوادر کی حیثیت رکھتے ہیں ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین نے اپنی گراں قدر تصنیف شمس العلماء مولوی سید میر حسن — حیات و افکار" میں بیان کئے ہیں جن میں سے چند ایک یہاں درج کئے جا رہے ہیں۔

ایک مرتبہ سر سید پنجاب آئے تو گرمیوں کا موسم تھا، لو چل رہی تھی۔ میر صاحب پاس بیٹھے تھے۔ سر سید نے کہا "کیا یہ پنجاب ہے جسے انتخاب ہفت کشور کہتے ہیں"۔ میر صاحب نے برجستہ جواب دیا "جی ہاں اگر ہندوستان جنت نشان ہے تو پنجاب فرد انتخاب ہفت کشور ہے"۔

ایک روز آپ بازار میں ایک پھلوں کی دکان سے گذرنے لگے تو دکان دار نے کہا "مولوی صاحب سردا بہت اچھا ہے لیجئے"۔

پوچھا۔ کیا بھاؤ ہے؟

جواب ملا آٹھ آنے سیر۔

میر صاحب نے پنجابی میں کہا "سئیں بھائی میتوں نئیں سردا" (یعنی مجھے قبول نہیں۔)

ایک مرتبہ گرمی کے موسم میں ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگوں کو پانی پلایا جا رہا تھا۔ کسی نے کہا۔ بھائی جگ مولوی صاحب کی طرف لاؤ۔ آپ نے برجستہ فرمایا "جگ آئے گا تو جگ دیکھے گا"۔

سب جون

حصول کے سلسلے میں جس قاعدہ کا ذکر کیا ہے وہ قاعدہ ہمارے اسکول میں زیادہ شدت اور ضابطے کے ساتھ مروج ہے۔ میرا خیال ہے کہ مولوی میر حسن کی زیر نگرانی ہماری جو ادبیات کی کلاسیں جاری ہیں ان پر ہم ہر طرح سے فخر کر سکتے ہیں۔ مجھے اسی زندگی میں جن اساتذہ سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے یہ ان سب میں بہترین اور کامل ترین استاد ہیں اور بہت جلد ہی ان کے شاگرد عربی، فلسفے اور فارسی شاعری کے لئے اس ذوق و شوق اور جوش اور ولولے کو اپنا لیں گے جو ان مضامین کے لئے استاد کے دل میں ہے۔

[1] وہ علم و فضل کے اعتبار سے ایک غیر معمولی قد و قامت کے انسان تھے اور عربی ادب میں ان کا تبحر علمی اپنی مثال آپ تھا۔

سا گر چند ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز کا رنگ سیاہ تھا۔ میر صاحب کا معتقد تھا۔ ایک بار میر صاحب سے ملنے کے لئے آیا تو کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی اور بوندا باندی ہو رہی تھی۔ میر صاحب سے ملتے ہی کہنے لگے دیکھئے، موسم کتنا اچھا ہے۔ میر صاحب نے جواب دیا "آپ تو کالی گھٹا بن کر آئے ہیں۔"

ایک دفعہ میر صاحب زیادہ بیمار ہو گئے۔ حکیم حسام الدین حامد معالج تھے۔ جب کبھی حامد علاج کے لئے آتے تو کہتے آپ نے مرزا صاحب (مرزا غلام احمد) کی بیعت کیوں نہ کر لی۔ اب بھی کر لیجئے۔" دو چار مرتبہ سن کر چپ رہے۔ حامد شاہ نے بار بار جب یہی کہا تو میر صاحب نے فرمایا "مرزا صاحب نہ ہوئے ہرڑ ہوئے۔"

میر صاحب کالج جاتے وقت ٹائم پیس ایک رومال کے پلو میں باندھ کر لے جاتے تھے تاکہ وقت کی پابندی برقرار رہے۔ ایک دفعہ کالج کی اسٹاف میٹنگ میں دو منٹ دیر سے پہنچے۔ پرنسپل نے آپ کو گھڑی دکھا کر کہا۔ "مولوی صاحب آپ نے پورے دو منٹ ہمیں انتظار کرایا۔" میر صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "پھر کیا ہوا۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے اس دنیا میں کتنے برس آپ کا انتظار کیا ہے۔" پرنسپل صاحب کی عمر اس وقت بیتالیس سال تھی اور میر صاحب ان سے کوئی تیس برس بڑے تھے۔

سیالکوٹ کی اس صدی کی تیسری دہائی میں بالغوں کے لئے نائٹ اسکول قائم ہوئے تھے۔ میر صاحب بالغوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ ایک موقع پر حروف ابجد تحریر کیا۔ پھر لکھ کر ایک شخص سے پوچھا "لو بھائی ال (لام) بتاؤ"۔ اس نے "ص" پر انگلی رکھ دی۔ دوسرے سے پوچھا کہ "م بتاؤ" تو اس نے "ی" پر انگلی رکھ دی۔ مولوی صاحب نے فرمایا "شاباش، شاباش"۔ پروفیسر محمد دین بھی نے پوچھا کہ یہ شاباش کا کون سا موقع ہے؟ آپ نے فرمایا "انھیں اتنا تو معلوم ہے کہ ل، م، ص اور ی حروف ہیں۔"

سیالکوٹ میں ایک محلے کا نام کتراؤں کا محلہ ہے۔ آپ نے اس سے ایک لطیفہ پیدا کیا۔ فرمایا "ایک دفعہ باہر سے کوئی آدمی سیالکوٹ آیا اور پوچھا کہ کتوں کا محلہ کون سا ہے، جواب ملا کتوں کا محلہ کوئی نہیں، کتراؤں کا محلہ ہے۔ وہ بولا کہ کئی برس پہلے آیا تھا تو سنا تھا کہ یہاں کتوروں کا محلہ ہے میں نے سمجھا کہ اب وہ کتورے یقیناً کتے بن چکے ہوں گے۔

۱۴/ جون، جولائی، ۱۹۸۶ء

مذکورہ بالا لطائف میں سے بعض مولانا عبد المجید سالک نے "ذکر اقبال" (۱۹۵۵ء) اور بعض ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی نے "روایات اقبال" (۱۹۷۷ء) میں نقل کئے ہیں۔ گویا یہ تمام لطائف مولوی سید میر حسن کے زمانے سے آج تک سینہ بہ سینہ چلے آرہے تھے۔ بہر کیف دو ایک لطائف اس سلسلے میں اور بھی سن لیجئے، جن کا ذکر مولانا عبد المجید سالک نے "ذکر اقبال" میں کیا ہے۔

اس زمانے میں ایک شاعر منشی میراں بخش جلوہ سیالکوٹی تھے جو اکثر انجمن حمایت اسلام میں ہی آ کر نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ ذات کے قصاب تھے۔ عرضی نویسی کرتے تھے۔ خدا جانے کہاں سے شعر کہنے کی لت پڑ گئی۔ شعر کیا تھے بس بکوڑے سے تل لیا کرتے تھے۔ ان دنوں محلے کے ایک کلرک اہل زماں تھے جلوہ صاحب ان کو اکثر شعر سنایا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے آ کر کہا۔ "بھائی جلوہ تمہارے شعروں سے چھیچھڑوں کی بو آتی ہے۔" جلوہ صاحب تاؤ کھا کر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو اپنے اشعار سنا کر پوچھا کہ یہ اشعار کیسے ہیں، شاہ صاحب نے فرمایا سچ پوچھتے ہو تو تم نے اشعار کا جھٹکا کر دیا ہے۔

چرچ مشن والوں نے ایک مرتبہ ایک بہشتی کو نوکر رکھا۔ ہندوؤں نے کہا کہ مسلمان رکھا ہے تو ہندو بھی رکھا جائے۔ شاہ صاحب نے سنا تو فرمایا۔ معاف فرمایئے ہندو بہشتی نہیں ہو سکتا۔

مولوی ظفر اقبال بیان کرتے ہیں۔ ایک دفعہ شاہ صاحب مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ نماز کے بعد میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کا جوتا اٹھا لیا اور لے کر چلا کہ مسجد کے باہر ان کو پہنا دوں گا۔ شاہ صاحب نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا یہ جوتا میرا ہے اور میرے ہاتھ سے چھین لیا۔

مولوی سید میر حسن بڑے وسیع المشرب اور فراخ دل انسان تھے۔ ان کے حلقۂ احباب، ملنے والوں اور شاگردوں میں ایک بڑی تعداد ہندوؤں اور سکھوں کی تھی اور یہ سب مولوی صاحب کے علم و فضل اور کشادہ دلی کے باعث ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اس ضمن میں ان کے شاگرد عالم رائے کا ذکر اس سے قبل آ چکا ہے۔

مولوی عبدالعزیز گوجرانوالہ کے ایک بزرگ تھے جن سے ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے مولوی سید میر حسن مرحوم کے بارے میں بہت معلومات حاصل کیں۔ مولوی عبدالعزیز کا کہنا ہے کہ "مولوی سید میر حسن کے پاس ہندو بھی بہت آتے تھے۔ ہری چند گوجرانوالہ کا تحصیلدار اُن کی بہت عزت کرتا تھا۔ تعطیلات میں ان کے گھر بھی جاتا تھا۔" یہ اور اسی طرح کی متعدد روایات ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کی مرتبہ کتاب "روایات اقبال" میں موجود ہیں۔ جن میں سے چند نیچے درج کی جا رہی ہیں۔

سید ذکی شاہ اپنے والد محترم سید میر حسن کے دو شاگردوں رکن الدین اور نہال سنگھ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رکن الدین اور نہال سنگھ دونوں میٹرک، ایف۔ اے۔ بی۔ اے۔ ایم۔ اے اور مقابلے کے امتحانوں میں برابر اول و دوم نکلتے رہے۔ رکن الدین سشن جج کے عہدے پر پہنچ کر پنشن پر ہوئے۔ نہال سنگھ پہلے ڈپٹی کمشنر بنے، پھر پٹیالہ میں انھیں وزارت کا عہدہ ملا۔

ان دونوں عقیدت مندوں کا یہ حال تھا کہ رکن الدین والد سے ملنے آتے تو واپس ہوتے وقت پچھلے پاؤں چلتے کبھی پیٹھ والد صاحب کی طرف کر کے نہ چلتے۔ نہال سنگھ کی یہ کیفیت تھی کہ گاڑی پر سوار کہیں جا رہے ہوتے جہاں والد صاحب پر نظر پڑتی، گاڑی روک کر اتر جاتے اور ساتھ ساتھ پیدل چلتے۔ ان کی موجودگی میں کبھی گاڑی پر سوار نہ ہوتے۔[1]

آپ کا ایک شاگرد دیوان سنگھ تھا۔ وہ سیشن جج بن گیا تھا۔ وہ بھی آپ کا بڑا احترام کرتا تھا۔ جہاں آپ کو دیکھتا گاڑی سے اتر پڑتا۔[2]

آپ کا ایک شاگرد جگن ناتھ دہلی میں تھانے دار تھا۔ اس کے ہیں بیٹے تھے رام جی داس، کش داس اور گوپال داس۔ والد صاحب ایک مرتبہ دہلی گئے میں بھی ساتھ تھا۔ ان کے مکان پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ سب مرد میرٹھ گئے ہوئے ہیں۔ عورتوں نے والد کی آواز پہچان لی۔ اصرار سے ٹھہرایا اور پوچھا کہ آپ کیا کھائیں گے؟ فرمایا کھچڑی کھانا تیار کرو، ہم پھر آکر کھائیں گے۔" دو گھنٹے کے بعد ان کے ماں بیٹے تو سب واپس آگئے تھے۔ ان کو عورتوں نے تار دے کر بلا لیا تھا۔ کھانا کھایا۔ جس کمرے میں انھیں ٹھہرایا گیا تھا اس میں نماز کے لئے مصلیٰ اور پانی کا لوٹا انھوں نے خود رکھا۔ ان لوگوں نے بڑی خاطر مدارات کی۔ گاڑی لے کر سارے شہر کی سیر کرائی۔

---

[1] [2] بروایت سید ذکی شاہ۔

اور بہت سے شیشے دیئے۔[1]

چیت رام صاحب ... دھیانوں خواجہ حافظ ... الوان پڑھنے آتے تھے۔ اس زمانے میں میر صاحب کی آنکھوں کا اپریشن ہونے والا تھا۔ والد صاحب نے پہلے سبق پڑھایا پھر اپریشن کرایا۔[2]

شیخ گلاب دین جو ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر اقبال) کے عزیز دوستوں میں سے تھے، سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور بہت غریب آدمی تھے لیکن شرارتوں میں بھی بے مثال تھے۔ شرارت ہی کی بنا پر اسکول سے نکال دیئے گئے تھے۔ میرے والد ایک روز بازار سے گذر رہے تھے۔ دیکھا کہ بازار میں دیا سلائی بیچ رہے ہیں۔ یہ دیکھا تو کہا۔ بھئی صبح آنا۔ ہم سفارش کر کے اسکول میں داخل کرا دیں گے۔ پھر لالہ بھیم سین کے بیٹے لالہ کنور سین کو پڑھانے کی ڈیوٹی لگا دی۔ (گلاب دین کو) دو روپے ماہوار ٹیوشن ملنے لگی۔ لالہ کنور سین پڑھ لکھ کر پہلے لاہور لا کالج کے پرنسپل اور بعد میں جموں و کشمیر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہوئے۔ مولوی میر حسن کی بہت تعریف کرتے تھے۔[3]

والد صاحب کے شاگردوں میں کنور سین اور نہال سنگھ عربی کے ایم۔ اے تھے کنور سین بات بات میں بے تکلف قرآنی آیات پڑھتے تھے۔ انھوں نے ایک میڈل کالج میں رکھا جس کا نام "بھیم سین میر حسن میڈل" تھا۔ (بھیم سین ان کے والد کا نام تھا) یہ میڈل اس شخص کو دیا جاتا تھا جو عربی میں اچھے نمبر لے کر پاس ہوتا۔ کنور سین کے والد کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بات چیت میں اس طرح بلا تکلف کلام پاک کی آیات استعمال کرتے تھے کہ ان پر حافظ کلام ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

ایک دفعہ نہال سنگھ ایک عمدہ کمبل جموں سے والد صاحب کے لئے لایا۔ والد صاحب نے فرمایا کہ مجھے ضرورت نہیں۔ وہ زبردستی کمبل دے کر چلا گیا کہ آپ کا ہدیہ میں کسی اور کو نہیں دے سکتا۔[5]

والد صاحب کوئی چیز کسی شاگرد سے نہیں لیتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کا ایک شاگرد بال گوبند مصری لایا۔ خلاف عادت مصری رکھوا لی۔ رات کو کھانسی اٹھی تو کہا مصری کی ڈلی لاؤ۔ اس کے کھانے سے کھانسی رک گئی۔ تو کہا بال گوبند کو بلاؤ۔ وہ آیا تو فرمایا کہ تم محبت سے مصری لائے تھے۔ اس سے بھی

---

[1] [2] [3] [4] [5] بروایت سید ذکی شاہ

بہت فائدہ ہوا ۔ ۔ اور مصری ۔ ۔ ۔ دکیا فرمایا ۔ ۔ ۔ نہیں"۔[1]

جگن ناتھ فقیر چند اور جوگی رام آپ کے شاگرد بیماری میں روزانہ عیادت کے لئے آتے تھے۔ ۱۲ ستمبر کو منگل کے دن جگن ناتھ کسی وجہ سے نہ آسکا۔ شام کو آدمی بھیج کر بلوایا اور فرمایا "آج کیوں نہیں آئے"، اس نے کہا۔ "کچھ کام تھا"۔ تو نے بھی ہم نے کہا "تم سے مل لیں"۔ وہ مل کر گیا تو اگلے دن صبح کو آپ کا انتقال ہو گیا۔"[2]

کنور سین اتنا ادب کرتا تھا کہ ایک مرتبہ والد صاحب جلسے میں آئے تو انھیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور جھک کر سلام کیا۔ جب تک آپ بیٹھ نہ گئے کنور سین کھڑا رہا۔[3]

بیماری کے دنوں میں ان کا ایک ہندو شاگرد ہیم راج ملنے آیا۔ وہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز تھا۔ میں اور میرا بھائی نقی پاس بیٹھے تھے کہ بولے علیحدگی میں بات کرنا ہے۔ والد صاحب نے مجھے اور میرے بھائی کو اٹھوا دیا تھوڑی دیر کے بعد ہیم راج چلا گیا تو بلا کر فرمایا اس شخص کا خلوص دیکھو تیس ہزار روپے لا کر میرے قدموں پر رکھ دئے اور کہا کہ شاید آپ کو بیماری میں تکلیف ہو۔ میں نے یہ روپیہ آپ کی برکت سے کمایا ہے، آپ ہی کی برکت سے کمانے کے قابل ہوا ہوں۔ میں نے بہت کچھ کہہ سن کر روپیہ واپس کیا۔[4]

ان کا ایک شاگرد بہاری لال عربی فارسی خوب جانتا تھا۔ کالج والوں کی تجویز تھی کہ اسے والد صاحب کی جگہ پر پروفیسر بنا دیا جائے۔ وہ ملازمت کا خواہش مند بھی تھا۔ پرنسپل سے جا کر ملا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ والد کی جگہ پر مقرر کیا جا رہا ہے تو بولا "پرنسپل صاحب! میں بھوکا مر جاؤں گا لیکن اپنے استاد کی کرسی پر نہ بیٹھوں گا"۔ یہ کہہ کر واپس آگیا۔[5]

مولوی صاحب کے شاگرد کنور سین وقتاً فوقتاً کچھ ہدیے کے طور پر مولوی صاحب کی خدمت میں بھیجتے رہتے تھے۔[6]

یہ مولوی صاحب کے ہندو اور سکھ شاگردوں کی بات تھی۔ ان کے حلقۂ احباب میں ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد کم نہیں تھی۔

---

[1] [2] [3] [5] بروایت سید ذکی شاہ

[4] بروایت پروفیسر محمد دین کھوکھر۔ روایات اقبال صفحہ ۱۹۔

مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی نے ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کو سید میر حسن کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے بتایا کہ "وہ سادہ مزاج اور خوددار انسان تھے۔ گھر پر جو طلبہ پڑھنے آتے تھے ان کی خدمت خود کرتے تھے۔ کسی سے کوئی معاوضہ نہ لیتے تھے۔ ہندو، سکھ، عیسائی ان سے کمال عزت سے پیش آتے تھے۔[1]

جہاں تک ان کے ہندو، سکھ اور عیسائی صاحب کا تعلق ہے ان میں لالہ بھیم سین (رائے بہادر لالہ کنور سین کے والد) آر۔ ایم۔ سی پیٹرسن، سردار دیال سنگھ، شو رام، ڈاکٹر جان ڈبلیو ینگسن، ریورنڈ جارج واٹ، ریورنڈ ولیم اسکاٹ اور ریورنڈ جان گیرٹ نے اس زمانے میں بڑا نام پایا۔ آخر الذکر چار حضرات کا تعلق چرچ مشن کے ساتھ تھا۔ مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی نے سید میر حسن کے ہندو اور سکھ احباب میں لالہ نرنجن داس سب جج، سردار حضورا سنگھ وکیل، پنڈت بیلی رام وکیل، سردار کھڑک سنگھ (مشہور قومی لیڈر) اور سردار جرأت سنگھ ڈسٹرکٹ جج (ریٹائرڈ) کا بالخصوص ذکر کیا ہے۔

مولوی سید میر حسن کی علمی فتوحات کا تھوڑا سا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ دراصل ان کے علمی کارناموں کی تفصیل کے لئے دفتر چاہیئے یہاں صرف چند ایک کا ذکر کیا جائے گا۔ سید ذکی شاہ اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے جب سید میر حسن کا تبادلہ وزیر آباد سے سیالکوٹ ہوا۔ کہتے ہیں کہ میرے والد نے اس وقت تک اقلیدس نہیں پڑھی تھی پادری نے ایک مرتبہ کہا۔ آپ جن کو اقلیدس پڑھاتے ... اس زمانے میں ایک استاد سردار دیال سنگھ بڑا اقلیدس داں تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اور والد صاحب سے عربی فارسی پڑھتا تھا۔ اس نے کہا آپ تیار ہو جائیں میں اقلیدس پڑھا دوں گا۔ چنانچہ روزانہ اس سے پڑھ کر جماعت کو پڑھاتے تھے۔ اس طرح خود اپنی محنت سے والد صاحب نے اقلیدس میں بھی کمال حاصل کر لیا۔ والد صاحب کا مشغلہ تعلیم و تدریس کے سوا کچھ نہ تھا۔ شاگردوں سے وقت مقرر کر لئے جاتے تھے۔ اسکول اور کالج جاتے اور آتے پڑھاتے تھے۔ بازار سے سودا سلف لینے جاتے تو اس وقت بھی کوئی نہ کوئی طالب علم کتاب لئے ساتھ ہو جاتا۔ کچھ نہ کچھ پڑھا جاتا۔ ان کی زندگی کا پروگرام یوں تھا۔ تہجد کے لئے اٹھتے نماز پڑھتے

---

[1] روایات اقبال ص ۱۹۴۔

صبح کی نماز کے بعد قبرستان چلے جاتے۔ واپس آتے تو کھانا کھاکر اسکول چلے جاتے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب سیالکوٹ میں کالج نہ تھا، صرف اسکول تھا۔ گرمیوں میں اسکول سے گھر نہیں آتے تھے۔ وہیں لڑکے روک لیتے اور کھانا گھر سے چلا جاتا۔ وہیں کھانا کھاکر دھوپ کم ہونے تک بیٹھے رہتے۔ اس اثنا میں شاگردوں کو بھی سبق دیتے رہتے۔" [1]

ملک کے علمی اور ادبی ماحول میں ان کے لئے احترام کا یہ عالم تھا کہ "۱۸۹۵ء کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں جو لاہور میں منعقد ہوئی تھی ان کی ممبری کا کارڈ کھو گیا۔ بارش شروع ہو گئی۔ جلسے میں گئے تو والنٹیروں نے روک لیا۔ نواب محسن الملک نے دور سے انھیں دیکھا تو پکار کر کہا ارے انھیں روکتے ہو جن کی بدولت کانفرنس ساری ہے۔ پھر آپ نے انھیں ڈائس پر بٹھایا۔" [2]

سیالکوٹ اس زمانے میں قادیان کے بعد بڑی حد تک احمدیت کا مرکز تھا۔ سید میر حسن احمدی نہیں تھے لیکن مرزا غلام احمد کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم ہمیشہ برقرار رہے۔ مرزا صاحب بھی ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ سید میر حسن نے اس دوستی کو اپنے مذہبی عقائد پر حاوی نہیں ہونے دیا اور اپنے عقائد کے متعلق وہ اپنے خیالات کا اظہار بے جھجک اور دو ٹوک کیا کرتے تھے۔ بقول سید ذکی شاہ "ہمارے بھوپھی سید خورشید انور کو دق کا عارضہ ہو گیا تھا۔ والد صاحب انھیں حکیم نورالدین کو دکھانے کے لئے قادیان لے گئے۔ مسجد میں جاکر اس دریچے میں بیٹھے جہاں مرزا صاحب بیٹھتے تھے۔ لوگوں نے وہاں سے اٹھا دیا۔ پھر وہ دریچے کے پاس بیٹھ گئے۔ مرزا صاحب آئے تو سلام کا جواب دے کر بیٹھ گئے اور متوجہ نہ ہوئے۔ والد نے کہا شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔" مرزا صاحب نے دیکھا تو بڑی محبت اور تپاک سے ملے۔ عبدالکریم کی ڈیوٹی لگا دی کہ مولوی صاحب کو اچھی جگہ ٹھہراؤ اور دو باتوں کی خاص تاکید کی، ایک یہ کہ مولوی صاحب کو صبح صبح بھوک لگتی ہے انھیں ہر وقت ان کی مرضی کے مطابق کھانا دیا جائے۔ دوسرے انھیں کتابوں کا بہت شوق ہے۔ اچھی کتابیں پڑھنے کے

[1] روایات اقبال صفحہ ۔

[2] بروایت سید محمد ذکی روایات اقبال صفحہ ۱۷۔

لئے دی جائیں۔ ساتھ ہی کہا کہ صبح چائے میرے ساتھ پیئیں۔ بہت تواضع کی۔ جب واپس لوٹے تو مرزا صاحب والد صاحب کے یکّے کے ساتھ دو میل چل کر پکی سڑک پر آئے اور کہا کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ باتیں علیحدگی میں ہوئیں اور کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ کیا باتیں کیں۔ چند باتوں کا ذکر والد صاحب نے کیا لیکن انھیں راز میں رکھنے کا کوئی عہد نہ تھا۔ مثلاً مرزا صاحب نے پوچھا۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں کیا یہ دکان داری ہے؟ والد صاحب نے جواب دیا۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔ میں نے آپ کے رجسٹر نہیں دیکھے۔ آمدنی و خرچ کے حساب کی پڑتال نہیں کی۔ اس حالت میں کیا کہہ سکتا ہوں۔۔۔ یہ باتیں بھی ہوئیں۔

مرزا صاحب: مسیح فوت ہو گیا؟

والد صاحب: ہو گیا ہوگا۔

مرزا صاحب: وہ دوبارہ آئے گا تو کیا کرے گا؟

والد صاحب: یہ مسیح کو معلوم ہے۔

بعض لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے مرزا صاحب کی بیعت کی؟ جواب دیا کہ نہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا مرزا صاحب نے بیعت کے لئے کہا ہی نہیں؟ فرمایا۔ "نہیں۔" [1]

مرزا غلام احمد اور سید میر حسن کی دوستی اور عیسائیوں میں ان کے احترام کا یہ عالم تھا کہ جب مرزائیوں اور عیسائیوں میں مذہبی مباحثے ہوتے تھے تو مولوی سید میر حسن کو حَکَم بنایا جاتا تھا۔

اسی طرح مرزائیت کے متعلق سید ذکی شاہ نے ایک اور واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "میرے والد کے چچیرے بھائی حکیم حسام الدین عمر میں پانچ سال ان سے بڑے تھے۔ وہ بڑے سخت مزاج اور درشت تھے۔ ان کے مقابلے میں والد صاحب بہت ہی حلیم الطبع تھے۔ میر حسام الدین احمدی ہو گئے تھے وہ مرزا صاحب کی ایک دو کتابیں لے کر والد صاحب کے پاس آئے اور کچھ عبارتیں دکھاکر غصے میں بولے۔

کہو مسیح فوت ہو گیا کہ نہیں؟

[1] روایات اقبال۔ صفحہ ۲۰۔

والد صاحب: فوت ہو گیا ہوگا۔

میر حسام الدین: پھر آئے گا؟

والد صاحب: میر فیض اللہ مر کر آئے ہیں؟

میر حسام الدین یہ سن کر بے اختیار بولے "بے ایمان، کافر، منکر خدا و رسول" اور یہ کہتے ہوئے چلے گئے۔ میر حسام الدین کی نظر کمزور تھی۔ ان کے مکان اور ہمارے مکان کی ڈیوڑھی ایک تھی۔ کوئی شخص سیڑھیوں پر اترتا چڑھتا تو پاؤں کی آہٹ سن کر پوچھتے "کون ہے؟"۔ ایک دن میر حسام الدین سیڑھیوں سے اتر رہے تھے کہ والد وہاں پہنچ گئے۔ میر صاحب نے پوچھا "کون ہے؟" والد نے کہا "بے ایمان، خدا و رسول کا منکر"۔ میر حسام الدین نے یہ سنتے ہی انھیں جوش محبت سے گلے لگا لیا۔ بولے "بھیا! تمھاری انہی باتوں نے تو ہمیں مارا ہوا ہے۔"[1]

مادۂ تاریخ نکالنے کے فن میں سید میر حسن کو جو مہارت حاصل تھی وہ بڑے بڑے تاریخ گو علماء کے لئے باعث رشک تھی۔ سر سید احمد خاں کا جب انتقال ہوا تو ڈاکٹر محمد اقبال نے کلام پاک کی اس آیت سے تاریخ نکالی:

اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَھِّرُکَ

اس وقت ان کے پاس سید ذکی شاہ بیٹھے تھے۔ ان سے کہا کہ ابھی کالج جا کر شاہ صاحب کو یہ تاریخ سناؤ۔ چنانچہ سید ذکی شاہ فوراً کالج گئے اور اپنے والد محترم کو علامہ اقبال کی نکالی ہوئی تاریخ سنائی۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں نے بھی تاریخ نکالی ہے اور وہ تاریخ تھی "غَفَرَ لَہٗ"۔

مولانا حالی نے "حیات جاوید" میں ان دونوں تاریخوں کا ذکر کیا ہے لیکن تاریخ نکالنے والوں کا نام کسی بھی مادۂ تاریخ کے ساتھ درج نہیں۔ انھیں نام معلوم نہیں ہوں گے۔ چنانچہ سید میر حسن نے مولانا حالی کو خط لکھ کر ان کے اس سہو کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی تو مولانا حالی نے معذرت کرتے ہوئے جواب میں لکھا کہ مجھے ناموں کا علم نہیں تھا۔ "حیات جاوید" کے دوسرے ایڈیشن میں یہ دونوں نام لکھ دوں گا لیکن مقام حیرت ہے کہ یہ نام "حیات جاوید" کے کسی ایڈیشن میں شامل نہ ہو سکے۔

سید میر حسن کی دیانت داری اور خوش معاملگی اس بلند مرتبے کی تھی کہ انھوں نے کفن دفن کا سارا خرچ اپنے انتقال سے قبل اپنے بیٹوں کے حوالے کر دیا تھا۔ کچھ مدت تک وہ اپنے بیٹے کے تانگے میں کالج جاتے رہے۔ تانگے کا یہ سارا کرایہ انھوں نے انتقال سے پہلے اپنے بیٹے کو عطا کر دیا۔ چنانچہ انتقال کے وقت کسی دوست، عزیز یا رشتہ دار کا کوئی روپیہ پیسہ ان کے ذمے نہیں تھا۔

مولوی ظفر اقبال نے ان کی دیانت داری اور فرض شناسی کے چند واقعات ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کو سنائے تھے ان میں سے یہ ایک واقعہ ہے۔

مولوی ظفر اقبال کہتے ہیں کہ "میں جب لاہور میں تعلیم پا رہا تھا تو ایک دفعہ یونی ورسٹی کے کسی امتحان کے پرچے مولانا سید میر حسن کے پاس تھے۔ میرے ایک استاد نے ایک طالب علم کے پرچے کے لئے مجھے مولانا کے پاس بھیجا اور تاکید کی کہ اس طالب علم کو اچھے نمبر دے دئے جائیں۔ مجھے مولانا میر حسن کی روش کا علم تھا لیکن استاد کے حکم سے مجبور ہو گیا۔ صبح کے وقت مولانا قبرستان میں جاتے تھے اس لئے اسٹیشن سے سیدھا قبرستان کے رستے پر ہو لیا کہ وہاں ملیں گے انھیں پیغام پہنچا دوں گا۔ وہ ملے تو میں نے سلام عرض کیا۔ پھر تمہید کے طور پر عرض کیا کہ اپنے استاد کا پیغام لے کر آیا ہوں جو آپ کو پہنچانا چاہتا ہوں خود میرا اس معاملہ میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ شاہ صاحب نے پیغام سنا تو فرمایا کہ یہ لوگ دین اور دنیا کو الگ سمجھتے ہیں۔ ان سے کہہ دیجئے کہ پیغام مل گیا ہے میں خوب غور کروں گا۔ پھر پرچہ دیکھوں گا۔ اگر گنجائش ہوئی تو ضرور نمبر دوں گا، لیکن مولانا روم کے قول کے مطابق لقمہ ہی دیا جا سکتا ہے حلق بنا کر نہیں دیا جا سکتا۔ یونی ورسٹی سے جو ہمارا معاہدہ ہے اس کی پابندی نہ ہو تو جو کچھ ملتا ہے وہ حلال نہ رہے حرام ہو جائے۔"[1]

مولانا میر حسن کے ہر روز صبح قبرستان جانے کا ذکر اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مولانا تیس اکتیس برس کے تھے کہ ان کی بہن سخت بیمار ہوئیں۔ انھوں نے بہن کے علاج معالجے میں کوئی کسر نہ چھوڑی

---

[1] روایات اقبال صفحہ ۲۳۔

[1] روایات اقبال صفحہ ۵۶

لیکن مریضہ کی حالت بد سے بدتر ہوگئی۔ ایک دن انتہائی مایوسی کے عالم میں اس کی بہن کے منھ سے نکلا کہ میں مرجاؤں گی اور کوئی میری قبر پر فاتحہ پڑھنے بھی نہیں آئے گا۔ سید میر حسن آب دیدہ ہوگئے اور اپنی بہن سے انھوں نے وعدہ کیا کہ میں ہر روز تمھاری قبر پر آکر فاتحہ پڑھا کروں گا۔ چند روز بعد ان کی بہن نے جان جان آفریں کے سپرد کی اور مولانا سید میر حسن زندگی بھر اس عہد کو نبھاتے رہے۔ وہ ہر صبح قبرستان جاتے تھے اور اپنی بہن اور دوسرے لوگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھ کے گھر واپس آتے تھے۔

قناعت پسند ایسے تھے کہ جب وہ مرے کالج سیال کوٹ میں پڑھاتے تھے تو انھیں پنجاب یونی ورسٹی لاہور، علی گڑھ کالج اور گارڈن کالج راولپنڈی سے ملاوہ آئے اور زیادہ تنخواہ کی پیش کش ہوئی لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ سیال کوٹ مشن والوں نے اس وقت میری قدر دانی کی جب مجھے کوئی نہیں جانتا تھا اب میں بڑھاپے میں ان کے کالج کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ پنجاب یونی ورسٹی لاہور کی تو یہ خواہش تھی کہ مولانا محمد حسین آزاد کی سبک دوشی کے بعد مولوی سید میر حسن ہی یونی ورسٹی میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوں۔ یونی ورسٹی میں مولانا محمد حسین آزاد کی جانشینی ایک بڑا اعزاز تھا لیکن وہ فقر و استغنا کا ایک مجسمہ تھے۔ انھوں نے مرے کالج سیال کوٹ کے ساتھ اپنا رشتہ منقطع کرنا گوارا نہ کیا۔ اقبال اکثر کہا کرتے تھے کہ میں نے استغنا اپنے استاد شاہ صاحب ہی سے سیکھا ہے۔ مرے کالج میں آپ کے علم و فضل کی بدولت آپ کو جس عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کا نائب جب کالج میں پہنچتا تھا تو اکثر ایسا ہوتا تھا کہ پرنسپل صاحب خود ان کی انگلی پکڑ کے انھیں ملنے کے آیا کرتے تھے۔ جب مختلف درجوں کا ٹائم ٹیبل بنتا تھا تو پرنسپل صاحب کی یہ ہدایت ہوتی تھی کہ ٹائم ٹیبل نافذ ہونے سے پہلے مولوی صاحب کو دکھا دیا جائے اور اگر وہ اس میں اپنی سہولت کے پیش نظر کوئی تبدیلی کرنا چاہیں تو یہ تبدیلی کر دی جائے۔

آپ مارچ ۱۹۲۶ء میں جو اسی برس کی عمر کو پہنچ کر مرے کالج سے سبک دوش ہوئے۔ اس وقت آپ کی تنخواہ ایک سو بیس روپے ماہانہ تھی۔ کالج کے منتظمین نے ان کی ستر روپے ماہوار پنشن مقرر کی۔ پنشن کے بارے میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ کالج نے اس سے قبل کسی بھی سبک دوش ہونے والے استاد کی پنشن مقرر نہیں کی تھی۔ مولوی میر حسن پہلے پروفیسر تھے جنھیں سبکدوش ہونے کے بعد کالج نے پنشن دی اور ساتھ ہی نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا۔

آپ کا انتقال ۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو ہوا ——

خدا کی رحمتوں کا نور برسے مرنے والے پر!

تو یہ تھا اس زمانے کا سیال کوٹ اور اس زمانے کا علمی، ادبی اور ثقافتی ماحول جس میں ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو اقبال نے جنم لیا۔

▲▲

غزلیں

جاوید شاہین

موج بلا ٹھہر گئی ایک عذاب رہ گیا
عمر گذارنے کو اب شہر خراب رہ گیا

گھرا کے تیرگی سے یوں باندھا تمام رخت دل
اس کے سرد طاق پر صبح کا خواب رہ گیا

رنگ حنا اتر گیا کیسے صبا کے ہاتھ سے
راہ بہار میں کہاں تھک کے گلاب رہ گیا

دریا جو چپ ہے اس قدر دیتا نہیں ہے کچھ خبر
پانی ہے یا کہ سطح پر صرف سراب رہ گیا

سمٹے سے پہلے اس کے نقط جانے بکھر گئے کہاں
سر سواؤں میں کہیں میرا خواب رہ گیا

ساحل بچا کے جان و دل جانے وہ کب نکل گیا
میرے اور اس کے درمیان کوئی حساب رہ گیا

کیا کہوں کتنا مجھے کون ہے کھانے والا
میں کہ ہوں گھر میں فقط ایک کمانے والا

صبح کو ہانک کے لے جاتے ہیں آخر کار مجھے
گھر بلا لیتا ہے تب کو کوئی تھانے والا

اس کا عمرہ تھا مرے دل کی گرفتاری تک
آگے سب کار محبت ہے زمانے والا

میں اور اس طرح کنارے کو پکڑ کر بیٹھوں
رنگ دریا ہے بہت ہوش اڑانے والا

یہ جو باہر ہے یہاں رت ہے اداسی والی
موسم دل بھی ہے پتوں کو گرانے والا

سن پڑا جیسے کبھی لکھ لی ہے غزل اب تنہا میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں اس کو کوئی گانے والا

کب سے کھڑے ہیں راہ میں جانے دھر ہے کس طرف
پوچھو یہ لوگ کون ہیں ان کا نگر ہے کس طرف

دن کا کٹا ہوا بدن دیتا نہیں ہے کچھ سراغ
شام کے پاؤں ہیں کہاں صبح کا سر ہے کس طرف

ویسے تو سارا ہی شجر ہے مرے گھر کے وسط میں
اس کی پھلی ہوئی کوئی شاخ مگر ہے کس طرف

سارا کمال ہے یہی رکھتا ہے دھیان میں یہی
آنکھ ہے اس کی کس جگہ اور نظر ہے کس طرف

رات کی ساری گشت کا حال اسے بتا ذرا
چپ ہے کس گھروں میں اور چور کا ڈر ہے کس طرف

شام میں یہ کیسا شور ہے گھر سے نکل کے دیکھنا
بات اڑی ہوئی ہے کیا اصل خبر ہے کس طرف

غزلیں

سہیل احمد زیدی

نگاہ جرح پہ یا پھر لبِ شجر رکھوں
سپر ہے ایک میں اس کو کدھر کدھر رکھوں

دیارِ دل ہی سے فتنے تمام اٹھتے ہیں
کہیں رہوں مگر اس شہر پر نظر رکھوں

وہ یوں نہ مانے تو اندر سے توڑ دوں اس کو
کہ اک ہاتھ پہ شمس ایک پہ قمر رکھوں

سوالِ وصل پہ انکار کر چکا ہے وہ
ملے جواب تو اک مسئلہ دگر رکھوں

محاصرہ میں ہواؤں کے ہے مکاں ایسا
کدھر کروں کوئی روزن کدھر کو در رکھوں

عجیب کام یہ اس نے لگا دیا مجھ کو
خبر ہر ایک کو دوں خود کو بے خبر رکھوں

ڈوبتے منظر میں شامل ہو گیا
یاد رہ جانے کے قابل ہو گیا

دور تک میدان اک دم صاف تھا
پھر وہ خود اپنے مقابل ہو گیا

پہلے وہ سنتا رہا پھر جانے کیوں
داستاں میں خود بھی داخل ہو گیا

راہ کھوٹی کی تو منزل مل گئی
بیچ سے ٹوٹا تو کامل ہو گیا

لے گیا مجھ سے چھپا کر دوست کو
لمحۂ بے درد محمل ہو گیا

تھا حصارِ ہجر میرے چار سمت
ہر طلسمِ وصل باطل ہو گیا

غزلیں

سہیل احمد زیدی

جب بھی کھولی عشق نے آنکھ ایک ہی نقشہ رہا
ہاتھ میں کچا گھڑا، اور سامنے دریا رہا

رات بھر اس کی چمکتی آنکھ کا چرچا رہا
تھا تو میں اونچے مچانوں پر مگر ڈرتا رہا

جانے کیا کچھ ڈھونڈتا تھا جادۂ برباد میں
ایک سایہ صحن دل میں دیر تک ٹھہرا رہا

گھوم پھر کر تھک گئے تو گھر کی یاد آنے لگی
لگ گئے ہم راہ پر صحرا صدا دیتا رہا

آسماں پر روشنی کی کشتیاں چلتی رہیں
شہر اور اس کا مقدر کہر میں ڈوبا رہا

سارے موسم اپنے اپنے پھول رکھتے ہیں سہیل
ہجر میں کالے گلابوں کا چمن مہکا رہا

بے فیض کتابوں کے اوراق کھنگالوں گا
اپنے سے نہ ملنے کی کچھ راہ نکالوں گا

پڑھ لے نہ مرا چہرہ، بے ربط لکیروں کا
وہ شخص جب آئے گا اخبار اٹھا لوں گا

تقدیر کی مٹھی میں ہیں عشق و ہوس دونوں
کیا کچھ مجھے کرنا ہے سکے کو اچھالوں گا

دل اس کا دکھانا کیا، جب حال وہ پوچھے گا
کچھ بات بتا دوں گا، کچھ بات چھپا لوں گا

یہ ایسا پرایا پن فطرت ہی میں شامل ہے
صحرا میں بھی ٹھہروں تو دیوار اٹھا لوں گا

غزلیں

سہیل احمد زیدی

خورشید کی کرن سے اک رابطہ بنا رکھو
دہلیز پہ راتوں کی خوابوں کا دیا رکھو

بے نور ہوئے انجم بے صوت ہوئی بستی
اس ہجۂ ساکت میں اک حرفِ دعا رکھو

موسم ہے نمو کا یہ شاید وہ شجر نکلے
مٹی میں ثمر رکھو پانی میں ہوا رکھو

اک رسم چلی نکلے اک رنگ نیا ابھرے
تپتی ہوئی دھرتی پر اک برگِ حنا رکھو

ہر موجۂ ہوس اٹھ کر تم تک نہ پہنچ پائے
محمل سے ذرا پہلے اک دشتِ قضا رکھو

ہستی بھی سہیل اپنی مت بیچ میں لاؤ
وادی طویٰ ہے یہ نعلین جدا رکھو

آنکھ کا امتحان کیسا تھا
دور سے آسمان سا تھا

رات جلتا رہا دیا جس پر
وہ کھنڈر وہ مکان کیسا تھا

راستے بھر نہ کوئی پیڑ آیا
پھر وہ اونچا مچان کیسا تھا

کچھ خبر ہی ملی نہ سورج کی
سر پہ یہ سائبان کیسا تھا

قتل کرنے سے قبل کی ساعت
مجھ پہ وہ مہربان کیسا تھا

ہاں یہ تم ذکر کس کا کہتے تھے
ہاں تو وہ مہربان کیسا تھا

شہر کے وسط سے ذرا ہٹ کر
وہ جو اک تھا مکان کیسا تھا

میں کہ اب شہر کا نشان ہوا
تھا مگر بے نشاں کیسا تھا

اک حواب کی مانند ہیں دانش بھی جنوں بھی
تھے شہر بہت راہ میں اور دشت فسوں بھی

اس گھر سے کوئی خاص تعلق نہیں میرا
مانے گا نہ کوئی اسے میں لاکھ کہوں بھی

قدموں کو نہ اٹھنے دیا آسیبِ سفر نے
کاندھوں کو دبائے رہا کچھ رخت زبوں بھی

جھیلوں میں اترتے رہے نور گہ پردے
جھاڑی میں الجھتا رہا اسلاف کا خوں بھی

اک گونج الگ صاف رہی شور نفس سے
بجتا رہا کم کم ہی سہی سازِ دروں بھی

کچھ اپنے مقدر میں بھی لکھی نہیں دنیا
جینے کا سلیقہ مجھے آتا نہیں یوں بھی

غزل

سید عارف

کیا جانے رات کیسی کہانی سنا گئی
بچوں کے ساتھ ساتھ ہمیں نیند آ گئی

نکلے تھے دھوپ بانٹ کے اندھی گلی سے ہم
گھر کا چراغ رات کی آندھی بجھا گئی

ہم کو بھی اپنے آپ سے انکار تھا بہت
سورج کی آنکھ پھول سے شبنم گرا گئی

اتنا تو یاد ہے کہ جزیرہ بھی پاس تھا
اُبھرے تو موج موج سمندر دکھا گئی

یوں بھی تو جھوٹے موٹے سرِ کردار ہم ہی تھے
لیکن زمیں کی پیاس کہانی سنا گئی

راتوں سے زخم کھا کے پلٹنے کی دیر تھی
جگنو سی آنکھ راہ میں چاندی بچھا گئی

اندر سے ٹوٹ ٹوٹ کے برباد ہو گئے
عارف یہ زندگی ہے کہ رشتے نبھا گئی

غزلیں

سید عارف

آنکھوں میں خواب، خواب ہی منظر سجاؤ گے
کیا آدمی کو اور بھی پتھر بناؤ گے

پاگل ہوا کی مار سے خود آشنا رہو
ورنہ سمندروں میں کہیں ڈوب جاؤ گے

ٹوٹو گے زندگی کو بچانے کے نام پر
بے نام منزلوں کی کہانی سناؤ گے

سب بند ٹوٹ جائیں گے جب باڑھ آئے گی
منظر تم اس بہار کا کس کو دکھاؤ گے

ظالم ہو تو ہاتھ میں تلوار بھی رکھو
مردہ نگر کا خواب کہاں تک چھپاؤ گے

خود کو تعبیر کی الجھن سے بچا لائے ہیں
خواب آنکھوں کے سمندر سے اٹھا لائے ہیں

چاندنی اپنی اچھالیں گے یہ ننھے جگنو
راستے ہم بھی اندھیروں کے لگا لائے ہیں

اب ضرورت ہی نہیں زادِ سفر کی ہم کو
روشنی پھول سی آنکھوں سے چرا لائے ہیں

دل کہ بنجارہ ہے بستی میں نہیں ٹھہرے گا
کن سوالوں کی بھلا طرزِ ادا لائے ہیں

یوں کسی بات سے انکار بھلا لگتا ہے
لوگ تو روز نیا اپنا خدا لائے ہیں

غزلیں

سید عارف

آنکھیں بجھی بجھی سی ہیں پیغام کچھ نہیں
اب کے بچھڑ بھی جائیں تو الزام کچھ نہیں
بنجر زمیں کا خواب کھلونے کا خواب ہے
لیکن ہمارے واسطے اب کام کچھ نہیں
جذبوں کی سرد آگ سے جل جائیں گے بدن
روکو اسے کہ رات کا انجام کچھ نہیں
زخمی پرند نیند کے نشے میں چور ہیں
زینے اترتی رات ترے دام کچھ نہیں
مچھلی پھسل کے ہاتھ سے دریا میں گر گئی
لذت حنوں کی اس تو لب بام کچھ نہیں

باتیں ہوئی تھیں رات بڑی آسماں لگی
مجھ کو تو روز روز کی یہ داستاں لگی
زندہ ہوا ہے کون اندھیروں کے درمیاں
اک چیخ روشنی سے بڑی بدگماں لگی
یوں بھی حساب دینے سے عاجز ہے زندگی
نیکی بدی کے نام سے اچھی دکاں لگی
چٹکی میں دھوپ تھام کے پھینکی کسی نے کیوں
دنیا نئے ثبات مجھے ایسی جاں لگی
شعلے بھڑک رہے ہیں جزیرے ہیں چار سو
کشتی مرے وجود کی آ کر کہاں لگی

عید

- ایک ماہ کی عبادت اور ریاضت کی بعد بے پایاں مسرتوں کا پیام لاتی ہے
- جذباتی ہم آہنگی اور اتحاد کو مستحکم کرتی ہے۔
- اس مبارک موقع پر چھوٹے بڑے امیر و غریب سب بلا تفریق مذہب و ملت ایک دوسرے سے گلے ملتے جاتے ہیں۔
- اس طرح اس عظیم تہوار سے مساوات اور جمہوریت کو بھی فروغ حاصل ہوتا ہے۔

آئیے اس پُرمسرت موقع پر یہ عہد کریں

- یہ کہ اس تیوہار میں ہم آہنگی، یک جہتی، مساوات اور جمہوریت کا جو جذبہ پنہاں ہے ہم اپنی روزمرہ کی عملی زندگی میں ہر سطح اور ہر قدم پر اسی جذبے سے کام کریں گے تاکہ ہمارا ہر روز روزِ عید بن جائے۔

یاد رکھئے!

- ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب اسی مادرِ وطن کے فرزند ہیں۔
- وطن اور انسانیت ــــ دونوں رشتے سے سب بھائی بھائی ہیں
- ہمارے یہ سب تیوہار اسی اخوت اور بھائی چارے کا درس دیتے ہیں۔

آئیے یہ بھی عہد کریں کہ!

- اپنے اپنے فکر و عمل سب کو اس بھائی چارے کے رنگ میں اس طرح رنگ لیں کہ یہ رنگ کبھی مٹ نہ پائے!

وہ پریم اور پیار بھریں انگ انگ میں
ستر کروڑ لوگ ہیں سب ایک رنگ میں

جاری کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اترپردیش

خضر راہ

ابوالکلام قاسمی

'خضر راہ' بانگ درا کی طویل نظموں میں اپنی بعض فنی خصوصیات کی بنا پر ایک ممتاز نظم ہے۔ 'خضر راہ' کی دوسری اور خصوصیات کے باوصف ڈرامائی صورت حال کی تخلیق اور 'واحد متکلم' کو شاعر اور حضرت خضر کے کرداروں میں منقسم کر کے پیش کرنے کے انداز نے اس نظم کو اس پس منظر کا حامل بنا دیا ہے جو 'شمع و شاعر' کے علاوہ بال جبریل کی بعض بلند مرتبہ نظموں کا خاصہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بانگ درا کی نظموں میں اقبال کے فکری اور فنی ارتقا کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اس کا موازنہ 'بال جبریل' میں شامل 'ذوق و شوق' اور 'مسجد قرطبہ' جیسی نظموں سے نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ ذوق و شوق اور مسجد قرطبہ میں سامنے آنے والی فنی پختگی کا پیش خیمہ اگر بانگ درا کی کسی ایک نظم کو قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ نظم 'خضر راہ' کے علاوہ کوئی اور نہیں —— اقبال چونکہ جذبات اور محسوسات کے بجائے (عام فہم انداز میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ) تصورات اور خیالات کے شاعر ہیں۔ اس لئے اقبال کی فن کاری کے راستے کا سب سے بڑا پتھر بھی ان کا فلسفہ اور فکر ہی ہے۔ اقبال کے شعری ارتقا پر غور کرتے ہوئے اگر اس سوال سے صرف نظر کر لیا جائے کہ شاعر اقبال کیونکر اپنی فکری بلند آہنگی اور خطیبانہ لب و لہجہ سے نبرد آزما نظر آتا ہے اور کس طرح فنی تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے؟ تو فن کار اقبال کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کی طویل نظموں کے سلسلہ میں نظم کی صنف کے ساتھ انصاف کرنے اور اس صنف کو ایک 'عضویاتی کل' کے طور پر برتنے کا مسئلہ بھی معرض بحث میں رہا ہے۔ اس ضمن میں ہمیں مدافعت کا رویہ اختیار کرنے کے بجائے حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اپنانے کی ضرورت ہے۔ نظم جدید کے نام سے کرنل ہالرائیڈ اور محمد حسین آزاد کے ذریعہ شروع کی جانے والی تحریک کو اگر ہم اپنے سامنے رکھیں تو ہمیں یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہ ہوگی کہ اقبال دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں نظم گوئی کی تاریخ اور اس صنف کے اعلیٰ نمونوں سے واقف ہونے کے باوجود اپنی زبان کی حد تک یکہ و تنہا اس صنف میں بعض بلند پایہ تخلیقات سامنے لانے میں مصروف تھے۔ ان کے گرد و پیش میں نظم گوئی یقیناً ان گنت شاعروں کی مشق سخن کا محور تھی مگر مشق سخن سے بلند ہو کر محض معدودے چند نمونے ہی اردو نظم کے ارتقائی سفر کے سنگ میل کی حیثیت اختیار کر سکے تھے۔ اس سیاق و سباق میں اقبال کی بعض طویل نظموں میں ربط و تسلسل کی کمی اور فارم کے بعض دوسرے نقائص کا جواز فطری معلوم ہوتا ہے۔ اقبال اپنی کمزوری سے واقف ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے اس نقص کی تلافی دوسرے فنی لوازم سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خضر راہ کے بہت سے شعر اور کم سے کم دو تین بند، نظم کے بیانیہ اور واقعاتی تسلسل کو مجروح

کرتے ہیں۔ مگر اس کا ازالہ اس جذباتی تسلسل سے ہو جاتا ہے جو اس نظم کے اشعار کو ابتدا میں ڈرامائی صورتِ حال سے تخلیق ہونے والے محور سے وابستہ رکھتا ہے۔ مزید براں یہ کہ موضوع کی مناسبت سے بہت سے تلازمات کا اہتمام اس نظم کے گرد ایک حصار قائم کیے رہتا ہے۔ اگر الفاظ شماری سے احتراز بھی کیا جائے تو کم از کم 'دریا' اور 'گرفتاری' کے مناسبات اور تلازمات کا سلسلہ پوری نظم میں ایک نوع کی تنظیم کا احساس ضرور دلاتا ہے۔ ——

ساحلِ دریا اس نظم میں محل وقوع بھی ہے اور مرکزی استعارہ بھی کہ 'دریا'، اقبال کی شاعری میں دنیا کے چند ممتاز شاعروں کی طرح وقت کے استعارے کے طور پر سامنے آتا رہا ہے۔ زمانِ مسلسل اور غیر منقسم وقت کے تصور پر اگر اقبال کے حوالے سے تفصیل میں نہ بھی جایا جائے، تب بھی دریا، یا ساحلِ دریا، کسی نہ کسی شکل میں اقبال کے تصورِ زماں کا عکس پیش کرتے رہتے ہیں۔ اقبال کے پیش کردہ مناظر میں دریا اور دریا کے کنارہ کے علاوہ غروبِ آفتاب کی تصویر ہمیں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ غروبِ آفتاب کے کسی نظام کا تابع ہونے یا دوسرے الفاظ میں اس کی گرفتاری کی ایک شکل ہے۔ جاوید نامہ میں یہ تصویر اس طرح نمایاں کی گئی ہے۔

عشق شور انگیز بے پروائے شہر — شعلہ او میرد از غوغائے شہر
خلوتے جوید بدشت و کوہسار — یا لبِ دریائے ناپیدا کنار
من کہ در یاراں نہ دیدم محرمے — بر لبِ دریا بہ آسودم دمے
بحر و ہنگامِ غروبِ آفتاب — نیلگوں آب از شفق لعلِ مناب
کور را ذوقِ نظر بخشد غروب — شام را رنگِ سحر بخشد غروب
بادلِ خود گفتگوہا داشتم — آرزوہا جستجوہا داشتم

مسجدِ قرطبہ میں بھی کم و بیش، منظر یہی ہے البتہ زاویۂ نگاہ کسی قدر بدلا ہوا ہے۔

وادیِ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی،
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

"خضرِ راہ' میں بھی اقبال کا خواب جاگتی آنکھوں کا خواب ہے۔ رات کے افسوں نے طائر کو آشیانوں میں اسیر کرا دیا ہے اور انجمِ کم ضو بھی طلسمِ ماہتاب میں گرفتار ہے۔ یہ افسوں اور اس گرفتاری کے تلازمات اور اس سے مناسبت رکھنے والی تراکیب نظم کے مختلف حصوں میں ان الفاظ کی شکل میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسیر، مستِ خواب، محوِ نظر، رہینِ جادہ، زنجیریٔ کشت و تخیل، بندگی، تسخیر، جادوگری، جادوئے محمود، خواب، حلقۂ گردن، غلامی، خواب آور، مسکرات وغیرہ —— اسی طرح دریا بھی اپنے تلازمات کا جال نظم کے مختلف حصوں پر پھیلائے ہوئے ہے۔ دریا، تصویرِ آب، اضطراب، موجِ مضطر، طوفاں، کشتیٔ مسکین، چشمۂ سلسبیل، جوئے کم آب، بحرِ بیکراں، حباب، قلزم، سراب، شبنم، مانندِ آب، نیل، ساحل، رفتارِ دریا، سمندر وغیرہ وغیرہ۔ ان تلازمات اور کلیدی الفاظ سے مناسبت رکھنے والی تراکیب سے زیرِ بحث نظم میں اقبال کے لفظیاتی نظام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لفظیات کا جو نظام بانگِ درا کی نظموں میں اپنے وجود کا صرف احساس دلاتا ہے، وہ بالِ جبریل کی شاعری میں زیادہ نمایاں اور مستحکم ہو کر سامنے آتا ہے۔ یہی نظام 'خضرِ راہ' کے بہت سے غیر مربوط اشعار کو ایک خاص قسم کے ربط اور ہم آہنگی سے آشنا کرتا ہے اور فکری یا فلسفیانہ بالادستی کے باوجود منفی نقطۂ نظر سے وحدت کا احساس دلاتا ہے۔

'خضرِ راہ' کا آغاز موثر ڈرامائی صورتِ حال کے ساتھ ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ: ـ

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب

بظاہر یہ دو مصرعے آگے آنے والی بات کے پس منظر کا بیان ہیں۔ مگر اس بیان میں ساحلِ دریا پہ محوِ نظر ہونے اور گوشۂ دل میں 'جہانِ اضطراب' کو چھپانے کا جو ذکر ملتا ہے وہ پوری نظم میں آگے

چل کر رونما ہونے والے واقعات اور کیفیات کا اشارہ ہے۔ چند اشعار کے بعد حضرت خضر سے ملاقات اور گفتگو میں حضرت خضر کا یہ کہنا کہ "اے جویائے اسرار ازل! چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب" محض اتفاقیہ جملہ یا خضر کا الہامی طرز تخاطب نہیں ہے۔ اقبال نے پہلے ہی شعر میں صورت حال کچھ ایسے الفاظ میں بیان کی ہے کہ "گوشۂ دل میں جہان اضطراب چھپائے ہوئے" سے بجائے خود چشم دل کے وا ہونے اور تقدیر عالم کے بے حجاب ہونے کا تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کہ شاعر کے ساحل دریا پہ محو نظر ہونے سے بھی خضر کی زبان سے "اے جویائے اسرار ازل" جیسے الفاظ کے ساتھ تخاطب اختیار کرنے کا جواز (نظم کی ابتدا سے ہی) موجود نظر آتا ہے ــــ اب ذرا اس منظر کو ملاحظہ کیجیے جس کے لئے پہلے شعر سے پس منظر تیار کیا گیا ہے۔

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفل شیر خوار
موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجم کم ضو گرفتار طلسم ماہتاب

ان شعروں میں شاعری اور مصوری جیسے دو فنون لطیفہ ایک دوسرے میں گھل مل گئے ہیں۔ دریا کے ساتھ بہتے ہوئے پانی کا جو تصور وابستہ ہے وہ اپنی جگہ برقرار ہوتے ہوئے دریا کے نرم سیر ہونے اور ایک خاص فضا میں دریا پر تصویر آب کا گمان گذرنے کی جزئیات اور حرکت اور سکون کے متضاد عناصر کی مدد سے تصویر میں رنگ بھرنے کا کام لیا گیا ہے۔ پہلے شعر میں نظر کی حیرانی تجسس کا استعارہ بن جاتی ہے۔ نظر کی حیرانی سے جو پیکر ابھرتا ہے اس کے بالمقابل شب کا سکوت افزا، ہوا کا آسودہ اور دریا کا نرم سیر ہونا سکون اور ٹھہراؤ کی فضا کی تخلیق کرتے ہیں۔

پہلے مصرع کے تینوں حصے دریا پر تصویر آب کا گمان گذرنے کے عمل میں ایک قسم کی شدت پیدا کرتے ہیں ــــ دوسرے شعر میں ایک خوبصورت تشبیہ ہے، 'موج مضطر' کے دریا کی گہرائیوں میں مست خواب ہونے کی۔ تشبیہ دی گئی ہے 'طفل شیر خوار' کے گہوارے میں سونے سے۔ یہ ایک مرکب تشبیہ ہے۔ توازن اس طرح استوار کیا گیا ہے کہ گہرائی کے ساتھ گہوارہ 'مست خواب' ہونے کے ساتھ سو جاتا ہے، اور موج مضطر کے ساتھ طفل شیر خوار کے الفاظ متوازی طور پر استعمال کئے گئے ہیں۔ لفظی مناسبات اور صوتی ہم آہنگی کے علاوہ مشبہ بہ کو پہلے مصرعے میں اور مشبہ کو دوسرے مصرعے میں پیش کرنے کی وجہ سے بھی اس شعر میں ندرت کا احساس ہوتا ہے ــــ اگر غور کیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ زیر بحث نظم کے ابتدائی چند اشعار میں فنی تنظیم اور منصوبہ بندی کی اور بھی کئی شہادتیں موجود ہیں۔ نظم کا واحد متکلم اپنی ذات اور اپنے معروض (دریا) کے جن عناصر کو ابھارنا چاہتا ہے ان میں ایک طرف 'دریا' ہے تو دوسری طرف 'گوشۂ دل'، ایک طرف 'موج مضطر' محو خواب ہے تو دوسری طرف شاعر کے دل میں 'اک جہان اضطراب' چھپا ہوا ہے اور ایک جانب شاعر کی نظر حیران ہے تو دوسری جانب دریا پر اسے تصویر آب کا شبہہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تصویر بھی حیرانی کی کیفیت کا مظہر ہوتی ہے۔ اس طرح نظر کی حیرانی 'تصویر کی حیرانی' کا عکس بن جاتی ہے۔ دریا کی گہرائی میں موج مضطر کے محو خواب ہونے کے بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بات گوشۂ دل میں اک جہان اضطراب کے چھپے ہونے کے تلازمۂ خیال بھی ہے ــــ اس نظم کے ابتدائی تین شعروں میں جس خاموشی، سکون اور سناٹے کی فضا بندی کی گئی ہے اس کا آخری حصہ چوتھا شعر ہے۔ اس شعر میں رات کے افسوں سے طائر کو آشیانوں میں اسیر اور انجم کم ضو کو طلسم ماہتاب میں گرفتار دکھلایا گیا ہے۔ مگر یہ دونوں مصرعے دو مناظر کا بیان نہیں ہیں۔ بلکہ 'افسوں' اور 'گرفتار' کے لفظوں سے پابندی اور اسیری سے اس لفظی نظام کو جس کا احساس ابتدائی اشعار کے ہر مصرعے میں

ہوتا ہے' ایک قسم کا تسلسل بھتا گیا ہے۔ شاعر کی نگاہ کی پابندی 'محو نظر' کی ترکیب سے ظاہر ہوتی ہے۔ گوشۂ دل سے جہانِ اضطراب کے مخفی ہونے کا اندازہ ہوتا ہے، ایک مصرعے میں طفل شیر خوار اطمینان کی نیند سوتا نظر آتا ہے اور یوں وہ اسیر غفلت ہے۔ تو دوسری جگہ موج مضطر دریا کی گہرائیوں میں مست خواب دکھائی دیتی ہے۔ اس سلسلے کا اختتام ان مناظر پر ہوتا ہے کہ طائر آشیانوں میں اسیر ہیں اور ستارے ماہتاب کے طلسم میں گرفتار ہیں۔ گویا واحد متکلم کی ذہنی اور قلبی کیفیات سے لے کر مناظر فطرت اور شاعر کے معروض تک تمام چیزوں میں پابندی اور اسیری کا کوئی نہ کوئی عنصر ضرور موجود ہے۔ ابتدائی اشعار کے سیاق و سباق میں ان انسلاکات کے اہتمام کی توجیہہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ نظر کی حیرانی اور دل کی گھٹن کے بیان کو خارجی حوالوں کے ذریعہ اسی طرح شدت تاثر کا حامل بنایا جا سکتا تھا ــــ مگر بعد کے شعر پر غور کیجئے تو بات صرف اتنی ہی نہیں معلوم ہوتی اس کا سبب یہ ہے کہ اگلے شعر میں ایک ایسے اسطوری کردار کا حوالہ آنے والا ہے جو زندگی کی دوسری معمولی پابندیاں تو درکنار، زمان و مکان کے دائرے میں بھی اسیر نہیں دکھائی دیتا۔ ؎

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیک جہاں پیما خضر
جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب

وہ وقت یا زمان جس کا استعارہ 'دریا' بنا تھا اور جس کے دست و برد سے دنیا کی کوئی چیز محفوظ نہیں، یہاں خضر اس وقت کی گرفت سے آزاد ہے' وقت کا سفر ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی جانب ہوتا ہے اور یہی وقت جس انسان پر اثر انداز ہوتا ہے اس کی عمر کا سفر بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے کی طرف ہوتا ہے۔ اگر مختلف مدارج کی یہ ترتیب باقی نہ رہے تو وقت کی بالا دستی کے کوئی معنی باقی نہیں رہتے۔ خضر کا تعارف یوں کرایا جاتا ہے کہ ع جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب۔

اس مصرعے سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ یہاں پیری کا سفر رنگ شباب کی طرف ہے۔ یہ مصرع وقت کی زنجیر سے خضر کے آزاد ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور اس سے پہلے کے مصرعے میں خضر کو 'پیک جہاں پیما' کہہ کر 'زماں' کے ساتھ 'مکاں' کو بھی خضر کی دست رس میں دکھایا گیا ہے۔ اس طرح پابندی اور اسیری کی پوری فضا میں حضرت خضر کی آزادی اور زمان و مکان کے شکنجے سے تحفظ۔ حضرت خضر کی شخصیت کے کئی پہلو نمایاں کرتا ہے۔ اگلے شعر میں حضرت خضر کی زبان سے جو بات ادا ہوتی ہے اس سے بھی خضر کی شخصیت کا ایک اہم پہلو سامنے آتا ہے۔ پوری صورت حال کچھ اس فن کاری کے ساتھ پیش کی گئی ہے کہ خضر کا شاعر سے 'جویائے اسرار ازل' کے الفاظ سے تخاطب اختیار کرنا غیر فطری نہیں معلوم ہوتا۔ شاعر کی نظر کی حیرانی اور پوری صورت حال میں غور و خوض اور ارتکاز کی جو کیفیت نمایاں ہو رہی ہے، اس میں 'جویائے اسرار ازل' کی شناخت کر لینا خضر جیسی شخصیت کے لئے کوئی مشکل کام نہیں رہ جاتا۔ ابتدائی اشعار میں 'محو نظر' اور 'تھی مصطر حیراں' سے ظاہری نگاہوں کے متجسس ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خضر شاعر کو چشم دل کو وا کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مناظر فطرت اور ان کی باریکیاں شاعر کی آنکھوں پر جس طرح روشن ہیں، اس کا اندازہ مناظر کی پیش کش سے ہوتا ہے' اس لئے اب صرف بصیرت کی ضرورت ہے (ع ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں) بصیرت کے بغیر تقدیر انسانی (بمعنی قسمت) اور تقدیر کائنات (بمعنی مقدرات عالم) بے حجاب نہیں ہو سکتی۔

دل میں یہ سن کر بپا ہنگامہ محشر ہوا
میں شہید جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

وہ دل' جس کے ایک گوشے میں جہان اضطراب چھپا ہوا تھا اور وہ آنکھیں جو سراپا تحیر اور تجسس تھیں انھیں خضر کی ذرا سی توجہ سے اظہار کے وسائل مل جاتے ہیں۔ وہ اضطراب جو مخفی تھا اب ہنگامۂ محشر بن جاتا ہے اور وہ نگاہیں جو شہید جستجو تھیں ان کو اظہار کی زبان

مل جاتی ہے۔ اس شعر کے ساتھ بہت سے سوالیہ نشانات اور استفہامی کیفیات کا خاتمہ ہوتا ہے اور اظہار و ابلاغ کی ڈرامائی کیفیت واضح ہو کر سامنے آتی ہے ــــ شاعر کا مکالمہ جن الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے ان کا ایک حصہ نظم کے پہلے بند کے ایک منظر کی توسیع ہے۔ اور دوسرا حصہ ایک قرآنی تلمیح کے توسط سے ہمارے ذہن کو ماضی کی دور اندیشیاں اور دانش ورانہ روایت کی طرف مبذول کرتا ہے۔

اے تری چشم جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار
جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش
'کشتیِ مسکیں' 'جانِ پاک' 'دیوارِ یتیم'
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

پہلے شعر کو نظم کے ابتدائی اشعار میں شامل ایک مصرع 'موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب' کو سامنے رکھ کر پڑھیے تو اس شعر کی بلاغت اپنے نقطۂ عروج پر نظر آئے گی یعنی وہ موجِ مضطر جس کی گہرائیوں میں مست خواب ہونے کا ذکر پہلے آچکا ہے، خضر کے لئے دریا میں سوئے ہوئے یا خاموش ہنگامے (موجِ مضطر) یا طوفان، کوئی مخفی حقیقت نہیں ہیں۔ نظم کی لفظیات اور رمافیہ کے اس مربوط نظام سے پتہ چلتا ہے کہ خضرِ راہ کے پہلے بند میں محل وقوع کے بیان، فضا بندی اور بعد میں پیش آنے والے واقعات و مکالمات کے درمیان ناگزیر تعلق ہے ــــ جہاں تک 'کشتیِ مسکیں'، جانِ پاک اور دیوارِ یتیم کی تلمیحات کا سوال ہے تو یہ تلمیحات بھی اپنی اصل کے اعتبار سے نظم کی پوری فضا سے ہم آہنگ ہیں۔ قرآن کریم کی 'سورۂ کہف' میں جس مقام حضرت خضر سے حضرت موسیٰ کی ملاقات کا ذکر آیا ہے وہ بجائے خود ایک ڈرامائی انداز لئے ہوئے ہے۔ اس ملاقات کا محل وقوع بھی اسی طرح دریا کا کنارہ ہے جس طرح شاعر اور خضر کی تخیلاتی ملاقات کا محل وقوع ساحلِ دریا ہے۔ موسیٰ کے ساتھ کلام اللہ کی صفت وابستہ ہے اور شاعر بھی صاحب کلام ہونے کی وجہ سے شاعر کہلاتا ہے۔ شاعر کی نگاہیں حقائق اشیاء کے سلسلے میں متجسس اور حیران ہیں اور موسیٰ کا علم خضر کی واقفیت کے سامنے حیرت فروش ہے ــــ ظاہر ہے کہ یہ ساری مماثلتیں محض اتفاقی نہیں ہیں۔ تلمیحی اشارات کی تفصیل میں جائے بغیر زیر بحث اشعار میں شاعر کے لئے حضرت کی قد آور شخصیت کو کردار بنا کر پیش کرنے کی اصل وجہ یہی سامنے آتی ہے کہ خضر کی شخصیت، سلسلۂ روز و شب کے دست برد سے محفوظ ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ زمانہ بھی اس نظم میں ایک مخفی کردار کی حیثیت سے بار بار اپنے وجود کا اثبات کر رہا ہے۔ اقبال حضرت خضر سے پہلا سوال اس طرح کرتے ہیں:۔

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش

یہاں روز و شب اور فردا و دوش سے بے نیازی، اور ماضی و حال اور مستقبل سے خضر کی واقفیت، خضر کے ان جوابات کے اسناد و اعتبار کی راہیں ہموار کرلی ہے جو شاعر کے استفسار کے نتیجے میں دیئے جانے والے ہیں مگر اس کے بعد شاعر، حضرت خضر سے جو سوالات کرتا ہے ان میں سوائے موزونیت کے اور کوئی شعری خوبی نہیں۔ زندگی کا راز، سلطنت کی ماہیت اور سرمایہ و محنت کی کش مکش کا بیان، اس حد تک بیان محض ہے کہ آپ اسے شاعرانہ بیان کا نام بھی نہیں دے سکتے۔ بعد کے اشعار میں ایک سوال کے لئے چھ مصرعے صرف ہوگئے ہیں۔ یہ مصرعے اختصار اور جامعیت کی صفت سے محروم ہیں۔ البتہ جس شعر پر دوسرے بند کا یا بہ الفاظ دگر سوالات کا اختتام ہوتا ہے وہ نثری طرز تخاطب اور طول کلامی کی فضا کو... بل تبدیل کر دیتا ہے ؎

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

اس شعر کی دو جہتیں واضح ہیں۔ ایک جہت تلمیحی ہے جس میں آگ اور نمرود کے ساتھ ابراہیم خلیل اللہ کی آزمائش کی طرف ہمارا ذہن منتقل ہوتا ہے اور اس کی دوسری جہت استعاراتی ہے جو آگ، اولادِ ابراہیم

اور نمرود کو زمانۂ حال سے جوڑتی ہے۔ پہلے مصرعے میں اولادِ ابراہیم کے نام سے معروف کے ذکر میں کوئی ابہام نہیں، مگر "کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے" میں کس کا امتحان کون لینے والا ہے کے استفہام سے ایک غیر قطعی اور نسبتاً مبہم فضا کی تخلیق ہوتی ہے۔ یہ غیر قطعیت اس لئے بھی پیدا کی گئی ہے کہ ابراہیم کا اپنے آپ کو ابتلائے آزمائش سے عہدہ برآ کرنا تو ایک امر واقعی ہے مگر کیا اولادِ ابراہیم بھی اس آزمائش میں پوری اتر سکتی ہے؟ اس لئے کہ عصر حاضر کا نمرود تاریخی نمرود سے زیادہ صاحب اقتدار، اور عصر حاضر کے نمرود کی بھڑکائی ہوئی آگ پہلے سے کہیں زیادہ مشتعل اور صبر آزما ہے، جب کہ اولادِ ابراہیم، ابراہیمی صفات سے یکسر محروم ہے ——

زیر بحث شعر میں استفسار اور استفہام سے زیادہ خود کلامی کی کیفیت نمایاں ہے، اور یہ خود کلامی، خود کلامی کے ساتھ خود احتسابی بھی بن جاتی ہے۔ اس شعر میں نمرود کا استعارہ ماقبل کے اشعار میں وارد ہونے والے الفاظ، سلطنت، اقوام و ذات، اسکندر اور فطرت اسکندری کو ایک نقطہ پر مرتکز کر دیتا ہے۔

اقبال کے سوالات میں صحرا نوردی، زندگی، سلطنت، سرمایہ و محنت اور عالم اسلام کی صورت حال کو سمجھنے اور ان مسائل کے حوالے تقدیر عالم کو بے حجاب دیکھنے کی خواہشیں نہایت سنجیدہ اور معصوم ہے۔ شاعر اپنے علم و فضل کو بالائے طاق رکھ کر خضر کی ہمہ دانی سے مستفیض ہونا چاہتا ہے۔ چنانچہ حضرت خضر کے طویل مکالمے میں کوئی مداخلت یا بحث و تمحیص کی صورت نہیں پیدا ہوتی۔ یہ انداز نظم کے باقی ماندہ حصے سے مکالماتی اور ڈرامائی صورت حال کو ختم کرتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ اقبال کا فنی محاکمہ کرنے والے بعض نقادوں کو جواب خضر کے پانچ حصے خود مکتفی نظموں کی مانند دکھائی دیتے ہیں۔ مگر یہ بات کیوں کر فراموش کی جا سکتی ہے کہ شاعر کے سوالات کا دھاگہ، بعد کے نسبتاً بکھرے ہوئے دانوں کو اپنے آپ سے جوڑے ہوئے ہے۔

خضر راہ کا تیسرا بند صحرا نوردی کے بارے میں خضر کے جواب پر مبنی ہے۔ یہ حصہ 'جواب خضر' کے تمام حصوں سے زیادہ طاقتور اور شعریت سے مملو ہے۔ اس حصے کے اشعار پر غور کرنے سے پہلے اگر اس کے آخری شعر پر توجہ دی جائے تو ماقبل کے اشعار کی معنویت زیادہ بہتر پس منظر میں واضح ہوتی ہے۔

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر! رازِ دوامِ زندگی

اس شعر میں زندگی کی ردیف ایک طرف زندگی کے بارے میں خضر کے جواب کا پیش خیمہ بنتی ہے تو دوسری طرف جام زندگی کی گردش کا ذکر ماقبل کے اشعار کی کلید فراہم کرتا ہے۔ اس بند کے تمام اشعار کے لئے گردش پیہم کی ترکیب کلیدی لفظ کی حیثیت رکھتی ہے۔ تگاپوئے دمادم، بانگ رحیل کی گونج، آہو کا بے پروا خرام، بے سنگ و میل سفر، نمودِ اختر سیماب پا، غروب آفتاب، چشم خلیل کا روشن ہونا، کارواں کا قیام، اور تازہ ویرانے کی تلاش، ساری چیزیں گردش پیہم کے کلیدی لفظ سے جڑی ہوئی ہیں اور ان تمام بیانات، تشبیہات اور تلمیحات میں حرکت اور ارتعاش کے عمل کے ساتھ متحرک پیکروں کی تخلیق کا عمل، ایک مشترک قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل
وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل

ان اشعار میں دشت و صحرا کی زندگی کے ایسے رنگا رنگ مناظر

سامنے لائے گئے ہیں جن سے پابند زندگی کے بالمقابل آزاد زندگی کی جھلکیاں سامنے آتی ہیں اور مختلف حسی پیکر ہمارے حواس کو متحرک کرنے کا کام انجام دیتے ہیں۔ 'رہین خانہ' کے لفظ سے تخاطب اختیار کرنے کے سبب صحرانوردی کے ترجیحی نکات زیادہ موثر انداز میں ہم بردار ہوتے ہیں۔ رحیل کا لفظ تو اپنی جگہ پر حرکت و عمل کی نمائندگی کرتا ہی ہے۔ اس کے ساتھ بانگ اور پھر بانگ رحیل کی گونج ہماری سماعت کے لئے فردوس گوش بن جاتی ہے۔ اس پیکر کی تخلیق میں بصری اور سمعی پیکروں کو جس طرح مخلوط کیا گیا ہے، وہ عام حسی پیکر کے مقابلے میں زیادہ فن کارانہ ہے ـــــ دوسرے شعر میں آہو کے خرام کے ساتھ اس کی لاپروائی اور بے نیازی کی صفت اہمیت کی حامل ہے۔ اس بے نیازی سے دوسرے مصرعے کا بے برگ و سامان قیام اور بے سنگ و میل سفر نسبتاً زیادہ معنی خیز بن جاتا ہے۔ اس کے بعد کے شعر کو پڑھ کر تخیل کا اندازہ ہوتا ہے۔ فضائے دشت میں بانگ رحیل کی گونج' اور ریت کے ٹیلے پہ آہو کے بے پروا خرام ہے۔ آزادی کی جو تصویریں ابھرتی ہیں وہ کسی نہ کسی طرح دشت کی سرزمین اور مٹی کے دائرے میں مقید ہیں۔ جب کہ بام گردوں سے جبین جبرئیل کے نمایاں ہونے سے' نور اختر سیماب پا کی تشبیہ ہمارے حواس کو ایک ماورائی فضا میں لے جاتی ہے۔ اختر کے ساتھ سیماب پا کی متحرک صفت کے ساتھ نور سے معرض وجود میں آنے والی مخلوق کی پیشانی کی شباہت تخیل کی پرواز کی بہترین مثال ہے۔ اس شعر میں صبح کا منظر ہے تو اس کے بعد کے شعر میں شام کے وقت غروب آفتاب کا۔ خاص بات یہ ہے کہ یہاں غروب آفتاب دن یا روشنی کے جانے کا اعلان نہیں بلکہ یہ وہ غروب ہے جس کو دیکھ کر ماضی میں کچھ لوگوں کی آنکھیں روشن ہو چکی ہیں، اس موقع پر شاید اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ تلمیح حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے عرفان ذات باری کے اس واقعے کی ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں تفصیل سے آیا ہے ـــــ

اگلے شعر میں صحرا کی زندگی کا ایک اور منظر ہے جس کو دوسرے غیر مرئی منظر سے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔ دشت و صحرا میں پانی کے چشمے پر، قافلوں کے قیام پر جنت میں سلسبیل کے گرد ایمان والوں کے ہجوم کا گمان گذرتا ہے۔ یہ تشبیہ ہمارے تصور کو ماورائی فضا میں لے جاتی ہے اور کائنات کی دیکھی ہوئی اور ان دیکھی ہوئی اشیاء کے درمیان مماثلت کے پہلوؤں کی تلاش کی تخیلاتی قوت کا ثبوت فراہم کرتی ہے، دنیاوی علائق اور دنیا سے بے نیازی کا وہ موازنہ جس کا احساس اس بند کے ابتدائی اشعار میں زیریں لہر کے طور پر ہوتا ہے اس شعر میں پابندی اور آزادی کے فرق کے نام سے بے نقاب ہو کر سامنے آتا ہے ؎

تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیری کشت و نخیل

یہاں محبت کا لفظ نہایت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اقبال کی پوری شاعری کے سیاق و سباق میں یہ محبت وہ قوت حیات ہے جو اپنے مقصد کے علاوہ دنیا کے تمام علائق سے انسان کو بے نیاز کر دیتی ہے۔ ویسے اردو اور فارسی کی شاعری کی روایت میں سودائے محبت اور جنون عشق کے ساتھ ویرانے کا جو تعلق نظر آتا ہے وہ بھی پابندی اور تھکن کی نفی کرتا ہے۔ زیر بحث بند کی ابتدا میں 'رہین خانہ' کے لفظ سے جس کے تخاطب کو سامنے رکھا جائے تو 'زنجیری کشت و نخیل' کی معنویت زیادہ اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے۔ اس بند کے آخری شعر میں' جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے 'گردش پیہم' کا کلیدی لفظ، ماقبل کے سارے مناظر، بیانات اور تشبیہات کا محور ہے ؎

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوام زندگی

یہ رازِ دوام زندگی، دراصل شاعر کے اسی مکالمے کا جواب ہے کہ

ع زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش

گردشِ پیہم، وقت کے حصار کو بھی توڑتی ہے اور شخصیت کی پختگی کی ضمانت بھی بنتی ہے۔ اس طرح خضر کی شخصیت روز و شب کی دسترس سے بلند ہے اور دانش وری کے نقطۂ نظر سے بلاغتِ فکر و نظر کے اعلیٰ مدارج پر فائز بھی۔ خضرِ راہ کے تیسرے بند کے محولۂ بالا آخری شعر کی ردیف 'زندگی' ہے۔ یہ ردیف زندگی کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں خضر کے ان تصورات کی پیش کش کا ماحول بناتی ہے جن کا اظہار نظم کے چوتھے بند میں کیا گیا ہے۔ پہلے، دوسرے اور تیسرے بند میں اقبال نے فلسفیانہ رویے سے زیادہ شاعرانہ وسائلِ اظہار سے کام لیا ہے۔ چنانچہ تخیل کی غیر معمولی قوت تشبیہات و استعارات، پیکر تراشی اور ڈرامائی صورتِ حال کی تخلیق کی طرف زیادہ متوجہ ہے۔ چوتھے بند میں تخیل کے اس بے محابا استعمال کا اعادہ تو نہیں ہوتا مگر شاعرانہ بیانات کا اہتمام ضرور ملتا ہے۔ جوابِ خضر کے اس حصے میں ہی نہیں بلکہ 'سلطنت' سرمایہ و محنت اور دنیائے اسلام کے ذیلی عنوانات کے تحت آگے جو اشعار ملتے ہیں وہ دراصل تصوراتی اور فلسفیانہ شاعری کے ضمن میں آتے ہیں۔ اس موقع پر غور طلب بات یہ ہے کہ آیا اقبال اپنی تصوراتی اور فکری شاعری میں شاعرانہ وسائلِ اظہار کو پس پشت ڈال دیتے ہیں یا اس نوع کے اشعار میں بھی شعری تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لیے سب سے کارآمد طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ اقبال کے ان افکار کا جن کا اظہار ان کی نثر میں ہوا ہے ان کی فکری شاعری سے موازنہ کیا جائے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ ان کا شعری فلسفہ ہمیں احساس اور تخیل کی سطح پر ہمیں کس حد تک متاثر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں زیادہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی نثر میں بیان ہونے والے افکار میں جو جامعیت اور قطعیت دکھائی دیتی ہے، اقبال کی فلسفیانہ شاعری اس جامعیت اور قطعیت کی حامل نہیں معلوم ہوتی۔ اقبال کے مفکرانہ بیانات شاعری میں صرف ٹھوس بیانات نہیں رہتے بلکہ شاعرانہ بیانات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خیالات تجربات میں تبدیل ہوتے نظر آتے ہیں، اور شاعری میں ان کے فلسفیانہ تصوراتِ زندگی کی معنویت میں کچھ اس انداز میں اضافہ کرتے ہیں کہ شاعرانہ تجربات کی شکل اختیار کر کے آفاقیت اور عمومیت سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال اپنی تصوراتی شاعری میں جس مشکل ذمہ داری کو اپنے سر لیتے ہیں اس کی راہ میں دو چار بہت سخت مقامات بھی آتے ہیں۔ بسا اوقات ان کی شاعرانہ گرفت کمزور بھی پڑتی ہے اور ان کے شاعر پر ان کا مفکر اور فلسفی غالب آنے کی کوشش کرتا ہے مگر ایسے مقامات اقبال کی بھرپور نمائندگی نہیں کرتے۔ اقبال کی تصوراتی شاعری کا بہترین حصہ شاعرانہ اور فلسفیانہ، دونوں اعتبارات سے وہی ہے جہاں وہ شعریت اور فلسفہ کو ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ خضرِ راہ میں اتفاق سے دونوں طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔ اگر صرف تخیلات پر مبنی اشعار اور تخیلات کے تعاون سے پیش ہونے والے افکار کی قدر و قیمت کے تعین کے نازک پیمانوں کو فراموش کر دیا جائے تو فکری شاعری کی مابہ الامتیاز خصوصیات کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

زندگی کے بارے میں خضر کے تصورات جن اشعار میں پیش ہوئے ہیں، ان کا مطالعہ بتلاتا ہے کہ تخیل کے محدود استعمال کے باوجود ایسے اشعار نظم کی فنی قدر و قیمت میں تخفیف نہیں کرتے۔ اس حصے کے ابتدائی دو شعر اس طرح ہیں: ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

زندگی کی عام منطق کے اعتبار سے فائدہ اور نقصان، کامیابی اور ناکامی اور فتح اور شکست زندگی کے معاملات کے تسلیم شدہ پیمانے ہیں۔ سود و زیاں سے زندگی کی ماورائیت کا خیال، اقبال کے

نقطۂ نظر کو زندگی کی منطق کے بجائے شاعرانہ منطق کے قریب لے جاتا ہے۔ اس کی مزید توثیق دوسرے مصرعے کے قول محال سے ہوتی ہے۔ زندگی کا کبھی 'جان' سے عبارت ہونا اور کبھی جان کی قربانی سے، یہ بات بجائے خود ایک پیراڈوکس ہے۔ یہ پیراڈوکس یا قول محال اس شعر کو فکر محض ہونے سے بچاتا ہے۔ دوسرا شعر بھی زندگی کی ایک مسلمہ حقیقت کی نفی کرتا ہے۔ ہم چوں کہ زندگی کو روز و شب' امروز و فردا اور ماہ و سال کے پیمانوں سے ناپتے ہیں اس لئے زندگی محدود بھی معلوم ہوتی ہے۔ مائل بہ زوال بھی دکھائی دیتی ہے اور اس کی بے ثباتی بھی اظہر من الشمس ہے۔ اس شعر میں شاعر اس کلیہ ہی کی نفی کرتا ہے۔ چناں چہ اس کے نزدیک زندگی جاوداں' پیہم دواں اور ہر دم جواں ہے۔ یہ دونوں اشعار اپنے آخری تجزیے میں شاعرانہ بیانات بہ مبنی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ان میں شعری طریقۂ کار کی ایک جھلک اس توازن کے سبب بھی ہے کہ پہلے شعر میں زندگی کی ماہیت کا بیان اس کی 'کیفیت' کے نقطۂ نظر سے ہوا ہے اور دوسرے شعر میں اس کی 'کمیت' کے زاویۂ نگاہ سے ـــــ بعد کے اشعار میں سرآدم' ضمیر کن فکاں' کوہکن' جوئے شیر' تیشہ اور سنگ گراں کے الفاظ سے تلمیحی ابعاد کا اضافہ ہوتا ہے۔ بندگی کو جوئے کم آب سے اور آزادی کو بحر بے کراں سے تشبیہ دینے کے سبب آزاد زندگی کی معنویت کے کئی پہلو ہمارے اوپر روشن ہوتے ہیں۔ ایک شعر میں ہستی یا کائنات کو قلزم ہستی اور انسان کو حباب سے مماثل قرار دیا گیا ہے۔ عدم اور وجود کا زیر و بم اور قلزم ہستی سے حباب کا ابھرتا اور پھر معدوم ہو جاتا' آزمائش و ابتلا کی جو تصویر ہمارے سامنے لاتا ہے وہ قابل توجہ ہے ـــــ زندگی سے متعلق دوسرے بند میں انسان کی مخفی قوتوں کو بروئے عمل لانے کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اس کو صرف ایک شعر میں بیان کیا جا سکتا تھا۔

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اس بند میں صداقت کے لئے مرنے' تڑپنے اور سوئے گردوں نالۂ شب گیر کھینچنے کا مشورہ مشاعرانہ اظہار پر مفکرانہ بالادستی کا مظہر ہے۔ فکر کی بہت نمایاں لہر مندرجہ بالا شعر کی سطح پر بھی تیرتی نظر آتی ہے' مگر زمین و آسمان مستعار کی نفی اور نفی یا معدومیت کے بطن سے ایک عالم نو کی باز آفرینی سے وہ شاعرانہ تصویر بھی بنتی ہے جو ہمارے حواس میں تلازمات کی ایک دنیا کو متحرک کرتی ہے۔

خضر راہ کے چھٹے بند میں "سلطنت کیا چیز ہے"؟ کا جواب حضرت خضر کی زبان سے دیا گیا ہے۔ اس بند میں حاکمیت اور محکومیت کے ہمہ گیر مسئلے پر خاصے وسیع پس منظر میں اظہار خیال ملتا ہے۔ پہلا شعر اس بند کے باقی دس اشعار کے لہجے اور رجحان کا تعین کرتا ہے۔ اس شعر میں دو باتیں اہم ہیں۔ ایک قرآن کریم کی اس آیت کا حوالہ کہ اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَجَعَلُوْا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَا اَذِلَّۃً وَکَذٰلِکَ یَفْعَلُوْنَ ۔ یعنی "جب بادشاہ لوگ کسی قریے میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں فساد و فتنہ برپا کرتے ہیں اور وہاں رہنے والے با عزت لوگوں کو ذلیل و خوار کرتے ہیں، اور وہ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔" (سورۂ انعام) اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس میں اقوام غالب کی سلطنت کو "جادوگری" کہا گیا ہے۔ قرآنی آیات کے حوالے سے حاکمیت کا عام طریقۂ کار اور انسانی اقدار کی پامالی کا مروجہ انداز سامنے آتا ہے اور 'جادوگری' کے لفظ سے فریب اور التباس کی اس کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں محکوم قومیں حق و باطل یا سفید و سیاہ کی تفریق اور تمیز کی صلاحیت تک سے محروم کر دی جاتی ہیں۔ ایک مصرع میں عملی صورت حال کا بیان ہے تو دوسرے مصرعے میں اسی فریب نظر کا جو ہم سے سوچنے اور سمجھنے کی طاقت چھین لیتا ہے۔ ایک مروجہ طریقہ ہے اور دوسرا جدید ترین سیاسی حربہ ـــــ جادوگری کا یہ سلسلہ ہماری زندگی کو کس کس طرح اپنے حصار میں رکھتا ہے اس کو ایک بار پھر تلمیحات کی مدد سے بیان کیا گیا ہے۔ ؎

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں ساز دلبری
خون اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری

پہلے شعر میں تلمیح کو اس شکل میں استعمال نہیں کیا گیا جس میں وہ تاریخی اور روایتی طور پر ہمارے شعر کا حصہ ہے۔ بلکہ شاعر نے اس تلمیح کو منقلب کرکے ایک اور ہی نتیجہ نکالا ہے۔ ایاز سے محمود غزنوی کی محبت زیر بحث شعر میں محبت یا بے لوث وارفتگی نہیں رہتی بلکہ ایک ایسا طلسم ہے جو ایاز کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے یہاں جادوئے محمود کے اثر سے چشم ایاز کا حلقۂ گردن میں ساز دلبری دیکھنا۔ شاعرانہ صورت گری کے ساتھ معنی آفرینی کی بھی عمدہ مثال ہے۔ دوسرے شعر میں موسیٰ تلمیحی نام بھی ہے اور استعارہ بھی۔ جس سحر کاری کا ذکر اول الذکر شعر میں آیا ہے اس کا بطلان دوسرے شعر میں پیش کیا گیا ہے۔ بعد کے اشعار میں طلسم سامری کو مغرب کے جمہوری نظام اور مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق کے پرفریب سیاسی ہتھکنڈوں میں دکھلایا گیا ہے۔ ان اشعار میں ہم عصر سیاسی نظام اور اس کے بعض پہلوؤں پر تبصرہ ضرور ہے مگر یہ تبصرہ بھی شاعرانہ بیان پر مبنی ہے۔ جمہوری نظام کو قیصری کا ایک نادار کہنا یا اس نظام کے پس پردہ جبر و استبداد کو روا رکھنا، یا غریب ممالک کا سرمایہ داروں کی جنگ زرگری کا آلۂ کار بننا یقیناً نثری تبصروں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ مگر ان اشعار میں اقبال نے جو شاعرانہ طریقۂ کار اختیار کیا ہے اس میں مغربی جمہوریت کو ساز کہن کے نام سے موسوم کرنے اور اس ساز کہن کے پردوں سے نوائے قیصری کے ابھرنے کی بات ہمارے حسی تجربے کا حصہ بنتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح جمہوری قبا میں دیو استبداد کے رقصاں ہونے اور اس پر نیلم پری کے رقص کا گمان گذرنے سے جو تمثیلی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ بیک وقت تشبیہ، تمثیل، تلمیح اور پیکر تراشی جیسے وسائل شعریہ پر مبنی ہے: ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

مغرب میں آئین سازی، اصلاحی کاوش اور رعایات و حقوق کے نعرے جس قدر بلند بانگ انداز میں لگائے جاتے ہیں اور ان نعروں کے پس پردہ غیر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر قوموں کے استحصال کا جو حاکمانہ رویہ اپنایا جاتا ہے اس کو مغرب کے طب کی ایجاد کردہ ان شکر آمیز گولیوں کا نام دینا جو مشرقی اقوام کو خواب غفلت میں پہنچا کر ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیتی ہیں۔ اس کو اقبال کا سخت سے سخت نقاد بھی سپاٹ یا غیر شاعرانہ بیان کا نام نہیں دے سکتا۔
خضر راہ کے پہلے بند کے بعض اشعار میں جسمانی اور ذہنی اسیری کے تلازمات کا ذکر مضمون کے شروع میں کیا گیا تھا۔ زیر بحث اشعار میں خواب اور جادوگری سے مناسبت رکھنے والے الفاظ کی تکرار ملتی ہے۔ جادوگری، خواب، ساحری، جادوئے محمود، طلسم سامری، نیلم پری، خواب آوری اور سراب رنگ و بو، جیسے الفاظ اور تراکیب کے ذریعے اس نظم کی مخصوص فضا کو استحکام ملتا ہے۔ اس بند کے آخری شعر میں سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھنے اور قفس کو آشیاں خیال کرنے کی نادانی پر طنز کیا گیا ہے۔ طنز کا یہ لہجہ زیر بحث بند کے زیادہ تر اشعار میں نمایاں ہے۔ یہ طنزیہ لہجہ ہی اس نوع کے فکری اور فلسفیانہ اشعار میں فکر و فلسفہ کی لے کو زیادہ تیز ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔
اب تک زیر بحث آنے والے تین بند میں "زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟" کا جواب حضرت خضر نے دیا ہے، ان کے بعد کے دو بند" اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟" کا جواب ہیں۔ پہلے بند کے ابتدائی تین شعروں کا تعلق بندۂ مزدور کو دئے جانے

پیغام سے ہے۔ یہ پیغام نہایت سپاٹ انداز میں دیا گیا ہے۔ طرزِ اظہار براہ راست ہے اور ان شعروں میں شعریت بھی نہیں ملتی، مگر اسی بند میں بعد کے چند شعر، شعریت، استعاراتی طرزِ اظہار اور بالواسطہ طرزِ تخاطب کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اگر اقبال نے اس بند میں پیغام رسانی کا غیر شاعرانہ انداز اختیار کرنے پر اکتفا کیا ہوتا تو وہ یقیناً اپنے شاعرانہ منصب سے غفلت برتنے کے مرتکب قرار دئے جا سکتے تھے۔ مگر پیغام رسانی کی ذمہ داری کے ساتھ وہ اپنے شاعرانہ منصب کو فراموش نہیں کرتے: ؎

ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
"خواجگی" نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

ان اشعار میں استعمال ہونے والے نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب اور رنگ جیسے الفاظ سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔ یہ الفاظ ہم عصر مسائل یا سماجی اور ثقافتی حوالوں کی وجہ سے فنی نقطۂ نظر سے غیر اہم نہیں ہیں۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسی مسائل اور حوالوں کے لئے شاعر نے سیاق و سباق کیسا فراہم کیا ہے۔ نسل، قوم اور تہذیب و رنگ کی تفریق کو جہاں خواب آور گولیوں اور نشہ آور دواؤں کے طور پر استعمال کرنے کی بات کی جائے وہاں معاملہ فلسفہ و فکر کا نہیں رہ جاتا۔ اس قسم کا فلسفیانہ یا فکری بیان شاعری کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ برگِ حشیش کو شاخِ نبات سمجھنے، خواجگی کے بنائے ہوئے مسکرات کا شکار ہونے اور سکر کی لذت میں نقدِ حیات لٹوانے کی باتیں سرمایہ دار اور مزدور کی باہمی آویزش کی شاعرانہ تعبیرات ہیں۔ ان اشعار میں استعمال ہونے والی تلمیحات نہ صرف ہم عصر مسائل کے پیش کش کو استعاراتی جہت بخش رہی ہیں۔ بلکہ ان مسائل کو عمومیت اور آفاقیت سے بھی ہم کنار کر رہی ہیں۔

سرمایہ، محنت سے متعلق دوسرا بند استعاراتی اور محاکاتی طرزِ اظہار کا عمدہ نمونہ پیش کرتا ہے۔ اسی بند کے پہلے شعر میں۔ ع "غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک" کا مصرعہ غنچہ دامن اور شبنم کے الفاظ کے ذریعہ مزدور یا مزدور کی قسم کے کسی بھی طبقے کے لئے قناعت نہ کرنے کا نہایت موثر محاکاتی بیان بن جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ قناعت ایک محمود صفت ہونے کے بجائے، ہمت عالی کے پس منظر میں صفت محمود باقی نہیں رہتی۔ فطری مظاہر سے محاکاتی فضا تخلیق کرنے کا سلسلہ اگلے اشعار میں بھی برقرار رکھا گیا ہے: ؎

آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک
باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک

اقبال کے کلام میں خونِ صد ہزار انجم سے سحر کے پیدا ہونے کا ذکر مختلف مقامات پر مختلف اور متنوع استعاراتی پہلوؤں کے ساتھ آیا ہے۔ یہاں اس کی جہت روسی انقلاب کے تاریخی حوالے کی ہے دوسرے شعر میں جنت سے نکالے جانے کی وجہ سے چشمِ آدم کو گریہ و زاری کرتے ہوئے نہ دکھلا کر ایک منقلب تلمیحی صورت حال دکھلائی گئی ہے۔ اس صورت حال میں زندگی کے دوسرے موانعات کے ساتھ خود جنت بھی فطرت انسانی کے لئے زنجیر دکھائی دیتی ہے۔ موانعات کی ساری زنجیریں توڑ ڈالنے کے سبب ہی دوریٔ جنت کی وجہ سے چشمِ آدم کے آنسو نہ بہانے کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ پیکر تراشی کے ساتھ تہہ داری کی فضا اس شعر کو زیادہ قابلِ لحاظ بناتی ہے۔ موخر الذکر شعر میں زخمِ گل کے واسطے تدبیر مرہم، پر سوالیہ نشان قائم کرنے کی

وجہ سے باغباں کی کوتاہ اندیشی اور بہار کا قوتِ تخلیق اپنی پوری شدت کے ساتھ ہم پر منکشف ہوتی ہے۔ مظاہرِ فطرت کی مدد سے شعر کی محاکاتی فضا اسی پر مستزاد ہے ــــ اس بند کے آخری شعر میں ماقبل کے اشعار کا لب و لہجہ برقرار رکھا گیا ہے۔ کرمکِ ناداں کو طوافِ شمع سے آزاد ہونے اور اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہونے کا مشورہ، اقبال کے نظامِ فکر میں انسان کے لئے اس کی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی اہمیت کو ایک خاص انداز میں پیش کرتا ہے۔ طوافِ شمع سے آزادی اور عرفانِ ذات کی کوشش 'کرمکِ ناداں' کی تشبیہ کے پس منظر میں زیادہ معنی خیز ہو جاتی ہے۔

خضرِ راہ میں جس مقام پر حضرتِ خضر سے شاعر کے بعض استفسارات، مکالمے کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں وہاں شاعر نے براہِ راست 'دنیائے اسلام' کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ ایشیا کے خرقۂ دیرینہ کے چاک ہونے اور نوجوانوں کے اقوامِ دولت کے پیرایہ پوش ہونے کا ذکر البتہ آیا ہے۔ مگر یہ باتیں ضمنی حیثیت رکھتی ہیں۔ بنیادی مسئلے کی طرف 'کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے' کے مصرع کے ذریعے توجہ دلائی گئی ہے۔ اس مسئلے پر خضر کا جواب قدرے تفصیلی ہے۔ اس میں اختصار اور جامعیت کے بجائے طول کلامی کو روا رکھا گیا ہے۔ 'دنیائے اسلام' کے بہت سے اشعار کی بلند ہم آہنگی اور طوالتِ بیان اس مسئلے سے اقبال کی جذباتی وابستگی کا ثبوت ہے۔ بعض اشعار میں جذباتی وابستگی جذباتیت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ بالخصوص دوسرے بند کے کئی اشعار کی جذباتی بلند آہنگی نظم کے بڑے حصے میں قائم رکھی جانے والی فنی تنظیم کو کسی حد تک مجروح کرتی ہے۔ اس کے برخلاف دنیائے اسلام کا پہلا اور آخری بند مصرعی طرزِ اظہار اختیار کرنے کے سبب نظم کے بڑے حصے سے واضح طور پر ہم آہنگ ہے۔ خضر کہتے ہیں:

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز
لے رہا ہے مے فروشانِ فرنگستان سے پارس
وہ مئے سرکش حرارت جس کی ہے مینا گداز

ان اشعار میں عالمِ اسلام کی معاصر صورتِ حال کو جس طرح تعلیمی انداز سے ہم کنار کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ شریف حسین کی انگریزوں سے ساز باز اور اس کے نتیجے میں ترکوں سے شریف حسین کی بغاوت مسلمانوں کے لئے ایک سیاسی اور قومی سانحہ تھی۔ مگر اس سیاسی یا قومی سانحے کو تثلیث کے فرزندوں کے ہاتھوں میراثِ خلیل کے لٹنے اور خاکِ حجاز سے کلیسا کی خشتِ بنیاد بنائے جانے کے ذکر سے جو غیر واقعاتی یا عمومی حقیقت کی شکل میں ڈھالا گیا ہے اس کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ خلافت کی تحریک ترکوں کی ایک تحریک سہی مگر ہندوستانی مسلمانوں نے جس طرح اس تحریکِ خلافت پر پوری قوم کے مستقبل کا دار و مدار سمجھ لیا تھا۔ اس کا بھرپور اظہار پہلے اور دوسرے شعر سے ہوتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں نہ شریف حسین کا نام آیا ہے اور نہ ترکستان کا۔ ان اشعار میں تثلیث کے فرزند کے ساتھ خشتِ بنیادِ کلیسا کا ذکر اور میراثِ خلیل کے ساتھ خاکِ حجاز کا ذکر ہے یا پھر کلاہِ لالہ رنگ کا۔ کچھ تشبیہیں ہیں اور کچھ استعارے جو معاصر سیاست کی بھی ترجمانی کرتے ہیں اور ان اشعار کو واقعاتی حصار سے آزاد بھی رکھتے ہیں ــــ اس طرح ملک بار تیسرے شعر میں صرف ایران تک محدود نہیں رہتا بلکہ پورے مشرق کی داستان بیان کرتا ہے۔ مغربی افکار اور تہذیب و ثقافت کے لئے ایسی مئے سرکش کا استعارہ جس کی تندی اور حرارت مشرقی اقوام کے وجود کو متزلزل کر سکتی ہے 'صرف استعارہ سازی کے عمل کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اپنے اختصار، جامعیت اور موثر شعری پیٹرن کی وجہ سے حسی اہتزاز کے ساتھ فلسفہ و فکر کی ایک دنیا کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ اس بند کے آخری شعر میں اقبال، جلال الدین رومی

کے حوالے سے تہذیبیں تعمیر اور انحطاط میں عروج کے مناظر کا مشاہدہ کرتی ہیں۔ اس طرح یہ حصہ اقبال کے پورے نظام افکار میں مثبت اقدار کے ایقان سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

دنیائے اسلام کا دوسرا بند جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، بلند آہنگی اور سیاسیہ لب و لہجے کی وجہ سے مشفقانہ مشورے کی حیثیت رکھتا ہے۔ شعریت کی کمی اور شاعرانہ حکمت عملی کا فقدان اس بند میں واضح ہے۔ ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات، ایشیا والے ہیں اس نکتے سے ابتک بے خبر یا پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو، یا جو جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا جیسے مصرعے، یا پھر یہ شعر کہ

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گذر

ان مثالوں سے اس بند کی کمزوری کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔
اس بند کے برخلاف دنیائے اسلام کے آخری بند کے اشعار میں شاعرانہ حکمت عملی نمایاں ہے۔ خیالات افکار کی سطح سے بلند ہو کر اپنے حسی متبادل کی شکل میں تبدیل ہوتے نظر آتے ہیں۔ حسی پیکروں سے ایک شعری فضا بنتی ہے اور یہ شعری فضا خیالات کو محسوس فکر کا درجہ عطا کرتی ہے : ؎

تو نے دیکھا سطوت رفتار دریا کا عروج
موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
اپنی خاکستر سمندر کو ہے ساماں وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان پیر دیکھ

موخرالذکر مصرع ''می نداند اول آں بنیاد را ویراں کنند'' کی توسیع ہے۔ یہ وہ پیش بینی اور مستقبل کی بشارت ہے جو فکری اعتبار سے پیغمبرانہ شان رکھنے کے باوصف تخلیقی اعتبار سے فن کارانہ بلندیوں کو چھوتی ہے کہ اس کا لب و لباب جس شعر میں بیان ہوا ہے اس میں اقبال نے ''آئینۂ گفتار'' کے لفظ سے ایک تجریدی اکائی کے لئے تجسیمی صفت استعمال کر کے استعارے کی تخلیق کا نادر طریقہ اختیار کیا ہے۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

''خضر راہ'' پر گفتگو نامکمل رہے گی۔ اگر اس نظم کے سلسلے میں علامہ اقبال کی ایک وضاحت کو پیش نظر نہ رکھا جائے۔ خضر راہ پر سید سلیمان ندوی کے اس اعتراض کے جواب میں کہ ''اس نظم میں جوش بیان کی کمی ہے''۔ اقبال نے اپنے ایک خط میں ان کو لکھا تھا کہ :۔

''جوش بیان کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے، صحیح ہے۔ مگر یہ نقص اس نظم کے لئے ضروری تھا (کم از کم میرے خیال میں)۔ جناب خضر کی پختہ کاری۔ ان کا تجربہ اور واقعات و حوادث عالم پر ان کی نظر، ان سب باتوں کے علاوہ ان کا انداز طبیعت جو 'سورۂ کہف' سے معلوم ہوتا ہے، اس بات کا مقتضی تھا کہ جوش بیان اور تخیل کو ان کے ارشادات میں کم دخل ہو۔ اس نظم کے بعض بند میں نے خود نکال دیئے اور محض اس وجہ سے کہ ان کا جوش بیان بہت بڑھا ہوا تھا اور جناب خضر کے انداز طبیعت سے موافقت نہیں رکھتا تھا۔ (اقبال نامہ ۲، ص ۱۱۹)

سید سلیمان ندوی بحیثیت ایک عالم دین ہونے کے قومی مسائل پر اقبال سے جس جوش و خروش کی توقع رکھتے تھے اس کا تعلق براہ راست اظہار اور بلند آہنگی سے تھا۔ مشرقی شعر و ادب کی فضا میں یہ بات بہت زیادہ معیوب بھی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مگر شاعری میں انضباط خیالات اور تہذیب جذبات کا معاملہ زیادہ بنیادی اور اہم رہا ہے۔ والیری نے جوش کے بارے میں جو یہ بات لکھی ہے کہ ''جوش و خروش ایک شاعر کے لئے کوئی موزوں کیفیت نہیں''۔ اس بات سے کسی بھی صاحب ذوق کو مشکل سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ اقبال سید سلیمان ندوی سے غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے اس لیے انھوں نے اپنے دفاع میں جوش بیان کی کمی کا دفاع کیا ہے۔ جہاں تک تخیل کی

می کا سوال ہے تو خضرِ راہ میں یہ فرق بہت واضح ہے کہ جوابِ خضر کے حصے میں ماقبل کے اشعار کے بالمقابل قوتِ تخیل کا استعمال کم ہے۔ مگر تخیل کا فقدان نہیں۔ ممکن ہے اقبال باوجود کوشش کے اپنی شاعرانہ افتادِ طبع سے مکمل انحراف نہ کر پائے ہوں — جوش کے سلسلے میں زیادہ حقیقت پسندانہ رویہ اقبال نے ان اشعار میں ظاہر کیا ہے۔ ؎

بیم چوں بنداست اندر پائے ما
ورنہ صد سیل است در دریائے ما
بر نمی آید اگر آہنگِ تو
زخمہ بر یم سست تارِ چنگِ تو

اقبال نے خضرِ راہ میں جوشِ بیان سے احتراز کی جو دانستہ کوشش کی ہے وہ گرامی کے نام ان کے ایک اور مکتوب سے ظاہر ہوتی ہے۔ مگر اس کے باوجود خضرِ راہ پر آج تک جتنے اعتراضات کئے گئے ہیں ان کا تعلق اکثر جوشِ بیان سے رہا ہے۔ یہ بات اسی جگہ درست ہے کہ خضرِ راہ کے جن اشعار میں براہِ راست طرزِ اظہار، جوش و خروش اور بلند آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔ وہی اشعار فنی اعتبار سے خضرِ راہ کی قدر و قیمت میں کسی حد تک تخفیف کرتے ہیں۔ خضرِ راہ پر فارم کے ناقص ہونے اور اس کے مختلف حصوں کے ایک دوسرے سے قدرے بے نیاز ہونے کے اعتراضات بھی کئے جاتے رہے ہیں، مگر غور کیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ نظم کے ابتدائی دو بند میں شاعر اور خضر کے کرداروں کی پیشکش اور خضر سے شاعر کے مختلف سوالات نظم کے باقی ماندہ حصہ کو ایک دوسرے سے مربوط رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ ویسے اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ زیرِ نظم بحث کے دو تین بند یا کچھ اشعار نظم کی فنی تنظیم اور تخلیقی فضا کو متاثر کرتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ حصے نظم میں شامل ہوتے ہوئے اس کا ناگزیر حصہ نہیں مگر یہی بات اس نظم کی صنفی کمزوری کے طور پر نمایاں ہوتی ہے۔
خضرِ راہ کی قدر و قیمت کے صحیح تعین کے لئے ہمیں متذکرہ بالا ضمنی نقائص کے بجائے اس بات کو اہمیت دینی چاہیے کہ کیا اس نظم کا لفسیاتی نظام پوری نظم میں کسی تنظیم اور ربط و تسلسل کا احساس دلاتا ہے؟ اس سوال کا جواب اثبات میں دیا جائے گا کہ خضرِ راہ میں بعض کلیدی الفاظ اور تراکیب کے مناسبات اور تلازمات کا اہتمام اس نظم کے اندر پائے جانے والے لفظیاتی نظام کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اس ضمن میں دریا اور گرفتاری کے مناسبات اور تلازمات کا ذکر ابتدائی صفحات میں آ چکا ہے۔ زیرِ بحث نظم کے سلسلے میں پوری نظم میں نمایاں نظر آنے والی شاعر کی فنی حکمتِ عملی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس حکمتِ عملی کا اظہار کہیں فکری عناصر کے حسی متبادل کی تلاش اور شعری پیکروں کی تشکیل کی صورت میں ہوا ہے تو کہیں بعض متضاد حقائق کی جدلیاتی کیفیت سے کسی نئی حقیقت کی تخلیق کی کوشش اور سپاٹ خیالات کے بجائے تخلیقی صداقت کی سحر آگینی جیسے فنکارانہ طریقوں سے ہوا ہے۔ یہ خصوصیات اس نظم کے لئے ایک ایسی قوت بن گئی ہیں جس کے سبب اگر اس نظم کو غیر معمولی نظم کا درجہ نہ بھی دیا جائے جب بھی یہ قوت خضرِ راہ کو معمولی نظم ہونے کے الزام سے محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ خضرِ راہ کی فنی قدر و قیمت اس کی فلسفیانہ اور فکری بنیادوں سے کہیں زیادہ قابلِ توجہ ہے اور یہی بات خضرِ راہ کی وقعت کی ضامن ہے، ورنہ افکار و خیالات تو آتے جاتے رہتے ہیں۔

▲▲

غزلیں

خالد اقبال یاسرؔ

عدو مقابل عقب کی دیوار بھی مخالف
نحیف ہاتھوں میں کند ہتھیار بھی مخالف

جہاز رانوں کے ڈولتے دل، مدلستی نیت
شکستہ تختے نزار پتوار بھی مخالف

گھمس میں سینوں کے وسوسوں کی پنپتی بیلیں
افق سے اٹھتی گھٹا کے آثار بھی مخالف

زمین مردے قبول کرنے سے بھی معطل
بٹائیوں پر مصر زمیں دار بھی مخالف

محاذ کے راستے سے ناآشنا ہراول
پڑاؤ سے کوچ کے کماں دار بھی مخالف

فضا بھی کچھ ساز گار ہے سازشوں کی خاطر
اور اس پہ یاسرؔ کچھ اہل دربار بھی مخالف

ابوالحسنات حقی

یوں اپنے دل سے ہر اندیشے کو نکال دیا
کہ شاخِ ہجر کو بھی بوسۂ وصال دیا

وہ ایک لمحہ جو میری گرفت میں بھی نہ تھا
اس ایک لمحہ نے کیا صعف ماہ و سال دیا

شگفتِ زخم سے آساں نہ تھا گزر جانا
مگر اسی نے مجھے ضبط بھی کمال دیا

کھلی جو آنکھ تو بے گانگی کی سطح یہ تھا
میں تہ نشین تھا کس نے مجھے اچھال دیا

وہ مرحلہ تھا کہ زندان غم کو چھوڑ آتے
شکستہ پائی نے لیکن ہمیں سنبھال دیا

یہ اور بات کہ آساں پسند میں بھی تھا
اور اس نے کام بھی مجھ کو ذرا محال دیا

وہ دور تھا تو کعت حاک تھی مجھے دنیا
قریب آیا تو اندیشۂ مآل دیا

بہت عزیز تھی ہم کو ردائے فقر و غنا
ہمارے ہاتھ میں کیوں کاسۂ سوال دیا

اسی سبب حسنات اس کو چاہتے ہیں بہت
اک اجنبی نے انھیں زخم حسب حال دیا

غزلیں

عبید صدیقی

رواں ہے چاند کی کشتی فضا سہانی ہے
حدِ نگاہ تلک آئینہ کہ پانی ہے

اسی کے دم سے ہے معمور دل کا پیمانہ
وہ ایک یاد کہ جس کو کہیں پرانی ہے

کسی پہ ہجر رقم ہے کسی پہ وصل کا نقش
ہر ایک رات کی اپنی الگ کہانی ہے

یہی ہے فصلِ جنوں کے لئے جگہ موزوں
یہ دشتِ دل کہ جہاں سبزہ ہے نہ پانی ہے

ہوائے شام ہی قاصد بنی تو پہنچے گا
وہ اس کے نام جو پیغام اک زبانی ہے

زمیں پہ لالہ و گل اس کے عارضوں کی مثال
فلک پہ مہرِ منور جبیں کا ثانی ہے

میدانوں میں خاک اڑی ہم کانپ گئے
پت جھڑ کی آواز سنی ہم کانپ گئے

دن نکلا تو دل میں خوف سمایا عجب
سایوں کی دیوار گری ہم کانپ گئے

ساحل پر سب نقش ہمارے ادھورے تھے
دریا میں اک موج اٹھی ہم کانپ گئے

سونا مٹی ہوتے دیکھا خوشی ہوئی
مٹی جب سونا بنی ہم کانپ گئے

کیا بتلائیں کتنے دلوں کا آیا دھیان
کہساروں برف جمی ہم کانپ گئے

اک مدت سے خفا بہت تھے نیند اور خواب
دونوں میں کچھ ایسی ٹھنی ہم کانپ گئے

اپنی سب تبدیلیں اس کی زد پر تھیں
نفرت کی وہ ہوا چلی ہم کانپ گئے

رحم کے قابل بن جانا منظور نہ تھا
سینے سے فریاد اٹھی ہم کانپ گئے

بام و در کے رنگ کو گلنار ہوتے دیکھنا
وقت کی بارش اسے بیمار ہوتے دیکھنا

گدگدی کر کے جگانا رات کے پچھلے
اس کو گہری نیند سے بیدار ہوتے دیکھنا

کیا بتاؤں کس قدر بھاتا ہے یہ منظر مجھے
رفتہ رفتہ دو دلوں میں پیار ہوتے دیکھنا

وہ مسیحا تھا مگر اس نے گوارا کر لیا
خواہشوں کو آئے دن بیمار ہوتے دیکھنا

مجھ پہ اکثر بار ہوتا ہے یہ آڑے وقت میں
سایۂ دیوار کو دیوار ہوتے دیکھنا

جمع کرنا خواب کے نایاب موتی رات بھر
صبح ان آنکھوں کو بس نادار ہوتے دیکھنا

چاندنی راتوں میں دریا کی اداسی کو کبھی
ہو سکے تو مائلِ گفتار ہوتے دیکھنا

غزلیں

عبید صدیقی

اس ناوک مژگاں کے نشانے کے لئے ہے
اک دل ہے مگر وہ بھی گنوانے کے لئے ہے
وہ آگ جسے کہتے ہیں ہم لوگ محبت
حاساک دل و جاں کے جلانے کے لئے ہے
اے شہر ہوس تیرے تقاضوں کے علاوہ
اک اور تقاضا بھی نبھانے کے لئے ہے
تو آ کہ تری راہ میں لے ہجر کے موسم
اور حسرت آنکھوں کا مٹانے کے لئے ہے
اس شاخ کی تقدیر میں کب ہوں گی بہاریں
اک عمر مرے پاس کھلانے کے لئے ہے

کچھ بات ہے ایسی کہ بھلائی نہیں جاتی
وہ آگ جو مرنے سے بچائی نہیں جاتی
مخصوص ہے بس کار جنوں کے لئے صحرا
یہ شہر ہے یاں خاک اڑائی نہیں جاتی
وہ اشک کا گوہر ہو کہ ہو خواب کا موتی
گر جائے کوئی شے تو اٹھائی نہیں جاتی
سب رنگ میسر ہیں مجھے اور ہنر بھی
تصویر مگر تیری بنائی نہیں جاتی
جینے کی کوئی راہ نکل آتی ہے خود ہی
یہ راہ کسی کو بھی سجھائی نہیں جاتی
اس یاد دل آرام کی راحت کا تقاضا
اک پل کو بھی اب آنکھ لگائی نہیں جاتی
ہم دونوں ہی مجبور ہیں، لاچار ہیں، بے بس
اٹھتی ہوئی دیوار گرائی نہیں جاتی
ڈر ہے کہ سلگ اٹھیں گے الفاظ کے خاشاک
دل پر جو گذرتی ہے سنائی نہیں جاتی

یقیناً ہم کو گھر اچھے لگے تھے
کہیں پہلے مگر اچھے لگے تھے
اسے رخصت کیا اور اس سے پہلے
یہی دیوار و در اچھے لگے تھے
وہ دریا ہجر کا تھا تند دریا
اداسی کے بھنور اچھے لگے تھے
ہمارے ہاتھ میں پتھر کا آنا
درختوں پر ثمر اچھے لگے تھے
اسیری سے ذرا کچھ دیر پہلے
بدن پر بال و پر اچھے لگے تھے
ہوا کا زور بھی اپنی جگہ تھا
سراسیمہ شجر اچھے لگے تھے
صعوبت تو سفر میں لازمی تھی
مگر کچھ ہم سفر اچھے لگے تھے

عزم بہزاد

اے راہ رو راہ سخن تیز قدم رکھ
کچھ اپنا کچھ اس کارِ مشقت کا بھرم رکھ
ممکن ہو تو اس خاک توقع سے گزر جا
یا لمحۂ موجود میں سانسوں کو بہم رکھ
سب تیر اسی سمت سے آئے ہیں ابھی تک
اس بار ادھر سے کوئی میاد ستم رکھ
اس موسم بے مہر کی سختی سے نہ گھبرا
تو ساعت آئندہ میں امید کرم رکھ
اس آنکھ پہ ظاہر ہی نہ کر لرزشِ انفاس
یا خانۂ خواہش میں کوئی حشت الم رکھ
یہ سلسلۂ حاضر و غائب ہے ازل سے
اس باب میں مت اپنے لئے خوف عدم رکھ
اک عمر گذاری ہے سرِ دشت خموشی!
اب عزم کسی کوئے سماعت میں قدم رکھ

زندگی اک سفر اس سفر میں بہم جسم و جاں دیکھنا
ایک درویش کا جیسے ہر دم سوئے آسماں دیکھنا
ہم اسیرانِ تیرہ شبی کا یہ معمول مدت سے ہے
اک دیا دیکھنا اور سر پر کئی امتحاں دیکھنا
کاروبارِ مہ و سال کے پیچ و خم تم پہ کھل جائیں گے
تم کسی رہگزارِ تمنا میں پیرو جواں دیکھنا
اب تو آنکھوں کو بیداری اور خواب سے کوئی نسبت نہیں
جوئے خوں دیکھنا یا کبھی کوئی ابر رواں دیکھنا
آج تم ہم سے بچھڑے ہو یہ سانحہ کوئی کم تو نہیں
باب آئندگاں میں اسے رونق داستاں دیکھنا
بے یقینی کی یہ شب بالآخر تمہیں راس آ ہی گئی
صبح اٹھنا تو مازو پہ تعوید وہم و گماں دیکھنا
کتنی مشکل میں ہیں عزم اہل بصیرت جنھیں ہر گھڑی
سینۂ خاک سے بے تناتی کا اٹھتا دھواں دیکھنا

غزلیں

عزم بہزاد

اے حدیثِ حسن اتنی خود آرائی کس لیے
ہر دم جنونِ بادیہ پیمائی کس لیے

پہلے ہی سوچنا تھا کہ یہ وقت آئے گا
اب روز روز شکوۂ تنہائی کس لیے

یہ کھیل درمیانِ نگاہ و دریچہ ہے
اس دائرے میں اتنے تماشائی کس لیے

دورانِ عشق منزلِ حیرت نہیں ملی
اور اب ملی تو خدشۂ رسوائی کس لیے

مجھ جیسا پہلے تو بھی ریاضت پسند تھا
پھر پوچھنا کہ اسی پذیرائی کس لیے

ہم اہلِ رمز چپ ہیں مگر اے ہوائے وہم
دیوار و در پہ تہمتِ گویائی کس لیے

کچھ دن سے عزم اس کی گلی میں نہیں گئے
آخر یہ احتیاط مرے بھائی کس لیے

اک پریشانی تو یہ بھی ہم ترے بیمار تھے
دوسرے، دشمن ہمارے تیرے دعوے دار تھے

اے گروہِ منکرانِ عشق اتنا یاد رکھ!
کارِ دل کرنے سے پہلے ہم بھی دنیا دار تھے

کچھ دنوں سے تنگ دستی آ گئی تو کیا ہوا
ہم وہ گاہک تھے کہ وجہِ گرمیٔ بازار تھے

ظاہری اسباب پر کب تک نگاہیں ڈالتے
دل کی بربادی کے جب سب راستے ہموار تھے

وقتِ رخصت ساکنانِ کوئے جاناں رو پڑے
ورنہ ہم تو کوچ کرنے کے لیے تیار تھے

عزم تم بھی شام سے سونے کے عادی بن گئے
بھائی! تم تو شہر بھر میں سب سے شب بیدار تھے

غزلیں

خواجہ رضی حیدر

نہ رہ گذر میں اماں ہے نہ بام و در میں پناہ
ہر ایک سمت کھڑی ہے عداوتوں کی سپاہ

وہ آنکھ دل پہ ستارے سجائے تھے جس نے
وہ آنکھ دل کے مقابل بنی ہوئی ہے گواہ

اب آسماں پہ سجا ہے مثال برگ خزاں
کبھی یہ چاند بھی چلتا تھا چاند کے ہمراہ

بساط عشق کے تازہ نفس کو ہے دشوار
نئی رتوں کے نئے ہم نشیں سے رسم و راہ

یہ کہہ رہی ہے مری روح سے ہوائے نشاط
اداس کیوں ہے محبت میں خاک خیمہ گاہ

بدل رہے ہیں رضی جسم و جاں کے سب موسم
حصار کھینچ رہی ہے اک اجنبی کی نگاہ

غبار ہجر سے پیدا شگفتگی کر لو
اٹھا ہے ابر اٹھو شاخ دل ہری کر لو

یہ کہہ رہا تھا کوئی رات شہر والوں سے
بجھے ہیں دل تو دریچوں میں روشنی کر لو

ہوا کی زد پہ دلوں کی بساط رکھی ہے
ذرا چراغ کی لو میں کمی کمی کر لو

جو ارتکاز مراسم جسے بتاؤ گے
وہ مشورہ یہی دے گا کہ دوستی کر لو

مرے مزاج کو سمجھو تو میں تمہارا ہوں
وگرنہ کتنا ہی اظہار دل بری کر لو

یہ لغزشیں بھی محبت کی اک ضرورت ہیں
مگر ضروری نہیں ان کو لازمی کر لو

یہ دوریاں تو ہمیشہ کی دوریاں ہیں رضی
یہ مصلحت کا تقاضا ہے دوستی کر لو

قریب کے مہتاب رقصاں چشم وحشت گیر میں
جیسے امکان رہائی حلقۂ زنجیر میں

جاگتی آنکھوں سے دیکھے خواب کیا کیا شام کو
اور پھر الجھے رہے ہم رات بھر تعبیر میں

کل بھی ہم اک شخص کی تسخیر میں مصروف تھے
آج بھی مصروف ہیں اک شخص کی تسخیر میں

رنگ تو اک واسطہ ہیں جسم کے عرفان تک
رنگ کو کس نے مقید کر دیا تصویر میں

تم نے لکھا ہے رضی احوال کس کے عشق کا
عشق کا قصہ تو لکھا ہے کتاب میر میں

ہمدم کاشمیری

حبس میں ہوں کھلی فضا لکھنا
میرے حق میں کوئی دعا لکھنا
زرد ہے جسم و جان کا موسم
سبز پتوں کا سلسلہ لکھنا
بام و در میں چھپا ہے سناٹا
کوئی آہٹ کوئی صدا لکھنا
یاد آئے نہ گھر میں دفتر کی
در و دیوار پر دعا لکھنا
شاخ در شاخ جو سنی تو نے
دشت در دشت وہ صدا لکھنا
بجھ رہے ہیں شفق شفق لمحے
شام کے ہاتھ میں حنا لکھنا
اس طرف دھوپ ہے کڑی ہمدم
کوئی سایہ کوئی گھڑی لکھنا

عرفان صدیقی کے نام

زمین سے دور بہت آسمان سے باہر
میں سوچتا رہا وہم و گمان سے باہر
میں خاک و خوں کی حد سے ابھی نہیں گزرا
مجھے نہ ڈھونڈ مرے جسم و جان سے باہر
یہ کس کا سایہ مرے دشمنوں کی صف میں تھا
کوئی کبھی تیر نہ نکلا کمان سے باہر
عجیب شخص ہے وہ کس نگر میں رہتا ہے
کہیں ملا نہ مجھے میرے دھیان سے باہر
نہ جانے کیسے بجھا طاق پر دیا ہمدم
ہوا کو رکھا تھا ہم نے مکان سے باہر

صدیق عالم

ایک نحیف شاعر کے نام

ٹوٹ کر اک پر گرا، کھڑکی سے اندر
ایک پر ——
آسماں خاموش،
سورج مضمحل
راستوں پر گرم سائے بے لباس
وہم تجھ کی سلیں، سنگیں دیواریں قیاس
ایک لمحے کی تڑپ، قرنوں کا بے معنی سفر
ٹوٹ کر اک پر گرا کھڑکی سے اندر
ایک پر ——
تار سا اک
کوری آنکھیں
کوئی آہٹ تک نہیں نزدیک و دور
کاغذی سیپوں سے لپٹے، ان لکھے، ٹوٹتے سطور
انگلیاں بے سمت و بے جاں، ہیچ ہے رنگ و ثمر
ٹوٹ کر اک پر گرا کھڑکی سے اندر
ایک پر ——

دائرے لاحل
فصیلیں رائگاں
آپ میں گم بے زباں قدموں کی چاپ
ٹیڑھے میڑھے جھٹکے دیتے ہوئے دل کو ستا ـ
مرہ نوکِ قلم پر کانپتے سو نحو در
ٹوٹ کر اک پر گرا، کھڑکی سے اندر
ایک پر ——
غرق دیوار و در
چھتیں بے اعتبار
بج رہی ہیں کھڑکیوں میں کچھ سلاخیں جاں بلب
شاعرِ بے جاں کی آنکھیں کھلی ہیں بے سبب
سرد قطرے موم کے جیسے پڑے ہوں ریت پر
ٹوٹ کر اک پر گرا، کھڑکی سے اندر
ایک پر ——

رفیع الدین

ایک نظم

یہ تمھارے پھول ہیں
چومتے ہیں جو شاخِ گل کو ہزار ہونٹوں سے
جھومتے ہیں ہوائے فصلِ بہار میں
کہیں سائے بہے ہوئے ہیں
اور کہیں روشنی
یہ تمھارے ہیرے چھپا لیے ہیں سحاب ہاتھوں نے
پیار میں
یہ تمھارا دریا ہے
ابھی موجوں کے پیچ و خم میں بٹا ہوا
کسی ساحلوں میں چھپا ہوا
یہ تمھاری رات ہے
پھول چنتی ہے خوشبوؤں کے شجر سے
اور ساحلوں سے جاگتی سیپیاں

نظمیں

قیصر زماں قیس

(۱)

اک درخت سوکھا سا سائباں بہاروں کا
دور تک نہیں ملتا
ریت کے سمندر سے باؤلی ہواؤں میں
ذرہ ذرہ شعلہ گوں ساکھ کی رگ دیے ہیں
آگ اک جھوتا سا دیکھتا رہا ہوں میں
میں کہ مرا سایا تھی
اس درخت کا سایا
اور مری راتوں پر شعلہ گوں ہواؤں کی بدلیاں سی چھائی ہیں
سوچتا رہا اکثر کاش مرا سینہ بھی
شاخ کی طرح ہوتا
اور گرم شعلوں سے مرا جسم جب جلتا
میں خموش ہو جاتا
اک درخت کی صورت، اک شاخ کی صورت

(۲)

تم نے اچھا کیا اپنی تحریر پر روشنائی گرا دی
مرے پاس کچھ بھی نہیں جس کو دکھلاؤں تم کو
بتاؤں تمھیں عہد ماضی
سناؤں تمھیں عہد ماضی کے قصے
تمھارے تغافل میں اک کرب ہے، بے حسی ہے اور بے بسی
میں کس طرح یہ کہہ سکوں گا کہ مرے لئے کوئی بھی زاویہ!
عہد کا عہد نامہ بھی باقی نہیں ہے
مرے پاس کچھ بھی نہیں ہے
مرا جان بلب دل ہے بے پیرہن جسم ہے
یا سمٹتی ہوئی زندگی ہے
مگر اس کا رشتہ تو معدوم ہے
کیا کہوں تم سے کس طرح پوچھوں؟
کہ اس بے نشانی ہی مرا نشاں ہے
یہ احساس مجھ کو بھی اب ہو گیا ہے
تم نے جو کچھ کیا ہے وہ بہتر کیا ہے
کہ اپنی تحریر پر روشنائی گرا دی
جو میں تم سے پوچھوں تو خاموشیوں میں
مرے درد دل سے بھی انکار کر دو
مجھے غیر کہہ دو!
مرے غیر کو اپنا دلدار کہہ دو!!

شمس الرحمٰن فاروقی

۱ ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل　　　یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

وزن　فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

بحر　رمل مثمن محذوف

شعر کا مفہوم بالکل صاف ہے، سب شارحین متفق بھی ہیں۔ غنچہ کھلنے کے پہلے یا وجود میں آنے کے پہلے انجامِ گل کی عبرت ناکی پر غور و فکر میں محو ہے۔ ذرا سی ہنسی (کھلنا) اور اس کے بعد بہت دیر تک اور بہت کثرت سے غور و فکر، یہ اس کی زندگی ہے۔ یہ سب تو ٹھیک ہے، لیکن خود غنچے کو محوِ فکر کہنے کا جواز، یا اس کے محوِ فکر کہنے کی دلیل کیا ہے؟ اس نکتے پر کسی نے غور نہیں کیا ہے۔ غنچے کو دل گرفتہ کہتے ہیں، لیکن محوِ فکر نہیں کہتے۔ لہٰذا یا تو کوئی دلیل ہو جس کی بنا پر ہم غنچے کو محوِ فکر ثابت کر سکیں یا کوئی سند ہو جس کے اعتبار سے ہم کہہ سکیں کہ غنچے کو محوِ فکر یا متفکر فرض کرنا بھی شاعرانہ رسومیات میں داخل ہے۔ جب تک اس مسئلے کو صاف نہ کیا جائے گا، شعر کی تشریح نامکمل رہے گی۔ غالباً اسی وجہ سے طباطبائی نے اس شعر کو "چیستان" اور "جادۂ مستقیم سے خارج" کہا ہے۔ بے خود موہانی ناراض تو بہت ہوئے ہیں لیکن اس اعتراض کا جواب فراہم کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

غلام رسول مہر نے البتہ اتنا لکھا ہے کہ "گل کا منہ بند ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عدم میں بیٹھی ہوئی ہے اور پھول کے انجام سے عبرت حاصل کرنے میں مصروف ہے۔" لیکن اس شرح میں گڑبڑ یہ ہے اگر گل کا منہ بند ہے تو وہ وجود میں آ چکی ہے اس لئے یہ کہنا بے معنی ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ عدم میں بیٹھی ہوئی ہے۔ شعر میں تو صاف لکھا ہے کہ "ہے عدم میں غنچہ محو"۔ لہٰذا غنچے کا فکر اس کے عدم سے متعلق ہے۔ یہ حضرات اگر ذرا سی تفتیش کرتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ غالب کا شعر چیستان نہیں ہے اور نہ جادۂ مستقیم سے خارج ہے۔ "غنچہ" اور "فکر و تامل" میں کئی اعتبار سے مناسبت فرض کی جاتی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ "خاموش" اور "سربستہ" غنچے کی صفات میں سے ہے۔ (بہارِ عجم)۔ ظاہر ہے کہ جو شخص خاموش یا سربستہ ہوگا اس کو محوِ فکر یا محوِ تامل فرض کر سکتے ہیں۔ اور آگے چلئے۔ غنچہ چیدن، غنچہ خوابیدن، غنچہ نشستن، ان کے بارے میں "بہارِ عجم" میں لکھا ہے کہ ہاتھ پاؤں سمیٹ کر سونا یا بیٹھنا اور ایسا "وقتِ تامل و تفکر" میں ہوتا ہے۔ بہارِ عجم میں مزید لکھا ہے کہ غنچہ شدن اور غنچہ بودن کے معنی ہیں "متامل ہونا"۔ لہٰذا غالب کے شعر میں غنچے کے متامل ہونے کا مفروضہ بالکل درست ہے، اور یہ شعر صراطِ مستقیم سے خارج ہونے کے بجائے سراسر راہِ راست پر ہے۔

تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن   چشمِ واگردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

وزن و بحر ۔ جو اوپر مذکور ہوا

شعر کا مضمون ایک حد تک میر سے مستعار ہے ؎

موندنا چشم کا ہستی میں ہمیں دیدہ ہے
کچھ نہیں آتا نظر جب آنکھ کھولے ہے حباب

(دیوان اول)

شعر کی شرح میں بھی تمام شارحین کم و بیش متفق ہیں، لیکن "رنگ باختن" کے معنی بیان کرنے میں اکثر کو مغالطہ ہوا ہے۔ "رنگ باختن" کے معنی "رنگ بدلنا" یا "رنگ کا تغیر پذیر ہونا" بیان کئے گئے ہیں (سہا، غلام رسول مہر، طباطبائی، بے خود دہلوی۔) لیکن یہ معنی شعر سے برآمد نہیں ہوتے۔ اگر "آگہی" کو فاعل فرض کیا جائے تو "رنگ بدلنا" (یعنی رنگ کا تغیر پذیر ہونا) بالکل بے محل اور مناسبت سے عاری ہے۔ اگر آگہی فاعل نہیں، صرف منادیٰ ہے تو اس صورت میں بات ذرا سی ہے، لیکن مصرعے کی سدھ سست ہو جاتی ہے اور رنگ تماشا کا بدلتے جانا ایک خود کار عمل ٹھہرتا ہے اس کے لئے آگہی کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی پھر رنگ تماشا کا بدلتے جانا یا جلووں کا وداع ہونا یا جلووں سے ہمارا تعلق ختم ہو جانا ایک ہی چیز نہیں ہیں، اور نہ وداع جلوہ کو رنگ تماشا کے بدلنے کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں۔ بے خود موہانی نے "رنگ باختن" کے معنی "رنگ اڑنا" لئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تماشا کے چہرے کا رنگ کب تک اڑتا رہے گا، لیکن شعر میں تماشا کے رنگ باختن کا ذکر ہے، تماشا کے چہرے کے رنگ باختن کا کوئی ذکر نہیں۔ لہٰذا بے خود موہانی کی تشریح لایعنی ہے۔

میرا خیال ہے غالب نے "رنگ باختن" کا محاورہ نہیں باندھا ہے بلکہ "رنگ" بمعنی "قدر و قیمت" یا "قوت و کیفیت" لکھا ہے اور "باختن" بمعنی "برباد کرنا" یا "ضائع کرنا" رکھا ہے۔ لہٰذا مصرعے کے معنی یہ ہیں کہ اے آگہی تو کب تک تماشا کی قدر و قیمت اور قوت و کیفیت کو ضائع و برباد کرتی رہے گی، شعر کے معنی یہ ہوئے کہ اگر آنکھ کھول کر دیکھا جائے تو جلوے کی قدر و قیمت ضائع ہو جاتی ہے۔ دیکھنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ ظاہری آنکھ بند کر کے چشمِ دل سے دیکھا جائے۔

یکم مارچ ۱۹۸۶

آتی جاتی لہریں • مظہر امام • اردو رائٹرز گلڈ الہ آباد • چالیس روپے •

ہمارے یہاں عام رواج ہے کہ ہم شاعر، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، ناول نگار، تنقید نگار کو الگ الگ اکائیوں کے روپ میں دیکھتے ہیں اور کسی ایسی تخلیقی شخصیت کو بلا جھجک قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں جس میں تخلیقیت اور تنقیدی بصیرت اور بصارت کے امتزاج کے امکانات موجود ہوں۔ ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں، نقادوں کا ذکر کرتے وقت ہم ان کی شناخت کا تعین ان کی ادبی شخصیت کے حاوی یا بعض اوقات محض مشتہر پہلوؤں کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں۔ میں مولانا حالی کو بڑا شاعر سمجھتا ہوں یا نقاد؟ میں شمس الرحمٰن فاروقی کو بڑا نقاد سمجھتا ہوں یا بڑا شاعر؟ یہ میرے ذاتی سوال ہیں لیکن میرے جوابات میرے سوالات کی طرح ذاتی ہونے کے باوجود نوعیت کے اعتبار سے غیر ذاتی ہو جاتے ہیں کیوں کہ میں ہر تخلیقی اظہار کو (جس میں تنقیدی اظہار بھی شامل ہے) فرد کی مکمل شخصیت کا اظہار قرار دیتا ہوں تمام مغائرتوں اور تمام تضادات کے باوجود۔

مظہر امام کی شخصیت حاوی اور مشتہر حالیہ پہچانی شناخت۔ ان کی شاعری۔ نظم و غزل۔ بطور خاص آزاد غزل سے وابستہ ہے۔ مظہر امام کے تنقیدی مضامین چونکہ درسی اور مکتبی ہرگز نہیں ہیں اور طرز اظہار کے اعتبار سے فطری غیر آراستہ لب و لہجے کا استعمال کرتے ہیں اس لئے مجھے اکثر و بیشتر ان کی شعری شخصیت ہی کی توسیع محسوس ہوتے ہیں۔ 'آتی جاتی لہریں' بطور عنوان یا نام کتاب کی حیثیت سے بھی سکہ بند 'تنقیدی'، مکتبی یا درسی عنوان یا نام نہیں ہے۔ کتاب کے مندرجات پر نظر ڈالنے سے فوراً مظہر امام کے ردعمل کی متنوع کیفیات کا تاثر مرتب ہوتا ہے۔ وہ اردو شاعری میں صورت کی جلوہ گری، آزاد غزل، داغ کے ایک غیر معروف شاگرد، پرویز شاہدی، سلام مچھلی شہری، محمد علوی، محمود جالندھری اور کلیم الدین احمد — سب موضوعات اور مضامین پر یکساں تازہ کاری کا ثبوت دیتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ان کا دائرۂ عمل صرف شاعری تک محدود نہیں ہے۔ وہ ردعمل کی تازہ کاری کا ثبوت ان مضامین میں بھی دیتے ہیں جو علی عباس حسینی، اختر اورینوی، عصمت چغتائی، نئے اردو افسانے اور دیگر موضوعات سے متعلق ہیں۔

مظہر امام ہر قسم کی ادعائیت سے آزاد ہیں۔ وہ شاد عظیم آبادی اور حسرت موہانی کا ذکر کرتے وقت، صرف ان کی شاعری کے بہترین جمالیاتی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں بلکہ انحراف کے ان پہلوؤں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو ان شاعروں کو دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کی بحث میں بھی ان کا رویہ انتہائی متوازن ہے۔ وہ اصطلاحی وابستگیوں اور قبائلی وابستگیوں سے بھی آزاد ہیں۔ اس کا ثبوت ان کے وہ مضامین ہیں جو انھوں نے پرویز شاہدی، سلام مچھلی شہری اور کلیم الدین احمد کی شاعری کے سلسلے میں لکھے ہیں۔ وہ ان شاعروں کے شعری محاسن کا بھی ذکر کرتے ہیں اور ان کے شخصی اور فطری تضادات کا بھی۔ کلیم الدین احمد کی ادبی شخصیت میں عجیب و غریب دوئی اور تضاد سرگرم کار تھے۔ شاعری کا جو معیار انھوں نے اردو شاعروں کے لئے قائم کیا تھا وہ اسی حد تک اس کے حصول میں شاذ و نادر ہی کامیابی کے آس پاس پہنچے۔ مظہر امام کا یہ بیان سنجیدہ غور و فکر کا مستحق ہے کہ عصمت چغتائی حاوی انداز میں زبان کی افسانہ نگار ہیں۔

مظہر امام آزاد غزل کے موجد ہیں۔ یہ بات مظہر امام بھی کہتے ہیں اور ہمارے ہم عصر شاعر اور نقاد بھی۔ یہ بیان صحیح اور ناقابل تردید ہے۔ یہ مسئلہ الگ ہے کہ آزاد غزل محض غزل ہے یا نظم یا آزاد نظم۔ آزاد غزل کے متنازعہ فیہ کردار اور اشکال کے تمام پہلو پچھلے کچھ برسوں میں خوب زور و شور سے زیر بحث رہے ہیں۔ مظہر امام نے 'آتی جاتی لہریں' میں شامل اپنے مضمون میں اکثر پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ بعض اوقات احتجاجی جوش و خروش والی، بعض اوقات مدلل، بعض اوقات امکاناتی۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ تجربہ چونکہ دریافت کا تجربہ ہے اس کے پورے امکانات کے روشناس ہونے کے لئے دور تک سرگرم سفر رہنے کی ضرورت ہے۔

'آتی جاتی لہریں' میں ردِ عمل کی جو نوعیت کارفرما ہے وہ 'زخم تمنا'، 'رشتہ گونگے سفر کا' (مظہر امام کے دو شعری مجموعے) اور ان نظموں، غزلوں،

آزاد غزلیں، ادبی مطالعوں کی توسیع ہے جو مظہر امام کی تخلیقی شخصیت کی نمائندہ ہیں۔

"آتی جاتی لہریں" مزاج اور رویے کے اعتبار سے مختلف النوع رنگوں کا مرقع ہے۔ بھاری بھرکم تنقیدی، ہجوم اصطلاحات و لفظیات سے پاک ہے اور غیر رسمی لب و لہجہ و اسلوب سے منور مجموعہ مضامین ہے۔

——— بلراج کومل

● **روشنی اور دھوپ** ● فضل حسین ● کتابستان، چک الٰہ آباد ● دس روپے۔

● **ریت کے محل** ● فضل حسنین ● کتابستان، چک الٰہ آباد۔ بارہ روپے۔

"روشنی اور دھوپ" اور "ریت کے محل" فضل حسنین کے ریڈیائی ڈراموں کے مجموعے ہیں۔ پہلا مجموعہ چار اور دوسرا مجموعہ تین ڈراموں پر مشتمل ہے۔ ڈراموں کی تین شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ ڈرامے جو اسٹیج پر دکھائے جاتے ہیں ہم انھیں دیکھ بھی سکتے ہیں اور سن بھی سکتے ہیں۔ دوسری شکل ریڈیائی ڈراموں کی ہوتی ہے۔ ہم انھیں صرف سن سکتے ہیں دیکھ نہیں سکتے۔ یعنی کرداروں کے نقش و نگار، ان کے حرکات و سکنات، چہروں کے تأثرات دیکھ نہیں سکتے۔ تیسری شکل ادبی ہوتی ہے۔ جب وہ ڈرامے کتابی شکل میں شائع ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں "مکالمے" ہی سب کچھ ہوتے ہیں۔ مکالمے ہی کردار کی شناخت کراتے، اور تجسس کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

فضل حسین کے ڈرامے چوں کہ ریڈیو کے لئے تحریر کئے گئے ہیں اس لئے ان کے مکالمے نہ تو معنی خیز ہیں اور نہ ہی ان میں تخلیقی قوت اور نہ وہ تجسس کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں۔ لیکن ان کے مکالمے کردار کی شناخت قائم کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ ان کے اکثر کردار فطری لگتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو ڈرامے کی ابتدا سے وسط تک تو فطری معلوم ہوتے ہیں لیکن ڈرامے کے اختتام پر بغیر کسی معقول جواز کے اچانک مفاہمت کر لیتے ہیں۔ اور اس وقت وہ مصنوعی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ان کے ڈرامے "منزلیں اور بھی ہیں" میں "دادی" جو نئے معاشرے اور تہذیب کی سخت مخالف ہیں اچانک نئے معاشرے سے مفاہمت کر لیتی ہیں جو "دادی" جیسے کردار کے لئے غیر فطری ہے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ مصنف کسی مسئلے کا حل پیش کرنا چاہتا ہے جو اس کے کردار کے مزاج کے مطابق نہیں لیکن کردار کو زبردستی مفاہمت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہاں وہ کردار نہیں بولتا بلکہ مصنف کا اصلاحی مزاج بولتا ہے۔ یہی ان کے ڈراموں کی کمزوری ہے۔

ان باتوں کے باوجود یہ کم نہیں کہ فضل حسین اس دور میں ڈرامے لکھ رہے ہیں۔ جب تک کثرت سے ڈراما نگار سامنے نہ آئیں گے اس صنف کو فروغ نہ ہو سکے گا۔

کتابت، طباعت اور گٹ اپ اچھا ہے۔

——— سید ارشاد حیدر

ماہنامہ اسباق ● جلد چہارم ● ادیب نمبر ●

مدیر ● نذیر فتح پوری ● سا چا پیر اسٹریٹ، پونہ ● تیس روپے۔

ماہنامہ "اسباق" کے دو خاص نمبر "سال اولیں نمبر" اور "محوی صدیقی" نمبر اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں۔ زیر تبصرہ شمارہ "اسباق" کا تیسرا خاص نمبر ہے۔ یہ مسعود حسین رضوی ادیب نمبر نہیں بلکہ "ادیب مالیگانوی نمبر" ہے۔ یہ نمبر ان کی پچاس سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں نکالا گیا ہے۔

اسباق کا یہ شمارہ ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ادیب مالیگانوی کی حیات اور شاعری پر مختصر مضامین اور ان کے کلام کے علاوہ ان کے شاگردوں کے کلام بھی شامل ہیں۔ مضمون نگار حضرات میں خود نذیر فتح پوری کے علاوہ عصمت جاوید، کالی داس گپتا رضا اور مولانا حسن عباس فطرت وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

کتابت، طباعت اور گٹ اپ اچھا ہے۔

——— سید ارشاد حیدر

▲▲

کہتی ہے خلق خدا

• "شب خون" شمارہ نمبر ۱۳۹ میں غزلوں کی اشاعت کے لئے ممنون ہوں۔ خاص طور سے اس لئے بھی کہ آپ نے مناسب طریقے سے شائع کیا۔

میری نئی کتاب "افکار و اظہار" جو پندرہ تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے، ۳۱ دسمبر ۱۹۸۵ء کو شائع ہو گئی ہے۔ آپ کے ملاحظے کے لئے ایک جلد بھیجنے کی کوشش کروں گا۔ اگر ہو سکے تو شب خون کے اگلے شمارے میں ایک چھوٹا سا اشتہار دے دیجئے۔ آخری صفحے پر خبرنامے میں شامل کر لیجئے تو مزید عنایت ہوگی۔

کانپور — نامی انصاری

• ۱۳۹ واں شمارہ بھی حسب معمول "شب خون" کے معیار و اقدار کا ترجمان ہے جس کی گونج عرصہ تک ادبی دنیا میں سنائی دیتی رہے گی۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے بیانیہ کردار کے اخراج کے متعلق S R KENAN اور دیگر مضمون کے جدید خیالات کو بنیاد بنا کر آج کی عملی (PRACTICAL) اور (MECHANICAL) زندگی کی صحیح عکاسی کی ہے۔ ان کا یہ سوالیہ کردار کا المیہ بھی ہے اور طربیہ بھی۔

جناب گوپی چند نارنگ نے "نثری نظم کی شناخت" پر بڑی جگرکاوی کی ہے جس سے نثری نظم کو نئی زندگی بھی ملی ہے۔ تاہم [illegible] ان کے بیان کردہ آہنگ سے کتنے لوگ استفادہ حاصل کر سکیں گے۔ جب کہ اس نظم کا جواز ہی یہی ہے کہ یہ پابند اور آزاد نظم کی قید و بند کے ردعمل میں وجود میں آئی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا مقالہ "میر کے کلام میں عاشق کا کردار" ایک نیا (APPROACH) ہے۔ بھرپور بیانیے سے کردار کے اخراج کے پس منظر میں میر کے عاشق کے کردار کی صراحت و وضاحت بڑی معنی خیز اور فرحت بخش ہو گئی ہے یعنی اس ترتیب و تہذیب سے لفظی اور معنوی ربط کی کئی تہیں کھلتی ہیں۔

جناب محافظ حیدر کی کہانی "آل م اور اوم" بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر برہنہ جسم اور روح کی کربلا کی دکھاتی ہے جو ہمارے عہد کی پیداوار ہے۔ اگر اس کو کہانی کا انجام سمجھ لیں تو وہیں سے نیا آغاز بھی ملے گا۔ اس کا یہی موڑ قابل توجہ ہے۔

مجموعی حیثیت سے ہم اس پیش کش کو اچھوتی انتہا بھی کہہ سکتے ہیں۔

جمشید پور — ظفر ہاشمی

• شب خون شمارہ نمبر ۱۴۰ میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی غزل کے مصرع

ابھی تو چشم زخم احوال عالم تیر کرنے تھے

میں /م/ /ز/ /ح/ /م/ /ا/ کی صوتی بندش بھی خوب ہے۔ غزل میں شعری حلاوت سے زیادہ علمی ثقالت ہے۔ تعجب ہے ایک [illegible] کی شاعری میں ثقالت کیوں۔ یا پھر میری کم فہمی ہو سکتی ہے۔

غالب کا یہ تفہیم شعر آئینے کی طرح صاف ہے۔ مگر فاروقی صاحب نے اس میں "ورطۂ معانی" دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ بدعہدی معشوق کا روایتی وصف ہے مگر یہاں طعن بدعہدی رقیبوں کی طرف سے عاشق پر حملہ ہے۔ اس داغ کو مٹانا عاشق کے لئے ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ اگر وہ داغ کو مٹا کر اپنے دامن کو آئینہ کی طرح صاف کر لیتا ہے تو معشوق اس میں ورطۂ ملامت دیکھ لے گا۔ ملامت سے تو طعن بدعہدی ہی بہتر ہے۔

کلکتہ — اقبال کرشن

• شب خون کیا ملا۔ جیسے کھوئی ہوئی پونجی مل گئی۔ ظفر اقبال، ساقی فاروقی، احمد مشتاق، عتیق حنفی، ملراج کومل، محمد علوی وغیرہ کا کلام پڑھ کر طبیعت روشن ہوئی۔ سریندر پرکاش کی کہانی مزہ دے گئی۔

ہاپکنس (امریکہ) — عادل منصوری

• زیب غوری کے سوگ کا گوشہ بڑا دلدوز ہے۔ رمز، تنہائی اور حسن [illegible] کے علاوہ فاروقی صاحب کا تحریر کردہ مرثیہ ایک الگ نوعیت کا ہے۔ پڑھ کر اشکبار بھی ہوا اور ایک ٹھہرے ہوئے دھوئیں کا سوگوار سکوت بھی میرے گرد تا دیر ہالہ چھائے رہا۔

یہ شمارہ فکشن کا ہی ایک شمارہ بن گیا ہے۔ انتظار حسین، سریندر پرکاش اور شوکت حیات کی کہانیاں شمارہ کی روح ہیں۔ رسائل پر سید ارشاد حیدر کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح بے لاگ اور واضح ہے۔

ہریانہ — مصور سبزواری

• "شب خون" میں زیب غوری کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی کا تحریر کردہ مرثیہ پڑھ کر

آنکھیں بھر آئیں۔ کتنے سادہ اور موثر انداز میں انھوں نے اس سانحہ کو منعکس کیا ہے۔ دراصل جو کچھ ہو گیا اس عدد رجھٹکے سے اور اچانک کہ ابھی تک بھی یقین نہیں آتا۔ ابھی تک مجھے دھوکا لگتا ہے کہ جیسے رہب غوری کا خط میرے پاس آنے والا ہے۔ یا یوں کہئے کہ دانستہ طور پر اس المیے کو فراموش کرنے کے لئے اس قسم کا دھوکا کھانے کو جی چاہتا ہے۔

تازہ شب خون میں برادرم ارشاد حیدر نے وارث علوی کی نامعقول تحریر کا بڑی معقولیت اور استدلال سے جواب دیا ہے۔ موصوف نے گذشتہ برسوں میں ایسے خطوط میں جا بجا میری تعریفیں لکھی تھیں۔ مجھ پر مضمون لکھنے کا بھی انھیں ارمان تھا۔ پھر اچانک کیا ہوا کہ معذرت پیش کر دی۔ خود ہی خواہش کی اور خود ہی اسی خواہش سے دست برداری بھی حاصل کی۔ اس قسم کی بچکانہ تلون مزاجیاں وارث علوی کے یہاں نہ ہوں گی تو اور کس کے یہاں ہوں گی؟

ہریانہ مصور سبزواری

● یہ شمارہ افسانوں کے لئے مخصوص ہے۔ کئی بہت عمدہ افسانے شامل ہیں۔ سریندر پرکاش نے پھر ایک بھرپور کہانی پیش کی ہے۔ انتظار حسین شاید ان دنوں اپنے معمول سے زیادہ لکھنے لگے ہیں، اندیشہ ہے کہیں وہ اپنے آپ کو دہرانے نہ لگیں۔ رہب غوری کے سلسلے میں تعزیتی تاثرات نے غم کی لے اور تیز کر دی۔

سید ارشاد حیدر کے تبصروں کے بارے میں اتنی تعریفیں چھپ رہی ہیں کہ ان کے درمیان میرا کچھ عرض کرنا نقار خانے میں طوطی کی آواز کے مترادف ہوگا۔ خدا کرے وہ اسی طرح معروضیت کو برقرار رکھیں۔ البتہ میری حقیر رائے میں جارحانہ لب و لہجہ سے احتراز لازم ہے۔ میں اپنی بات اس طرح واضح کرنا چاہوں گا کہ اگر میں مثلاً فاروقی صاحب پر تنقید لکھوں اور وہ جارحانہ بھی ہو، اس میں استہزا بھی ہو تو فاروقی صاحب کا کچھ نہیں بگڑے گا اور وہ شاید اس کا اثر بھی نہیں لیں گے۔ لیکن اگر اسی نوع کی تنقید ایک نئے / نوجوان، غیر معروف / نیم معروف لکھنے والے کی کتاب پر کی جائے تو اس کا مجموعی اثر اچھا نہیں ہوگا۔ میں نہیں سمجھتا ہوں کہ ایسی تنقید اسے بہتر تخلیق پر آمادہ کرے گی۔

ہری نگر مظہر امام

● سید ارشاد حیدر کے تبصروں کی نمایاں خصوصیات، ان کی رائے کی قطعیت، دوٹوک بات کہنے کا سلیقہ اور استدلالی محاکمہ رہی ہیں۔ زیر نظر شمارہ ۱۴۲ میں شامل ماہنامہ جواز، شمارہ ۲۳ پر ان کا تبصرہ میری رائے کا ثبوت ہے۔ وارث علوی صاحب کی تنقید شروع ہی سے اپنے عدم توازن کے باعث اعتبار سے محروم رہی ہے۔ وقتی طور پر اپنی متنازعہ آرا اور ژولیدہ انداز کی بدولت وہ قارئین کو چونکانے میں تو یقیناً کامیاب رہے مگر بہ حیثیت نقاد اور دانشور وہ اپنی ساکھ نہ بنا سکے۔ حالانکہ اپنی صلاحیتوں کے مناسب استعمال سے وہ جدید تنقید کا ایک اہم نام بن سکتے تھے۔ فاروقی صاحب کی کتاب "افسانے کی حمایت میں" ایک بے حد اہم کتاب ہے جو نئے افسانے کی تفہیم میں کامیاب ہے۔ یہ کتاب ان تمام مسائل کا احاطہ کرتی ہے جو قاری کے ذہن میں جدید افسانے کے سلسلے میں پیدا ہوتے ہیں۔ وارث علوی صاحب کا پہلے والا بیان کہ "فاروقی اردو تنقید کا ایک اہم موڑ ہیں جس پر اردو تنقید کو یا تو مڑنا ہوگا یا اس سے انحراف کرنا ہوگا" حقیقت پر مبنی تھا۔ یہ بات قابل افسوس ہے کہ وارث علوی صاحب نے اس اہم موڑ سے انحراف پسند کیا ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور صاحب کے اعزاز میں فاروقی صاحب کا مرتب کردہ مجموعۂ مضامین "تحفۃ السرور" پڑھا۔ حسن طباعت کے لئے غالباً یہ کتاب ۱۹۸۵ء کی بہترین اردو کتاب قرار پائے گی۔ مضامین بھی اپنے تنوع اور اعلیٰ معیار کے لئے بار بار پڑھے جانے کے مستحق ہیں۔ یہ کتاب یقیناً اس پائے کی ہے جس مرتبے کے حق دار سرور صاحب ہیں۔ جشن سرور کا انعقاد کر کے اور اس کتاب کو مرتب کر کے ادارۂ شب خون اور فاروقی صاحب نے ایک صالح روایت کی بنیاد ڈالی ہے جس کی توسیع میں حصہ لینا ہم لوگوں کے لئے سعادت کی بات ہوگی۔

حیدر آباد حسن عباس عابدی

اس مرتبہ نیا شمارہ آنے میں خاصی تاخیر ہوئی لیکن شکر ہے کہ مندرجات نے اس غیر معمولی تاخیر کی تلافی کر دی۔ پچھلے کسی شمارے کی طرح اس شمارے کو بھی آپ لوگوں نے افسانوں کے لئے وقف کیا ہے اور یہ اچھی بات ہے۔ کبھی کبھی اس طرح کی خوشگوار تبدیلی اچھی لگتی ہے۔ یقیناً نئے افسانہ نگاروں کے لئے یہ بات باعث مسرت ہونا چاہئے کہ آج افسانے کے تعلق سے جس شخص کی شد و مد سے مخالفت کی جا رہی ہے بلکہ اس کی داتیات پر بھی مبنی بیہودہ حملے کرنے سے بھی لوگ باز نہیں آ رہے ہیں، اسی کی

فراخ دلی اور غیر جانب داری کا یہ عالم ہے کہ اس نے پورا ایک شمارہ ہی افسانے جیسی "تھرڈ کلاس" صنف کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ اب بھی اگر لوگوں کا ذہن صاف نہ ہو تو اس کا علاج لقمان بھی نہیں کر سکتے۔

سریندر پرکاش بہت کم لکھتے ہیں۔ لیکن جب بھی لکھتے ہیں تو لکھنے کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کا ایک نہایت شاندار اور عمدہ افسانہ شاعر اگست ۸۰ء کے افتتاحی شمارے میں شوق سے پڑھا تھا۔ ان کا یہ افسانہ بھی جو ہے اس افسانے میں انھوں نے جس طرح مذہبی تلمیح کو مجرد علامتی رنگ دیا ہے۔ وہ انھیں کا حصہ ہے۔ اس افسانے میں ہمیں بہت گہرا سماجی شعور بھی ملتا ہے لیکن افسانہ نگار نے اسے کہیں بھی ٹین کا ڈھول نہیں بنایا ہے بلکہ اسے فن میں جذب کر دیا ہے۔ انتظار حسین کا افسانہ بھی اچھا ہے۔ لیکن مجھے کہنے میں تامل نہیں کہ ان کے حالیہ افسانوں کے مقابلے میں اس افسانے نے خاصا مایوس کیا۔ اس افسانے میں انتظار حسین تلاش بسیار کے بعد ہی کہیں کہیں نظر آتے ہیں اور وہ بھی اپنے مخصوص اور منفرد اسلوب کی وجہ سے۔ انھوں نے جس طرح اپنی بات کہنے کے لئے اور نئے معنوی ابعاد عطا کرنے کے لئے اس افسانے میں استعارے (اور کہیں کہیں علامت) کی نئی نئی اور تہہ در تہہ جہتیں پیدا کی ہیں۔ اس کی بنا پر یہ افسانہ ایک خاص عظمت اور رفعت کو پہنچ جاتا ہے، جہاں تک دوسرے جدید افسانہ نگاروں کی رسائی نہیں۔

مرحوم ریب غوری کے لئے آپ نے جو چند صفحات وقف کئے ہیں وہ بروقت ہے۔ شب خون پر یہ قرض تھا۔ قرض تو ابھی بھی پوری طرح ادا نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ ان کی شخصیت اور ان کے فن پر بھی کچھ ضرور آنا چاہئے۔ فن کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لئے یقیناً ابھی وقت چاہئے لیکن مختصراً میں یہی کہوں گا کہ تازہ شمارے میں مرحوم پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت تشنہ ہے۔ ہاں خراج عقیدت کے طور پر بہت مناسب ہے۔

"جواز" کے خاص نمبر پر سید ارشاد حیدر کا بے لاگ اور متوازن تبصرہ بطور خاص پڑھا۔ انھوں نے یہ اچھا کیا کہ وارث علوی کی خبر لینے کی بجائے ان کی خدمت میں انھیں کے مضمون کا ایک اقتباس پیش کر دیا جس میں ان کا ٹھکراں اور بے مغز باتوں کا کافی و شافی جواب موجود ہے۔ انھوں نے "جواز" کا تازہ شمارہ ۲۳ بھی ملاحظہ کیا ہوگا۔ اس شمارے کا سب سے دلچسپ حصہ خطوط کا ہے۔ کم و بیش ہر خط میں وارث علوی کے انداز نقد کی بھرپور مذمت کی گئی ہے اور اسے فن تنقید کے بالکل منافی بتایا گیا ہے۔

• آل احمد سرور صاحب کی ۷۵ ویں سالگرہ کے موقع پر شائع ہونے والا خوب صورت سوینیر ملا، دیکھ کر اور پڑھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ فاروقی صاحب کے زیر اہتمام جس تزک و احتشام کے ساتھ سرور صاحب کا جشن منایا گیا اس کی یاد تا دیر باقی رہے گی، اس موقع پر سرور صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے فاروقی صاحب نے مرتب کر کے جو کتاب شائع کرائی ہے وہ سرور صاحب کی ادبی خدمات کا ادنیٰ سا اعتراف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک حقدار کو اس کا حق ملا ہے۔ فاروقی صاحب کا حسن سلیقہ۔ ان کی نفاست اور سرور صاحب سے ان کی عقیدت کی جھلک ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہے۔ فاروقی صاحب بھی یقیناً اس اہم اور بروقت کام کرنے کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

سوینیر مجھے کئی لحاظ سے خاص طور سے پسند آیا۔ سرور صاحب کی CHRONOLOGY والا حصہ بہت معلوماتی ہے۔ ان پر کام کرنے والوں کو اس سے بہت مدد ملے گی۔ فاروقی صاحب اور جناب اصغر عباس نے بڑی عرق ریزی سے اسے مرتب کیا ہے۔ فاروقی صاحب نے سرور صاحب کے مختلف مضامین سے اہم اقتباسات کا ترجمہ بہت خوب کیا ہے۔ ہمایوں ظفر، زیدی صاحب کا تاثراتی مضمون بھی اچھا ہے۔ ایک بات البتہ سمجھ میں نہیں آئی کہ سرور صاحب پر جو کتاب شائع کی گئی ہے اس میں بیشتر مضامین سرور صاحب سے متعلق نہیں معلوم ہوتے جب کہ سارے مضامین ان کی شخصیت اور ان کے فن سے ہی متعلق ہونا چاہئے۔

کلکتہ — فاروق شفق

• جواز کے خاص نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے وارث علوی صاحب کے مضمون پر سید ارشاد حیدر نے ان کو صحیح زاویے سے آئینہ دکھایا ہے۔ اور جواز کے تازہ شمارے میں ان کے مضمون پر رد عمل کا جو سیلاب دیکھنے میں آیا اس کی مثال حالیہ برسوں میں کسی مضمون پر دیکھنے میں نہیں آیا۔ وارث علوی صاحب جو عمارت کی تعمیر کر رہے تھے اس کی بنیاد وہ خود ہی کھودنے لگے۔

رانچی — پرکاش فکری

● 'افکار و اظہار' کا اشتہار آپ نے بہت عمدہ شائع کیا۔ اس نوازش کے لیے ممنون ہوں۔

وارث علوی کے مضمون کے بارے میں سید ارشاد حیدر نے جواز کے تبصرے میں جو کچھ لکھا ہے اسے میں نے دلچسپی سے پڑھا۔ جواز کے ۲۰ نمبر کے شمارے میں ایک درجن سے زیادہ لوگوں نے تقریباً ایک ہی بات لکھی ہے کہ وہ صوت، صرف وقت، کاغذ اور سیاہی کا زیاں کرتے ہیں۔ سر پھرے لوگ ہر زمانے میں رہے ہیں مگر اس وقت ادب اور تہذیب کے سارے معیار کو بالائے طاق رکھ کر بعض لوگ اس سطح پر آگئے ہیں کہ وہ خود اپنی تحریروں کے مضمرات نہیں سمجھ پاتے۔

اگر آپ برا نہ مانیں تو عرض کروں کہ زیب غوری کے بارے میں تین تأثراتی خطوط اور چار غزلوں سے مرحوم کا حق ادا نہیں ہوا۔ یہ تو بس ٹالنے والی بات ہے۔ کم از کم ایک بھرپور مضمون تو ان کی شخصیت اور شاعری پر شب خون میں آنا ہی چاہئے تھا۔ اس کے علاوہ ان کے ایک دو غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل ہو جاتے تو یہ حصہ بڑی حد تک قابل اطمینان ہو جاتا۔ موجودہ صورت میں تو بس اسے فرض کی ادائگی ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

کانپور

نامی انصاری

● شب خون کا تازہ شمارہ دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی۔ شعری حصہ اور دو تین افسانے اور ارشاد حیدر کے تبصرے کو پڑھ کر خوشی ہوئی۔ محمد احمد رمز کی پہلی تخلیق، زبیر شفائی، اقبال کرشن، حسن عزیز اور برادرم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے مرثیے پڑھ کر ایسا لگا جیسے میں زیب غوری کے مزار میں دفن ہو گیا۔ حسن عزیز، زبیر شفائی اور محمد احمد رمز کے خطوط نے بھی کافی دیر رلایا۔ جواز اور شبستان پر ارشاد حیدر کے بے لاگ تبصرے بہت پسند آئے۔

مدراس

کاوش بدری

● اس مرتبہ چند صفحات مرحوم زیب غوری کے نام ہیں۔ خطوط کے ذریعہ جن لوگوں نے اظہار خیال کیا ہے وہ تمام زیب غوری سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں۔ خصوصاً محمد احمد رمز کا خط انتہائی متاثر کن ہے۔ خط پڑھ کر مجھ پر بھی ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ زیب اور رمز کی بے پناہ محبت کا اشاریہ یہ خط ہے۔ رمز کی دونوں نظمیں زیب مرحوم کے لئے بہترین نذرانۂ عقیدت ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال کرشن، زبیر شفائی اور حسن عزیز نے بھی اچھی اور متاثر کن غزلیں کہی ہیں۔ فاروقی صاحب کا مرثیہ (بہ طرز غزل) بھی دل دوز اور پرسوز ہے۔ زیب غوری اور شمس الرحمٰن فاروقی دونوں بڑے گہرے دوست تھے۔ جدید شاعری میں زیب کی شخصیت لافانی ہے۔ فاروقی نے بھی زیب کے شعری تیور کو شروع سے پہچانا اور سراہا۔ شب خون سے جن شاعروں کی وابستگی رہی ہے ان میں زیب کا نام سرفہرست ہے۔

مشمولات میں افسانے اور صرف افسانے (باستثنائے زیب کا سوگ) ہیں۔ اگر اس شمارے کو افسانہ نمبر کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ دوسرے رسائل تو خاص نمبر بڑے زور و شور سے شائع کرتے ہیں لیکن ان میں شب خون کی اپنی الگ روایت اور انفرادیت ہے۔ اور یہ انفرادیت ترتیب و تہذیب والے فن کار کی ہے۔ یوں تو سبھی افسانے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ خصوصاً ہم سریندر پرکاش، اقبال متین، احمد جاوید اور شوکت حیات وغیرہ نے بہترین افسانے لکھے ہیں۔ انتظار حسین کا افسانہ پہلے کہیں پڑھ چکا ہوں۔ سید ارشاد حیدر کے تبصرے جاندار اور بے مثال ہیں۔ 'جواز' شمارہ ۲۲ پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے "شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری" شب خون شمارہ نمبر ۹۹ کا وہ اقتباس نقل کیا ہے جو وارث علوی نے فاروقی کی تنقید نگاری کے ضمن میں لکھا تھا۔ اگر وارث علوی اپنی کہی ہوئی باتوں پر غور کر لیتے تو اس قدر متضاد قسم کی باتیں نہیں لکھ ڈالتے۔ وارث علوی کا نظریاتی تضاد اس اقتباس کو پڑھ کر لگایا جا سکتا ہے۔

● ادب دراصل عبادت، ریاضت، خدمت اور ان سب کا اتمام ہے۔ غلط زبان، بے قابو جذبات اور ناشائستہ لب و لہجہ وارث کی تنقیدی دریافت ہیں۔ ادب مستعار فساد کا آلہ نہیں بلکہ گفتار و کردار کا جمال و کمال ہے۔ قدوی اور تاتگے والا وارث علوی کا تنقیدی کردار کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔

گریڈیہہ (بہار)

قیصر زماں قیس

● شب خون کے شمارہ نمبر ۱۴۰ میں سریندر پرکاش کا افسانہ "خواب صورت" موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے سریندر پرکاش کا خوبصورت ترین افسانہ ہے۔ زندگی کے وسیع تر تجربے کو افسانے کے محدود کینوس میں پوری شدت کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کرنا اور ظاہری بے ربطگی میں بھی ربط پیدا کر لینا، یہ وہ خصوصیات ہیں جو سریندر کو اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ میں اس کہانی کو

ایک پختہ کار افسانہ نگار کی تکنیکی صلاحیت کا بھرپور اظہار سمجھتا ہوں۔

ریب غوری مرحوم پر فاروقی صاحب کا مرثیہ خوب ہے۔
'خوار' اور 'سستان' کے نیچے نمبر پر ارشاد حیدر کے تبصرے بھرپور ہیں۔ سلیم اختر کے خط کے ساتھ اگر ان کا پتہ بھی شائع کر دیا جاتا تو مصنف "اردو ادب کی تاریخ" سے براہ راست رابطہ قائم کر لیا جا سکتا تھا۔ کیا امید کریں کہ آئندہ شمارے میں اس طرف توجہ دی جائے گی

وسیم الرحمٰن
علی گڑھ

سلیم اختر کا پتہ سہواً رہ گیا تھا۔ اب حاضر ہے ۔ الجودت سی-۱۱۱ ۲۹ بہار سب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن۔ لاہور۔ الہ آباد ـــــ شب خون

● 'خوار' کے خاص نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد حیدر صاحب نے لکھا ہے:
'عارف صاحب نے نامناسب ترتیب کو روا رکھا ہے۔ بلراج کومل، ساقی فاروقی، محمد علوی وغیرہ سے پہلے عزیز قیسی کو چھاپا ہے۔'

ارشاد حیدر صاحب کی سخن فہمی اور صاحب نظری کے ہم قائل ہوتے اگر انہیں عارف صاحب سے شکایت ہوتی کہ عزیز قیسی سے پہلے چند شاعروں کی تخلیقات شائع کرنے کا جواز کیا ہے؟

قیسی کے شعری مجموعے "آئینہ در آئینہ" اور "گرد ماہ" ارشاد حیدر صاحب نے شاید پڑھے ہی نہیں ہیں۔ لاعلمی وہ عطیۂ خداوندی ہے کہ ہر سہو قابل درگزر ہو جاتا ہے

کریم نگر نجم الثاقب شحنہ

● ایک بار پھر آپ نے اتنی بہت سی خوبصورت کہانیوں کو ایک ساتھ چھاپ کر شمارے کو محفوظ کرنے کے قابل بنا دیا ہے۔ ابھی صرف تین کہانیاں 'اقبال متین' کھائی'، 'انتظار حسین اور سریندر پرکاش کی' پڑھ سکا ہوں، مگر پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ باقی کہانیاں بھی ایسی ہی معیاری ہوں گی۔

ریب غوری کے لئے گوشہ ذرا اور بڑا ہونا چاہئے تھا بلکہ فاروقی صاحب کا مضمون بھی شامل اشاعت ہوتا تو اور اچھا تھا۔

ریب غوری کے تعلق سے (شاید کتابت کی) ایک غلطی کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ رئیس شفائی کے خط میں پہلی سطر یوں چھپ گئی ہے 'موت قتیل شفائی کی ہوئی ہے' جہاں 'قتیل' کے بجائے 'ریب' ہو گا۔ خدا سلامت رکھے قتیل شفائی کو۔

تبصرے ایک بار پھر جی خوش کر گئے۔ ملک ہو تو شب خون کا ایک شمارہ شاعری کے لئے بھی وقف کیجئے۔

نجیب آباد مرغوب علی۔

● افسانے کی بہتات، مقالے کا سرے سے غائب ہونا اور نظم و غزل کی کمی ان سب نے بڑا مزہ دیا۔ "ریب غوری کا سوگ" کے تحت مختصر شعری حصہ اپنی تمام قلت کے باوجود حقیقی معنی میں بے حد جاندار ہے۔ جس کی ہر تخلیق خوب تر ہے۔ ریب غوری کی یاد میں محمد احمد رمز کی غزل سرائی یادگار تاثر چھوڑتی ہے۔ طرز جدید کے ساتھ رنگ سخن شائی اور تمام کلام موزوں و مرصع ہے۔ فاروقی صاحب کے غزل کے اشعار فکر انگیز ہیں۔ مذکورہ تخلیقات خاص طور سے پسند آئیں۔

انتظار حسین کا مکالماتی افسانہ "انتظار" رات کے وقت کسی کے انتظار سے پیدا ہونے والی اکتاہٹ اور غنودگی کی فضا میں سانس لیتا ہے۔ ہر جھپکی پر قاری کو چونکاتا اور خواب سے بیدار کرتا ہے۔

سیتامڑھی تاج ہاشمی

● تازہ شمارے میں ریب غوری کے سانحۂ انتقال پر ساری تحریریں آنسو بن کر آنکھوں میں تیرنے لگیں، خاص طور سے فاروقی صاحب کا مرثیہ بڑے کرب انگیز احساس کا حامل ہے۔ رئیس شفائی کی یہ بات سو فی صدی درست ہے کہ ریب غوری جدید غزل کے شہنشاہ تھے اور انہیں کبھی موت نہیں آسکتی۔

اس بار ایک ساتھ آپ نے عصری افسانوی ادب کے نمایاں ناموں کے ساتھ تیرہ افسانے شائع کئے ہیں، لیکن تمام افسانے متاثر نہیں کرتے۔ سریندر پرکاش 'بجوکا' کے بعد گاؤں کے پس منظر پر کوئی اچھی تحریر نہیں دے پائے۔ 'خواب صورت' کسی حد تک اس کمی کو پورا کرتا ہے۔ انتظار حسین کو شاید اپنے نام سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے کیونکہ 'انتظار' کے عنوان سے بہت کم عرصے میں شائع ہونے والا یہ ان کا دوسرا افسانہ ہے۔ آصف فرخی کا افسانہ 'بندر اور قلندر'، شوکت حیات کا 'درویش'، ہر لحاظ سے معیاری ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال متین، م، ق، خان، احمد جاوید اور مظہر الزماں خاں بھی اچھے لگے۔ اس شمارے میں اگر افسانوں پر کوئی مضمون ہوتا تو لطف دوبالا ہو جاتا۔

تفہیم غالب اور کتابوں پر تبصرے ہمیشہ کی طرح جاندار ہیں۔

جمشید پور ابرار مجیب

بہتر صحت عامہ کے لئے

ماحول کو صاف ستھرا رکھنے میں تعاون دیں

* ریاستی حکومت نے مسئلے کے لئے ایک علٰحدہ ماحولیات ڈائرکٹریٹ قائم کیا ہے۔
* ڈائرکٹریٹ نے ریاست کے اہم ثقافتی وتاریخی مقامات پر جیسے بدری ناتھ، دیوہ شریف (بارہ بنکی) بڑھور (کانپور) اور برج بھومی کے اطراف کے راستوں پر ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے خصوصی اقدامات کئے ہیں۔
* لکھنؤ میں جن گندے نالوں کا پانی گومتی میں گرتا ہے ان کے سلسلے میں ایسا بندوبست کیا گیا ہے جس سے وہ پانی اب گومتی میں نہیں جاتا ہے۔
* گنگا کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے ایک علٰحدہ پروگرام شروع کیا جا چکا ہے اس کے تحت ہردوار سے لے کر کلکتہ تک مختلف مقامات پر گندے پانی کو صاف وشفاف بنانے کے لئے آلودگی دور کرنے والی اکائیاں قائم کی جا رہی ہیں۔
* پروگرام کے عمل درآمد کے لئے سنٹرل گنگا اتھارٹی قائم کی گئی ہے۔ ریاستی سطح پر ریاستی جل نگم نگرانی کا کام انجام دے گا۔ ریاست کے مختلف شہروں جیسے رشی کیش، ہردوار، فرخ آباد، کانپور، الہ آباد، مرزاپور اور وارانسی، اس پروگرام سے مستفید ہوں گے۔

اسکیم کا پہلا مرحلہ سال ۱۹۹۰ تک مکمل ہو جانے پر توقع ہے کہ ان شہروں میں پانی کی آلودگی چالیس سے ۵۰ فی صد دور ہو جائے گی۔

* ریاست کی صنعتوں کو برابر یہ اطلاع دی جا رہی ہے کہ وہ اپنے یہاں گندگی صاف کرنے کے لئے پلانٹ لگائیں۔
* گنگا کی آلودگی دور کرنے کے لئے ۲۹۲ کروڑ روپے کی ایک وسیع اسکیم منظور کی گئی ہے۔ اس میں سے ۲۴۰ کروڑ روپے ساتویں پنج سالہ منصوبے کی مدت میں خرچ ہوں گے۔ اس میں ۱۱۶ کروڑ روپئے کی رقم اتر پردیش کے لئے منظوری۔
* ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے کے لئے وسیع پیمانے پر شجر کاری بھی کی گئی ہے۔ سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۵ء۲۳ کروڑ پودوں کے نشانے کے مقابلے میں ۵ء۲۴ کروڑ پودے لگائے گئے۔

صاف ستھرا ماحول صاف ستھری زندگی

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات ورابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

اخبار و اذکار

• اتر پردیش اردو اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ نے ۱۹۸۰ء میں شائع ہونے والی کتابوں پر ان کے مصنفین کو ایک لاکھ ستائیس ہزار پانچ سو روپے کے انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کی مختصر فہرست حسب ذیل ہے :-

• **دس ہزار روپے** : (خصوصی انعامات) :-
جناب مہذب لکھنوی مرحوم (پس از مرگ)، پروفیسر محمد حسن اور جناب عمر انصاری۔

• **تین ہزار روپے** : جناب معین احسن جذبی (گداز شب) جناب شہریار (خواب کا در بند ہے) اور پروفیسر عنوان چشتی (عروضی اور فنی مسائل)

• **دو ہزار روپے** کے انعامات میں مرحوم غیاث احمد گدی (سارا دن دھوپ) جناب اقتدار حسین خاں (لسانیات کے بنیادی مسائل)، قاضی جلیل عباسی (کیا دن تھے) اور محمود حسن قیصر (عشری درد بیدی) کے نام شامل ہیں۔

• **ڈیڑھ ہزار روپے** کے انعامات میں ڈاکٹر بشیر بدر (آمد) زبیر رضوی (الف تماشا)، مرزا خلیل بیگ (اردو کی لسانی تشکیل) سید سکندر آغا (مرزا محمد جعفر اوج)، شیام لال کالرا عابد پیشاوری (متعلقات انشا) حامد ولی الحق (دیوان غزلیات سودا) اور میرہ عثمانی (معمار، شخص اور شاعر) کے نام شامل ہیں۔

• **ایک ہزار روپے** کے انعامات میں ڈاکٹر تسیم حنفی (مجھے گھر یاد آتا ہے)، عرفان عباسی (داستان امیر مینائی)، عروج زیدی (متاع مسکن)، مامی انصاری (افکار و اظہار)، جگناپرساد راہی (سرابوں کی فصیل) کیف احمد صدیقی (حساب لفظ لفظ کا)، دینا ناتھ مست کشمیری (الہامات مست)، کمال جائسی (سادہ ورق)، رگھوبیر سرن دواکر راہی (صد چاک)، سرج بہادر سکسینہ شاہد بدایونی (درد کے رشتے) جمیل احمد (جدید اسباب الامراض اور معالجات) اور افتخار الحق تکمیل (طبی مقالات) کے نام شامل ہیں۔

• **ناشرین کتب کو انعامات** :- نصرت پبلشرز لکھنؤ۔ پندرہ سو روپے اور مکتبہ جامعہ دہلی، اور انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔ ایک ایک ہزار روپے۔

• **کاتبوں کو انعامات پانچ سو روپے** :- جناب نسیم اختر (لکھنؤ) جناب سید اقبال احمد (اعظم گڈھ) اور جناب ایس۔ ایم منظہر (الہ آباد)

اس بزم میں

خواجہ رضی حیدر : کراچی کے نئے شاعر ہیں۔

رفیع الدین : ان دنوں قطر میں مقیم ہیں۔

عزم بہزاد : کراچی کے نئے شاعر ہیں۔

قیصر زماں قیس : گریڈیہہ (بہار) کے نئے شاعر ہیں۔

ہمدم کاشمیری : کراچی کے نئے شاعر ہیں۔

145

Rs. 4.00

کلاسیکی اردو شعریات، طباطبائی کی زبان میں(۱)

طباطبائی کو اکثر لوگ غالب کے نکتہ شناس شارح کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن انھوں نے اس صدی کے اوائل میں بعض اہم مضامین لکھے تھے جن میں ہماری کلاسیکی شعریات کے بارے میں اہم نکات کھرے پڑے ہیں۔ ذیل کے اقتباسات "مقالات طباطبائی" مرتبہ ڈاکٹر اشرف رفیع سے اخذ کئے گئے ہیں۔

—شمس الرحمن فاروقی

(۱) شعر کی بنا قضایائے شعریہ پر ہے اور قضایائے شعریہ مضامین خیالی کا نام ہے۔

(۲) شعر ایسی چیز نہیں کہ مواعظ و عقائد و معارف میں بہ کار آمد ہو کیوں کہ ان مسائل کے ثبوت کے لئے مبادی یقینیہ چاہئے اور شعر مضامین خیالی کا نام ہے

(۳) وہ قدیم داستانیں، پرانی کہانیاں جو ہر زمان میں مشہور ہوتی ہیں، کیسے ہی بے سر و پا خلاف عقل واہیات افسانے ہوں، شاعر کے ادائے مطلب کا آلہ بن جاتے ہیں۔

(۴) شعر میں اثر بر سبیل استدلال ہرگز نہیں ہے، بلکہ بر سبیل مجانست ہے۔ شاعر مثلاً کسی چیز سے متاثر ہو کر لذت یا حسرت ظاہر کرتا ہے سننے والے مجانست فطری کے سبب سے اس شے کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ استدلال کے اثر میں اور شعر کی تاثیر میں فرق ہے۔

(۵) اثر شعر کا اگر نشاط و اہتزاز ہے تو وہ تخیل کا فعل ہے، اور اگر استعجاب اور استغراب ہے تو تشبیہ و استعارہ وغیرہ کا فعل ہے۔

(٦) قوم، زبان وضع کرتی ہے اور شاعر اس میں اصلاح کرتا ہے۔

(۷) جس شہر میں کوئی ایسا شاعر پیدا ہو جاتا ہے جس کا کلام شہرۂ آفاق ہو جائے، اس شہر کی زبان سطرت و مانوس ہو جاتی ہے .. زبان اردو کی عمر ابھی کم ہے۔ ہاں ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اگر اردو بولنے والے جب تک تباہ نہ ہو گئے تو جہاں جہاں اردو بولی جاتی ہے مستند ہو جائے گی اور لکھنؤ و دہلی کی تخصیص نہ رہے گی۔

(۸) زبان کو شعر میں اس قدر دخل ہے کہ اس کے برخلاف علم و قیاس کچھ نہیں چل سکتا۔

(۹) فسانہ لکھنا بلکہ فسانہ بنانا شعر کا بڑا میدان ہے اور شاعر کے بہت سے کمالات ایسے ہیں کہ اگر فسانہ گوئی سے اس نے احتیاط کی تو وہ ظاہر نہیں ہونے پاتے۔... جس شعر میں کوئی معاملہ بندھ جاتا ہے وہ شعر اصل میں چھوٹا سا افسانہ ہوتا ہے۔

(۱۰) ابن خلدون و ابن رشیق وغیرہ خوبی معنی کا قطعاً انکار کرتے ہیں... معانی بے لفظ کے ادا ہی نہیں ہو سکتے۔

(ماخوذ از "حقیقت شعر" ۱۹۰۹)

اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۸۶ء

مدیر/پرنٹر/پبلشر: عقیلہ شاہین ٹیلی فون: ۳۴۹۶ ۵۳۵۵۰۰ جلد: ۱۹ شمارہ: ۱۴۳

مطبع۔ تاج آفسٹ پریس الہ آباد سرورق: خطاط: فیاض احمد

بارہ شمارے: ۴۵ روپے فی شمارہ: چار روپے دفتر: ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد

ترتیب و تہذیب

شمس الرحمٰن فاروقی

منیب الرحمٰن

ایک دن وہ آئے گا
جب یہ الفاظ پیرہن اپنا
جسم سے اپنے نوچ پھینکیں گے
اور گھر سے نکلیں گے
اپنی رعنائی برہنہ میں
جیسے صبح کا سورج
ابر سے نکل آئے

پھر یہ الفاظ، بھیس بدلے ہوئے،
مصلحت کی سڑکوں پر
در بہ در نہ بھٹکیں گے
اور وہ دردِ اجنبی پن کا
ان کے سینے میں جو مچلتا ہے
ناگہاں شعلہ بن کے لپکے گا
خون بن کے مہکے گا

وہ اگر آئے

منیب الرحمٰن

وہ اگر آئے تو یہ عمرِ رواں لوٹ آئے
میں بھٹکتی ہوئی کرنوں کے لئے پٹ کھولوں
میرے آئینے میں ہر صبح نہاں لوٹ آئے
جاگ اٹھے رات کی بھیگی ہوئی ہر پگڈنڈی
اور گذری ہوئی بارش کا سماں لوٹ آئے

وہ اگر آئے تو پھر مجھ پہ چہکتی چڑیا
دل کو پھر بھولے ہوئے گیتوں سے سرشار کرے
کسی سوئے ہوئے احساس کو کروٹ آئے
کسی گم ہوتی ہوئی یاد کی آہٹ آئے
کوئی آواز خیالوں کو خبردار کرے

وقت کے فاصلے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں
راستے ماند پڑے ہیں، کون ادھر آیا ہے
دل کو ہر بار کسی سائے نے بہکایا ہے
کھو گئی پیروں کی آواز گھنے جنگل میں
اور گنجان درختوں پہ دھواں چھایا ہے

دیوار گریہ!

وزیر آغا

عجب جادو بھری آنکھیں تھیں اس کی
وہ جب پلکیں اٹھا کر اک نظر تکتی تو آنکھوں کی
سیہ جھیلوں میں جیسے
مچھلیوں کو آگ لگ جاتی
ہزاروں سرخ ڈورے تلملا کر جست بھرتے
آب گم کی قید سے باہر نکلنے کے لئے
سو سو جتن کرتے
مگر مجبور تھے
چاروں طرف آنسو کے گنبد تھے
نمی کے بلبلے تھے
اور اک دیوار گریہ
جو ازل سے تا ابد پھیلی ہوئی تھی

عجب جادو بھری آنکھیں تھیں اس کی
بظاہر آنے والوں کو "نہ آنے" کے لئے کہتی
بباطن چاہتی دیوار کو وہ توڑ کر اس تک پہنچ جائے

کھڑا ہوں میں پس دیوار گریہ
نمی کے بلبلوں کو اس کی پلکوں پر لرزتے، جھلملاتے
دیکھتا ہوں انگلیوں سے چھو بھی سکتا ہوں
مگر دیوار گریہ کو
افق سے تا افق پھیلی ہوئی
شیشے کی اس شفاف چادر کو
کبھی، اب تک تو کوئی توڑ کر آگے نہیں آیا
میں اک آنسو بھرے لمحے کی سلوٹ
میں کیسے پار کر سکتا ہوں اس کو!!

غزل

وزیر آغا

سب خوش تھے ہم کہ ناچتے تاروں کے پاس تھے
جاگے سحر کے وقت تو کتنے اداس تھے

ہاں اے ہوا! ہمیں بھی بتا ان کا کیا ہوا
وہ پھول سے بدن جو ترے آس پاس تھے

مٹی میں مل کے بھی نہ مٹے وہ خجستہ پے
گلیوں کی باس تھے کبھی کھیتوں کی باس تھے

اس شہر ناسپاس کو تو نے سرا تو دی
کیا شہر کے تمام مکیں ناسپاس تھے؟

جا بھی چکے تھے اور رکے بھی کھڑے تھے ہم
اے سے دور جا کے بھی ہم اپنے پاس تھے

کس دور میں رہے بری آوارپا نہ ہم
ہم تو ترے غلام تھے، ہم تیرے داس تھے

رو دیے گئے سموں سے مگر بار بار ہم
ہر چند ہم زمیں پہ کبھی سبز گھاس تھے

ادب، اقدار اور پاپولر کلچر

دیویندر اسر

کسی صبح ہم اٹھیں اور خبر ملے کہ ہومر، کالی داس، فردوسی، شیکسپیئر، غالب، پریم چند کے شاہکار کسی زلزلے یا آگ سے فنا ہو گئے ہیں تو شاید چند لوگوں کے سوا کسی کو غم نہ ہوگا کہ کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ اخباروں میں زلزلے اور آگ اور کسی لیڈر کے دورے اور تقریر اور غم کے اظہار کی خبر ضرور چھپ جائے گی۔ ادب کی ضرورت کسی کو بھی نہیں۔ دھوبی، نائی، کسان، انجینیئر، سرکاری ملازم، فوجی، سپاہی، ڈاکٹر، رکشا والے، مل مزدور، سیاست داں، کسی کے لئے میگھ دوت، ہیملٹ، شاہنامہ، اوڈیسی، دیوانِ غالب یا کامائنی کی ضرورت نہیں۔ سب لوگ اپنے اپنے شعبوں میں ادب کے بغیر کام کر سکتے ہیں، زندگی میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور آرام دہ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ادب زندگی کا اہم مسئلہ نہیں۔ عام لوگوں کے لئے جن میں خواص بھی شامل ہیں، امیر، غریب، متوسط طبقہ، تعلیم یافتہ، ناخواندہ، نوعمر اور عمر رسیدہ کسی کے لئے بھی ادب کی کوئی اہمیت نہیں۔ ادیب شاید کچھ ادیبوں کو چھوڑ کر موجودہ دور میں شہرت، دولت، مقبولیت کچھ بھی نہیں دے سکتا جب تک کہ ادیب ادارہ بندی کا اسیر ہو جائے اور ادب کو تفریح کے عوامی فارمولوں کی سطح پر نہ لے آئے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب اور عوام میں اکثر ہمیشہ سے ایک سماجی اور ذہنی فاصلہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی قوم کا کلچر فلم، کرکٹ اور ٹیلی ویژن تک محدود ہو جائے تو حالات اس سے بہتر نہیں ہو سکتے۔

ادیب اور فن کار عام لوگوں سے اگر برتر نہیں تو الگ ضرور سمجھے جاتے ہیں۔ فن کار اور عوام کے مابین ایک ذہنی فاصلے کے باوجود لوگوں کے ذہن میں ان کی جداگانہ حیثیت کے ساتھ ساتھ ان کا ایک رومانی تصور بھی ہوتا ہے کہ وہ سماج کے باشعور اور حساس افراد ہیں جن کے باعث ادب اور فنونِ لطیفہ کو اپنے عہد کی ثقافت میں مرکزی اور ممتاز مقام حاصل ہوتا ہے۔ کلاسیکی دور میں انھیں راجاؤں، سامنتوں اور اشرافیہ کی سرپرستی حاصل تھی۔ ان کے پاس دولت تھی، تعلیم تھی، فرصت تھی اور وہ باذوق سمجھے جاتے تھے۔ ماس میڈیا کی اشاعت سے قبل ادیب اور فن کار شعوری یا غیر شعوری طور پر ایسے سرپرستوں اور ایسے قارئین، ناظرین، سامعین سے متاثر ہوتے تھے۔ ان کی فکر اور تحریر پر اس کا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ ادب کا مواد اور موضوع ہی نہیں بلکہ اس کا فارم اور اسلوب بھی اس سے متاثر ہوتے تھے۔

موجودہ دور میں ماس میڈیا کی وسعت اور مقبولیت کے باعث کلچر درباروں اور محلوں کی دیواروں سے باہر نکل کر عام لوگوں کے گھروں میں داخل ہو رہا ہے۔ عام لوگوں کے تصور کے ساتھ ساتھ ان کی سماجی حیثیت میں تبدیلی آئی ہے۔ اب عام لوگ بھی "سماج" میں شامل ہو رہے ہیں۔ اس سے قبل سماج سے مراد ایک مخصوص برسرِ اقتدار طبقہ تھا۔ اس طبقے کے ادب اور فن، کلاسیکی ادب اور فن کو جہاں جدیدیت سے نبرد آزما ہونا پڑا وہاں عوام کی نئی ابھرتی ہوئی تہذیب نے بھی چیلنج کیا ہے۔ لوک سنسکرتی اور بادلی ورثے نے بھی اس کے اثر کو کم کرنے میں کوئی کم رول ادا نہیں کیا۔ جب ماس میڈیا کے وسائل عام ہو گئے اور عام لوگوں کی رسائی ادب اور فن تک ممکن ہو سکی تو

پاپولر کلچر کی نمو تیزی سے ہونے لگی۔

لیکن پاپولر کلچر سے ادیب اور فن کار، مفکر اور دانشور اور کچھ ماہرین نفسیات اور سماجیات بڑے پریشان ہیں۔ انھوں نے بارہا اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ فن اور ادب کی اعلیٰ قدریں ختم یا مسخ ہو رہی ہیں۔ شائستہ ادب اور فن کے قارئین اور ناظرین، سامعین کا دائرہ سمٹ کر بہت ہی محدود ہوتا جا رہا ہے۔ اسی لئے آج زندگی کے بارے میں اہم اور بنیادی سوالات نہیں پوچھے جا رہے ہیں اور دری پاپولر کلچر کی اصطلاح کئی معنوں میں استعمال ہوئے۔ عمومی، عام قسم، عام پسند، مقبول عام اور عامیانہ۔ یہ اس پر منحصر کرتا ہے کہ ہم کون سا رویہ اپناتے ہیں۔ ان کے جواب کی کوئی سنجیدہ تلاش کی جا رہی ہے۔ تعلیم کی اشاعت، جمالیاتی ذوق کی پرورش کرنے میں پوری طرح ناکام نہ سہی بے اثر ضرور ثابت ہوئی ہے۔ اس لئے تعلیم بھی ادب اور ثقافت کی نشو و نما میں ممد ثابت نہیں ہو رہی اور نہ ہی انسان کی حس لطیف اور نفاست کو تیز کر رہی ہے۔ ایک زمانے میں یہ خیال عام تھا کہ عام لوگوں کی تعلیم ہماری ثقافتی پسماندگی کو دور کر دے گی۔ اگر تعلیم عام ہو جائے تو تہذیبی احیا اور ادبی اقدار کی اشاعت ممکن ہو سکتی ہے لیکن تعلیم کے عام پرچار سے یہ امید پوری نہیں ہوئی۔

یہ صحیح ہے کہ اب زیادہ لوگ کتابیں اور رسالے پڑھتے ہیں۔ لیکن کیا یہ جمالیاتی ذوق یا روحانی بالیدگی کے لئے ہے یا تفنن طبع اور نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے یا وقت گزارنے اور نیند لانے کے لئے۔ ان میں ادبی کتابیں اور رسالے بہت ہی کم ہو گئے ہیں۔ سائنس، ادب اور کلچر کے شعبوں میں سستی کتابیں بھی شائع ہو رہی ہیں لیکن ذوق کی تربیت نہیں ہو رہی۔ رچرڈ ہوگرڈ نے اپنی کتاب 'دی یوسس آف لٹریسی' میں اس مسئلے کا گہرا سائنسی تجزیہ کیا ہے۔ اس نے تحریر کیا ہے کہ یہ خیال غلط ثابت ہو گیا ہے کہ جو لوگ معاشی مجبوریوں کے باعث جمالیاتی ذوق سے محروم رہ جاتے ہیں، تعلیم ان کے لئے ایسے مواقع مہیا کرے گی جن سے وہ ادبی ذوق کی تسکین کر سکیں گے لیکن اگر آج ہم عام لوگ اور تہذیب یافتہ لوگوں کی زبان کا ذرا غور سے مطالعہ کریں تو ایسا معلوم ہو گا جیسے وہ بگڑے ہوئے شہری لوگوں کی زبان ہے۔ اس لئے جہاں ایک طرف پاپولر کلچر کی نشو و نما کے لئے سماجی اور تکنیکی ماحول سازگار ہو رہا ہے تو وہاں دوسری طرف اس کے خلاف ایسی فضا تیار ہو چکی ہے۔

آخر پاپولر کلچر کے خلاف دائر کیس کے بنیادی نقطے کیا ہیں؟

ہر سماج میں معدودے چند لوگ ہی ایسے ہوتے ہیں جو باذوق ہوتے ہیں یا جن میں ادب اور فن کی خلاقانہ صلاحیت ہوتی ہے۔ ایسے لوگ ایک مخصوص مزاج کے حامل ہوتے ہیں اور وہ ادب اور فن کی تخلیق کے لئے سازگار ماحول تیار کرتے ہیں۔ تعلیم کے پرچار کے لئے یہ ضروری نہیں کہ یہ دائرہ وسیع ہو جائے گا۔ تخلیقی قوت اور مہارت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی اور نہ ہی ہر کسی کو ادبی پرکھ اور اس کی قدر متعین کرنے اور اس سے محظوظ ہونے کی استطاعت حاصل ہوتی ہے۔ ذہنی طور پر نابالغ لوگ انسانیت کی عام قدروں سے الگ ہو کر ایک ایسی تہذیب کی پرورش کرتے ہیں جو عامیانہ اور کرپٹ ہو چکی ہے۔ کیونکہ جب ہر چیز اور ہر فرد کے مصائب و محاسن اور رویے اور کردار کا پیمانہ حصول دولت ہے تو اخلاقی اور جمالیاتی اقدار بے معنی ہو جاتی ہیں اور یہ سب ہماری زندگی میں اتنا گہرا داخل ہو چکا ہے کہ اس کے باہر کا ماحول ہمیں اجنبی، بے معنی اور بے لذت محسوس ہوتا ہے۔ اگر کسی لمحے یہ سب کچھ رک جائے تو ایسا محسوس ہو گا کہ ہمارے پاس اپنے ذہن اور روح میں کچھ نہیں جو ہماری زندگی کو بھر سکے، زندہ رکھ سکے، سوائے ایک وسیع بھیانک خلا کے اندر بھی اور باہر بھی۔

(۲) ماس میڈیا / پاپولر کلچر (میں نے یہاں ماس میڈیا اور پاپولر کلچر کو ایک ہی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے حالانکہ کیمول کمینس کی تحقیقات کی رو سے یہ صحیح نہیں۔ دونوں میں کئی اجزا کے مشترک ہونے کے باوجود فرق ہے)۔ طبع زاد رنگ کا حامل نہیں ہوتا۔ اس کا فکر اور اظہار منفرد اور مخصوص نہیں ہوتا۔ اجتماعی اور عمومی ہوتا ہے۔ اس میں یکسانیت کے باعث جدت، وسعت اور گہرائی ممکن نہیں اور یہ ایک موضوع، مواد اور طرز اظہار کے محدود دائرے میں ہی سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ ہم ایک ہی طرح کے گانے سنتے ہیں، ایک ہی طرح کی فلمیں دیکھتے ہیں، ایک ہی طرح کے رسالے پڑھتے ہیں۔ مسلسل پرچار اشتہارات کے باعث ہمارا ذوق یکساں ہوتا جا رہا ہے، ہمارا ذاتی فیصلہ اور پسند اور ذوق دھیرے دھیرے اس کا شکار ہو رہے ہیں یا تو وہ ختم ہو جاتے ہیں یا عمل میں نہیں آ سکتے۔ اور ہم ایک بے معنی مجہولیت کا شکار بن کر رہ جاتے ہیں۔ سلسلہ وار ڈرامے

جو ٹیلی ویژن کے ذریعے پیش کئے جاتے ہیں وہ چند بندھے ٹکے فارمولوں پر مبنی ہوتے ہیں، کردار نمائش بن جاتے ہیں اور بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ ایسے پروگرام "سویرا ویرا" اور "سٹ کام" کے دائرے میں آتے ہیں۔

(۳) ماس میڈیا / پاپولر کلچر ادیبوں، فن کاروں اور دانشوروں کے بجائے شو بزنس کے اداکاروں کو پیش کرتا ہے۔ اگر اہل علم و دانش ان پروگراموں میں پیش ہوتے ہیں تو وہ بھی ایک قسم کا "رول پلے" کرتے ہیں۔ فلم اور ٹیلی ویژن ہیرو کو مقبول بناتے ہیں، ہیرو کوئی بھی ہو سکتا ہے فلمی اداکار، سیاست داں یا جرائم پیشہ، جھوٹے واقعات جھوٹے قصے کہانیاں، جھوٹے آدمی ذہن پر غلبہ پالیتے ہیں۔ یہ دور اس ہیرو کا نہیں جو کوئی معرکہ خیز کام کرتا ہے، سیاست اور انقلاب کی راہ میں شہید ہو جاتا ہے یا زندگی قربان کر دیتا ہے۔ اگر کوئی ہیرو ہے تو تفریحی دنیا کا کوئی گلیمر زدہ، ماس میڈیا کسی کو بھی ہیرو بنا سکتا ہے۔ اس کے لئے غیر معمولی ذہن کی ضرورت نہیں، جسم کی کشش کی ضرورت ہے، صلاحیت کی نہیں، سائنس کی ضرورت ہے ذہانت کی نہیں، دولت کی ضرورت ہے۔ کلچر کے زوال کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ آج کوئی عظیم ہستی پیدا نہیں ہوتی۔ سب معمولی آدمی ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ اینٹی ہیرو کا دور ہے جو حالات کو اپنے آدرش کے مطابق موڑنے کے بجائے خود حالات کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔ آج کوئی بھگت سنگھ پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ بھگت سنگھ کے پاس جذبہ تھا، نصب العین تھا ماس میڈیا کی براہ راست اور پوشیدہ طور پر ذہنوں کو متاثر کرنے والی قوت نہیں تھی۔

۴۔ ادب اور فن کے خلاف سب سے بڑا حربہ جو آج کل میں لایا گیا ہے وہ ماس میڈیا ہے۔ فلم، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور کثیر الاشاعت رسالے (ویسے یہ ادب کے نام پر بہت کچھ شائع اور نشر کرتے رہتے ہیں) ماس میڈیا نے ایک غیر اخلاقی، غیر جمالیاتی، لمحاتی لذت پرستانہ، تفریحی ادب کی اشاعت میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ ہم کیا کھائیں، کیا پہنیں، کیا خریدیں، کیا سوچیں، کیا دیکھیں، کس کی سرپرستی کریں، کس سے نفرت کریں، کیا پسند کریں، کیا ناپسند کریں، کیا پڑھیں، کیا نہ پڑھیں، یہ سب کچھ ماس میڈیا طے کرتا ہے اور یہ سب کچھ پوشیدہ نفسیاتی طور پر غیر شعوری اور بعض اوقات براہ راست شعوری تحریک کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کا ایک گہرا تجزیہ ... نے اپنی کتاب ... میں

بحث کیا ہے۔ پاپولر کلچر میں حسن اور عشق، حیات اور موت، انسان اور کائنات، فرد اور سماج کے تصورات بدل گئے ہیں۔ جسمانی اور روحانی زندگی سے عاری یہ لوگ جدید سماج کے ایسے مہاجرین ہیں جن کی جڑیں نہیں، وہ بھیڑ یا ہجوم سے الگ نہیں رہ سکتے، وہ تنہائی کی لذت کے بجائے تنہائی کی دہشت کے دائرے میں رہتے ہیں۔ فرسودہ روایت اور رائج طرز فکر کو ادبی تخلیقات چیلنج کرتی ہیں جس کا خطرہ ماس میڈیا لینے کے لئے تیار نہیں کیونکہ انہیں ہر طبقے کی خوشنودی حاصل کرنی ہوتی ہے۔ بالخصوص برسر اقتدار طبقے اور تاجروں کی جو یا تو ماس میڈیا کے مالک ہیں یا ماس میڈیا ان کے کنٹرول میں ہے یا جن سے ماس میڈیا کو رقم ملتی ہے اور یہ سب کچھ عوام کے نام پر ہوتا ہے۔ اور اس طرح ماس میڈیا موجودہ حالات کو بدستور قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے اور ماس میڈیا کی رسائی دور دور تک پھیلے ہوئے اندرون علاقوں تک، شہروں اور گاؤں اور آدی واسی بستیوں تک ہے۔ ماس میڈیا ان کی روزمرہ کی زندگی کے مسائل کو نظر انداز کرکے، انہیں "سرکس" پیش کرتا ہے۔

(۵) پاپولر کلچر لوگوں کی توجہ ان کے پیچیدہ اور سنجیدہ مسائل کی طرف نہیں دلاتا بلکہ ہر چیز کو سطحی طور پر پیش کرتا ہے۔ مسائل کا مطالعہ بھی سطحی اور ان کا حل بھی سطحی۔ اس طرح یہ مسائل اور زیادہ الجھتے جاتے ہیں، ناقابل حل ہوتے جاتے ہیں۔ اسی لئے جب تک کسی دیش میں کوئی بحرانی صورت حال پیدا نہیں ہوتی، عوام فعال نہیں ہوتے۔ اہل علم و دانش لوگوں کی توجہ ان کے روزمرہ کے مسائل اور زندگی کی طرف دلاتے ہیں لیکن میڈیا سے متاثر لوگ حقیقت سے فرار کرتے ہیں وہ حقیقت کو برداشت نہیں کر سکتے جدید دور نے ایک ایسے روحانی خلا کو جنم دیا ہے جس میں تلاش، مسرت، جذبات اور جبلتوں کی بے روک ٹوک تسکین کو زندگی کا مقصد تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ رویہ ایک مادی لذت پرست کلچر کی اشاعت کرتا ہے جو نہ صرف ادب اور فن کی جمالیاتی اقدار اور روحانی ضرورتوں کی نفی کرتا ہے بلکہ اسے تحقیر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ درحقیقت پاپولر کلچر کو عموماً نیم تعلیم یافتہ لوگوں کا کلچر سمجھا جاتا ہے۔

(۶) پاپولر کلچر میں اکثریت کو اقلیت کے طرز فکر پر ترجیح دی جاتی ہے۔ وہ لوگوں کے ذہن میں "انتشار" پیدا نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ انجام کار سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اپنے ذہن، ضمیر اور روح پر بوجھ ڈالنے کی ضرورت نہیں۔

(۷) پاپولر کلچر میں واقعات کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ عام لوگ کرپشن، جرم، تشدد، جبر، ناانصافی اور زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ وہ احتجاج نہیں کرتے۔ حقائق سے نبرد آزما ہونے کی ساری سکت اور عزم مفلوج ہو جاتا ہے۔ وہ ماس میڈیا کے چکر ویو میں اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ جس سے داخل ہونے کا راستہ تو انھیں مل جاتا ہے لیکن باہر نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہوتے ہیں۔ علم، ادب اور فن غیر ضروری ہو جاتے ہیں۔

(۸) ذوق اور پسند میں یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ماس میڈیا ان لوگوں کی کشش کا باعث بن جاتا ہے جو دولت، معاش یا عام مقبولیت کی خاطر اس میں داخل ہوتے ہیں اور اپنی تخلیقی قوتوں کو تاجرانہ طرز و ر تول کے تحت استعمال کرتے ہیں۔ مواصلات کے ذریعہ اتنے ہمہ گیر اور جامع ہو جاتے ہیں کہ لوگ باہمی اشتراک اور ذاتی رشتوں سے کٹ جاتے ہیں یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی۔

یہاں مشہور ماہر نفسیات ڈیوڈ رونلڈ لینگ جسے "پاگلوں کا مسیحا" کا خطاب عطا کیا گیا ہے (اور جسے رد نفسیات کے مبلغ کے طور پر یاد کیا جاتا ہے) کا ذکر ضروری ہے۔ ایک تیرہ برس کی لڑکی کے والدین نے لینگ سے شکایت کی کہ وہ ان کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے اور وہ غیر معمولی عمل کر رہی ہے کیوں کہ جب ہم ٹیلی وژن دیکھتے ہیں تو وہ اسے کمرے میں جا کر خالی دیوار پر نظریں گاڑ دیتی ہے۔ لینگ نے کہا "میرا خیال ہے کہ لڑکی اسی دیر تک دیوار نہیں دیکھتی جتنی دیر تک اس کے ماں باپ ٹیلی ویژن اسکرین دیکھتے ہیں۔ انھیں اپنی لڑکی کے دیوار دیکھنے پر اعتراض ہے، اسے ٹی۔ وی دیکھنے پر نہیں۔ یہ محض اپنی اپنی پسند ہے۔ مریض کون ہے وہ لڑکی جو بغیر کچھ بولے خالی دیوار دیکھتی ہے یا اس کے ماں باپ جو گھنٹوں ٹی۔ وی۔ اسکرین پر نظریں جمائے رکھتے ہیں۔ وہ مفصل طور پر پرچھائیاں دیکھتے ہیں جب کہ لڑکی خالی دیوار پر تصویر کشی کے تخیلی اور تخلیقی عمل سے گذرتی ہے۔

(۹) سوپ اوپیرا کی یہی خصوصیت ہے کہ وہ زندگی کے تمام مسائل کو بڑی خوش اسلوبی سے سلجھا دیتے ہیں۔ افراد اور خاندان جو مشکلات میں مبتلا ہو جاتے ہیں کسی نہ کسی طرح اپنی مشکلات کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کر لیتے ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں ممکن نہیں ہوتا کیونکہ داستان کو جاری رکھنا ہوتا ہے اس لئے نئی مشکلات پیدا ہوتی رہتی ہیں اور حل ہوتی رہتی اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لوگ اشتیاق سے اس زندگی کی حقیقت کو اپنی زندگی کی حقیقت سے زیادہ ترجیح دیکر دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ پروگرامر یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے ڈراموں کا مواد لوگوں کی روزمرہ کی زندگی سے اخذ کرتے ہیں اور اسے ایک بہت عام اور وسیع پس منظر میں پیش کرتے ہیں جس سے زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔ وہ لوگوں کو فرار کی جانب نہیں لے جاتے بلکہ سوچنے کے لئے ان کو ذہنی غذا مہیا کرتے ہیں۔ "سٹ کام" کے چلانے والے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کو ان کی روزمرہ کی زندگی کی تلخیوں سے دور فرصت اور تفریح کے کچھ لمحات مہیا کرتے ہیں جو ان کی نفسیاتی صحت کے لئے ازحد ضروری ہے

(۱۰) ماس میڈیا اگر ادب عالیہ کو بھی پیش کرتا ہے تو اس طرح کہ اس سے ادب بھی غائب ہو جاتا ہے اور عالیہ بھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ادب عالیہ کی جمالیاتی قدر کو مسخ کئے بغیر اسے ماس میڈیا کے ذریعے عام لوگوں تک پہنچایا جا سکتا ہے کیا اس سے ادب کا معیار اسالیب نہیں ہو جائے گا کہ اس کی قدر متعین کرنا بھی مشکل ہو جائے گا ماس میڈیا کے دور میں کیا ادبی جمود یا زوال کو روکا جا سکتا ہے

(۱۱) ماس پروڈکشن کے باعث پاپولر کلچر اعلیٰ معیار برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اس کے پیش نظر سامعین/قارئین کا ایک وسیع ہجوم ہوتا ہے نہ کہ اقدار، معیار اور ذوق۔ پاپولر کلچر جدید کی اعلیٰ اقدار پر مبنی مواد کو مستعار لے کر اسے مقبول عام بنانے کے لئے اس کے جوہری اقدار اور فنی حسن کو ختم کر دیتا ہے، یہاں تک کہ ان لوگوں کو بھی

اور کلچر کی تشکیل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جن میں فنی صلاحیت، فساد طبع اور رائج ہوتی ہے۔ دھیرے دھیرے یہ سب کچھ زنگ آلود ہو جاتا ہے اور ایک مخصوص سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ جہاں تک سامعین کا سوال ہے وہ منفعل ذہنیت اور منفی تسکین کے حامل ہو جاتے ہیں۔ بائیں بازو کے مفکر ہربرٹ مارکیوز کے خیال میں ماس میڈیا بقراطوں اور آمروں کے ہاتھ میں ایک مہلک حربہ ہے جس کا استعمال لوگوں کے استحصال اور جبر کے لیے کیا جاتا ہے۔

(۱۲) ماس میڈیا سماجی۔ اخلاقی۔ ذہنی۔ جذباتی طور پر مضر ہے۔ وہ لوگ جو ذہنی طور پر "منتشر" ہوتے ہیں ماس میڈیا ان کو تسکین اور فرار کی راہ مہیا کرتا ہے۔ یہ فرد کو ایٹمی ذرہ میں بدل دیتا ہے۔ یہ بھی ایک لعنت ہے جس سے نجات ممکن نہیں۔ جو انسان کی پہچان کو ہی نہیں اس کے جوہر کو بھی ختم کر دیتا ہے۔

. . اور یہ فہرست بہت طویل ہے۔

ماس میڈیا۔ سوسائٹی۔ کلچر کے مخالفین میں وہ دانشور زیادہ نمایاں ہیں۔ جو نئی ٹکنالوجی اور الیکٹرانکس کو انسان کی بقا اور اس کے اخلاقی ارتقا اور مستقبل کے لئے مہلک قرار دیتے ہیں۔ نامور اسپینی ماہر سماجیات خوزے اورتیگا اے گیسے نے ۱۹۳۲ء میں شائع اپنی مشہور کتاب "ریوولٹ آف دی ماسس" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ موجودہ دور میں جس تہذیب کی پرورش ہو رہی ہے اس میں انفرادی فکر، احساس اور ذوق کو ایک اجتماعی ڈھانچے میں ڈھالا جا رہا ہے۔ انسانی روح اور کلچر کو مادی زندگی کا شکار بنایا جا رہا ہے۔ عام لوگ اپنی روایات سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ ماس میڈیا، ٹکنالوجی اور ادارہ بندی کے مشترک عمل کے تحت یکسانیت اور REGIMENTATION کا شکار بنتے جا رہے ہیں۔ کلچر، فن اور ادب اور زندگی کی آسائشیں جو کل تک ایک مخصوص طبقے تک محدود تھیں۔ عام ہوتی جا رہی ہیں لیکن اس عمل میں ان کی منفرد تخلیقی اہمیت بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ان حالات میں سماج میں تناؤ اور کشمکش کی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جس کے باعث تشدد آمیز عمل کو تحریک مل رہی ہے۔ . .

اور اس طرح موجودہ تہذیب ایک گہرے بحران کا شکار ہو کر زوال کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یاد رہے کہ اس کتاب کو شائع ہوئے پچاس برس سے بھی زیادہ عرصہ ہو گیا ہے اور اس کی اشاعت کے اگلے دس پندرہ برسوں میں ٹکنالوجی پر خوب وار کئے گئے۔ بقول گیسے آج لوگوں کو قدرے زیادہ آزادی، تعلیم اور فراغت نصیب ہے۔ لیکن اس کا صحیح استعمال نہیں ہو سکا۔ آج بھی لوگ یسوع مسیح پر مارکس کو ترجیح دیتے ہیں۔ نئے بائیں بازو کی تحریک کے مفکر ہربرٹ مارکوزے نے پاپولر کلچر کو ریاست اور سرمایہ پرستوں کا پھیلایا ہوا جال قرار دیا ہے جسے تبدیلی اور انقلاب کے خلاف جبر اور تشدد کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ماس میڈیا، ٹکنالوجی اور پاپولر کلچر لوگوں کے لئے ارتقائی عمل ہے جس کے باعث احتجاج کا جذبہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ یہ ایک نشہ ہے جو ان پر طاری ہو جاتا ہے اور انھیں تبدیلی کے عمل سے دور رکھتا ہے۔ زندگی کی حقیقت سے دور انھیں خوابوں کی دنیا میں لے جاتا ہے۔

دانشور بڑے تذبذب کی حالت میں ہیں۔ ایک طرف تو وہ جمہوریت، عوام اور کلچر کی وسعت کی بات کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ کلچر جو عوام پسند کرتے ہیں ان کو عامیانہ قرار دے کر اس کی مذمت کرتے ہیں یعنی پاپولر کلچر کی جو جمہوریت اور تعلیم کے پرچار کے دور کا تقاضہ ہے اس کے خواص، کردار اور اس کی جمہوریت پرستی اور کشمکش کے باعث کلچر کے مسائل حل نہیں ہو رہے ہیں۔

لیکن

یہ ماس میڈیا ہی ہے جس نے ادب اور فن کو عوام تک پہنچایا۔ درباروں، محلوں اور مندروں سے نکال کر کے اسے شہروں کے گلی کوچوں اور گاؤں اور دور دراز علاقوں تک لوگوں کے گھروں میں پہنچایا ہے۔ چاہے وہ کیلنڈر ہوں یا کیسٹ، ٹیلی ویژن ہو ریڈیو یا فلم۔ ادب اور فن کی اجارہ داری اور اشرافیت ختم ہو رہی ہے۔ جو لوگ انفرادی ذوق اور تخلیقی صلاحیت کی باتیں کرتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ تہذیب، روایت، ادب عالیہ، فنون لطیفہ، لوک کلا اور سنگیت کے زوال کو ٹکنالوجی کے ذریعہ ہی روکا جا سکتا ہے۔ ماس میڈیا کو نظر انداز کرنا اور اس کی مذمت کرنا عام

لوگوں کو ادب اور فن سے محروم رکھنا ہے۔ آج ریڈیو، ٹرانسسٹر، ٹی وی، سیٹیلائٹ، کیسٹ، چلتے پھرتے سنیما گھر، ویڈیو، پیپر بیکس کے ذریعے ٹیگور، پریم چند، غالب، روی شنکر اور رابندر ناتھ ٹھاکر، بڑے غلام علی خاں، سبالکشمی، حسین، لتا منگیشکر، بیگم اختر کتنے ہی نام ہیں جو ملک اور دنیا کے طول و عرض تک پہنچے ہیں۔ کیا یہ کلچر کی رسوائی ہے یا کلچر کا احیا۔ پاپولر کلچر نے عام لوگوں [illegible] جمود سے نکال کر ان کی قوت کو متحرک کیا ہے۔ ان کو [illegible] انفرادیت عطا کی ہے اور ذاتی اظہار کے مواقع [illegible] بڑی تعداد میں اضافے کا نتیجہ ضروری نہیں کہ معیار میں کمی آ جائے۔ [illegible] میڈیا اور ٹیکنالوجی کے باعث جو تبدیلی آئی ہے، وہ [illegible] یہ حقیقت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور [illegible] کلچر کی [illegible] کو رد کیا جا سکتا ہے۔ ادیب، عوام اور سماج کے باہمی رشتے میں بنیادی تبدیلی آئی ہے۔ ادب اور فن خواص کے دائرے سے باہر نکل کر پورے سماج میں داخل ہو کر عام لوگوں کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ ہر فنی تخلیق کا سماجی پہلو ہوتا ہے۔ فنی تخلیق کا عمل کتنا ہی نجی کیوں نہ ہو جب اس کی نمائش کی جاتی ہے یا کوئی تحریر چھپ کر منظر عام پر آتی ہے، موسیقی کی محفل ہوتی ہے، یا تصویروں کی نمائش یا کتاب کی اشاعت یا ماس میڈیا کے ذریعے کچھ نشر ہوتا ہے تو وہ فنی تخلیق سماجی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جب وہ اپنے دوستوں، پرستاروں یا سرپرستوں کی [illegible] باہر آتی ہے تو اس کو پیش کرنے کے لیے کئی دوسرے لوگوں کی تنظیم [illegible] کی ضرورت پڑتی ہے۔

یہ سوچنا کہ لوگ کند ذہن اور ذوق سے عاری ہوتے ہیں، یک سمتی اور پس ماندہ طرزِ فکر ہے۔ کلچر کے شعبے میں اطلاعات، علم، تفننِ طبع اور جمالیاتی تسکین کئی چیزیں شامل ہیں۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ کس کا کیا رول ہے۔ لوگوں میں مختلف النوع ذوق ہوتے ہیں [illegible] ایک طبقے کے ذوق کو اعلیٰ یا معیاری قرار دے کر ان کے ذوق کی [illegible] کسی کو کم ذوق یا بد ذوق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور یہ نہ ہی کسی کو

کلچرل ذوق کی اشاعت کو اعلیٰ کلچر کا پیمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہر کلچر میں کئی طرح کی سطحیں ہوتی ہیں۔ اگر ہم محض اعلیٰ کلچر اور باذوق اشرافیہ کو ہی کلچر کی رفعت سمجھتے ہیں تو عوام کی کلچر تک رسائی کبھی نہیں ہو سکتی اور کلچر سماجی زندگی میں سرایت نہیں کر سکتا۔ جس کے باعث سماج میں ہمیشہ کلچرل تفریق، دوری اور کشمکش رہے گی۔ صرف تعلیم کے پھیلاؤ سے ہی اعلیٰ کلچر کو فروغ حاصل نہیں ہوتا۔ جس ماس سوسائٹی میں ہم رہ رہے ہیں اس میں کسی غالب، فردوسی، شیکسپیئر یا کالی داس کا تصور ممکن نہیں۔ آج تخلیقی قوت بھی تہہ در تہہ سماج کے مختلف طبقوں میں سرایت کر چکی ہے۔ یہ سب کچھ سماجی تبدیلی، ماس میڈیا اور پاپولر کلچر کے باعث ہی ممکن ہو سکا ہے۔ اعلیٰ کلچر کے مقام پر متوسط طبقے کا کلچر زیادہ مقبول ہو رہا ہے جو پاپولر کلچر کے زیادہ قریب ہے۔ لیکن اعلیٰ کلچر کے تقاضوں کو بھی کسی حد تک پورا کرتا ہے۔ اعلیٰ کلچر میں ذاتی ذوق، جمالیاتی حس اور ذہنی اپج زیادہ غالب ہے۔ پاپولر کلچر کا مرکز قارئین، ناظرین، سامعین ہے جن کے سماجی پس منظر، معاشی رتبے، اقتدار اور احساسات کو مدنظر رکھ کر تخلیقات پیش کی جاتی ہیں۔ پاپولر کلچر اکثریت کے جمالیاتی ذوق اور ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ لازمی نہیں کہ یہ کلچر کمرشل کلچر ہی ہو۔ ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ اسے کس قسم کا کلچر چاہیے۔ کیا عام لوگوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بھی کلچر کی نشوونما سے فیض یاب ہو سکیں۔ وہ کسی بھی طرح اعلیٰ کلچر کی نمو میں حائل نہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اعلیٰ ادب کے خالق خود ہی پاپولر کلچر کی مقبولیت اور منافع کے باعث اعلیٰ ادب کی تخلیق کو خیرباد کہہ رہے ہیں تو زیادہ صحیح ہے۔ وہ عوام کی کند ذہنی، محالات اور سماج کو کوستے ہیں۔ یہ خود دفاعی اور سفاکانہ عمل ہے۔

آج کا دور کلچرل، جمہوریت اور کثرت وجود کا دور ہے۔ اعلیٰ کلچر کے معدودے چند داعیان کو یہ اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اکثریت کے کلچر کے بارے میں اپنی رائے اور پسند کو عوام پر لاد دیں۔ پاپولر کلچر عام لوگوں کے لیے مضر نہیں۔ پاپولر کلچر پورے سماج میں پھیلی ہوئی کمیونیکیشن کا

بہت ہی کم لیکن اہم حصہ ہے۔ سماج میں جاری دوسرے اثرات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک دوسری کتاب "ریوولٹ اگینسٹ ماسس" (۱۹۷۱ء) میں آرون وائلڈوسکی نے ان سے حالات پر اظہار فکر کرتے ہوئے لکھا ہے سیاسی خواص کا طبقہ اور تمام ہمارا انقلابی طبقہ اور کلچرل آلودگی کے مخالفین کلچر کو ان لوگوں تک نہیں لے جانے دینا چاہتے جو ابھی تک کلچر سے محروم رکھے گئے ہیں۔ نئے کلچر نے سائنسی نظام کے مقابلے میں متوسط طبقے کی قوت کو بڑھایا ہے۔

ماس میڈیا کے اثرات کو کم یا ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہمارے عہد کی تہذیب کا جزو لاینفک بن چکا ہے۔ ادب عالیہ کو پاپولر کلچر سے ہمیشہ خطرہ رہا ہے لیکن ہم یہ امر فراموش کر دیتے ہیں کہ ادب عالیہ پورے سماج کا کلچر نہیں بن سکتا۔ یہ چند طبقوں کے افراد تک ہی محدود رہے گا۔ جوں جوں عوام سماج کے مسائل کا حصہ بنتے جائیں گے پاپولر کلچر کی مانگ اور اشاعت بڑھتی جائے گی اور اعلیٰ کلچر پر اس کا اثر پڑنا ناگزیر ہے۔ اگر لوگوں کی کثیر تعداد اعلیٰ کلچر کی جمالیات سے لطف اندوز نہیں ہو سکتی تو کیا ہم ان لوگوں کو کلچر کے دائرے سے باہر کر دیں۔ سماج میں مختلف النوع اثرات اور جمالیاتی اظہار کے باعث لوگوں کی کلچرل ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے پاپولر کلچر رہے گا۔ پاپولر کلچر کے بارے میں ہمارا رویہ مخالفت کا نہیں مفاہمت کا ہے۔ ہم اس بارے میں کئی رویے اپنا سکتے ہیں۔ پاپولر کلچر کو مسترد کرنا، قبول کرنا، نظرانداز کرنا، بہتر بنانا، بدل دینا یا آگاہ کرنا۔

ہمیں پاپولر کلچر کے کس حصے کے بارے میں کون سا رویہ اپنانا ہے اہم سوال یہ ہے نہ کہ سارے پاپولر کلچر کی ہی نفی کر دینا۔ پاپولر کلچر اس خلا کو پر کرتا ہے جسے اعلیٰ کلچر نے چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے اس کی یلغار کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اعلیٰ کلچر پر حاوی ہو جانا چاہتا ہے یا اس کا مقام حاصل کرنا چاہتا ہے بلکہ اس معنی میں ہے کہ وہ کلچر سے محروم لوگوں کو اپنے دائرۂ اثر میں لانا چاہتا ہے۔ ماس کلچر کا معیار کم ہو سکتا ہے لیکن وہ سماج اور تہذیب کے لئے خطرہ نہیں اور پھر وہ اتنا بڑا بھی نہیں جتنا ہم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب کلچرل اشاعت کے لئے ماس میڈیا کا استعمال ہوتا ہے تو وہ ذاتی تخلیقی عمل سے آگے نکل کر مشترک سماجی عمل بن جاتا ہے۔ اس باعث اولیں تخلیق میں کچھ نئے عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں، کچھ میں تبدیلی آجاتی ہے اور کچھ کم ہو جاتے ہیں۔ جب کوئی ادبی تخلیق کسی مخصوص میڈیا سے نشر ہوتی ہے تو اس میں اس میڈیا کے لوازمات کے مطابق تبدیلی آجاتی ہے۔ اسی لئے مارشل میک لوہن جو اس دور کے الیکٹرانک مسیحا قرار دئے جاتے ہیں۔ نے کہا ہے:

"MEDIUM IS THE MESSAGE"

ماس میڈیا فرصت کے لمحات کو پر کرتا ہے۔ ہم فرصت کا کیا استعمال کرتے ہیں اس سے ہماری طرز زندگی معین ہوتی ہے۔ ماس میڈیا کی اہمیت اور اثر سے انکار یا فرار ممکن نہیں خاص طور پر نئی نسل جس کی پرورش الیکٹرانک میڈیا کے دور میں ہوئی ہے پاپولر کلچر کی سب سے بڑی سرپرست ہے۔ ماس میڈیا کے اثر کو روکا نہیں جا سکتا چاہے ہم اسے اپنی زندگی اور سماج کو بہتر بنانے کے لئے استعمال میں لائیں یا صرف 'تفریح' سستے پن، اشتہارات یا پروپیگنڈہ کے لئے۔ اگر ہم صحیح طور پر اس پاپولر کلچر کی طرف توجہ دیں جس کی جڑیں ہماری سرزمین اور تہذیب میں گہری ہیں، جو حال کے مسائل کو اپنے اندر سمیٹتا ہے اور مستقبل کی جانب استقبال کرتا ہے تو ہمیں پاپولر کلچر کے بارے میں بھی تربیت دینی پڑے گی۔ اسی طرح جس طرح ہمارے تعلیمی نصاب میں ادب عالیہ کی تعلیم شامل ہے۔ اعلیٰ ادب اور پاپولر کلچر سے آویزش نہیں، باہمی اشتراک سے ہی نئے عہد کے نئے ذہن کی پرورش کر سکتے ہیں۔

▲▲

غزل

ساقی فاروقی

وقت ابھی بیدار نہ ہوا تھا تم بھی راز میں تھے
اک سسکتا سناٹا تھا ہم آغاز میں تھے

اس سے پیار کیا جس پر خاموشی نازل کی
اس پر ظلم کیا جو سند اپنی آواز میں تھے

ہر قیدی پر آزادی کی حد جاری کر دی
ہونٹوں کا اعجاز ہوئے جو نغمے ساز میں تھے

حبس تھا کوئی صبح فروزاں ہونے والی تھی
شام قدم بوسی پر تھی سائے پرواز میں تھے

جس نے خوں میں غسل کیا اور آگ میں رقص کیا
حیف کہ سارے ہنگامے اس کے اعزاز میں تھے

غزلیں

ساقی فاروقی

ہم ترے پاس درد کی شدت سے آئے ہیں
دن سے نڈھال رات کی نیت سے آئے ہیں

یادوں میں اک چراغ نگاہوں میں اک دھنک
سب رنگ و نور ایک جراحت سے آئے ہیں

پلکوں پہ تار تار قیامت کی دستکیں
سارے عذاب خواب کی جنت سے آئے ہیں

تو اپنی آگ میں ہے تو ہم اپنی آگ میں
اور فاصلے مزاج کی غربت سے آئے ہیں

الفاظ معتبر کہ معانی بکھر گئے
یہ مرحلے خیال کی لکنت سے آئے ہیں

یہ ظلم ہے، خیال سے اوجھل نہ کر اسے
جو حاصلِ سفر ہے معطل نہ کر اسے

وہ شعلۂ سوال کہ دنیا اجال دے
دل کے چراغ میں تو مقفل نہ کر اسے

ہر سلطنت پہ رکھے ہیں مگر دشمنوں کے سر
ناداں بڑا دماغ ہے قتل نہ کر اسے

حیرت تری سرشت ہے نارس تری نگاہ
وہ عقدۂ جمال — ابھی حل نہ کر اسے

یہ اور بات ایک ستارے سے جنگ ہے
بس جنگ ہے جہادِ مسلسل نہ کر اسے

اتر پردیش کامیابی کی بلندی پر

۲۰ نکاتی پروگرام پر عمل درآمد کے سلسلے میں اتر پردیش سارے ملک میں سرفہرست ــــ
یہ محض قسمت یا اتفاق کی بات نہیں ہے۔ حقیقتاً یہ مسلسل کوششوں اور اس نظم وضبط کا نتیجہ ہے جس کا مظاہرہ حکومت اور عوام کی جانب سے کیا گیا۔ اس کے علاوہ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی مخلصانہ اور فعّال قیادت میں اس پروگرام کو جس بھرپور عزم انداز میں عملی شکل دی گئی ہے، یہ اس کا بھی نتیجہ ہے۔

سال ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران پروگرام کی تقریباً سبھی مدوں میں صد فی صد اور بعض میں دگنی اور تین گنی کامیابی حاصل ہوئی۔ کامیابیوں کا فی صد حسب ذیل ہے:-

* بے زمین افراد کو قابل کاشت زمین کی تقسیم میں ــــ ۳۶۳ فی صد
* قلت زدہ مواضعات کو پینے کا پانی مہیا کرنے میں ــــ ۲۲۹ فی صد
* ضرورت مندوں کو رہائشی پلاٹوں کے الاٹمنٹ میں ــــ ۲۲۲ فی صد
* دیہی علاقوں کی رہائشی اسکیم میں ــــ ۱۶۹ فی صد
* گندی بستیوں کے سدھار میں ــــ ۱۳۷ فی صد
* بایو گیس پلانٹ لگانے میں ــــ ۱۳۶ فی صد
* ٹیوب ویل کی بورنگ میں ــــ ۱۱۷ فی صد
* نجی چھوٹی آب پاشی پروگرام میں ــــ ۱۱۶ فی صد
* مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے ذریعہ غریبی دور کرنے میں ــــ ۱۱۶ فی صد
* قومی دیہی روزگار پروگرام میں ــــ ۱۱۱ فی صد
* دیہی بے زمین روزگار گارنٹی پروگرام میں ــــ ۱۰۶ فی صد
* شجرکاری میں ــــ ۱۰۹ فی صد
* بندھوا مزدوری کی بازآبادکاری میں ــــ ۱۰۵ فی صد
* دیہی صنعت کاری میں ــــ ۱۴ فی صد

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات ورابطۂ عامّہ اُتّر پردیش

نسب خو

کائنات کا بازی گر

نواں سفر

شفق

" کائنات کا بازی گر " کی قسطیں تین بار شب خون میں چھپیں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کہانی شب خون کے لئے وقف ہو گئی ہے چونکہ یہ مسلسل کہانی ہے اس لئے اس کی ایک دو قسطیں اگر کسی دوسرے رسالے میں میری یا مدیر کی مجبوریوں سے چھپ جاتی ہیں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ضائع ہو گئیں۔ بات سلسلہ وار قاری تک پہنچانے کی خواہش مجھے اس کے لئے مجبور کرتی کہ میں بقیہ قسطیں شب خون کے صفحات پر بکھیر دوں تاکہ کہانی کا مجموعی تاثر قائم رہے شب خون شمارہ ۱۲۹ میں ساتویں/آٹھویں سفر کے بعد یہ تین نئے سفر بھی قارئین شب خون کی نذر ہیں۔ — شفق

رات اندھیری تھی۔

آسمان گرد آلود تھا دور تک پھیلی ہوئی عمارتیں تاریکی کے غلاف میں لپٹی ہوئی تھیں، اور شاہراہیں سو چکی تھیں، دور سڑک پر کبھی کبھی کوئی گاڑی آڑی ترچھی آتشیں لکیریں کھینچتی گذر جاتی۔

وہ بہت دیر سے کھڑکی میں کھڑی اندھیرے آسمان میں امید کا کوئی ستارہ ڈھونڈ رہی تھی میرے چاروں طرف بھی تو ایسا ہی اندھیرا ہے، اس نے افسردگی سے سوچا ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا، ٹٹول کر راستے طے ہو رہا ہے چہروں کی شناخت ختم ہو چکی ہے۔ اب صرف سائے ہیں اور کیا سائے گرفت میں آتے ہیں،

وہ کھڑکی سے ہٹ کر میز تک آ گئی، شطرنج کی بچھی ہوئی بساط پر نظریں پڑیں تو افسردگی اور بڑھ گئی دونوں محاذوں پر غداروں کی طاقت بڑھ رہی ہے۔ دشمن کو مدد دی جا رہی ہے کہ وہ شہر کو گھیر لے۔

بچاؤ کی تدبیریں ..... اس نے شہادت کی انگلی سے پیشانی کھٹکھٹائی اب کوئی دھماکہ ہی ذہن کی پوشیدہ اور خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر سکتا ہے مگر کیسا دھماکہ .. ۔ کیا جنگ چھیڑ دی جائے ؟،،

نہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ عوام کو بار بار گمراہ نہیں کیا جا سکتا اور غدار میری کمزوری سے واقف ہو جائیں گے۔

آہنی دیواریں .. ۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گئی، سوچ کی لکیریں اس نقطہ پر مرکوز ہوئیں تو ذہن اسکرین بن گیا

تصویریں گذرنے لگیں تو ہونٹ مسکرا اٹھے آنکھیں جگمگانے لگیں، پھر اسکرین پر ایک چہرہ نمودار ہوا۔ سانولا رنگ، لمبوترا چہرہ عمر کی بھٹی میں تپے ہوئے بال، جہاں دیدہ آنکھیں۔ چہرہ قریب آ گیا۔ کلوزاپ .. چمکتی ہوئی آنکھوں سے شعاعیں نکل کر اس کے ذہن میں پیوست ہونے لگیں تو وہ چھوئی موئی کی طرح سمٹ گئی۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ بجھ گئی۔

پہلا آدمی — اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دیواریں بھی ممکن نہیں کہ وہ زمانہ دوسرا زمانہ تھا، جب میں نے جو چاہا کیا، جسے چاہا کیا مگر اب تو گھر کی بلیاں بھی آنکھیں دکھانے لگی ہیں، اور اس شخص کو تو مخالفت کی عادت پڑ گئی ہے، پہلے غداروں کی مخالفت کی اور اب میری کر رہا ہے، یہ کسی کا نہیں کہ تاریخ کے صفحات پر ہیرو بننا چاہتا ہے۔

دونوں محاذوں پر میری گرفت کمزور ہو رہی ہے اور میری کچھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں ؟ اس کے مرتے ہی میری ساری صلاحیتیں بھی مردہ ہو گئی ہیں، مگر مجھے زندہ رہنا ہے اپنے لئے، اپنے خاندان کے وقار کے لئے، دوسرے ولی عہد کے لئے، اس کی نظریں دیوار پر اڑتے ہوئے جہاز کی تصویر پر رک گئیں، کیا یہ ممکن ہے — ؟ وہ تصویر کے نزدیک چلی گئی، کیا بے سہارا کرنے والا سہارا بھی بن سکتا ہے ؟

نہیں..... اس نے افسردگی سے سوچا۔ "منزل کا تصور ہی میعادی چیز ہے اور اس کی منزل تو....

ہوا چلی تو کتاب کے ورق پھڑپھڑا کر کھل گئے۔

انسان کی حالت سنگِ مرمر کے اس پتھر کی سی ہے جو پہاڑ سے نکلا ہے۔ جب تک سنگ تراش اسے خراش تراش کر پالش اور جلا سے آراستہ نہیں کر سکتا۔ اس کی خوبیاں چھپی رہتی ہیں۔"

وہ دیر تک ان سطروں کو گھورتی رہی۔ پھر اڑتے ہوئے جہاز کو دیکھا تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

آنے والے کے سر پر کپڑے کا گٹھر تھا اور داڑھی بے تحاشہ بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے اندر آکر تین بار فرشی سلام کیا اور پھر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

آپ کے گھر کی کیا خبر ہے؟ ملکہ نے پوچھا تو اس کی ٹھوڑی سینے سے جا لگی۔

میں مجبور ہو گیا ہوں کہ ان کی پشت پر مذہب کا سایہ ہے۔ اب خبر ملی ہے کہ وہ مظاہرہ کرنے یہاں آئیں گے۔

یہ آپ کے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ آپ کی اپنے گھر میں کوئی وقعت نہیں رہ گئی ہے، وہ برہم ہو گئی۔ پھر کس طرح نمائندگی کے دعوے دار ہیں۔

وہ بہت دیر تک سر جھکائے کھڑا رہا پھر دھیرے سے بولا میں آپ کا قدیم نمک خوار ہمیشہ ملکہ کی سالمیت اور محل کا وفادار رہا ہوں۔ امتحان شرط ہے۔

امتحان ——— اس نے دانت پیسا۔ آپ لوگ اس لائق ہیں کہ ایک ایک کر کے نکال دئے جائیں۔ چلے جائیے یہاں سے۔

اس کے جانے کے بعد وہ پھر میز کے پاس آئی۔ سادے اور آگے نکل آئے تھے، تو اب یہ محل کے سامنے سر اٹھائیں گے۔ اس نے پیادوں کو گھورا ان کی دیکھا دیکھی دوسرے میعاد والے بھی آئیں گے۔ پھر محل کے دو طرفہ ہوگا۔ چاروں طرف آگ لگ جائے گی مگر پہلا آدمی کچھ کہنے ہی نہیں دیتا کہ خود کو کھلونا بنے کے بجائے کھلونا بنانے والا سمجھنے لگا ہے۔

وہ اور پھر دستک ہوئی۔ "وہ" جھلا کر غلام کو کوئی سخت بات کہنے والی تھی کہ اس نے چاندی کی طشتری سامنے کر دی۔

میر جاؤ.... وہ ڈھیلی پڑ گئی۔

آنے والے کو وہ چپ چاپ دیکھتی رہی۔

ملکۂ عالیہ میں یہ پوچھنے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ پہلے آدمی کی میعاد پوری ہو رہی ہے اس کے متعلق آپ نے کیا سوچا۔

میعاد پوری ہو رہی ہے ——— وہ زیرِ لب بڑبڑائی، اس کے ذہن میں روشنی کا جھماکا ہوا، تو یہ کانٹا نکل رہا ہے؟ اس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے آنے والے کو دیکھا، صبح مشیروں کو بڑے ہال میں جمع کر کے اس مسئلے پر غور کیا جائے۔

اس کے جانے کے بعد وہ دیر تک کرسی پر بیٹھی فائل پڑھتی رہی اور اس کے سامنے چہرے آتے رہے، خونی آنکھیں، بڑے بڑے دانت، مڑی ہوئی ناک اور مکروہ ہونٹ.....

قاتل، راہزن، ڈاکو، اسمگلر اور سزا یافتہ..

اس نے جھنجھلا کر فائل بند کر دیا۔ ولی عہد نے یہ کیا تماشہ کیا تھا۔ کیا یہ لوگ اسی اہم ذمہ داریوں کے اہل ہیں؟ غدار اور ان کا کوئی مقابلہ نہیں کہ ان کی زندگی نظم و نسق سنبھالتے گذری ہے اور اق کی گھاڑتے اور رسم کی گھڑی نزدیک آتی جا رہی ہے۔ ایک کانٹا خود نکل جائے اگر انتخاب میں چوک ہو گئی تو پھر شیرازہ بکھر جائے گا، بدگمانیاں ... جائیں گی اور تاریخ کے صفحات پر آخر کار ناکام و نامراد کا عنوان لگ جائے گا۔ پھر میں کیا کروں ——— ؟ اس نے دیوار کو اس طرح دیکھا جیسے اس سے جواب طلب کر رہی ہو۔ وہ بجلیاں کہاں دفن ہو گئیں جو ذہن میں کوندا کرتی تھیں اور دشمن حیران رہ جاتے تھے، وہ زندگی، وہ ہماہمی اس کی لاش کے ساتھ میری صلاحیتیں کیوں مردہ ہو گئیں؟ تصور اس کی پرچھائیں کا ہے، اس نے بغل کے کمرے میں بچے کو سوئی ہوئی عورت کو دیکھا ..... اس منحوس نے میرا سکون چھین لیا ہے، اسے دیکھ کر وہ یاد آ جاتا ہے اور دماغ کچھ سوچنے کے لائق ہی نہیں رہتا۔ سمجھوں گی، اس سے سمجھوں گی، اس مسئلے سے ہٹ لوں تو پھر.

صبح وہ ہال میں داخل ہوئی تو دھوئیں کے مرغولے اور بدبو کے بھبکوں نے اس کا استقبال کیا اور اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ ان کی یہ جراءت! اس کا چہرہ تپ گیا' پھر وہ اندر داخل ہو گئی کہ یہ وقت مناسب نہیں تھا۔

اس نے اپنی نشست پر بیٹھ کر حاضرین کا جائزہ لیا سب موجود تھے نگراں کے چہرے..... دھندلائی ہوئی آنکھیں' ناخنوں سے بہتی ہوئی پان کی سرخی۔ ہونٹوں میں دبی ہوئی کوئی شے اور قالین پر تھوک کی پچکاریاں۔ .

اس نے ایک ایک چہرے کا جائزہ لیا پھر اس کی نظریں مایوس لوٹ آئیں کہ ان سے کوئی توقع ہی فضول ہے۔

بولنے والے نے صورت حال پر روشنی ڈالی تو مشوروں کا طوفان اٹھا وہ چپ چاپ سب کی باتیں سنتی رہی اور پہلی بار اسے احساس ہوا کہ انھیں تو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے۔

وہ چپ چاپ ہال سے نکل آئی مگر اس کے دماغ میں بہت مشوروں کا طوفان اٹھا' غصہ اور احساس بے بسی کہ اب کیا کروں۔ اس نے دن میں کئی بار خود سے سوال کیا اور جب شام ہوئی تو اس کے بے چین قدم کتابوں کی الماری کے پاس رک گئے!

تم خوش قسمت تھے کہ اپنی زندگی میں ہر بغاوت کو کچل کر اس محل کے وقار کا تحفظ کیا تھا۔ اس نے پیار سے ایک کتاب کی جلد پر ہاتھ پھیرا اور اسے لئے ہوئے کرسی تک واپس آئی۔ انگلیاں ورق سے الجھتی رہیں۔ نظریں سطروں پر پھیلتی رہیں۔ مگر ذہن کہیں اور تھا پھر ایک صفحہ پر اس کی نظریں ٹھہریں تو ذہن سمانے لگا اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئی' غور سے پورا صفحہ پڑھا اور پھر پڑھا۔

مجھ سے پہلے پرکھوں نے کٹھن وقتوں میں یہی کہا تھا کہ یہ رشی منیوں کا دیش ہے' اس نے عقیدت سے کتاب چوم لی۔ رات ہوئی تو وہ ننگے پاؤں باہر نکلی' اس کے بدن پر معمولی سی ساڑی تھی' اندھیرا اپنے قدم مضبوط کر چکا تھا اور سالگرہ تو ... بد حال عورت تھی اور سیکڑوں دشمن' دور سے کوئی سایہ دیکھ کر سہم جاتی۔ اوٹ میں چھپنے کی کوشش کرتی' نہ جانے کون ہے؟ اخباری نمائندہ ہوا تو دوسرے دن گرم خبریں گھروں کا دروازہ کھٹکھٹائیں گی۔

راہ میں ایک مکان کے سامنے مسلح افراد کو دیکھ کر وہ درخت کی اوٹ میں چھپ گئی' وہ چوکنی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے قریب بڑی سی گاڑی کھڑی تھی' کچھ دیر بعد مکان کے اندر سے رونے پیٹنے کا شور بلند ہوا اور کچھ لوگ اپنی پیٹھوں پر بکس لادے باہر نکلے۔ انھیں دیکھ کر گاڑی غرائی' دروازے کھلے اور وہ اس میں سما گئے' فضا میں کئی دھماکے ہوئے اور گاڑی دھول اڑاتی گذر گئی تو پڑوسیوں کے دروازے کھلے۔

وہ درخت کی اوٹ سے نکل کر تیزی سے آگے بڑھ گئی مگر اس کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے' وہ تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ آگ کی روشنی میں ایک معمر عورت' نوجوان لڑکے اور شیر دل کے نعش کو دیکھا۔ جلتی ہوئی لڑکی کا منہ ہاتھ اور پیر بندھے ہوئے تھے اور شعلے باہوں میں بھرے اسے پیار کر رہے تھے۔

اس کا جی چاہا وہ نوجوان کی آنکھیں پھوڑ دے اور معمر عورت کے منھ پر اتنے طمانچے مارے کہ اس کی آنکھیں بہہ جائیں' مگر..... اس کا موقع نہیں تھا۔ وہ مضمحل قدموں سے آگے بڑھتی رہی پھر نیم کے درخت کے نیچے سرگوشی سن کر رک گئی۔

سو جاؤ میرے لال' صبح ہوگی تو تمھیں روٹی دوں گی۔
مگر ماں بہت بھوک لگی ہے اور پھر سسکیاں۔

آبادی ختم ہونے والی تھی اور محافظوں کی کوٹھری میں روشنی تھی۔ وہ جلدی سے گذر جانا چاہتی تھی مگر ایک دل دوز چیخ سن کر رک گئی۔ کواڑ کی جھری سے اندر جھانکا' میز پر کھلی ہوئی شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی' ایک گلاس کی شراب آدھی ہو گئی تھی' دھوئیں کے مرغولے چکرا رہے تھے اور زمین پر پڑی ہوئی برہنہ لڑکی بھنبھوڑی جا رہی تھی' دو محافظ الگ کھڑے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

سالی بہت چیختی کیوں ہے' رپورٹ لکھی جا رہی ہے نا۔ پھر قہقہے' پھر چیخیں۔

نفرت اور دہشت سے اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ بدن کا خون سمٹ کر کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا' تھکن نے اچانک اس پر شب خون مارا تھا' آبادی پیچھے چھوٹ چکی تھی' ناہموار زمین پیروں میں نشتر لگا رہی

تھی، مگر اس کا ذہن آندھیوں کی زد میں تھا۔

بادشاہ تو خدا کی طرف سے عوام کی جان و مال کا محافظ ہوتا ہے۔ مگر میں خدا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ رات کتنی گناہوں کی پرورش کرتی ہے! پھر دور سے پہاڑ نظر آئے، کالے ہیبت ناک دیو کی طرح، ہوا کی سسکیاں تیز ہو گئی تھیں، اس کا دل دھڑکنے لگا، اس کا دل چاہا وہ واپس لوٹ جائے، آگے نہ جانے کون سی بلائیں منتظر ہوں۔ مگر اس کے قدم پھر تیز ہو گئے۔ کیا ان بلاؤں سے زیادہ ہیبت ناک ہوں گے جنہیں پیچھے چھوڑ آئی ہوں؟ اگر اس جسمانی اذیت کے بدلے سکوں مل گیا تو میں عہد کرتی ہوں کہ اپنے لوگوں کو اس مصیبت سے نجات دلاؤں گی۔

پہلی بار اسے احساس ہوا کہ راستہ کیا ہوتا ہے؟ اندھیرا کتنا پرہول ہوتا ہے اور رات کتنی ڈراؤنی ہوتی ہے، ورنہ محل کے آرام دہ کمروں میں سب کچھ کتنا دل فریب معلوم ہوتا ہے، جی چاہتا ہے گھنٹوں اندھیرے کمرے میں آنکھیں بند کئے بیٹھے رہا جائے اور ہلکی سی آواز بھی کانوں میں نہ پڑے۔

راستہ ختم ہو گیا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر عبادت گاہ کے دروازے پر پہنچی، چراغ کی مدھم روشنی ماحول کو پراسرار بنائے ہوئے تھی، دیوی کے ہاتھوں کی برچھی راکشش کے سینے میں پیوست تھی اور جیتا جیتا خون ابل رہا تھا۔ دیوی کی نگاہیں دروازے کی طرف تھیں اور ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ وہ دیوی کے قدموں میں گر پڑی۔ ماں تو سب کچھ جانتی ہے، سب کچھ دیکھتی ہے، تیری پجارن سنکٹ میں ہے، مجھے شکتی دے ماں کہ میں حالات کا مقابلہ کروں، روشنی دے ماں کہ میں اندھیرے میں بھٹک رہی ہوں، وہ بہت دیر تک روتی رہی، آنسوؤں سے پاؤں دھوتی رہی مجھے شکتی دے ماں، راستہ دکھا۔

پھر نزدیک ہی کوئی درندہ غرایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی، دیوی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی تھی اور غار میں عجیب سی گونج کے ساتھ روشنی بڑھ رہی تھی۔

سامنے کی دیوار پر متحرک سایوں کو دیکھ کر وہ سنبھل گئی۔

اڑتا ہوا ہوائی جہاز، دو چھوٹے چھوٹے ہاتھ ..... نوشکی کا ناٹک ... وہ زیر لب بڑبڑائی۔

دیواروں کی تصویریں غائب ہو چکی تھیں، گونج کے ختم ہوتے ہی روشنی بھی ماند پڑ گئی اور وہ چراغ کی روشنی میں ماں کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔

ماں، مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا، میری رکشا کر، مجھے راستہ دکھا کہ میں پرکھوں کی امانت کی رکشا کر سکوں۔

وہ واپسی کے لئے روانہ ہوئی تو اس کا ذہن دیواروں کی تصویروں میں الجھا ہوا تھا، اڑتا ہوا جہاز . . کیا یہ ممکن ہے؟ چھوٹے چھوٹے دو ہاتھ اور نوشکی کے ناٹک کا کیا مطلب ہے؟

رات ختم ہونے والی تھی اور صبح سے پہلے اسے محل میں پہنچنا تھا اس لئے اس کی رفتار بہت تیز تھی اور جب سورج نے آنکھیں کھولیں تو وہ عقبی دروازے سے محل میں داخل ہو رہی تھی۔

ماں تم اس طرح ــ ؟

میرے ساتھ آؤ۔

وہ چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا پھر الجھے ہوئے لہجے میں بولا مگر ممی تم سمجھ رہی ہو کہ میرا . .

میں صرف یہ سمجھتا ہوں کہ تمھاری رگوں میں بھی وہی خون ہے جو تمھارے بھائی کی رگوں میں تھا۔

وہ تو ٹھیک ہے مگر میری منزل....

بیوقوف! وہ بھی کوئی منزل ہے، کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میرے بعد اس محل کے دروازے تم پر بند ہو جائیں، موروثی محل دوسرے کا قبضہ ہو، ہم حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں سمجھے . ..

اور پھر اعلان کرنے والا گلی گلی شور مچا رہا تھا، مل گیا، نعم البدل مل گیا شہر کے ہر خاص و عام کو خوش خبری سنائی جاتی ہے کہ ولی عہد نے عوام کی خدمت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

ایک مرحلہ تو طے ہو گیا۔ ملکہ نے شطرنج کی بساط پر نظریں جما

سرچ۔ اس دو چھوٹے چھوٹے ہاتھ ۔ ۔ ۔ ۔

جب وہ بڑے ہال میں داخل ہوئی تو مشیروں نے اسے مبارکباد دی، اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے اور ثابت کیا کہ یہ پہلے ولی عہد سے زیادہ فعال ہوگا۔

وہ چپ چاپ ساری باتیں سنتی رہی مگر اس کی نظریں مشیروں کے ہاتھوں پر جمی ہوئی تھیں اور یہ انکشاف بھی ہوا کہ مشیروں کے ہاتھ غیر متوازن ہیں داہنا ہاتھ بے حد لمبا ٹخنوں کو چھوتا ہوا، بایاں ہاتھ چھوٹا۔

پھر وہ بولنے کے لئے کھڑی ہوئی تھی، میرے لئے سب سے بڑی خوشی اس میں ہے کہ میرے عوام چین و سکون سے رہیں مگر مجھے اطلاع مل رہی ہے کہ وہ نہ صرف غیر محفوظ ہوگئے ہیں بلکہ طرح طرح کے مظالم کا شکار بھی ہو رہے ہیں اور مجھے شرمندگی ہے کہ ہمارے محافظوں کا کردار بھی مشکوک ہوگیا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے آدمی کے انتخاب میں ایسے فرد کو منتخب کریں جو نہ صرف اس بگڑتی صورت حال پر قابو پائے بلکہ ہماری معاونت کرے۔

وہ چپ ہوئی تو مشیروں نے اسے یقین دلایا کہ عوام قطعی محفوظ ہیں اور کہیں سے کسی ناخوشگوار واقعہ کی اطلاع نہیں ملی ہے نہ ہی محافظوں کا کردار مشکوک ہوا ہے اور یہ کہ غداروں نے عوام کو گمراہ کرنے کے لئے افواہوں کا بازار گرم کر رکھا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔

ملکہ ان کی آنکھیں دیکھ رہی تھی۔ ظلم و ستم کے ذکر پر ان کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک آجاتی تھی۔ پیاسی پیاسی خونی چمک اور دائیں ہاتھ کی مٹھیاں کھل بند ہو رہی تھیں، مجلس برخواست ہوئی تو وہ کپڑے کے گٹھر والے کو اپنے ساتھ لیتی آئی۔

تم نے کہا تھا کہ تم پرانے نمک خوار ہو۔ اگر تمہیں کوئی ذمہ داری سونپوں تو کیا امید کروں کہ تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس نے جھکا ہوا سر اٹھا کر ملکہ کو دیکھا، اگر آپ غلام کو کسی خدمت کے لئے منتخب کر چکی ہیں تو غلام یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ اس کا پہلا اور آخری فرض آپ کی خوشنودی ہوگا، اس نے دونوں ہاتھ جوڑ لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چھوٹے چھوٹے دو ہاتھ۔

وہ خوشی کے امنڈتے ہوئے سیلاب کو پی گئی، کہیں ایسا نہ ہو بعد میں تم بھی کھلونا بنانے کی فکر کرنے لگو۔

وہ بری طرح چونکا تھا اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ میں اور یہ پہلا آدمی ـــــ اس نے اپنے چکر کھاتے ہوئے سر کو مشکل ہی سے سنبھالا، میں اور یہ پہلا آدمی۔ اس نے اپنے محنت کش ہاتھوں کو دیکھا، میں اور پہلا آدمی۔ اسے سب کچھ گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اور ملکہ مسکراتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کر سوچ رہی تھی، ایک تیر سے دو شکار نہایت آسان ہے۔ یہ کبھی باغی نہ ہوگا کہ یہ اس کے لئے امید سے بڑا اعزاز ہے۔ پھر کمزور ہوتے محاذ پر میری گرفت مضبوط ہو جائے گی، یہ اعزاز ایک فرد کے لئے ایک قوم کے لئے، قوم کی سرفرازی کی علامت، علیحدہ ہونے میں کیا رکھا ہے۔ اب انہیں تشدد کا راستہ چھوڑنے پر مجبور کروں گی کہ مہرہ میرے ہاتھ میں ہے۔

لوگوں نے اس خبر کو حیرت سے سنا۔ وہ اسے اچھی طرح پہچانتے تھے اس کی صلاحیت سے بھی واقف تھے مگر اتنا اہم عہدہ۔ کیا یہ اس کا اہل ہے؟ یہ تو وقت بتائے گا کہ کس میں کتنی صلاحیت ہے، چائے خانوں میں پان کی دوکانوں پر، دفتروں میں، اسکول کالجوں کے اسٹاف روم میں، ریلوے پلیٹ فارموں پر، ڈرائنگ روم میں بحثیں ہی بحثیں تھیں۔

وہ بڑا تھا مگر جہاں دیدہ کہ اس کی آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا تھا۔ غدار جگہ جگہ گھوم رہے تھے۔ اس کے اندر قوت فیصلہ اور فیصلہ پر اٹل رہنے کی ہمت تھی مگر یہ شخص تو کچھ بھی نہیں ہے۔ پہلا آدمی دنیا میں ہماری نمائندگی کرتا ہے، یہ تو صرف ایک زبان بولتا ہے، سنتا اور سمجھتا ہے۔ یہ شطرنج کی بساط کا مہرہ ہے۔ ملکہ نے اسے قہقہہ بچانے اور غداروں کو مات دینے کے لئے رکھا ہے جب وہ مجبور ہو جائے گی تو دھماکہ کرے گی۔ اس کے کاندھوں پر بندوق ہوگی اور ٹریگر پر ملکہ کی انگلیاں۔ وہ اپنے مخالفوں کا شکار کھیلے گی کہ اسے اس کی عادت پڑ گئی ہے۔

بڑے بالوں والے اس الجھن میں پڑ گئے کہ اب کیا کریں۔ ایک طبقہ جنگ جاری رکھنا چاہتا تھا مگر دوسرا اسے اپنے آدمی کی ملامی سمجھتا تھا۔ مظاہرہ ضرور ہوگا۔ جوشیلا نوجوان چیخ رہا تھا۔ میں مقصد پر اپنی جان قربان کردوں گا، اگر تم ساتھ نہ دوگے تو میں تنہا جاؤں گا تنہا مروں گا کہ مقصد قربانی مانگتا ہے، اگر تم مقصد پر ایمان رکھتے ہو تو میرا ساتھ دو، اپنی بزدلی کو مصلحت کا نام مت دو کہ غدار اپنے گھر میں بیٹھے ہیں۔

ہم غیر قوم کے افراد ہیں، ہمیں بزدلی کا طعنہ مت دو کہ ہم نے وطن کے تحفظ کے لئے اپنا خون بہایا ہے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ کچھ دن انتظار کرو، ہماری عجلت ہمارے نمائندے کو شرمندہ لب کر سکتی ہے۔

ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اسے بھی موقع مل جائے گا کہ ہم نے اس پر اعتماد کیا، اسے مہلت دے دی۔

تم سب خود کو فریب دے کر اپنی زندگی میں حسد بے مصرف دن کا اضافہ کرنا چاہتے ہو، جوشیلا نوجوان اور گرم ہو گیا، یاد رکھو بغیر خون دیئے کوئی بھلے مقصد پورا نہ ہوگا کہ دنیا کی تاریخ یہی کہتی ہے ...

گرد کو دیکھ کر وہ چپ ہو گیا۔ سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو میٹنگ کی کارروائی شروع ہو گئی۔

ملکہ گہری نظروں سے ساری ہل چل دیکھ رہی تھی پرچھائیاں اسے پل پل کی خبریں پہنچا رہی تھیں۔ کون کیا کہہ رہا ہے، عوام کیا سوچ رہے ہیں۔

دھماکے کی گونج ختم ہونے کے بعد بھی لرزش باقی رہتی ہے، یہ لرزش بھی ختم جائے گی، ابھی تو میری جیب میں کتنے دھماکے پوشیدہ ہیں۔ کس کس پرچے میں گوٹیاں ہوں گی اور ضروری ہے کہ دھماکے ہوتے رہیں تاکہ میں عوام کے ذہن پر مسلط رہوں، اور جب ملکہ کو یقین ہو گیا کہ لرزش بھی ختم ہو چکی ہے تو وہ مرحوم ولی عہد کے کمرے میں داخل ہو گئی، اپنے بیٹے سے کھیلتی ہوئی وہ چونک کر کھڑی ہو گئی، ممی آپ . . .

وہ چیزیں کہاں ہیں جن کی وجہ سے میری انگلیاں دلی ہوئی ہیں۔ اس کا چہرہ خشک تھا۔

میں کہہ چکی ہوں کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے، ممی آپ کے سامنے ہے آپ چاہیں تو تلاشی... .

تو تم دینے سے انکار کرتی ہو؟

وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ پھر بے بسی سے بولی، میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ......

خاموش .. وہ گرجی۔ سلسلہ ٹوٹ چکا ہے اب اس گھر میں تمھاری ضرورت نہیں۔

وہ بھونچکا سی اسے دیکھتی رہی . ... یعنی میں یہاں سے چلی جاؤں؟

ابھی اور اسی وقت ... وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

مگر ممی! میں اس ننھی سی جان کو لے کر کہاں جاؤں، کیا آپ کو اس کی محبت نہیں؟

خبردار! جو پھر تم نے ممی کہا، جب وہی نہیں رہا تو میرا کوئی نہیں۔ مجھے اس گھر سے صرف اس لیے نکالا جا رہا ہے کہ اس کی جگہ تمھارے لاڈلے بیٹے کو مل جائے، وہ پھر بپھر گئی۔ اس کی تصویریں تک اس گھر سے ہٹا دی گئیں، مگر یاد رکھیے یہ آپ کو بہت مہنگا پڑے گا اور ...

رامو... ملکہ حلق پھاڑ کر چیخی، باہر پھینک آؤ اس کتیا کو۔

اور جب وہ دائیں ہاتھ میں بچہ اور بائیں ہاتھ میں سوٹ کیس لے کر محل سے نکل رہی تھی تو نوکروں کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

گیٹ پر رک کر اس نے ڈبڈبائی نظروں سے محل کی دیواروں کو دیکھا، اس کی زندگی کے سنہرے دن یہیں گزرے تھے، اس نے خواب بھی دیکھے، خوابوں میں تو قوس قزح کے رنگ بھی گھلے تھے مگر اب .. دور دور تک لیٹی ہوئی سنسان سڑک، دھول کے مرغولے، آگ برساتا ہوا سورج اور بلکتا ہوا بچہ.. . اب وہ کہاں جائے کہ اس نے کبھی کہیں جانے کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ وہ بے مقصد چلتی رہی، دکھ اور تھکن سے نڈھال سڑکوں کا لمس وہ بھول چکی تھی، اب تو یہ سڑکیں ہی اس کا مقدر تھیں۔ دھوپ اور تھکن سے جب چلنا مشکل ہو گیا تو اس نے اٹیچی زمین پر رکھ دی،

بچے کو گود سے اتار دیا، ممکن تھا کہ وہ بھی سڑک کے کنارے بیٹھ جاتی کہ ایک برق رفتار کار کے بریک چرچرائے۔

ارے آپ ــــ اترنے والا دوڑ کر اس کے پاس آیا، یہاں اس حال میں ....، اوہ میں سمجھ گیا۔ آیئے گاڑی میں بیٹھ جایئے کہ وہ نہیں رہا مگر اس کے چاہنے والے موجود ہیں۔

ہوں ــــ تو وہ اس کی گاڑی میں چلی گئی، پرچھائیں کے جلنے کے بعد وہ زیر لب بڑبڑائی، وہ کتا جسے ہڈی نہیں ملی تو بھونکنے لگا ہے، اب اسے سہارا دے گا؟

مگر ماں ــــ یہ اچھا نہیں ہوا کہ وہ بہرحال ہماری عزت تھی، ولی عہد نے بولنا چاہا تو اس نے بری طرح جھڑک دیا۔ نالی کے کیڑے بہت دیر تک فرش پر نہیں رہتے۔ اسے واپس جانا ہی پڑتا ہے، تم نے تیاریاں مکمل کر لیں، سامان ایرپورٹ جا چکا ہے۔

سنو، سفید قوم میں تمھیں ملکش ہونا ہے۔ یہ تاثر دینا ہے کہ تم اس ملک کے ہونے والے بادشاہ ہو، میرے سفر کا بس یہی مقصد ہے۔

غلام چاندی کا طشت لے کر حاضر ہوا تو وہ اس کی آمد کا انتظار کرنے لگی، آنے والے کے ہاتھ میں کاغذات تھے۔

ملکۂ عالیہ ــ کورنش بجا لانے کے بعد وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق تینوں خالی جگہوں کے لئے رسم کا اعلان ہو چکا ہے، یہ دیکھئے۔ اس نے ادب سے کاغذ پیش کیا۔

رپورٹ پڑھنے کے بعد اس نے سر اٹھایا، وہاں کیا حالات ہیں،

ایک جگہ تو برسوں سے آپ کی توجہ چاہتی ہے دو جگہوں کے لئے مشیروں کو متحرک کر دیا گیا ہے، امید ہی نہیں یقین ہے کہ نتیجہ آپ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔

ایسا ہونا ہی چاہئے کہ عوام نے ہمیں کا کوئی بھی حصہ ہے اور تندار برا کل سے ہی تو ساری امکانی کوشش کرو کہ اسی پر مستقبل کا دار و مدار ہے۔

جہاز فضا میں بلند ہوا ہی تھا کہ گاڑیاں شہروں کی طرف روانہ ہو گئیں۔ ان میں ہتھیار بھرے ہوئے تھے اور ڈرائیور کی سیٹ پر ایک پیکٹ رکھا ہوا تھا۔ اور پھر کئی شہروں کی سڑکیں رنگین ہو گئیں۔ آگ لگی، ... سو ...

۳۰ / ۱ / ۸۲ ــ ضمیر البدر ، لوسہ ۲۰۰۶

اٹھا اور آسمان کھلبلا گیا، کراہیں گونجیں، نعرے لگے اور زخمیوں کی چیخیں وحشیانہ قہقہوں میں دب گئیں۔ ہفتوں آگ جلتی رہی، بھڑکتے ہوئے شعلے اپنا دائرہ بڑھا رہے تھے۔ خبریں ہوا کے دوش پر لرزتی جاتیں حالانکہ نکاسی کے تمام راستوں پر کڑے پہرے بٹھا دئے گئے تھے۔

اور لوگ دم بخود پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے جن کے ایک ہاتھ ٹخنوں کو چھو رہے تھے، آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ نتھنوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ہونٹ تضحیکی انداز میں سکڑ کر ایک طرف جھک گئے تھے اور چمکتے ہوئے دانتوں کی قطاریں لہو میں ڈوبی ہوئی تھیں، ان کے ایک ہاتھ میں مشعل تھی دوسرے میں پیٹرول کے پیپے۔

پھر محل کے سامنے بڑے بالوں والے نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں خنجر تھے، بازوؤں سے مال بہہ رہی تھی، بال وحشیانہ انداز میں اڑ رہے تھے۔ وہ نعرے لگاتے ہوئے محل کی طرف بڑھ رہے تھے۔

رک جاؤ۔ ٹھہر جاؤ آگے مت بڑھو، بھاری اور گونج دار آواز چیخ چیخ کر انھیں حکم دے رہی تھی۔ واپس لوٹ جاؤ کہ یہ ممنوعہ علاقہ ہے، آگے موت ہے، کوئی بچ سکے گا، کوئی نہ بچا سکے گا چلے جاؤ واپس چلے جاؤ۔

اور جوشیلا نوجوان اپنی قمیص کے بٹن کھولے، سینہ سپر کئے محافظوں کو للکار رہا تھا۔ مارو یہاں مارو کہ میں مرنے کے لئے ہی آیا ہوں۔ اور بوڑھے آسمان نے دیکھا، بوڑھی زمین نے دیکھا، محل کے کنگوروں نے دیکھا کہ اس کی لاش خاک و خون میں لتھڑی پڑی ہے، مگر اس کے لبوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ ہے۔

ملکہ کو پل پل کی خبریں پہنچ رہی تھیں وہ مضطرب تھی مگر دلاسی ما ٹکی کہ وہ اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عہد کر چکی تھی۔ تب ہی ڈگڈگی بجاتے ہوئے، مرحوم ولی عہد کی پرچھائیں نے ماد گار یاد دلائی بتائی ہے اور ڈسکی کا مالک ہسپتال میں موت کی گھڑیاں گن رہا ہے۔

میرے خدا! یہ کیا ہو گیا ــــ اس نے بے بسی میں مٹھیاں بھینچ لیں۔ مجھے وہاں سے جانے کا ... تشویش نہیں مگر اس کتیا کی یہ ہمت ... اور ذرہ مر رہا ہے۔

سنو — تم چلے جاؤ، وہ ٹہلتے ٹہلتے رک کر ولی عہد کی طرف مڑی۔ ناٹک کے گرد آہنی دیوار کھینچ دو، ڈاکٹروں سے کہو کہ وہ دنیا کی بہترین دوائیں فراہم کریں۔ اسے ہر حال میں زندہ رہنا ہے۔ جاؤ اسی وقت روانہ ہو جاؤ اور سنو۔ کتیا کے مددگاروں کی فہرست فراہم کرو۔ میں آ کر انھیں مزا چکھاؤں گی اور پہلے آدمی سے کہہ دینا۔ یہ مظاہرہ مجھے پسند نہیں آیا، کہ دنیا بھر کے کھلاڑی آ رہے ہیں، ہماری عزت خاک میں مل جائے گی۔ اور مہمانوں کے خیر مقدم میں کوئی کمی نہ ہو، میں جلد ہی آ کر سب کچھ خود دیکھوں گی۔

جب ولی عہد کا جہاز رن وے پر رکا اور وہ دوڑتا ہوا اسپتال میں داخل ہوا تو لوگ حیرت زدہ ہو گئے۔

یہ صحیح ہے کہ وہ مایہ ناز فن کار ہے مگر اتنا اہم بھی نہیں کہ ولی عہد دورہ چھوڑ کر اس کی عیادت کو دوڑ پڑے۔

چہ میگوئیاں الفاظ بننے کو بے چین تھیں، یہ حادثہ نہیں قتل ہے۔

یہاں تو روز سیکڑوں مرتے ہیں پھر یہ تشویش۔

اتنی رازداری، اتنا سخت پہرہ، ہوائی جہاز سے دوائیں؟

مشیروں کی گاڑیاں ہسپتال کا چکر کاٹ رہی ہیں۔

اور جب ملکہ کی آمد کی خبر سن کر لوگ استقبال کے لئے ایرپورٹ پہنچے تو ملکہ نے مالا پہننے سے انکار کر دیا۔

یہ خوشی کا موقع نہیں کہ میں عیادت کے لئے آئی ہوں، آپ لوگ پھیر یہ سمجھئے میں سیدھے ہسپتال جاؤں گی۔

پھر شہر بھر پر لگاکر اڑنے لگیں، پرچھائیں کے مددگار پکڑے جا رہے ہیں۔

ملکہ نے اعلان کیا، یہ سب قاتل ہیں، مجرم ہیں۔ یادگار پارٹی مجرموں کی پناہ گاہ ہے۔

کچھ دن پہلے تو یہ ملکہ کے قریبی آدمی تھے۔ ذہنوں میں سوال تھا مگر پوچھنے کی مہلت نہ مل سکی کہ پل چل پڑھ گئی تھی۔

شہر کی صفائی شروع ہو چکی تھی، شکاری ٹرکوں میں بڑے بڑے جال لئے سڑکوں پر گشت لگا رہے تھے، جہاں کوئی مفلوک الحال بوڑھا بھکاریا جوان نظر آیا اسے ٹرک میں بھر کر شہر سے دور پھینک دیا جاتا کہ دلہن کی طرح سجی ہوئی جگہ میں کوڑے کرکٹ کا کیا کام۔

گاؤں بسا دیا گیا۔ شراب نالیوں میں بہنے لگی اور عیش و عشرت کے دروازے کھل گئے۔ یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ اسی شہر میں نیم کے درخت کے نیچے ایک ماں اپنے بھوکے بچے کو جھوٹی تسلیاں دیتی ہے، چپ ہو جاؤ صبح کو روٹی دوں گی۔

بڑے بالوں والے مظاہرے پر آمادہ تھے مگر نظم و نسق بونوں کے ہاتھ میں تھا۔

ہفتوں خبروں کا بازار گرم رہا مگر لوگوں کے دل انجانے خوف سے دھڑک رہے تھے۔ ٹیکس پہلے ہی کیا کم تھا؟

جتنا اس کھیل پر خرچ ہوا ہے اس سے اس ملک کا ہر فرد لکھ پتی بن جاتا۔ غدار گھروں کے دروازے کھٹکھٹا رہے تھے۔ خسارہ پورا کرنے کے لئے پھر ہمارا خون نچوڑا جائے گا۔ آپ لوگ کچھ دیکھ رہے ہیں؟ لوگوں کی آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی تھیں، لٹتی ہوئی عصمتیں، جلتی ہوئی گودیں، لٹتا ہوا گھر، لہو میں ڈوبے ہوئے ہونٹ، بھوک سے دم توڑتے بچے، سسک سسک کر مرتی ہوئی کنواریاں، جلتی ہوئی دلہنیں، ایڑیاں رگڑتے ہوئے بوڑھے اور وہ مشیر... جو ہر ناجائز کو جائز کہہ رہے تھے۔

ایک محاذ پر آگ تھی جو سب کچھ جلا کر خاکستر کر دینا چاہتی تھی، دوسرے پر ہڑتالیں، بموں کے دھماکے، اڑتی ہوئی ٹرینیں اور بھرتی ہوئی جیلیں۔

لوگ دیکھ رہے تھے۔ سوچ رہے تھے، ہماری بدنصیبی کہ ہم بار بار غلطیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں، ہم نے غداروں سے امیدیں وابستہ کیں پھر ملکہ کے آگے سر جھکایا مگر حالات بگڑتے گئے۔ اس لئے ہم عہد کریں کہ ناکارہ ترین افراد کو اپنا ہیرو بنا لیں کہ سبق دینا ضروری ہے۔

اور جب تین گھروں کے رسم کا نتیجہ سامنے آیا تو ملکہ نے ایسے

بُھراتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

علامتیں بتا رہی ہیں کہ ہوا مخالف ہو رہی ہے، شاخیں جھکولے کھا رہی ہیں، حصار ٹوٹ رہا ہے، غداروں کی طاقت بڑھ رہی ہے۔ وہ پھر متحد ہونے کی کوشش کر رہے ہیں، ضرورت ہے تبدیلی کی، بہت بڑی تبدیلی کی ورنہ تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرائے گی مگر نہیں ...... اس نے سر جھٹکا، میں شکست نہیں کھا سکتی، عین وقت پر بازی پلٹ دوں گی کہ میری جھولی میں دو طاقتور بم موجود ہیں۔ انتظار ہے۔ صرف وقت کا انتظار ....

●

دسواں سفر

وقت دھیرے دھیرے سرک رہا ہے۔ رسم کی گھڑیاں قریب آتی جا رہی ہیں، اور حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں، میرے پاس دو طاقتور بم ضرور موجود ہیں مگر کیا پتہ صورت حال کیا ہو جائے، وہ فکر میں ڈوبی ہوئی کھڑکی کے پاس گئی، چنبیلی کے پودے پر نظر پڑی تو اس کی تشویش اور بڑھ گئی۔

یہ پھول کھلنے کا موسم ہے مگر ہری بھری شاخیں زرد ہوتی جا رہی ہیں۔ مالی زرد ہوتی شاخیں کاٹتا رہتا ہے، دوائیں ڈالتا ہے مگر مرض پھیلتا ہی جا رہا ہے، اگر اب بھی اس مرض کی تشخیص نہ ہو سکی تو ......؟

پھر اس کے کان محتاط قدموں کی چاپ پر لگ گئے، بہت ہلکی سی چاپ۔ جیسے کپڑا زمین پر گھسیٹا جائے، آواز عقبی دروازے کی طرف سے آ رہی تھی۔ پھر دروازہ دھیرے سے تھپتھپایا گیا۔

آنے والا لمبا تڑنگا شخص سفید پینٹ شرٹ اور کریپ سول جوتے میں ملبوس تھا۔ اس کا سانولا چہرہ اور آنکھیں پتھر کی طرح منجمد اور بے جان معلوم ہو رہی تھیں۔

عقبی دروازہ دھیرے سے بند کرنے کے بعد وہ مین دروازے کی طرف آئی ہوا ہماری سنسان پڑی تھی مگر کونے والے کمرے سے اطالوی موسیقی کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔

اس نے دروازہ بند کر کے لاک کر دیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ آنے والا زمین پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

تمھیں علم ہے میں نے تمھیں کیوں بلایا ہے؟ اس نے سرگوشیوں میں پوچھا۔

آنے والے کی نظریں زمین سے اٹھ کر گھڑی بھر کے لئے اس کے چہرے پر رکیں پھر جھک گئیں۔ مگر اس کے بھینچے ہوئے لب ساکت رہے۔

وہ بھی چپ رہی شاید اپنی باتیں کہنے کے لئے مناسب لفظوں کا انتخاب کر رہی تھی۔ کمرے میں گھڑی کی ٹک ٹک دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔

تم دیکھ رہے ہو، میرا مطلب موجودہ صورت حال سے ہے۔ وہ گھڑی بھر کے لئے رکی، تم اس سے پہلے بھی میرے لئے اہم خدمات انجام دے چکے ہو، ویسے تو میرے بازو بہت پھیلے ہوئے ہیں مگر میں ایک ایسا بازو چاہتی ہوں جو سب کی نظروں سے پوشیدہ ہو کر صرف میرے مفاد کا تحفظ کرے، اگر آنے والے دنوں کے لئے ہم نے ابھی سے تدبیریں نہ کیں تو ....؟ خطرات بڑھ رہے ہیں، دشمن طاقتور ہو رہے ہیں، وہ میرے ہر اقدام کی مذمت کر کے عوام میں میری ساکھ گرا رہے ہیں۔ پرانی چالیں بے اثر ہو گئی ہیں، اس لئے میں کوئی نیا کھیل چاہتی ہوں۔ ایسا پوشیدہ کھیل کہ سوائے کھلاڑیوں کے اور کوئی واقف نہ ہو سکے .... .

تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو۔؟

اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا، مگر اس بار چہرہ دوسرا معلوم ہو رہا تھا، تیز چمکیلی آنکھیں اور ہونٹوں پر سفاک سی مسکراہٹ۔

سوال اختیارات کا ہے ـــ وہ پہلی بار بولا تھا، اس کی آواز اس کی شخصیت کی ضد تھی، بالکل کسی عورت کی طرح مہین۔

چونکہ یہ خفیہ مشن ہو گا، اس لئے اختیارات لامحدود ہوں گے، تم اس کے سربراہ ہو گے، چونکہ مجھے تم پر اعتماد ہے اس لئے میں سمجھتی

نہوں کر .....

وہ زیرِلب مسکراتا رہا، مگر اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں جیسے وہ دور کسی محاذ پر برسرِپیکار ہو۔

وقت تیزی سے گذر رہا ہے۔ تمھیں لائحۂ عمل مرتب کرنے میں جلدی کرنی پڑے گی۔ جاؤ اور آج ہی سے تیاری شروع کر دو۔ مجھے تمھاری تیسری آنکھ سے امید ہے کہ وہ میرے لیے اندھیرے میں روشنی کی کرن ڈھونڈ لے گی۔

اس کے جانے کے بعد ملکہ نے دروازہ کھول دیا۔ کھڑکی کے پردے نیچے اسکولی گیت گا رہے تھے اور ایک کار گیٹ میں داخل ہو کر تیزی سے پورٹیکو کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اس کے لوٹتے ہوئے قدم رک گئے، کار سے تین نوجوان اترے اور تیز تیز قدم سے اس کی طرف بڑھے۔

اوہ ممی ..... تمھارے کام بہت تھکا دینے والے ہوتے ہیں، ولی عہد کرسی پر ڈھیر ہوتا ہوا بولا' دن بھر ٹیلیفون کرتے کرتے میں تھک گیا، مگر ہر جگہ سے جواب مل گیا ہے' انھیں اس تاریخ پر کوئی اعتراض نہیں، اب تم تیاری کرو۔

اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں، میرا خواب شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے۔ میری شہرت کے قدم گھر سے باہر نکل رہے ہیں، میں سربراہوں کی کمیٹی کی سربراہ ہوں گی، وہ ٹہلتی ہوئی دیوار پر لگی تصویر کے پاس رک گئی۔

پاپا تم دیکھ رہے ہو تمھاری بیٹی کہاں جا رہی ہے؟ وہ تصویر کی پیشانی چوم کر بولی، تمھیں دکھ تھا ناکہ تمھارے کوئی بیٹا نہیں، اب تمھاری آتما کو شانتی ملے گی کہ تمھاری بیٹی تم سے آگے قدم بڑھا رہی ہے، مجھے آشیرواد دو پاپا کہ میں اس ذمہ داری کو نبھا سکوں۔

سنو ـــــ وہ ولی عہد سے مخاطب ہوئی، تم اور تمھارے دوست ان کے استقبال کی تیاریاں کریں گے، ایسا استقبال جو ان کے شایانِ شان ہو انھیں اس کا احساس نہ ہو کہ ایک غریب ملک کا ممبران کا سربراہ بن گیا ہے۔

مگر ممی ـــــ ولی عہد کے چہیتے والے دوست نے دھیرے سے کہا۔ کھیلوں کے اخراجات پر ہی ابھی تک چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کیا اس طرح؟

خاموش رہو۔ ملکہ نے جھڑک دیا۔ تم سیاست داں نہیں ہو یہ دیکھنا میرا کام ہے کہ عوام کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند، اس اعزاز کے بدلے مجھے اقتدار سے ہٹنا بھی پڑے تو مجھے منظور ہے۔

چشمے کی اوٹ میں اس کی آنکھیں بجھ گئیں، پرنس کوٹ والا چپ رہا اور ولی عہد جلدی سے اٹھ گیا۔ چلو کہ ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔

ان کے جانے کے بعد وہ دیر تک ٹہلتی رہی، خوش آئند مستقبل کا تصور اسے بے چین کئے رہا، اس نے سکریٹری کو طلب کیا اور اخبار کے لئے بیان لکھوانے لگی۔

جب ریڈیو اور اخبار سے تاریخوں کا اعلان ہوا تو مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ شروع ہو گئی۔

ملکہ کو کیا ہو گیا ہے؟ ابھی ہم ایک فضول خرچی کی دلدل سے نکل بھی نہیں سکے ہیں اور ٹیکس کا بوجھ کمر توڑ رہا ہے کہ یہ دوسری فضول خرچی کیا ملک بالکل دیوالیہ ہو جائے گا؟

غداروں کو نیا موضوع ملا۔ وہ گلی گلی گھوم رہے تھے۔

اس کانفرنس سے ہمارے غریب دیش کا کون سا مسئلہ حل ہو گا، یہاں غربت ہے، افلاس ہے، بے روزگاری ہے اور مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے۔ ٹیکس کمر توڑ رہے ہیں۔ ایسے میں یہ کانفرنس صرف ملکہ کے لئے فائدہ مند ہے، وہ بھوکے ننگے عوام کی لاشوں پر کھڑے ہو کر اپنا قد بلند کرنا چاہتی ہے، امر ہونا چاہتی ہے، اسے ملک کے عوام سے، عوام کے مسائل سے کوئی ہمدردی نہیں، جب رسم کا وقت آئے گا وہ اپنی سازشوں سے عوام کو بے وقوف بنا دے گی، اس لیے ہوشیار رہیے۔ وقت آ رہا ہے جب آپ اپنی خواہش کے مطابق نمائندے منتخب کر سکیں گے۔

مگر صفائی کی مہم شروع ہو چکی تھی، شہر سجایا جا رہا تھا، ہر موڑ پر پہرے بٹھا دئے گئے، پانچ ستارے والے ہوٹلوں میں جدید آلات لگائے گئے اور ساری دنیا سے براہ راست رابطے کے انتظامات کئے گئے۔

چہل پہل بڑھ گئی اور جہاز رن وے پر اترنے لگے، دنیا کے کونے کونے کے سربراہوں کی آمد شروع ہوئی اور خبروں کا بازار گرم ہو گیا۔

وقت مقررہ پر میٹنگ کی کارروائی شروع ہوئی تو وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اسٹیج پر پہنچی اور تالیوں کی گونج میں اختیارات کی منتقلی ہوئی۔

صدر کی کرسی پر بیٹھ کر اس نے حاضرین پر نظر ڈالی اور اس کا سر غرور سے تن گیا۔ فلش کیمروں کی چکا چوند، ٹیلی ویژن کیمروں کے زاویے، ساری دنیا میں اس کو دیکھا جا رہا ہوگا، ساری دنیا کے اخبار اس خبر کو اولیت دیں گے، تصویریں چھپیں گی اور ریڈیو سے اس کے نام کا اعلان ہوگا اور۔

جب وہ تقریر کرنے کھڑی ہوئی تو الفاظ کا موجیں مارتا سمندر اس کے پاس تھا اور حاضرین اس میں ڈوب رہے تھے، ڈوبے جا رہے تھے، وہ سن رہے تھے، تالیاں بج رہی تھیں، وہ بول رہی تھی، الفاظ کانوں سے اتر کر دل کی رگوں کو جھنجھوڑ رہے تھے، خوش گوار لہریں اٹھ رہی تھیں، ہونٹ مسکرا رہے تھے اور وہ بول رہی تھی۔

تقریب ختم ہوئی تو جیسے ایک سنہرے خواب سے آنکھیں کھلیں اور حقیقت کی تلخ زمین پر ایک سوالیہ نشان کھڑا تھا۔ پانچ سالوں کے لئے ملے ہوئے اعزاز کی حفاظت کیسے کی جائے کہ ہم وطنوں نے پسند نہیں کیا ہے، انھیں دنیا میں عزت سے زیادہ اپنے مسائل کی فکر ہے، پیٹ کا دوزخ سب سے اہم ہے اور وہ میرے اقدامات کو فضول خرچی اور وقت کا زیاں سمجھتے ہیں۔

میں ہمیشہ دو پست طبقوں کی حمایت سے کامیاب ہوتی رہی ہوں، مگر تجربے نے ان پر سے بھی اعتماد ختم کر دیا، اس لئے اونچے طبقے کی حمایت ضروری ہے۔ اگر مجھے کٹر مذہب پسندوں کی حمایت حاصل ہو جاتی تو ۔۔۔ مگر کیسے؟ وہ مجھے اپنی راہ کا پتھر سمجھتے ہیں اور میں نے ہر حادثے پر انھیں موردِ الزام ٹھہرایا ہے کہ ابتدائی زمانوں میں آدمی زیادہ حساس اور اعلیٰ قدروں کا حامی ہوتا ہے۔ میرے سامنے دو راستے ہیں، انتہائی بلندی پر جاتا ہوا، انتہائی پستی میں گرتا ہوا، اگر میں سنبھل نہ سکی، پرکھوں کی امانت کی حفاظت نہ کر سکی، اسے اپنے خاندان میں منتقل نہ کر سکی تو پھر تاریخ کے صفحات دو فرد پر ختم ہو جائیں گے اور اس گھرانے کے افراد عام آدمیوں کی طرح زندگی کی بقا کے لئے جد و جہد کرتے کرتے موت کی نیند سو جائیں گے اور کسی کو معلوم بھی نہ ہوگا۔

عقبی دروازے پر پر اسرار قدموں کی چاپ ابھری تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئی، آنے والا خاموشی سے اندر چلا آیا اور دروازہ بند ہو گیا۔

کیا خبر ہے؟ ملکہ نے بے صبری سے پوچھا۔

میں نے سارا انتظام مکمل کر لیا ہے، اس کی آنکھیں شکاری بلیوں کی طرح چمک رہی تھیں، صرف آپ کے حکم کی دیر ہے۔

کام کہاں سے شروع ہوگا؟

ملکہ عالیہ راستے ہی راستے ہیں، بالکل نئے راستے، کسی کو شک بھی نہیں ہوگا اور آپ بلند ہوتی چلی جائیں گی یہ دیکھئے۔ اس نے جیب سے کاغذ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اس نے کانپتی انگلیوں سے کاغذ کھولا اور اس کی بے چین نظریں سطروں پر پھیلنے لگیں، پھسلتی رہیں، چہرے کے زاویے بنتے بگڑتے رہے۔ پیشانی پر سلوٹیں ابھرتی مٹتی رہیں، کاغذ کی تحریر ختم ہو گئی تو اس نے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کاغذ میز پر رکھ دیا۔

بہت خطرناک قدم ہے۔

خطرناک ضرور ہے مگر فتح یقینی ہے، آپ کی حیثیت اس کشتی کی سی ہو جائے گی جو ڈوبنے والوں کے سروں پر اچانک پہنچ جائے۔

وہ بہت دیر تک سوچتی رہی، بار بار کاغذ اٹھا کر جگہ جگہ سے پڑھتی، پھر طویل سانس لے کر کہنے لگی، جب مستقبل داؤں پر لگ جائے تو خطرات سے کھیلنا ہی پڑے گا۔

اس نے اطمینان سے کاغذ اٹھایا اور ماچس کی تیلی سلگا کر کاغذ میں آگ لگا دی، دونوں کی نظریں جلتے ہوئے کاغذ پر جمی رہیں۔

اس طرح ۔۔۔ اس نے جلے ہوئے کاغذ کی راکھ واش بیسن میں بہا دی۔ کوئی کاغذی کارروائی نہیں ہوئی کہ یہ جیتی ہوئی بازی پلٹ

بھی دیتے ہیں اور ہیرو مجرم بن جاتا ہے۔ سب کچھ ہمارے ذہنوں میں ہوگا، کام شروع ہوگا اور ختم ہو جائے گا بس .... وہ اٹھ کھڑا ہوا، غلام کے لئے آپ کا اعتماد سب سے بڑا اعزاز ہے۔

اور جب آدھی رات گذر گئی، گلیاں اور سڑکیں سونی تھیں۔ الیکٹرک پول میں لٹکا ہوا بلب اندھیرے سے جنگ میں مصروف تھا اور گھورتا ہوا اپنی خوابیدہ نظروں سے سنگی دیواروں کو تک رہا تھا۔

سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک سایہ بڑی عبادت گاہ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی جھکی ہوئی ٹوپی نے اس کا نصف چہرہ چھپا لیا تھا، وہ بے حد چوکنے انداز میں دبے قدموں سے راستہ طے کر رہا تھا۔ مرکزی دروازے پر پہنچ کر وہ رک گیا۔

دروازے میں چھپی ہوئی آنکھیں اس کا جائزہ لے رہی تھیں، وہ دیر تک دیوار سے چپکا ہوا کسی تبدیلی کا منتظر رہا۔ پھر اس کے ہاتھ زنجیر کی طرف بڑھتے ہی تھے کہ دروازہ کھل گیا اور اندھیرے سے کئی سائے نکل پڑے۔

مار ڈالو کتے کو۔

نہیں پہلے پوچھ لو کون ہے؟

پوچھنے سے کیا فائدہ، یہ سرکاری کتا ہے۔

میں سرکاری کتا نہیں ہوں۔ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ میری تلاشی لے لو میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے، میں گرد سے ملنے آیا ہوں۔

مگر اس طرح . رات میں

یہ تم نہیں سمجھو گے، گرد مجھ سے مل کر خوش ہوں گے۔

مار ڈالو۔

ٹھکانے لگا دو۔

نہیں اسے گرد کے پاس لے چلو، اگر گرد نے حکم دیا تو مار کر دفن کر دیا جائے گا، پہلے اس کی تلاشی لے لو۔

پر پیچ راستوں پر قدم قدم پر پہرے، حفاظتی انتظامات۔ کوڈ الفاظ کا تبادلہ۔

" تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟ — گرد نے بے حد نرم لہجے میں پوچھا۔

میں آپ سے تنہائی میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے محافظوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

گرد نے انھیں باہر جانے کا اشارہ کیا تو وہ ہچکچائے مگر..... ایک نے کہنا چاہا تو اس نے لاپرواہی سے ہاتھ ہلا دیا۔

محافظوں کے جانے کے بعد اس نے داہنے ہاتھ کا جوتا اتارا پھر جوتے کے اندر سے ایک کارڈ نکال کر گرد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

گرد نے کارڈ پر نظر ڈالی پھر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کا مطلب —؟

مجھے آپ کے مشن سے ہمدردی ہے اور میں اسے کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں۔

مگر کیوں؟ گرد کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔

آپ کا شک درست ہے، آپ کی جگہ میں بھی ہوتا تو یہی سوال کرتا۔ کہانی بہت لمبی ہے مختصراً اتنا سمجھ لیجئے کہ میں بھی وہ پرزہ ہوں جسے استعمال کر کے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا ہے۔ انتقام کا جذبہ فطری ہے مگر میں تنہا کیا کر سکتا تھا، آپ کے کام آ کر شاید اپنے جذبے کی تسکین کر سکوں۔

تم کیا کر سکو گے —؟ گرد نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا

میں..... اس نے فخر سے سر اٹھایا، ہتھیار اس مشن کے لئے ضروری ہیں، میں پورے علاقے کو گودام بنا دوں گا۔ پھر میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو آپ کے ہمدرد ہیں اور آپ کی کامیابی چاہتے ہیں۔ انہیں آپ سے ملا دوں گا، پھر محاذ بڑھ جائے گا، طاقت بڑھ جائیگی۔ ہم اتنا دباؤ ڈالیں گے اتنا دباؤ کہ اونچے ایوان کو جھکنا پڑے گا اور آپ ہیرو بن جائیں گے۔

وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟

آپ مجھ کو خدمت کا موقع دیجئے، ایک ایک بات سچ کر دکھاؤں گا۔

یہاں آنے سے پہلے میں نے مسائل اور ان کے حل پر بہت غور کیا ہے اور آپ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے ذہن میں کامیابی کی واضح تصویر ہے۔ آپ کے پاس جیالوں کی کمی نہیں، میں انھیں مسلح کروں گا اور ایک گوریلا ٹرینر انھیں تربیت دے گا۔ میرا اشارہ داڑھی مونچھ منڈوانے والے......

کیا وہ میری مدد کے لئے تیار ہے ــــ ؟ گرو کی آواز کپکپا رہی تھی۔

اس نے جواب کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ محافظ دھڑ دھڑاتے ہوئے کمرے میں گھس آئے۔

کیا بات ہے ــــ ؟ گرو نے پوچھا تو وہ نووارد کی طرف دیکھنے لگے۔

گدھا تیار ہو گیا ہے۔

اوہ نہیں . . . گرو نے جلدی سے کہا۔ یہ ہمارے لئے بے حد اہم آدمی ہے، ہم اس کی مدد سے گدھے بھریں گے، تم لوگ جاؤ اور بے فکر رہو۔ اس سے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

وہ سر جھکا کر چلے گئے تو نووارد کہنے لگا۔ یہاں لیسوں کی تعداد بہت ہے جنھیں اہم خدمات کے بعد کبھی ناکارہ پرزہ سمجھا گیا ہے وہ سب آمرانہ رویے سے شاکی ہیں، وہ سب ساتھ ہو جائیں گے اور وہ ٹرینر تو آپ کا ایسا آدمی ہے۔

رات گذر گئی تھی، مشرق میں روشنی کی کرن نمودار ہو کر کھڑکیوں سے جھانک رہی تھی جہاں ایک اہم فیصلہ ہو رہا تھا۔ جہاں دل و دماغ میں گھمسان کی جنگ جاری تھی۔ گرو کا دل اس کامیابی کی خوشی سے مسرور تھا، مگر ذہن بار بار سوالیہ نشان کھینچ دیتا۔ کیا واقعی یہ ہمدرد ہے ؟ اسے ہمارے مشن سے ہمدردی ہے ؟ یا یہ میرے لئے جال ہے؟ اگر یہ جال بھی ہے تو اسے آزمانے میں کیا حرج ہے ؟ زیادہ سے زیادہ میری جان جائے گی۔ اگر میں نے تو سر ہتھیلی پہ رکھ ہی لیا ہے۔ پھر اس پر کبھی یقین ہے کہ موت وقت سے پہلے نہیں آتی تو اس پر اعتماد کر لیا جائے۔

اگر یہ سچا ثابت ہوا تو...... ؟ اس کی آنکھیں خوش آئند تصور سے جگمگانے لگیں۔ اگر یہ جال ثابت ہوا تو آنکھیں دھندلا جاتیں

تم ہتھیار کہاں سے لاؤ گے ؟

وہ دھیرے سے ہنس دیا، میں آپ کے ذہن میں ہونے والی جنگ سے واقف ہوں اور اپنی صفائی میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر میری نیت میں کھوٹ ہوتا تو یہ بکھیڑا کیوں پھیلاتا، یہ دیکھئے، اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے قلم نکالا، یہ ایک جدید پستول ہے، انتہائی طاقتور، میں آپ کو گولی مار کر معاملہ ختم کر دیتا، اس لئے پھر کہوں گا کہ مجھ پر شک نہ کیجئے۔

میں نے پوچھا کہ ہتھیار کہاں سے آئے گا ــــ اس نے پستول کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہو گا، کسی کو مورد الزام نہ ٹھہرایا جا سکے، خریداری سرخ لوگوں سے برسر پیکار پہاڑی گوریلوں سے ہوگی اور پڑوسی سرحدوں سے اندر لایا جائے گا، میں ایسے افراد سے واقف ہوں جو یہ کام کرتے ہیں، آپ صرف پلاننگ کریں، حکم دیں، آپ کے جاں نثار اس پر عمل کریں گے ــ اب مجھے اجازت دیجئے کہ میں عملی ثبوت پیش کر سکوں۔

پھر فضائیں بوجھل ہو گئیں، چھٹی حس کے تار خطرے کا الارم بجانے لگے اور وحشت ناک خبریں پر لگا کر اڑنے لگیں۔

• عقاب کتوں پر بیٹھ کر آتے ہیں اور پلک جھپکتے شکار کر کے لوٹ جاتے ہیں، کوئی دیکھتا بھی نہیں، شاید کوئی نہیں دیکھتا کیوں کہ کسی کو بھی حلیہ نہیں معلوم، کان، آنکھیں، ہاتھ پاؤں اور بال توس کے ہیں۔ وہ کہاں سے آتے ہیں ؟ کب آتے ہیں؟ وہ کہیں سے نہیں آتے، یہیں موجود ہیں۔

مگر کسی کی طرف انگلی اٹھانے کی ہمت نہ تھی کیوں کہ اعلان کر دیا گیا تھا۔ انگلی اٹھانے والے کی انگلی، آنکھ اٹھانے والے کی آنکھ، منہ کھولنے والے کی زبان کاٹ ڈالی جائے گی۔

عقاب کے حملوں سے کوئی نہیں بچا، وہ جو اسے اپنا وطن سمجھ کر آ بسے تھے اور زندگی اپنے طور پر گذارنے کی جدوجہد کر رہے تھے اور وہ بھی جو نوواردوں کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ وکیل، ڈاکٹر، لیڈر،

پرنسپل کسان دوکان دار، راہ گیر اور اخباری نمائندے۔

کتے غراتے ہوئے آتے اور پڑوسی کے گھر سے چیخیں اور کراہیں گونجنے لگتیں تو اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بستروں میں کونے کھدروں میں دبک جاتے، مگر خوف زدہ نظریں بند دروازوں پر لگی رہتیں، کب دروازہ ٹوٹے گا اور اڑتے ہوئے عقابوں کی تیز چونچ آنکھ میں اتر جائے گی۔

کتے جب غراتے ہوئے واپس چلے جاتے تو بند دروازے کھلتے اور لرزتے قدموں سے وہ پڑوسی کے گھر جاتے، ادھڑی ہوئی لاشیں روتے بلکتے بچے اور بہا ہوا خون دیکھ کر وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے اور ان کے تصور کی آنکھیں اپنے گھروں میں ایسی لاشیں دیکھنے لگتیں۔

ہم اپنے ملک میں غیر محفوظ ہو گئے، ہمارے اپنے ہمارے خوں کے پیاسے ہو گئے ہیں، مگر ہمارا قصور کیا ہے، انھیں ملک سے شکایت ہے۔ گرایے حقوق کی جنگ ہیں وہ ہمیں کیوں کاٹ رہے ہیں، کس سے فریاد کی جائے، کون ہماری سنے گا، ملک نے آنکھیں اور کان بند کر لئے ہیں۔ محافظ تب آتے ہیں جب کتوں کے غرانے کی آوازیں فضا میں غائب ہوئے دیر ہو جاتی ہے، ہم یہاں رہ بھی نہیں سکتے کہ پیروں سے زمین اور سر سے آسماں غائب ہو رہا ہے ہم یہاں سے جا بھی نہیں سکتے کہ پیروں سے زمیں اور سر سے آسماں غائب ہو رہا ہے، ہم یہاں سے جا بھی نہیں سکتے کہ راہیں مسدود ہو گئی ہیں۔

وہ فکر کے اندھیرے میں گھر واپس ہوتے، اپنی سوئی کیوں کو حسرت سے دیکھتے، کیا پتہ پھر دیکھنا نصیب ہو یا نہ ہو، دفتر میں، بازار میں، سڑکوں پر، گلیوں میں، کھیت کھلیانوں میں ہر جگہ موت گھات لگائے ہوئے ہے اور ہمیں باہر نکلنا ہے کہ زندہ رہنے کے لئے ہوا کے ساتھ غذا کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور غذائیں بازاروں میں ملتی ہیں۔

محافظ بھی حیران پریشان کہ یہ سب ان کے لئے نیا تھا۔ وہ چوروں، بدمعاشوں سے الجھتے رہتے تھے جو اتنے بزدل ہوتے ہیں کہ محافظوں کا نام سنتے ہی رفو چکر ہو جاتے ہیں مگر یہ اتنے تربیت یافتہ ہیں، ایسا نفسیاتی حملہ کرتے ہیں کہ ہتھیار سنبھالنے سے پہلے اپنا کام ختم کر کے پر پیچ گلیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔

اخبار گنتیاں گنا رہے تھے، آج پندرہ، آج بیس، آج یہاں کل وہاں اور حادثوں کی اطلاعیں دل دہلا رہی تھیں۔

پھر خبریں آئیں، مصالحت کی گفتگو شروع ہو گئی ہے، کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ کوئی باعزت سمجھوتہ ضرور ہو جائے گا، مگر انجام ہمیشہ مایوس کن ہوتا۔

سمجھوتے کی کوئی صورت نہیں ہے کہ وہ اپنی مانگیں بدلتے رہتے ہیں، اعلان ہوتا۔ مگر مصالحت کا دوسرا دور جلد ہی شروع ہو گا۔

مگر یہ ہمیشہ ہوا کہ مصالحت کی گفتگو کے دوران عقابوں کے حملے تیز ہو جاتے اور لوگوں کی توجہ گفتگو سے ہٹ کر حادثوں پر مرکوز ہو جاتی، کیا ایسے میں مصالحت ہو سکے گی؟

زندہ رہنے کی ساری راہیں مسدود ہو گئی ہیں، حفاظتی تدبیریں ریت کی دیواروں کی طرح ڈھ گئیں، اب بے چھت کی دیواریں ہیں اور آگ برساتا ہوا سورج . لمبی لمبی زبانیں نکالتے ہوئے جو دھیرے دھیرے قریب ہوتے جا رہے ہیں، گرمی اور اتنی گرمی کہ سانسیں گھٹنے لگی ہیں، کیا پتہ ہم کل صبح سو کر اٹھ بھی سکیں گے یا زہریلی گیسیں ہمارا خاتمہ کر دیں گی۔

پراسرار تین آنکھوں والے نے جب شعلوں کی حدت محسوس کی تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے دور بیٹھے ہوئے کھدر پوش کو اپنے پاس بلایا اور دھیرے دھیرے اسے کچھ سمجھانے لگا۔

پھر کھدر پوش باہر نکلا اور راستہ طے کرتا ہوا ایک عمارت کے پاس ٹھہر گیا۔ سر اٹھا کر دیکھا، عمارت کے اوپر منہ کھولے ہوا تیرا گھور رہا تھا۔

تم ـــــ دبلے پتلے معمر آدمی نے کتاب سے نظریں اٹھائیں۔

میں خیر سگالی کے دورے پر آیا ہوں۔

خیر سگالی ـــــ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا، ایسا فرد جو

ہر حادثے کا قصور وار ہمیں ٹھہراتا رہا ہے وہ اس نہج پر بھی سوچے گا مجھے حیرت ہے۔

وقت اور تجربات سب سے بڑے معلم ہیں اور سوچنے والا ذہن ممکن ہے ابتدا میں بہتر نتائج نہ اخذ کر سکے مگر اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا احساس کر کے شرمندہ بھی ہوتا ہے، اس کا ازالہ بھی چاہتا ہے۔

مجھے یقین نہیں آتا — یہ دشمنی آج کی نہیں ہے، پھر اس یہ خیال کیوں آیا؟

میں اس کی پوری وجہ تو نہیں جانتا کہ میں صرف قاصد ہوں۔ مگر یہ ضرور بتا سکتا ہوں کہ ان کا جھکاؤ مذہب کی طرف زیادہ ہو گیا ہے اور آپ لوگوں کی اہمیت مسلم ہے۔

فضول باتیں — اس نے غصے میں بات کاٹ دی، اگر وہ مذہبی ہو جاتی تو کیا اپنے عزیزوں کو آگ کے شعلوں میں گھرا ہوا چھوڑ دیتی میرا اشارہ....

میں سمجھ رہا ہوں وہ سب بہت دکھی ہیں مگر اپنی ذمہ داریوں سے مجبور ہیں کہ دوسروں کے مذہبی مقامات کا احترام کیا جائے۔ پھر بھی وہ کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالیں گی۔

میں کیسے سمجھ لوں کہ وہ مجھ سے دوستی چاہتی ہے؟

امتحان شرط ہے۔ پندرہ سالوں سے جو آپ تہوار نہیں منا سکے ہیں، وہ منائیں۔ آپ کو ہر طرح کی آزادی ہو گی، وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

پھر دیر تک سرگوشیاں ہوتی رہیں۔

اس کے جانے کے بعد معمر آدمی نے کتاب بند کر کے الماری میں رکھ دی اور باہر نکل آیا۔ اسے سڑک پر دیکھ کر گذرنے والے رک گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سر ہی سر نظر آنے لگے۔

میرے عزیزو! میرے ہم وطنو! مجھے دکھ تھا کہ سب کچھ ہمارا ہوتے ہوئے بھی ہم اتنے مجبور ہو گئے ہیں کہ اپنا تہوار بھی نہ منا سکیں اور وہ بھی ان کی وجہ سے جو حملہ آور ہیں، جو مٹھی بھر ہیں اور جو غدار ہیں، اپنا سب کچھ الگ رکھتے ہیں، جن کی وفاداریاں مشکوک ہیں جو سرحد پار کے ملکوں میں اپنے ہم مذہبوں کی کامیابیوں پر خوش ہوتے ہیں اور ہم وطنوں کی کامیابیوں کا ماتم کرتے ہیں، دراصل یہ لوگ ہمارے دھرم کا کینسر بن گئے ہیں جو نہ دھرم کو پنپنے دیتے ہیں۔ اسے پوتر رہنے دیتے ہیں اس لیے میں تم لوگوں سے کہتا ہوں، ہم پندرہ سالوں بعد اپنا تہوار پھر منائیں گے، پھر پورے جوش و خروش سے منائیں گے اور جو مزاحم ہو گا اسے کاٹ کر پھینک دیں گے۔

مجمع نے تالیاں بجائیں۔

نہیں.. تالیوں کی نہیں تیاریوں کی ضرورت ہے۔ جاؤ اور تیاریاں کرو۔ ہمیں پندرہ برسوں کا خلا پر کرنا ہے۔ ہم زندہ قوم ہیں اور اپنی پرم پراؤں کے ساتھ زندہ رہیں گے۔

تیاریاں شروع ہوئیں تو ستر پر رحم والوں [illegible] دوڑے ہوئے سردار کے پاس گئے۔

آپ یہ کیا غضب کر رہے ہیں کہ پندرہ سالوں [illegible] ہوئے فتنے کو بیدار کر رہے ہیں، کیا آپ کو علم نہیں کہ [illegible] والوں نے اسے کیوں ممنوع قرار دیا تھا؟

ہم آزاد مملکت کے رہنے والے ہیں، یہاں سب کو برابر کا حق حاصل ہے، سردار نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ پھر [illegible] بات ہے کہ آپ تو اپنے تہوار دھوم دھام سے منائیں اور وہ جن کی یہ دھرتی ہے اور جو اسی دھرتی کی [illegible] تاریخ کے [illegible] آپ سے لڑتے رہے تھے [illegible] اپنا تہوار نہ منا سکیں، دوسرے لفظوں میں آپ کی برتری تسلیم کر لیں اور [illegible] کی روحوں کو شرمندہ کریں۔ پہلے والوں کو آپ کی [illegible] اس لیے قوم سے غداری کے مرتکب ہوئے تھے [illegible] میں تھی....

تیاریاں تیز ہو گئیں، اشتعال [illegible] بڑھتی گئیں، خوف و ہراس پھیلتا گیا اور تہوار کا دن [illegible] قریب آتا گیا۔ اخبار حوصلہ افزائی کر رہے تھے یہ ایک نیک قدم ہے ہماری

ہمدردیاں اس تہوار کے ساتھ ہیں اور ہم سردار کے اس اقدام کو سراہتے ہیں۔ مبارک باد پیش کرتے ہیں ابھی تو مکتی اندولن شروع ہوتا ہے۔ ان مقدس مقامات کو آزاد کرانا ہے جن پر حملہ آوروں نے اپنی عبادت گاہیں تعمیر کی ہیں، یاترا شروع ہونے والی ہے۔

اخبار چیخ رہے تھے، یہ تہوار نہیں خطرے کی گھنٹیاں ہیں، فضا کو زہر آلود بنانے کی سازش ہے، ہم صدیوں سے اس ملک میں رہتے چلے آ رہے ہیں، اخوت و آشتی ہمارا پیغام ہے، ہم کسی مذہب کے مخالف نہیں، ہم تو اس آگ کے مخالف ہیں جو اس تہوار کی اوٹ میں روشن کی جا رہی ہے، یہ گھاؤ تازہ کرنے کی سازش ہے، اس لئے ہماری سردار سے گذارش ہے کہ .. مگر چیخیں صدا بصحرا ہو گئیں اور تہوار کا دن آ گیا۔

پندرہ سالوں سے سینے میں دبے ہوئے مذہبی جذبات ایسے انڈے کہ حفاظتی باندھ ٹوٹ گئے، کسی نے ماچس جلا کر سگریٹ سلگائی تھی اور جلتی ہوئی تیلی لاپرواہی سے بہتے ہوئے تیل پر پھینک دی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سرسرا کر دوڑتی ہوئی آگ نے پورے شہر کو آغوش میں لے لیا۔ سرحدیں بند کر دی گئیں اور سوت اگلتا شہر خون اگلنے لگا، وحشت اور بربریت برسوں کے استعمال شدہ طریقوں سے اکتا چکی تھی اس لئے نئی مشقیں ہوئیں اور ستائیس جیتے انسانوں کو ایک کمپارٹمنٹ میں زندہ جلا دیا گیا۔

پھر غیر ملکی ریڈیو خبریں نشر کرنے لگے، آگ بڑی بھیانک ہے، بری سے پھیل رہی ہے، آس پاس کے محلے بھی زد میں آ رہے ہیں، جھونپڑپٹی سلگ رہی ہے۔

تب مقامی ریڈیو نے بتایا، چھٹ پٹ حادثوں کو چھوڑ کر حالات پوری طرح قابو میں ہیں اور حالات پر کڑی نظر رکھی جا رہی ہے۔

مگر آگ پوری شدت اختیار کئے ہوئے تھی اور شیر کی کھال اوڑھے معمر آدمی للکار رہا تھا۔

کاٹ ڈالو، ناسور کو کاٹ ڈالو۔ اپنی دھرتی کو پوتر کر دو کہ ایسا موقع بار بار نہیں ملتا۔ انھیں ختم کرنے کا یہی ایک راستہ ہے۔
پھر اس نے محافظوں کو غیرت دلائی۔

تم کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہو اور تمھارے بھائی کاٹے جا رہے ہیں، ٹوٹ پڑو ان غداروں پر، مار ڈالو ان قاتلوں کو جس طرح باجپئی میں محافظ اپنوں کا ساتھ دے رہے ہیں، ٹوٹ پڑو کہ یہی وقت ہے۔

ہفتوں خون بہتا رہا، پندرہ سال پہلے کی کہانی پھر دہرائی جا رہی تھی، یہ نئی کہانی پہلے سے زیادہ ڈراؤنی، ہیبت ناک اور خوں ریز تھی۔

پھر معززین کی آمد شروع ہوئی۔

سردار نے دورے کے بعد کہا۔ "میں نہیں سمجھتا تھا کہ اتنی بڑی بربادی ہو گی مگر یہ الزام غلط ہے کہ اتنے آدمی ایک جگہ زندہ جلائے گئے، مختلف جگہوں پر جلی ہوئی لاشیں یکجا کر دی گئی ہیں، پھر یہ کیسے کہا جائے کہ یہ اقلیت والے ہیں، اکثریت والے بھی ہو سکتے ہیں کہ شناخت ختم ہو چکی ہے۔

ملکہ ہاتھ میں رومال لئے آنسو پونچھتی پھر رہی تھی۔ لوگوں نے معمر آدمی کی طرف اشارہ کیا تو وہ کہنے لگی۔

کسی کا نام لینا مناسب نہیں ہے، سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ امن کیسے قائم ہو۔

ولی عہد نے محافظوں کے کردار کو درست قرار دیتے ہوئے فرمایا۔ میں جانتا ہوں۔ دو ہزار غیر ملکی یہاں آئے تھے۔ یہ انھیں کی شرارت ہے۔ اور جب ملکہ دورے سے واپس لوٹی تو پر اسرار آدمی کمرے میں موجود تھا۔

بڑا بھیانک .... یہ سب بڑا بھیانک ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

تجربات اکثر بھیانک ہوتے ہیں مگر ان کے نتائج خوش گوار

ہوتے ہیں، پراسرار آدمی نے دھیرے سے کہا۔ انھیں آپ کی دوستی کا امتحان مقصود تھا، خوشی ہے کہ آپ کسوٹی پر پوری اتریں۔

جب اخبار والے وہاں کی کہانیاں منظرِ عام پر لائیں گے تو رائے عامہ کا کیا ہوگا، سب ہی تشدد پر ایمان نہیں رکھتے۔

آپ کے اس خفیہ محاذ کی کامیابی اسی میں ہے کہ تابڑ توڑ حملے کئے جائیں اور اپنے مقاصد پورے کرلیں، مخالفین بھی بھونچکے رہ جائیں گے کہ ماتم کس کس کا کریں۔

وہاں کی کیا صورت حال ہے ؟

انتہائی دھماکہ خیز اتنی کہ پورے ملک میں بے چینی کی لہر دوڑ رہی ہے۔ مرنے والے اپنا خون ہیں اور خون مدد کے لئے پکار رہا ہے، اب وقت آگیا ہے کہ ہم ایک ہی ضرب میں سانپ کی کمر توڑ دیں، سانپ مرے گا تو لوگ اس حادثے کو بھول کر آپ کو نجات دہندہ سمجھنے لگیں گے۔

وہ سنبھل کر بیٹھ گئی تو وہ مسکرانے لگا۔ ندی نے اس پار زمانہ بھیجا جا چکا ہے، تربیتی مراکز کھولے جا چکے ہیں اور لائحۂ عمل مرتب کردیا گیا ہے، علیحدگی کا مطالبہ اس وقت شدید ہوگا جب رسم کا وقت ہوگا۔ پھر ایک آپریشن اس محاذ کا آخری عمل ہوگا اور آپ کی شہرت کے تابوت میں آخری کھیل۔ پھر آپ اتنی مستحکم ہوجائیں گی کہ......

کارروائی کب شروع ہوگی ؟

آپ چار دنوں بعد اچانک حملے کا حکم جاری کردیں، معرکہ جتنا شدید ہوگا اس سے زیادہ پروپگنڈہ کیا جائے، دشمن کو بے حد طاقتور بنا کر پیش کرنا ہے، تب ہی جیت کا اثر لوگوں کے دلوں پر ہوگا، اور آپ اس کارروائی کے لئے جواز پیش کرسکیں گی۔

مگر کیا پہلا آدمی اس حکم نامہ پر دستخط کردے گا ؟

ملکہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

کرنا ہی پڑے گا کہ اسے قومیت سے زیادہ عہدہ عزیز ہے۔

جی ڈرتا ہے کہ بونوں میں ان کی تعداد زیادہ ہے، کہیں مقدس مقامات کی بے حرمتی انھیں مشتعل نہ کردے۔

کیا تناسب ہے ان کا، صرف دو فی صد ہی نا ؟ پھر ان کا پہلا سبق حکم ماننا ہے، حکم عدولی کی سزا وہ جانتے ہیں اس لئے اس کی جرأت کر ہی نہیں سکتے۔ میں نے سارے پہلوؤں پر غور کرلیا

اور جب لوگ خبروں کی سرخیوں کو پرتشویش نظروں سے دیکھ رہے تھے، ریڈیو نے انھیں متوجہ کرلیا۔

بونے روانہ ہوچکے ہیں، سرحدیں بند کردی گئی ہیں، قاتل بہت جلد پکڑ لئے جائیں گے، یہ کوئی غلط کارروائی نہیں ہے۔ سبز پرچم والے جن کی ساری دنیا میں بڑی تعداد ہے۔ جب ان کے مقدس مقام پر شرارت پسندوں کو نکالنے کے لئے بونے کارروائی کرسکتے ہیں تو پھر یہ تو بہت کم ہیں مگر ان کی حرکتیں بہت گھناونی ہیں۔ ان کے مطالبات ماننے کا مطلب ملک کی تقسیم ہے اور کوئی بھی شہری ملک کی پھر تقسیم کا حامی نہیں، لہٰذا یہ قدم ملک کی سالمیت کے لئے ناگزیر ہوگیا تھا، یہ کارروائی کسی بھی قوم، کسی فرقے کے خلاف نہیں بلکہ شرارت پسندوں کے خلاف ہے۔ اسی لئے تو پہلے آدمی نے حکم نامے پر دستخط کیا اور اس کارروائی میں اس فرقے کے افراد بھی حصہ لے رہے ہیں بلکہ کمان انھیں کے ہاتھوں میں ہے، اگر اب بھی کارروائی نہ کی جاتی تو پھر اس فتنے کو کچلنا مشکل ہوجاتا۔

لوگ ریڈیو کے گرد بیٹھ گئے۔ خبریں ختم ہوتیں تو ہونٹ کھل جاتے۔

یہ کارروائی بہت پہلے ہونی چاہئے تھی۔

ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ آپ لوگوں کو تنقید کی عادت پڑ گئی ہے، مخالفت کا یہ مطلب نہیں کہ ہر بات میں کیڑے نکالے جائیں۔

مشکل یہ ہے کہ ہماری اچھی بات بھی یہ کہہ کر نظر انداز کردی جاتی ہے کہ ہمیں کیڑا نکالنے کی عادت ہے، میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس فتنے کو سر اٹھاتے ہی کچل دینا چاہئے تھا، اب کتنا خون

خرابا ہوگا۔

اب بھی یہ مشکل نہیں کہ بونے تجربہ کار ہیں۔ وہ اس سرعت سے ان پر ٹوٹیں گے جیسے وہ نہتوں پر ٹوٹا کرتے تھے۔ آپ سن لیجیے گا کل تک سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

مگر دوسرے دن ریڈیو نے خبر دی۔

بہت شدید مقابلہ ہو رہا ہے۔ ہمیں یہ امید نہیں تھی کہ انھوں نے اتنی تیاریاں کر لی ہوں گی۔ انھوں نے عبادت گاہ کو جنگی قلعے میں تبدیل کر دیا ہے اور ایک ایک انچ کے لئے بونوں کو بھاری قربانی دینی پڑ رہی ہے مگر بونے تحمل سے کام لے رہے ہیں۔

غیر ملکی ریڈیو نے نمک مرچ لگا کر خبریں سنائیں مگر ان کے ذرائع بھی محدود تھے کہ سرحدیں سیل کر دی گئی ہیں۔

آپریشن جاری رہا، ریڈیو سے بار بار اعلان ہوتا رہا۔

یہ افواہ بے بنیاد ہے کہ عبادت گاہ منہدم ہو گئی ہے، بونے صبر و تحمل سے کام لے رہے ہیں اور ان کا بھاری جانی نقصان ہو رہا ہے۔

کیا وہ اتنے منظم اور مضبوط ہیں کہ ہماری بہترین سپاہ بھی انہیں زیر کرنے میں ناکام ہو رہی ہے؟ لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے، کیا آپریشن کامیاب ہوگا؟

اگر کامیاب ہوا بھی تو اصل فتنہ بچ کر کانٹوں کی باڑھ عبور کر جائے گا اور کیا پتہ وہ نکل بھی گیا ہو، اصل مسئلہ تو گرد کا ہے، کاش وہ مارا جاتا۔

پھر خبریں آئیں، سخت مقابلے کے بعد بونے عبادت گاہ میں داخل ہو گئے ہیں مگر گرد کا پتہ نہیں چل رہا ہے جب کہ اس کے دوستوں کی لاشیں مل گئی ہیں۔

میں نہ کہتا تھا کہ وہ نکل گیا ہوگا، سارا کیا دھرا بے کار گیا۔ اور اب تو وہ زخمی ناگ بن جائے گا، نہ جانے کتنوں کو ڈسے گا۔

محاصرہ تنگ ہے، بچ کر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کیا فضول بات کر رہے ہیں، جب ریڈیو کہہ رہا ہے کہ اس کا پتہ نہیں چل رہا ہے تو آپ کہہ رہے ہیں کہ محاصرہ تنگ ہے، جب اس نے مقابلے کے لئے اتنی تیاریاں کی تھیں تو کیا فرار کے لئے سرنگیں نہ کھدوائی ہوں گی۔

مگر جب ریڈیو نے اس کی موت کی تصدیق کر دی تو سینوں میں رکا ہوا سانس خوشی کی چیخ کے ساتھ باہر آ گیا، لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ ملکہ کے نام کی جے جے کار ہونے لگی۔

ہماری ملکہ درگا کا دوسرا روپ ہے، وہ راکشس مارتی ہے، ہماری محافظ ہے۔ لوگ اخبار پر ٹوٹے ہوئے تفصیلات پڑھ رہے تھے۔

جب خوشی کے امڈتے ہوئے جذبات ذرا سرد ہوئے اور وہ رات کو کسی کام سے باہر نکلے تو انھیں ایک طویل القامت سایہ آسمان میں پرواز کرتا نظر آیا، جس کی پیشانی پر گہرا گھاؤ تھا جس سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

وہ خوف زدہ ہو گئے۔ کیا وہ مر کر بھوت بن گیا ہے،

نہیں، یہ سب ہماری نظروں کا قصور ہے کہ ہم ہر وقت اس کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

پھر خبریں آنے لگیں۔ وہ بونوں کے کیمپ پر لہراتا ہوا دیکھا گیا ہے۔ اور اس فرقے کے بونوں کا دماغ الٹ گیا ہے، وہ باغی ہو کر گولیاں چلاتے ہوئے نکل پڑے ہیں۔

پھر دوسری جگہ سے خبر آئی، پھر تیسری جگہ سے، پھر وہ اڑتے ہوئے جہاز میں ظاہر ہوا اور جہاز کا رخ پھر گیا۔

پھر وہ پردیس میں ظاہر ہوا اور وہاں آزاد مملکت کے قیام کے ساتھ دھمکیاں نشر ہونے لگیں۔

یہ افواہ بے بنیاد ہے کہ وہ آسیب بن گیا ہے۔ عوام کو خبردار کیا جا رہا تھا۔ افواہوں پر مت جائیے۔ حالات پوری طرح قابو میں ہیں بھگوڑوں کو گھیر کر پکڑ لیا گیا ہے، یہ انھوں نے خود سے نہیں کیا تھا بلکہ جس ملک نے انھیں اسلحہ سپلائی کیا تھا اسی کے ایجنٹ انھیں بہکا رہے ہیں، آپریشن جاری ہے، شرارت پسند گھیرے جا رہے ہیں۔

اور ان کے قبضے سے اسلحے اور گولہ بارود ضبط کیے جا رہے ہیں، بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا، ہر طرف امن و امان ہوگا۔

امن و امان ــــ ملکہ نے مسکراتی نظروں سے پراسرار آدمی کو دیکھا، مجھے تمھاری دوراندیشی پر فخر ہے۔ لوگ بھول گئے کہ کتنے کر گھے توڑے گئے اور کتنا خون بہا، انھیں بس یہ یاد ہے کہ میں نے ان کے لیے بھیڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا ہے۔ میں نجات دہندہ ہوں۔

ملکۂ عالیہ ــــ پراسرار آدمی نے سوچتے ہوئے کہنا شروع کیا، وقت آگیا ہے۔ جب آپ امر ہو جانے والے پروگرام پر عمل کریں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی کہ آپ کے پڑوسی ملکوں میں یہی ہوا ہے ــ آپ کو عوامی مخالفت کا سامنا نہیں ہوگا کہ اکثریت آپ کے ساتھ ہے اور آپ کی سرپرستی میں خود کو محفوظ سمجھتی ہے۔

ملکہ کی پیشانی کی سلوٹیں اس کی غماز تھیں کہ وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے، بہت دیر بعد سلوٹیں مٹیں اور آنکھیں نارمل ہوئیں تو وہ دھیرے سے بولی۔

تم ٹھیک کہتے ہو حملہ اور متواتر حملہ اور متواتر حملہ میرا نصب العین ہونا چاہیے کہ نتائج میرے حق میں جا رہے ہیں۔

پراسرار آدمی کے جانے کے بعد اس نے تالی بجائی اور خدمت گار حاضر ہو گیا۔

یہ جہاں کہیں ملے اسے حاضر کرو ــ اس نے کاغذ پر نام لکھ کر خدمت گار کے حوالے کیا۔

مکار چہرے اور خونی آنکھوں والا شخص اچانک طلبی پر ہراساں تھا اور اس کا بدن کانپ رہا تھا۔

وہ اپنی نشست سے اٹھ کر اس کے پاس آئی، کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر نرم لہجے میں بولی۔

تم ڈر رہے ہو ــ ڈرو نہیں کہ تمھارے سر پر میرا ہاتھ ہے اسی لیے تو میں تمھیں ایک اہم ذمہ داری سونپ رہی ہوں۔

اس نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھایا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

تیاری کرو کہ تمھیں برف پوش پہاڑوں میں عہدہ سنبھالنا ہے، میری نمائندگی کرنا ہے اور پھر... وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر مسکرانے لگی۔

میں سمجھ گیا ــ اس نے اطمینان کا سانس لے کر کہا خادم کسوٹی پر کھرا ثابت ہوگا..... مگر.. . وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

کہو تم رک کیوں گئے؟

آپ اپنی حفاظت کیجیے گا کہ ان کی دھمکی محض دھمکی نہیں ہو سکتی۔

وہ زیر لب مسکرائی۔ یہ دیکھو۔ اس نے پیٹ کے پاس کا بلاؤز الٹ دیا، اندر کھال سے ملتے جلتے رنگ کا عجیب وضع کا کپڑا تھا۔ زندگی کسے عزیز نہیں ہوتی، اس نے کپڑا برابر کرتے ہوئے کہا۔ میرے چاروں طرف آہنی دیواریں ہیں اور ہر دس قدم پر خصوصی تربیت یافتہ آنکھیں پھر کیا مجھے اس شخص سے خطرہ ہو سکتا ہے ــــ؟ اس نے دروازے پر کھڑے بڑے بالوں والے محافظ کی طرف اشارہ کیا۔

اگر واقعی یہ مسئلہ مذہبی ہوتا تو کیا یہ شخص اور اس جیسے اہم مقامات پر خدمت انجام دینے والے وفادار ہوتے؟ پہلے آدمی پر کستا دیا گیا اور اسے معتوب کیا گیا مگر حق و صداقت کا پہاڑ اپنی جگہ اٹل رہا ــ وہ اپنی نشست پر بیٹھ گئی مگر اس سے بے خبر تھی کہ دو پوشیدہ آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔

لوگوں نے اس تبدیلی کو اہمیت نہ دی کہ رموز مملکت ہے مگر جب برف پوش پہاڑوں پر زوردار دھماکے سے سردار کا محل ڈھ گیا تو وہ گھڑی بھر کے لیے چونکے اور ان کی سوالیہ نظریں ملکہ کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں جس پر کوئی شکن، کوئی اندیشہ، کوئی حزن نہ تھی۔

غداروں نے البتہ شور مچانا چاہا مگر کوئی لائحۂ عمل مرتب نہ کر سکے کہ وہ خود متحد نہ تھے۔

ملکہ گہری نظروں سے حالات کا جائزہ لے رہی تھی اس کی پیشانی سلوٹوں سے بھری رہنے لگی تھی۔

ممی بہت فکرمند ہیں۔ چشمے والے نوجوان نے کہا شاید وہ مخالف

[مددگ]اروں سے پریشان ہیں، دوسرا بڑا خطرہ ٹونگی والا ہے کیوں نہ اسے بھی ڈائنا مائٹ کر دیا جائے۔

ٹونگی والا ملکہ زیرِ لب بڑبڑائی، نہیں اسے ابھی چھیڑنا مناسب نہیں ہے۔

آپ خواہ مخواہ اسے اہمیت دے رہی ہیں، یہ رنگا سیار شیر کی نقل کرتا ہے، جہاں پانی میں گرا سارا رنگ اتر جائے گا۔ حکم ہو تو میں گڑھا کھود دوں؟

تم — ؟ وہ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگی، کیا تم میں صلاحیت ہے؟

آپ نے کبھی خدمت کا موقع ہی نہیں دیا ورنہ آپ کو میری صلاحیت کا اندازہ ہو جاتا۔

ممی اسے ایک موقع ضرور دیجئے۔ ولی عہد نے سفارش کی تو ملکہ جامد ہو گئی۔ مگر اس کا دل ڈر رہا تھا۔

دیکھو یہ بے حد نازک معاملہ ہے، ایسا نہ ہو کہ اپنے گڑھے میں خود گر پڑو یا مجھے گرا دو۔

آپ مجھے نا اہل نہ پائیں گی ممی — اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ صرف آشیرواد چاہیے۔

[illegible] اس [illegible] میں رکھا تھا [illegible] کی تیاریوں میں [illegible] کدال کا [illegible] کبھی کبھی جھک جاتا۔

ہوا اس [illegible] کھودنے کا [illegible] لے کر [illegible] مدد کرلی ہو [illegible]

اس کا چہرہ کھل اٹھا، [illegible] بنانے کا اس [illegible] اخباروں کی سرخیوں میں، خصوصی کالموں میں، دروازے پر بھیڑ بھاڑ، اس کی نظروں کے سامنے بہت سی تصویریں گذرنے لگیں، شہرت، عزت اور اختیار، وہ دیوانہ وار اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی انگلیاں کدال کے [illegible] گذر رہی تھی۔

صبح دھماکہ ہوا مگر بہت ہلکا سا، بارود گیلی تھی اس لئے صرف سردار کا رہائشی کمرہ منہدم ہوا اور وہ پانی بھرے گڑھے میں گرے بغیر دوسری طرف نکل کر مدد کے لئے چیخنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسکے گرد سر ہی سر نظر آنے لگے۔

چونکہ تم تنہا رہ گئے ہو اس لئے سرداری دوسرے کو سونپی جا رہی ہے۔

میں تنہا رہ گیا ہوں — اس نے حیرت سے اپنے مددگاروں کی طرف دیکھا، گن لو، گن لو انھیں کہ ان کی تعداد کتنی ہے۔ پھر بھی تم مجھے تنہا کہہ رہے ہو، یہ زیادتی ہے، یہ سازش ہے۔

یہ ڈونگی کا اسٹیج نہیں۔ حالات کی سخت اور کھردری زمین ہے۔ اس نے خشک لہجے میں کہا۔ جاؤ اور سکون سے بیٹھو کہ تمہارا رول ختم ہو چکا ہے۔

ناٹک تم کر رہے ہو، میرا رول ختم نہیں ہوا ہے۔ یہ ختم بھی نہیں ہوگا کہ میرے مددگار لالچی نہیں۔ مجھے حمایت حاصل ہے۔ میں اسی ثبوت کے ساتھ پہلے آدمی سے شکایت کروں گا۔

پہلے آدمی نے غور سے اس کی باتیں سنیں اور نظروں سے مددگاروں کی گنتی کی، ٹھیک ہے تم جاؤ میں مناسب کارروائی کروں گا۔

[illegible] دولت سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔

[ٹونگی] والا پریشانی کے عالم میں نمائندے کو ہدایت دے رہا تھا مگر کیسے [illegible] کوئی ماہر [illegible] وہ [illegible] روپوش ہو گئے ہیں۔

[illegible] اعلان کرو مددگار [illegible] انھیں رہا کیا جائے ورنہ [illegible] ہوں گے۔

ہم سب آزاد ہیں اور اپنی مرضی سے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، مددگاروں نے اخباری نمائندوں کو بتایا، ہم وقت پر باہر آئیں گے۔

پھر محلّوں میں آگ لگی اور شعلے لہو چاٹنے نکل پڑے، تب اسے شعلوں کا [illegible] لیا گیا۔

لوگ ناٹک دیکھ رہے تھے، ان کی آنکھوں میں تاسف تھا، تم نے
اسے انسان سے بلند کر کے دیوی کا اوتار مان لیا تھا، وہ جو چاہتی
وہی ہوتا جب تک چاہتی راج کرتی۔ پھر اس نے ایسا کیوں کیا۔
میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اس معاملے کا مجھے کوئی علم
نہیں، میں سرداروں کے کام میں، چاہے وہ میرا مخالف ہی کیوں نہ ہو
مداخلت نہیں کرتی، ملکہ نے پہلی بار زبان کھولی، جو کچھ کیا ہے نمائندے
نے کیا ہے، میں معاملے کی تحقیقات کروں گی۔
نمائندے نے استعفیٰ دیتے ہوئے کہا میں نے یہ سب کچھ اوپر
والوں کے حکم سے کیا تھا۔
جیتی ہوئی بازی پلٹ گئی، بنی ہوئی ساکھ ریت کی دیوار کی
طرح بیٹھنے لگی، وہ چشمے والے پر برس رہی تھی، تمہارا کیا بگڑا تھا۔
تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔ تمہاری نااہلی اور عجلت کا خمیازہ مجھے بھگتنا
ہے، جاؤ چلے جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔
وہ غصے میں بھری ہوئی کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ چنبیلی کے پودے
پر نظر پڑی تو اس کا غصہ اور بڑھ گیا۔
سارے ہی نااہل میرے گرد جمع ہو گئے ہیں، اس نے غصے میں
دانت پیسا۔ تم اپنے کو اس فن کا ماہر کہتے ہو، وہ مالی پر برس پڑی، مگر
اتنے دنوں میں تم ایک پودے کی بیماری نہیں سمجھ سکے۔ اگر اس کا تعلق
میرے مستقبل سے ہوتا تو میں صبر کر لیتی کہ یہ انسان ہے اور [illegible]
ہوں، پودے دیش کی ماں۔ یہ غیبی اشارہ ہے بیماری ہے سمجھے تم۔
ملکہ عالیہ... مالی نے ڈرتے ڈرتے کہا، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ
اس کی جگہ چنبیلی کا دوسرا پودا لگا دیا جائے۔
اور پھر اس کے بڑے ہونے کا، کلیاں لگنے، پھول کھلنے کا
انتظار کروں کیوں؟ وہ طنزیہ لہجے میں بولی، یہ پودا تو مجھے حوصلہ
اور جینے کی امنگ دیتا ہے۔ اس کے پھولوں کی مہک میرے دماغ کی
پوشیدہ قوتوں کو بیدار کرتی ہے، تم اس کی جگہ دوسرا پودا لگا کر مجھے
اتنے دنوں کے لئے بے کار کرنا چاہتے ہو [illegible]

بے حد اہم ہیں، اگر ایک ہفتہ کے اندر تم نے بیماری کا پتہ لگا کر علاج نہ کیا تو...
وہ دیر تک پھولوں کے درمیان ٹہلتی ہوئی ذہنی تناؤ دور کرنے
کی کوشش کرتی رہی، وہ کسی پودے کے پاس رک جاتی، انگلیوں سے
پھول کی پتیوں کو چھوتی۔ ہرے بھرے پتوں پر ہاتھ پھیرتی، دھوپ
دیواروں سے نیچے اتر آئی تھی اور گھاس پر موتیوں کی طرح چمکنے والی
شبنم تیزی سے غائب ہو رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا،
نیلے آسمان میں سیاہ بادل کا ایک ٹکڑا کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈول رہا
تھا۔ کتنا آزاد اور بے فکر ہے یہ بادل ــــ اس نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر
سوچا، کوئی منزل نہیں، کوئی فکر نہیں، کوئی پڑاؤ نہیں، کوئی الجھن
نہیں۔ بس ہوا کے دوش پر اڑتا رہے، اڑے جانا ہے، مگر یہ بادلوں کا
موسم تو نہیں ــــ محکمۂ موسمیات نے ایسی کوئی اطلاع نہیں دی ہے،
خیالات کی رو نے پلٹا کھایا، یہ بادل ہی ہے یا دھواں ہے؟ یہ
تہوار بھی مصیبت بن جاتے ہیں۔ اس بار اتنی جگہ آگ لگی ہے کہ گنتی
مشکل، وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی کمرے میں آئی تو پراسرار آدمی
کرسی پر کسی مجسمے کی طرح ساکت تھا۔
مادام مجھے افسوس ہے کہ عجلت میں ایک محاذ پر شکست ہو گئی،
مگر فکر کی بات نہیں کہ ہمارے ہاتھ میں ابھی ایک کارڈ موجود ہے اور
اس کا استعمال رنگ کی گھڑیوں ــــ پھر پہلے کیا جائے گا، پھر ایسی ہوا
چلے گی ایسی ہوا کہ ذہنوں میں لگی ہوئی گرہ [illegible]
آپ [illegible] مجھے [illegible]
[illegible] مجھے حالات کی اس تبدیلی کی [illegible]
[illegible]
[illegible]
امتحان کی باتیں شروع کیجئے کہ سب کا ذہن بٹ جائے، ساتھ ہی کچھ
دکھاوے کی باتیں بھی تاکہ غدار مشکوک رہیں، اس دوران میں کوئی
ڈرامائی قدم اٹھا کر حالات بدل دوں گا۔
اس کے جانے کے [illegible]

ان اندھیروں سے دل اوب جاتا ہے' اس نے سوچا 'میں نے اپنی ساری زندگی جد و جہد کی نذر کر دی، جو چاہا حاصل کیا۔ اب کوئی تمنا، کوئی آرزو دل میں نہیں رہی' بس رسم کا یہ موسم گذر جائے اور میں کامیاب ہو جاؤں تو پھر اقتدار ولی عہد کو سونپ کر سنیاس لے لوں گی۔ اس طرح میری آتما کو شانتی مل جائے گی کہ میں آخری فرض سے سبکدوش ہو گئی۔ اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر کونے والے کمرے کی طرف دیکھا۔ بچوں کے قہقہوں کے ساتھ ولی عہد کی آوازیں بھی آرہی تھیں' اس کی نظروں میں شرارت اور بھولا بھالا چہرہ گھوم گیا۔ کیسا لگے گا وہ میری کرسی پر بیٹھ کر' اس نے سوچا [illegible] کہ جیسے چلاتے رہیں کہ [illegible] کا اجارہ [illegible] کر لیا [illegible] کا احترام [illegible] کی یہ خواہش ہے

[illegible] اس [illegible] کی مستقیں [illegible] اس وقت اس کا [illegible] سے [illegible] ہو رہا تھا۔ جس [illegible] کوئی [illegible] ہاتھ [illegible] دونوں [illegible] ترتیب وضع [illegible] کھلے ہوئے تھے [illegible] ایک میلا سا [illegible] ختم ہو گئی۔ یہاں ایک [illegible] جس [illegible] لوگ بیٹھے ہوئے [illegible] دیکھ [illegible] فرشتے یاد آگئے۔ پھر اس [illegible] سارے [illegible] کو دیکھا جن کے لمبے لمبے بال اور بے ترتیب داڑھیاں خون میں تر تھیں۔ جہنم کے فرشتے ایک ایک مردے کو آگ میں ڈالتے۔ فضا میں جلتے ہوئے گوشت کی چراند پھیلتی۔ پھر وہ جلے ہوئے گوشت پر ٹوٹ پڑتے۔ پھر ان میں سے ایک کی نظر ملکہ پر پڑی اور اس کے ہونٹوں سے غراہٹ نما قہقہہ بلند ہو گیا۔ آگئی۔ ان داتا خود آگئی...

وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ ہا ہا ہا! اس کا گوشت کیسا لذیذ ہو گا۔ بغیر ریشے کا ملائم گوشت اور کڑکڑاتی ہوئی ہڈیاں..... وہ ہونٹ ہلاتے ہوئے منہ چلانے لگے۔

نہیں۔ نہیں۔ وہ چیخ رہی تھی' بچاؤ، بچاؤ.... مگر اس کی چیخ و پکار کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کی آنکھوں کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

پھر میں پر بڑے بڑے بالوں والوں کی لاشیں متحرک ہو گئیں۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے خون میں لت پت چہرے بڑے بھیانک لگ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر وہ رقص کرنے لگے، شیطانی رقص! ان کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ داڑھیاں ہل رہی تھیں اور زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔

پھر دوسری طرف سے ہنسنے کی آواز آئی۔ اس نے خود کو چشمیوں والوں کی زد سے جاتے ہوئے دیکھا۔ گھی پہنے، تہمد باندھے، سر گھٹائے، داڑھیوں کا خط بنوائے، جھلسے ہوئے اعضا، بریدہ مردے ہنستے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ گھیرا تنگ ہو گیا۔ موٹی موٹی انگلیوں میں پیالیاں جیسے ناخن اس کے چہرے کے قریب آگئے تھے' پھر کسی کی انگلیاں اس کی گردن سے ٹکرائیں اور ایک بے ساختہ چیخ اس کے حلق سے نکلی، اور اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

کمرے میں سرخ رنگ کا ملبہ اندھیرے سے جنگ میں مصروف تھا دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں اور وہ زمین پر پڑی گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اس کا بدن پسینے سے تر تھا' حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ اور دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ زمین پر پڑی حواس درست کرنے کی کوشش کرتی رہی تب اسے احساس ہوا کہ دروازہ پیٹا جا رہا ہے۔

[illegible] کون ہے ؟ اسے اپنی آواز خود اجنبی معلوم ہوئی۔

میں ہوں ممی۔ آپ ٹھیک ہیں نا؟ آپ کے کمرے سے چیخ کی آواز آئی تھی۔

شاید میں خواب میں ڈر گئی تھی۔ اس نے مسہری کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ جاؤ سو جاؤ، کوئی بات نہیں ہے۔

اور ٹھیک اسی وقت محل کے ایک دور افتادہ کمرے میں ایک نقاب پوش بڑے بالوں والے محافظ سے سرگوشی کر رہا تھا۔

میں نے تمہارا انتخاب اس لئے کیا ہے کہ تم قسمیں کھا چکے ہو مگر قسم پوری کرنے کا تمہارے پاس راستہ نہیں، اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں۔

میں بالکل تیار ہوں اور وہ بھی گاؤں سے آنے والا ہے، جس دن وہ آ گیا سمجھ لو کام ختم۔

وہ کب تک آئے گا کام جتنا جلد ختم ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے۔

میں نے خط بھیجا ہے اور کہلوایا بھی ہے دو چار دنوں میں وہ ضرور آ جائے گا۔

ٹھیک ہے، میں تم سے ملتا رہوں گا، دراصل مجھے تم سے اور تمام مقتولین سے ہمدردی ہے صرف اس لئے کہ میں کٹر مذہبی آدمی ہوں اور کسی بھی مذہب کی توہین برداشت نہیں کر سکتا اور یہ بھی یقین دلا دوں کہ کوئی مزاحمت نہ ہوگی اور مسئلہ ایسے حل ہو جائے گا جیسے کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ وقت پر تم خود ہی دیکھ لوگے اچھا اب میں جا رہا ہوں بہت کام ہیں، بہت انتظامات کرنے ہیں۔ بہت لوگوں کو شیشے میں اتارنا ہے۔

ملکہ نے مسہری پر لیٹ کر پھر سونے کی کوشش کی مگر نیند آنکھوں سے روٹھ چکی تھی، میں نے ایسا خواب کیوں دیکھا؟ کیا مقتول روحیں میرا تعاقب کر رہی ہیں، کہتے ہیں۔ خواب تصور کی بازگشت ہوتی ہے۔ میں نے تو کبھی بھولے سے بھی اس پر توجہ نہ دی کہ یہ سب بیدل مہرے ہیں شہہ بچانے کے لئے ہمیشہ قربان ہوتے رہے ہیں، پھر ان میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی کہ مجھے کانٹوں پر گھسیٹنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس نے کچھ منتر پڑھ کر اپنے اوپر پھونکا اور ذہن کو خالی کر کے ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا، نقطہ ذرا سی ڈھیل سے پھیلنے لگتا۔ وہ پھر دوریاں کھینچ دیتی، پھیلنے اور سمٹنے کی جدوجہد میں وہ نقطہ غائب ہو گیا۔

اور اس نے خود کو اسی وحشت ناک ماحول میں پایا، آگ اور تیز ہو چکی تھی، مردوں کا شیطانی رقص جاری تھا اور جہنم کے فرشتے ہونٹ چاٹتے ہوئے اس پر حملہ کر رہے تھے، ایک چیخ کے ساتھ اس کی آنکھیں پھر کھل گئیں۔ اس رات اس نے جتنی بار سونے کی کوشش کی خود کو اسی میدان میں پایا۔ خوف زدہ ہو کر وہ بستر سے اٹھ گئی اور الماری سے گیتا نکال کر اس کا پاٹھ کرنے لگی، کرتی رہی، یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ اس نے باہر نکل کر دیکھا، چنبیلی کی پتیاں اور زرد ہو گئی تھیں، آسمان کی طرف دیکھا، بادل کا ٹکڑا پھیل کر اس کے سر پر آ گیا تھا۔

قدموں کی چاپ سن کر وہ راستے کی طرف دیکھنے لگی، سکریٹری ادب سے سر جھکائے آ رہا تھا، قریب پہنچ کر وہ آدھے دھڑ سے جھکا۔

ملکۂ عالیہ! آج آپ کو دورے پر جانا ہے۔ کیا آپ تیار ہو گئیں؟

اوہ — وہ چونکی، تم نے ٹھیک یاد دلایا، میں تو بھول ہی گئی تھی، تم بیٹھو، میں تیار ہو جاتی ہوں، وہ تیز تیز قدموں سے کمرے میں چلی گئی۔

مگر جب وہ اسٹیج پر پہنچی اور ٹھاٹھیں مارتے مجمع سے مخاطب ہوئی تو نہ جانے اس کا دل کیوں بیٹھا جا رہا تھا۔ رات کا ڈراؤنا خواب بار بار یادداشت کی سطح پر پھیل جاتا اور کوئی ان دیکھا ہاتھ اس کا کلیجہ مسلنے لگتا۔

"مجھے فکر نہیں کہ کل میں زندہ رہوں یا نہیں رہوں مگر جب تک سانس ہے تب تک میں آپ کی اور دیش کی خدمت کرتی رہوں گی جب بھی میری جان جائے گی میرے خون کا ایک ایک قطرہ دیش کو مضبوطی دے گا اور متحد ملک کو زندہ رکھے گا۔ اس کی کھنکھتی آواز کانوں میں اتر رہی تھی اور مجمع زندہ باد زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا۔

اتنی کامیاب تقریب کے بعد بھی وہ تھکی تھکی سی تھی، گھر لوٹی تو رات ہو چکی تھی اور بڑھتی ہوئی رات کے ساتھ اس کی پریشانی

بڑھتی جارہی تھیں۔ وہ سوکر پھر خواب دیکھے گی اور کرب کی منزل سے
گذرے گی، وہ دیر تک ولی عہد کے بچوں کو کہانیاں سناتی رہی پھر
بچوں کو نیند آنے لگی تو وہ اپنے کمرے میں چلی آئی، دیر تک کرسی پر بیٹھی رہی
پھر بستر پر لیٹ گئی مگر نہ سونے کا عہد کر چکی تھی۔ وہ دورے پڑ گئے۔
ولی عہد کے بارے میں سوچتی رہی، نیند سے لڑتی رہی۔ میں کس طرح
اقتدار منتقل کروں گی کاش ..... میں .... اپنی آنکھوں....

پھر اس نے خود کو اس میدان میں پایا۔ مردوں کا وحشیانہ
رقص جاری تھا اور جہنم کے فرشتوں کی آنکھوں کی پیاس اور
بڑھ گئی تھی، وہ اور قریب ہو گئے تھے، اتنے قریب کہ ان کی سانسیں
اس کے بدن سے ٹکرا رہی تھیں۔ اچانک اسے دھکا لگا اور وہ ہوا میں
اڑتی ہوئی الاؤس میں جا گری۔

ایک تیز کراہ حلق سے نکلی اور وہ اچھل کر بیٹھ گئی، کیا میں
سو گئی تھی؟ اس نے دھڑکتے دل سے سوچا، گھڑی پر نظر پڑی تو
کچھ ہی دیر گذری تھی، میں ضرور آسیبی چکر میں پھنس گئی ہوں۔
اس نے بستر سے اترتے ہوئے سوچا، الماری کھول کر گیتا نکالی اور
اس کا پاٹھ کرنے لگی، بدشگون مارتی رہی مگر وہ مصلوب نہیں ہوئی
یہاں تک صبح ہو گئی۔

تمام رات جاگنے کی وجہ سے اس کا سر بوجھل ہو رہا تھا، آنکھیں
جل رہی تھیں اور بدن درد سے ٹوٹ رہا تھا اس نے کھڑکی میں کھڑے
ہو کر لان پر نظر ڈالی اور اسے یہ دیکھ کر دھچکا لگا کہ چنبیلی کی شاخیں
برہنہ ہو چکی ہیں۔ اور زمین نے زرد پتوں کا لباس پہن لیا ہے اس کی
طبیعت اور مرجھا گئی۔

سنو! وہ سکریٹری سے مخاطب ہوئی آج کا میرا سارا پروگرام
ملتوی کر دو۔ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔ آج میں آرام کروں گی۔
مگر مادام، میں فوٹو گرافروں کو وقت دے چکا ہوں وہ
دبی زبان سے بولا۔ بہت دور سے آئے ہیں۔
خیر، میں ان سے مل لوں گی۔

جب وہ تیار ہونے لگی تو اندر کا لباس اتار دیا۔ آج مجھے باہر
جانا ہی کہاں ہے۔ اس نے اپنی پسندیدہ دھاری دار ساڑی پہنی،
بال درست کیے، جب وہ باہر نکلی تو اس کے ذاتی محافظوں کے ساتھ
اس کا قریب مشیر بھی تھا۔ کمرے سے نکل کر اس نے چنبیلی کی شاخوں پر
نظر ڈالی پھر آسمان پر۔

بادل کا ٹکڑا ایک بڑے پہاڑ کی طرح اس پر گر رہا تھا۔
اس نے کسی سے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا کہ وہ اسے وہمی
سمجھیں گے۔ مگر بادل سے بچنے کے لئے اپنی رفتار تیز کر دی۔
ایک موڑ سے وہ مغل اعظم ہاؤس کی طرف مڑی اور سیڑھیاں
چڑھنے لگی تب ہی اوپر کھڑے بڑے بالوں والے محافظ نے اسے سلام کیا۔
جواب دینے کے بعد اس نے دیکھا محافظ کے ہاتھوں میں پستول
دبا ہوا ہے۔

یہ کیا کر رہے ہو۔ . وہ چیخی تھی، پھر فضا دھائیں.. .
دھائیں.... دھائیں کی آواز سے کانپ گئی، گولیوں سے بچنے کے لئے
ملکہ پیچھے کی طرف جھکی۔ خون کے چھینٹے دھاری دار ساڑی کو رنگین
بنانے لگے۔ اور وہ دھیرے دھیرے چکر کھاتی ہوئی زمین پر ڈھیر ہو گئی۔
ایک لمحے کے لئے زمین جیسے تھم گئی۔ سارے افراد شل ہو گئے۔
دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

پھر پیرک سے دوسرا محافظ نکلا، اس نے چاروں طرف دیکھا
پھر زمین پر پڑی ہوئی ملکہ کو، اس نے اپنی اسٹین گن کا رخ زمین پر
پڑی ملکہ کی طرف کر دیا۔ اور گولیاں اولوں کی طرح برس کر ختم ہو گئیں۔
ہر دس قدم پر تربیت یافتہ آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ ذاتی
محافظ اپنی جان بچانے کے لئے افراتفری کے عالم میں بھاگ رہے تھے۔
اور سب کچھ اتنی آسانی سے ہو گیا جیسے کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔
تب محافظوں نے بڑے سکون سے اپنے ہتھیار دے کر ہاتھ
اٹھا دیے۔
ہمیں جو کرنا تھا کر دیا۔

اور اس حادثے کے بہت دیر بعد ریڈیو سے بھرائی ہوئی آواز کہہ رہی تھی۔ ہم بڑے دکھ کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ ہماری ملکہ ہمارے درمیان نہیں رہیں۔ وہ اپنے ہی محافظوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئیں۔

پورے ملک کی سانسیں جیسے تھم گئیں، آنکھیں پھٹ گئیں۔ ہونٹ تشنجی انداز میں کھنچ گئے، پھر آنکھوں میں شیشے چمکنے لگے، پھر سسکیاں پھوٹیں پھر آنسو گرے اور آنکھوں نے کہرام مچادیا۔

ہم خون کا بدلہ خون سے لیں گے، ذہن سلگ اٹھا۔ بھنچے ہوئے جبڑے کھل گئے اور دانت ڈراکیولا کی طرح لپ لپ کرنے لگے، آنکھیں شکاری بلیوں کی طرح چمکنے لگیں۔

ان کے ایک ہاتھ میں پٹرول کے ٹن تھے اور دوسرے میں گھروں کے نقشے۔

پھر تاریخ اپنے آپ کو دہرانے لگی، مگر اس بار نمبر قاتلوں کا تھا۔

گھر جلے، دوکانیں جلیں، موٹر گاڑیاں جلیں، ہوائیں خون کی مہک لیے گھروں کے دروازے کھٹکھٹا رہی تھیں، آسمان آگ کے شعلوں سے لال ہوگیا تھا۔ چیخوں اور کراہوں سے زمین تھرانے لگی تھی، نہ جانے کتنے زندہ جلے، کتنے مارے گئے، کتنے لاپتہ ہوگئے۔

کوئی محاسب نہیں تھا، کوئی محافظ نہیں تھا، صرف موت تھی، قہقہے لگاتی ہوئی موت، دبوچتی ہوئی موت۔

ولی عہد نے ماں کی کرسی سنبھال کر اپیل کی، ہم شانتی سے کام لیں گے تو ممی کی آتما کو سنتوش ہوگا۔

مگر کان صرف چیخیں سننا چاہتے تھے، آنکھیں زندہ جلتے انسان دیکھنا چاہتی تھیں۔ ناک جلتے گوشت کی بو سونگھنا چاہتی تھی، انسان مرگیا تھا شیطان جاگ رہا تھا۔

اذیت پسندی نئے تماشے وضع کر رہی تھی۔ وحشت کی تسکین ہی نہیں ہوتی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا یہ اسی ملک کے باشندے ہیں جہاں گوتم اور گاندھی نے جنم لیا تھا جن کی تعلیمات دنیا کو شانتی کا سبق پڑھا رہی ہے۔

ہفتوں دن نہیں ہوا، رات نہیں ہوئی، وقت منجمد ہوگیا تھا۔ صرف وحشیانہ نعرے تھے اور سلگتے ہوئے کھنڈر، جلی ہوئی ہڈیاں اور سسکتے ہوئے بچے، اجڑی ہوئی مانگیں، لٹی ہوئی عصمتیں اور زبردستی توڑے گئے موتیوں کے کرب سے بے چین لڑکیاں۔

پھر ملکہ برف پوش چٹانوں میں ہمیشہ کے لیے روپوش ہوگئی۔ ایک باب ختم ہوا، زندگی بھی ہنگامی تھی، موت بھی ہنگامی رہی اور ولی عہد کفن اوڑھے راکھ کے ڈھیروں پر کھڑا سوچ رہا ہے۔ میں نے پھولوں کا تاج پہنا ہے یا کانٹوں کا۔

گیارھواں سفر

کانچ کا بازی گر..... کانچ کا بازی گر...

رات کے سناٹے میں ایک آواز کہیں سے ابھرتی ہے اور دیر تک چٹانوں سے سر ٹکراتی رہتی ہے، پھر دور ہوتے ہوئے سناٹے میں ڈوب جاتی ہے اور پھر وہی سناٹا جس میں صرف دل کے دھڑکنے کی آوازیں سنائی دیتی رہتی ہیں۔

میں اپنی کمیں گاہ سے باہر نکل کر دیکھتا ہوں، چاندنی میں نہائے ہوئے پہاڑ، چٹانوں پر اگے ہوئے پودوں میں کھلے رنگ برنگے پھول اور بے آواز بہتا پانی، کہیں کوئی سایہ نہیں، آہٹ نہیں، پرچھائیں نہیں، پھر کون مجھے پکارتا ہے؟ پکارے چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ میں بے چین ہوکر باہر نکل آتا ہوں۔

جانے کتنے دن بیت گئے، شاید مہینوں، شاید برسوں، جب میں نے محسوس کیا تھا کہ اب لوگوں کو میری ضرورت نہیں ہے پھر مصائب برداشت کرتا ہوا میرا بدن اتنا کمزور ہوگیا تھا کہ مجھے امید ہو چلی تھی شاید میری سزا کے دن پورے ہونے والے ہیں، تب وہ ایک رات آیا تھا..... وہی جس نے مجھے سفید عمارت سے نکال کر کشتی میں بٹھایا تھا، میری حالت دیکھ کر اس کی بے رحم آنکھوں میں عجیب سی چمک جاگی اور میں ضبط نہیں کر پایا کہ اس چمک کو میں جذبۂ ترحم کا نام دوں، یا اذیت پسندی کا رجحان — وہ چپ چاپ مجھے دیکھتا رہا پھر دھیرے

دھیرے چل کر میرے پاس آیا، میری نبض پر انگلی رکھی اور اس کے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سکڑ گئے۔

کمزور... بے حد کمزور، مگر تم فکر مت کرو، وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ساتھ دو آدمی اسٹریچر اٹھائے ہوئے تھے، مجھے احتیاط سے اسٹریچر پر لٹا دیا گیا اور جب وہ مجھے لے کر باہر چلے تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

اب شاید پھر مجھے نئے جہانوں کا سفر کرنا ہوگا ــــ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا، پر آشوب حالات سے گذرنا ہوگا، نئے زخم کھانے ہوں گے اور تقدیر میں لکھے گناہوں کا حساب چکانا ہوگا۔ میں اس کی مخالفت دکر سکا، کر بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے سامنے نہ جانے کیوں میری زبان گنگ ہو جاتی ہے، اس کی آنکھوں سے نکلنے والی تیز لہریں مجھے شامل کر دیتی ہیں اور میں سحر زدہ سا اس کا حکم ماننے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔

میں آنکھیں بند کئے، اسٹریچر پر پڑا رہا، راستہ طے ہوتا رہا مگر یہ اندیشہ ذہن کو پریشان کرتا رہا کہ ابھی امتحان کی اور کون سی منزلیں باقی ہیں اور اس کے لئے اذیت کے کون کون سے دروازے کھلیں گے کتنی بلائیں حملہ آور ہوں گی، آخر میں نے کتنی لمبی عمر پائی ہے یہ کیوں پائی ہے؟ میں کوئی پیغمبر ہوں کہ سیکڑوں سال تکلیفیں اٹھا کر بھی انسانیت کا درس دیتا رہوں میں تو بے حد حقیر سا انسان ہوں جنوں میں اپنا سب کچھ گنوا کر بھی کچھ نہ کر سکا، کچھ نہ پا سکا، کبھی مجھے دیوانہ کہا گیا، کبھی پر پتھر کسے گئے زد و کوب کیا گیا۔ کیا دیا مجھے ان لوگوں نے جن کے لئے میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا، پھر سارے جہان کی اذیت صرف میرا مقدر کیوں بن گئی ہے۔

راستہ طے ہو تا رہا، شاید ناہموار راستہ تھا، دھچکے تو ایسے لگ رہے تھے، آنکھوں میں چبھنے والی روشنی ختم ہو چکی تھی اور مجھے لے چلنے والوں کی سانسیں بری طرح پھول رہی تھیں۔

کہیں یہ مجھے دفنانے تو نہیں لے جا رہے ہیں؟ میرے ذہن میں روشنی کا جھماکا ہوا، اس نے میری نبض بھی تو دیکھی تھی اور اس کے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سکڑ گئے تھے، میری رگوں میں خون کا دوران تیز ہو گیا۔ شاید وہ میری زندگی سے مایوس ہو گیا ہے اور دنیا کو میرے وجود سے پاک کرنا چاہتا ہے، کیا واقعی ایسا ہے؟ میری سزا کے دن پورے ہو چکے ہیں؟

اسٹریچر ڈھونے والے بھی کچھ نہیں بولتے، آپس میں باتیں بھی نہیں کرتے کہ اس سے کچھ اندازہ ہوتا، مسطح زمین آرام سے طے کرنے کے بعد ان کی سانسوں کی آواز دھیرے دھیرے بڑھنے لگی تھی اور اب تو یہ کتوں کی طرح ہانپ رہے ہیں، ان سے کچھ پوچھنے سے کیا حاصل جو ہوگا سامنے آجائے گا۔

راستہ طے ہوتا رہا، بہت دیر گذر گئی۔ شاید آدھی رات، چاند نہیں نکلا تھا اس لئے اندھیرا تھا، یا شاید میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اس لئے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

پھر میرا اسٹریچر زمین پر رکھ دیا گیا۔ قدموں کی آوازیں دور چلی گئیں، میں دیر تک کسی کا منتظر رہا۔ پھر ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول دیں۔

غار میں مشعل کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے مجھے دیکھ رہا تھا

تم بہت تھک گئے ہو۔ اس نے سپاٹ آواز میں کہا اس لئے کچھ دن اس پر فضا مقام پر آرام کرو کہ تمھاری صحت کے لئے یہ ضروری ہے، یہاں کوئی تمھیں پریشان نہیں کر سکے گا، تمھیں تندرست ہونا ہے کہ ابھی لوگوں کو تمھاری ضرورت ہے۔

وہ چلا گیا تو میں نے مشعل اٹھائی اور غار سے باہر نکل آیا۔ دیر تک مہیب چوٹیوں کو گھورتا رہا، جنگل میں پھولوں کی مہک سونگھتا رہا اور بہتے ہوئے پانی کا مترنم نغمہ سنتا رہا پھر غار میں لوٹ آیا۔

تو اب مجھے یہاں رہنا ہے ــــ میں نے غار کا جائزہ لیا۔

زمین پر رکھا ہوا اسٹریچر اور سنگی دیواریں یہی میرا اثاثہ ہیں۔ میں نے اسٹریچر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ دوسری صبح آنکھ کھلی تو چڑیوں کی چہکار سنائی دی، پانی پر اترے ہوئے رنگ برنگے پرندے پھولوں کی پتیوں پر لرزتے ہوئے شبنم کے قطرے اور معطر فضا میں نے گہری گہری سانسیں لیں اور قدرت کے کرشمے دیکھے، میں دیر تک ننگے پاؤں سرد پتھروں پر ٹہلتا رہا، پانی نہ جانے کہاں سے بہہ کر کنڈ میں جمع ہو رہا تھا جس میں چاندی جیسی مچھلیاں اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں، بگلے اور دوسرے پرندے غوطے لگاتے اور چونچ میں مچھلیاں دبائے دور کسی چٹان پر بیٹھ جاتے۔

قدرت نے اپنی مخلوق کے لئے کیا کیا انتظام کیا ہے — میں نے ٹھنڈی سانسیں لے کر سوچا، مگر میں کیا کھاؤں گا — ؟ کیا صرف پانی اور ہوا پر زندہ رہا جا سکتا ہے؟ میں نے سر گھما کر اطراف کا جائزہ لیا۔ پھر میری نظریں اس لنڈ منڈ درخت پر ٹھہر گئیں جس میں لاتعداد سرپھل یا اسی جیسے پھل لگے ہوئے تھے۔ تو میرے لئے بھی انتظام ہے! میں نے دھیرے دھیرے قدم بڑھائے۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا یا شاید سب کچھ منجمد ہو گیا تھا، ایک دن، ایک سی راتیں، مشعل کا تیل ختم ہوئے نہ جانے کتنا عرصہ گذر گیا تھا، مجھے اب اس کی ضرورت بھی نہ تھی، موسم کی تبدیلی کا احساس ضرور ہوتا جب سرپھل کا درخت ہرے بھرے پتوں کا لباس پہن لیتا اور جھاڑیوں میں سرخ سرخ کھٹے میٹھے بیر اپنی طرف بلانے لگتے یا جب آسمان پر بادلوں کا خیمہ استادہ ہوتا ہے اور چٹانوں کی شگافوں سے سفید جھاگ کی طرح پانی اُبلنے لگتا۔

میں دن بھر چٹان پر لیٹا ہوا آسمان میں منڈلانے والے پرندوں کو دیکھتا یا پانی میں اٹھکھیلیاں کرتی مچھلیوں کو اور پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ رشی منی اور ولی اللہ لوگوں نے اپنا زیادہ وقت ویرانوں میں کیوں گذارا، یہاں قدرت کا جلوہ عیاں ہوتا ہے، دل کے دروازے کھلتے ہیں، ذہنی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں اور خدا کی موجودگی بہت قریب معلوم ہونے لگتی ہے۔ مجھے یہ وہم نہیں کہ میں کچھ ہونے والا ہوں یا مجھے بھی گوتم بدھ کی طرح عرفان حاصل ہوگا مگر ایک عجیب سا احساس، بہت کچھ پا لینے کا احساس مگر کیا — یہ معلوم نہیں۔

اور جب میں بھول گیا تھا کہ میں کون ہوں، رات کے سناٹے میں ایک آواز مجھے پکارنے لگی ہے، کیوں پکارتی ہے، مجھ سے کیا کام؟ میں اب کس کام کا رہ گیا ہوں، دنیا والے اب شاید مجھے پہچان بھی نہ سکیں کہ میری داڑھی مونچھ اور سر کے بالوں نے مجھے اس طرح گھیرا ہے کہ میں آدمی سے زیادہ گوریلا معلوم ہوتا ہوں۔

یہ آواز . . . یہ آواز . . . . میں بار بار ذہن پر زور دیتا ہوں، یہ کس کی آواز ہے، سے کی بیوی کی راجیش جی کی ملکہ کی یا اس پر اسرار آدمی کی جو مجھے یہاں پھینک گیا ہے۔

کیا یہ آواز منے کی ہو سکتی ہے؟ میں یادداشت کے سہارے آواز کو جوان کرنے کی کوشش کرتا ہوں، منا اب تیس برس کا ہو گیا ہوتا، کڑیل جوان اس کی آواز بچپن میں ہی بھاری تھی مگر چٹانوں سے ٹکرا کر کانوں تک پہنچنے والی آواز میں بہت صوتی تغیر ہو چکا ہوتا ہے اس لئے نہ لہجے کا پتہ چلتا ہے نہ آواز کی ساخت کا۔ بیوی کی بھی نہیں ہو سکتی۔ انتہائی مترنم نسوانی آواز تھی۔ زور سے بولنا تو وہ جانتی ہی نہ تھی۔ راجیش جی کی آواز پر علاقائیت کا اثر ہے اور ملکہ کی آواز . . . . میرا ذہن سنسنانے لگا، ملکہ کی آواز بھی ہو سکتی ہے یا اسی جیسے لہجے کی، مگر اسے کیا پڑی ہے جو مجھے آواز دے۔ میں تو اس کا معتوب ہوں۔ اس کی سازشوں کی نقاب کشائی کرنے والا۔

یہ آواز آسمان کی طرف سے یا پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی کی طرف سے آتی ہے، وہاں کون ہے، صرف پکارتے سے کیا حاصل ہے؟ اگر اسے کچھ کہنا ہے تو چلا آئے، یہاں کوئی دوسرا تو نہیں۔ راز داری کا سوال ہوتا تو کیا وہ اس طرح پہاڑوں سے آواز دیتا؟

میں جواب میں پوچھتا ہوں کہ کون ہے؟ اور کون ہے کون ہے کی آواز گونجتی ہوئی دور تک جاتی ہے اور پھر سناٹا چھا جاتا ہے،

میں پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دوڑتا ہوں اور جس دن میں نے پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر بسیرا کیا جہاں سے آواز آتی تھی تو اس رات آواز میرے مسکن سے ابھری تھی اور میں دیوانہ وار دوڑ پڑا تھا پہاڑی بندروں کی سی تیزی سے، جب غار کے دہانے پر پہنچا تو آواز کی گونج بھی ختم ہو چکی تھی۔ سناٹے میں صرف میری سانسوں کی آواز تھی۔ تیز تیز چڑھتی سانسوں کی آواز۔

میں تھک کر کسی چٹان پر لیٹ جاتا اور میری نظروں کے سامنے سے مناظر گذرنے لگتے، کبھی میں ہنستا، کبھی روتا، کبھی غصہ میں مٹھیاں بھینچ لیتا۔ مناظر گذرتے گذرتے دھندلانے لگتے اور پھر.......

وہ آدمی مجھے یہاں پہنچا کر بھول گیا تھا، دوبارہ آیا نہ میری خبر لی کہ میں زندہ ہوں یا مر گیا، اسے اس کی پرواہ بھی کیا، وہ تو نہ جانے کیوں آتا ہے۔ مجھے آج تک اس کا بھی اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ دشمن ہے یا دوست یا بے غرض محسن...... مگر بے غرض محسن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں جس معاشرے میں زندہ ہوں وہاں کوئی بھی مکمل نہیں۔ خود اپنے فرائض پورے نہیں کرتا تو دوسرے کی کیا فکر — ؟ جب راستے مسدود ہو جاتے ہیں اور تلوے لہولہان تو وہ مدد کے لئے پکارتے ہیں، اور جب کوئی مدد کے لئے آتا ہے، راہ دکھاتا ہے تو وہ یقین اور غیر یقین کی صلیب پر عیسیٰ ہونے کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ پتہ نہیں اب کیا حال ہوگا ان لوگوں کا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا۔ نہ جانے لوگ کیا کر رہے ہوں گے، کیا کسی نے کبھی مجھے یاد کیا ہوگا؟ میرا گھر کیا ویسا ہی ہوگا جیسا میں چھوڑ آیا تھا، کھلے ہوئے دروازے اور کھڑکیاں اور دالان میں پڑی ہوئی کھاٹ۔ آنگن میں جیسلی کا درخت مٹی کا کبوتر .کیا اب میں اپنے گھر نہیں جا سکوں گا؟ ایک نظر دیکھ بھی نہ سکوں گا؟ جہاں میری زندگی کے بہترین دن گزرے ہیں، جہاں میں مکمل انسان تھا، جہاں دیر تک کوئی منتظر رہتا تھا، جہاں میرا منا تھا، کھلونوں سے کھیلنے والا منا۔

دن گذر جاتا اور مجھے پتہ ہی نہ چلتا، شام کے سائے پہاڑ کی چوٹیوں سے نیچے اترتے، سورج کی آڑی ترچھی کرنیں بڑھتی ہوئی دھند میں کھو جاتیں اور ہر طرف سرمئی دھند پھیل جاتی۔ پھر چوٹیاں نظروں سے اوجھل ہوتیں۔ پھر پیڑ پودے اور پھر.....

کاش! پکارنے والا مجھے مل جاتا تو میں اس سے پوچھتا میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو تم نے مجھے خود فراموشی کی وادیوں سے آگہی کے دہکتے ہوئے جہنم میں ڈھکیل دیا، اب یہ سناٹا روح کو تھپک تھپک کر سلانے والا سناٹا چیختا ہے، کنڈ میں تیرتی ہوئی مچھلیوں کی یکسانیت اور پرندوں کے نغمے چیخ و پکار معلوم ہوتے ہیں، گہری جھیل جیسا شانت ذہن یادوں کی تیز آندھیوں کی زد میں ہے اور کہیں بہت اندر سوئی ہوئی خواہشات انگڑائیاں لے کر بیدار ہو رہی ہیں، اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو میں سوچتے سوچتے پاگل ہو جاؤں گا، چٹانوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر گوشت کا لوتھڑا بنا دوں گا۔ اس سے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟

رات ہوئی تو میں غار کے دہانے پر بیٹھ گیا، آج میں آواز کا مخرج معلوم کروں گا اور پکارنے والے کو دیکھنے کی کوشش کروں گا۔

رات دھیرے دھیرے بھیگتی گئی، چاند کی رات نہیں تھی مگر تارے ہنس رہے تھے اور چٹانوں پر نور کی چادر سی پھیلی ہوئی تھی، خوشبو سے بوجھل ہوا نتھنوں سے دل میں اتر کر گدگدی کر رہی تھی اور سکوت پپوٹے سہلا رہا تھا۔ مجھے پتہ بھی نہ چلتا کہ آنکھیں کب بند ہو گئیں مگر ذہن جاگتا رہتا، غنودگی سے مدافعت کرتا رہتا، آنکھیں بند ہو رہی تھیں، آنکھیں کھل رہی تھیں۔ وقت چیونٹیوں کی رفتار سے رینگ رہا تھا۔

اچانک میرے غنودہ سے حواس بیدار ہو گئے، شاید قدموں کی چاپ تھی۔ بے حد دبے قدموں کی چاپ، لومڑی یا جنگلی بلی بھی ہو سکتی ہے، مگر میری آنکھیں چاروں طرف تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ کوئی حرکت، کوئی آواز، کوئی سایہ۔

کاش کا بازیگر.....

چند لمحے کے لئے میرا دل دھڑکنا بھول گیا جہاں میں بیٹھا ہوں وہاں سے اتنا قریب، میرے غار کے عقب سے، دوسرے ہی لمحے میں نے

جست لگائی اور بندروں کی طرح پتھروں پر چڑھنے لگا، آواز چٹانوں سے ٹکرا رہی تھی اور میں چڑھتا جا رہا تھا۔ آواز کچھ دور گئی تھی کہ میں نے دیکھا ایک سفید سایہ تیزی سے واپس جا رہا تھا۔

سنو، رک جاؤ ــــ میں چیخا تھا۔

وہ گھڑی بھر کے لئے ٹھٹھکا، پلٹ کر چٹان کی طرف دیکھا۔ پھر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔

میں کہتا ہوں رک جاؤ، آج میں تمھیں جانے نہیں دوں گا۔

مگر وہ رکا نہیں، اس کی رفتار اور تیز ہو گئی تو میں نے چھلانگیں لگائیں اور اس کے عقب میں دوڑا، میرے ننگے پاؤں پتھریلی زمین کے عادی ہو گئے تھے اس لئے مجھے یقین تھا کہ دو تین چھلانگوں میں اسے پکڑ لوں گا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور پھر دوڑنے لگا۔ اس کی رفتار حیرت انگیز طور پر تیز ہو گئی۔ فاصلہ پھر بڑھ گیا۔

کب تک دوڑو گے کہ پہاڑی زندگی نے مجھے جفاکش اور مضبوط بنا دیا ہے، میں چیخ رہا تھا۔ تم تھک جاؤ گے اور میں تمھیں پکڑ لوں گا اس لئے رک جاؤ۔ ٹھہر جاؤ کہ . . . . .

مگر وہ بھاگتا ہی رہا، کالج کے بازی گر تم مجھے نہیں پکڑ سکو گے۔ اس نے دوڑتے دوڑتے جواب دیا۔

میں تمھیں ضرور پکڑوں گا سور کے بچے..... تم نے پکار پکار کر میرا جینا مشکل کر دیا ہے، تمھیں بتانا ہوگا کہ میری پرسکون زندگی میں خلل کیوں ڈالا؟

جواب میں زہر میں بجھا ہوا قہقہہ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں نے اپنی پوری قوت صرف کر دی، فاصلہ دھیرے دھیرے گھٹتا گیا، بس ایک جست اور..... مگر میں اوندھے منہ گھاس پر گرا تھا اور دور تک لڑھکتا چلا گیا تھا۔

وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہنس رہا تھا۔ تم مجھے نہیں پکڑ سکو گے۔

میں تمھیں ضرور پکڑوں گا۔ میں تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ پھر بھاگنے لگا، دوڑتے دوڑتے میں نے غور کیا، اس کے دونوں پاؤں ساکت اور زمین سے اٹھے ہوئے تھے، ہاتھ پرواز کے انداز میں پھیلے ہوئے تھے، تو کیا یہ اڑ رہا ہے؟

اس بھاگ دوڑ سے کیا فائدہ؟ میں جہنم تک تمھارا پیچھا کروں گا، بہتر ہے رک جاؤ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم مجھے کیوں بلاتے ہو؟

مگر وہ کچھ نہیں بولا۔

سنو! اپنے مافوق الفطرت ہونے کا یقین مت دلاؤ کہ کسی مافوق الفطرت ہستی کا مجھ سے کیا کام؟ میری سانسوں کی رفتار تیز ہو رہی تھی۔

زمین ہموار ہو گئی تھی اس لئے میری رفتار اور تیز ہو گئی اور پھر میں اپنے بدن کی ساری طاقت یکجا کر کے چھلانگ لگا دی۔

ایک چیخ گونجی اور میں نے اسے چھاپ لیا۔

ارے باپ کون ہے رے سالا نیچے دبا ہوا سایہ بری طرح چیخ کر گالیاں بک رہا تھا اور آزادی کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔

پھر کوئی ٹھنڈی سی چیز میری کنپٹی سے آ لگی، چھوڑ کر ہٹ جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔

مار دو گولی مگر میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ اسے بتانا ہوگا کہ پکار پکار کر اس نے میرا جینا کیوں دوبھر کر دیا۔

پھر میرے سر کے پچھلے حصے پر ضرب پڑی، آنکھوں کے آگے نیلی پیلی سی چنگاریاں اڑیں اور میری گرفت ڈھیلی ہو گئی۔

میرے نیچے دبا ہوا سایہ چکنی مچھلی کی طرح میری گرفت سے پھسل گیا

مار ڈالو، مار ڈالو سالے کو، مخالف گروپ کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سفید پوش کو دیکھنا چاہا مگر میرے سامنے تو چار سیاہ پوش افراد کھڑے تھے جن میں سے ایک اب بھی گالیاں بک رہا تھا۔

چھوڑو بھی، پاگل معلوم ہوتا ہے، ایک نے گالی بکنے والے کو ڈانٹا، پاگل سے الجھنے کا کیا فائدہ، چلو ابھی بہت کام ہے۔ وہ سب چلے گئے اور میں حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

چھوٹے بڑے مکانات، عبادت گاہیں اور پختہ سڑکیں۔

یہ تو شہر ہے، تو میں شہر میں پھر واپس آ گیا؟ مگر وہ سفید پوش کہاں غائب ہو گیا؟ ضرور کسی مکان میں چھپ گیا ہوگا، میں نے مکانوں کے دروازے کھٹکھٹائے۔

بہت دیر بعد دروازے کھلے اور پھر جلدی سے بند ہو گئے۔

یہ بھک منگے رات کو سونے بھی نہیں دیتے، جاؤ بابا معاف کرو ابھی کچھ نہیں ہے۔

یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ میں کچھ پوچھ بھی نہ کہہ سکا اور ان کا لہجہ اتنا پھاڑ کھانے والا تھا کہ کچھ پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ اور وہ سب واقعی نیند سے بیدار ہوئے تھے اس لئے اسے چھپانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آسمان میں صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تھے، درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے چہچہا رہے تھے، میں بے مقصد چلنے لگا، سڑکیں جانی پہچانی سی لگ رہی تھیں، در و دیوار شناسا سا معلوم ہو رہے تھے، پھر میری نظریں دیوار پر چپکے ہوئے پوسٹر پر رک گئیں۔

ملکہ کا مسکراتا ہوا چہرہ ــــ اور نیچے تحریر...... مگر ...... میرا دل دھڑک اٹھا۔ مرحوم.. مرحوم.... مرحوم...

میں نے آنکھیں مل مل کر دیکھا۔

تو یہ مسکراہٹ مرجھا گئی؟ پراعتماد چہرہ اور زندگی سے بھرپور آنکھیں سو گئیں؟ اور گرم چادر ولی عہد کے کندھوں پر آ گئی۔

میرے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔

محل کے دروازے پر اتنی بھیڑ...... ؟ کیا ولی عہد بھی ماں کے نقش قدم پر چل رہا ہے؟ میں رک گیا۔ قطار میں کھڑے افراد ہاتھوں میں بھاری اٹیچی لئے گڑگڑا رہے تھے۔

یہ اٹیچی لے لو اور رسم میں شامل ہونے کا پاس دلوا دو۔

آپ لوگ سمجھتے نہیں، نیا خون بے حد گرم ہوتا ہے، گیٹ پر کھڑا ہوا شخص سمجھا رہا تھا، اب پہلے والا زمانہ نہیں ہے۔ اب تو اسی کو پاس ملے گا جسے وہ دینا چاہیں گے، اس لئے یہ بھیڑ فضول ہے، گھر جا کر آرام سے بیٹھئے جسے شامل کرنا ہوگا اسے گھر بیٹھے خبر مل جائے گی۔

مگر وہ بضد تھے اور اپنی اپنی شخصیت پر روشنی ڈال رہے تھے۔

پہچانتا ہوں، میں آپ سب کو پہچانتا ہوں، آپ لوگ ملکہ کے قریبی ساتھی ہیں، وہ شخص نرمی سے سمجھا رہا تھا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، ممکن ہے لسٹ میں آپ سب کا نام شامل ہو، وہ دیکھئے منیجر صاحب آ رہے ہیں، ان سے باتیں کر لیجئے۔

وہ سب پلٹ کر دیکھنے لگے۔

ایک کار تیزی سے محل کی طرف بڑھ رہی تھی، گیٹ میں داخل ہو کر رک گئی اور اس میں سے چشمہ لگائے ہوئے نوجوان اترا۔

کیا بات ہے؟ یہ بھیڑ کیسی ہے؟ اس نے بارعب لہجے میں پوچھا۔

ہم رسم کے پاس کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ وہ سب بول رہے تھے۔ عادت کے مطابق ہم تحفے کے ساتھ آئے ہیں اور اس محل کے پرانے خدمت گار ہیں۔

اس نے سرسری نظروں سے ان کے چہروں کا جائزہ لیا، پھر اس کی نظریں بھاری اٹیچیوں پر جم گئیں، وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر گیٹ پر کھڑے شخص سے مخاطب ہوا۔

رسم کے انتظامات میں ان کی ضرورت ہوگی، اس لئے اٹیچیوں پر مالک کے نام کی سلپ لگا کر مال خانے میں جمع کر لو مگر.. . وہ بھیڑ کی طرف مڑا، اسے رشوت نہ سمجھیں کہ اس کا استعمال ملک کے مفاد میں ہوگا۔ آپ کے لئے میں اپنی سی کوشش کر دوں گا، آگے آپ کی قسمت

وہ سب اسی پر مطمئن ہو گئے کہ انھیں بدلتے ہوئے حالات اور اہم ہوتے چہروں کا اندازہ ہو گیا تھا۔

بس بوجھل قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

سورج طلوع ہو چکا تھا، سڑکوں پر آمد و رفت شروع ہو گئی تھی مگر ہر شخص کھویا کھویا سا تھا، وہ ہما ہمی وہ چہل پہل نہ تھی جو اس شہر کا شیوہ تھی، فضا پر ایک عجیب سی اداسی کی چادر تنی ہوئی تھی، میں نے سڑکوں کے کنارے جلی ہوئی گاڑیوں کے ڈھانچے دیکھے، جلی ہوئی عمارتیں دیکھیں اور میرے کان کھڑے ہو گئے۔ مجھے یاد آیا کہ میں پیچھے بھی لاتعداد جلی ہوئی عمارتیں چھوڑ آیا ہوں۔ کیا اس شہر پر نیپام بم برسائے گئے ہیں؟ میں نے قدم بڑھاتے ہوئے سوچا۔ ایسا منظر تو تب ہوا تھا جب پہلا دھماکہ ہوا تھا اور لوگ بس اسٹینڈ اور اسٹیشن کی طرف بھاگنے لگے تھے، جی چاہا کسی کو روک کر پوچھوں، پھر اپنی ہیئت یاد آئی تو ارادہ بدل دیا کہ کون جواب دے گا، ابھی اور نہ جانے کتنے عجوبے دیکھنے کو ملیں گے، کس کس کو پوچھوں گا؟

میں اپنے گھر جانا چاہتا تھا مگر خیالات کے ہجوم مجھے اور کہیں لئے جا رہے تھے۔

یہ میں کہاں چلا آیا؟ میں نے ٹھٹھک کر چاروں طرف دیکھا، یہ راستہ میرے گھر تو نہیں جاتا مگر یہ کیمپ!..... عورتوں اور بچوں کا کیمپ..... غم زدہ اور اجڑی ہوئی عورتیں، سوجی ہوئی آنکھیں، بکھرے ہوئے بال، گالوں پر آنسوؤں کے نشان، سڑک پر کسی کی راہ دیکھتی ہوئی آنکھیں اور بلک بلک کر روتے ہوئے بچے، جنھیں چپ کرانے والا کوئی نہیں، سب ایک دوسرے سے بے گانہ اپنے آپ سے بے گانہ۔۔

میں ان کے قریب چلا گیا، وہ خواب سے بیدار ضرور ہو گئی تھیں مگر کسی کو کوئی کام نہ تھا، کوئی ضرورت نہ تھی، وہ زمین پر بیٹھی تھیں، چپ چاپ، صرف ان کی آنکھیں متحرک تھیں اور سڑک کے آخری سرے پر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں، کسی کا سایہ، کسی کا ہیولیٰ ان کی آنکھوں کا رنگ بدل دیتا تھا پھر وہی اداسی، وہی اضمحلال۔

پھر سڑک پر ایک ٹرک نمودار ہوا اور گھر گھراتا ہوا ان کی طرف بڑھا تو ان میں ہل چل سی ہوئی، ان کی منتظر آنکھوں میں خوف و دہشت کے سائے ابھرنے لگے اور وہ بیٹھے بیٹھے پیچھے کھسکنے لگیں۔

ٹرک رکا اور اس میں سے معمر آدمی اتر کر ان کی طرف بڑھے تو وہ خوف زدہ ہرنی کی طرح چوکنا ہو گئیں، یہی تھے، یہی تھے، ان کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔

ماتاؤں اور بہنوں ــــــ وہ ان کے قریب پہنچ گئے۔ ہم آپ کے لئے بہت دکھی ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ آپ کو زیادہ سے زیادہ سہایتا اور سو دھائیں دلا سکیں، ابھی آپ ہماری بھینٹ سویکار کریں۔ انھوں نے سڑک کی طرف دیکھا جس سے کھانے کے پیکٹ اتارے جا رہے تھے اور آپ سے ہماری بنتی ہے کہ اپنے گھروں کو لوٹ جائیے، ہم آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔

وہ سب سہمی ہوئی نظروں سے انھیں دیکھ رہی تھیں۔

جب تک ہمارے مردوں کا پتہ نہیں چلتا ہم واپس نہیں جائیں گے۔

تمھارے مرد ــــــ انھوں نے طویل سانس لی، ان کی تلاش جاری ہے، ہمیں وشواس ہے کہ وہ جہاں بھی ہیں خیریت سے ہیں اور بہت جلد آپ سے آملیں گے۔

جھوٹ بالکل جھوٹ، ان کے ہونٹ لرز رہے تھے، ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہی قاتلوں کو للکار رہے تھے اور پھر..... کاش کوئی ہمارا حافظہ چھین لے، ان آنکھوں کی روشنی چھین لے کہ وہ منظر یاد نہ آسکے۔

کھانے کے پیکٹ تقسیم کئے جا رہے تھے مگر کسی کو بھوک نہیں تھی، کسی کو زندگی کی خواہش نہیں تھی۔ کھانے کے پیکٹ ان کے سامنے رکھے جا رہے تھے مگر وہ ان کی طرف متوجہ نہ تھیں۔ البتہ بچے کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے اور وہ افسردہ نظروں سے انھیں دیکھ رہی تھیں۔

بے چارے لاوارث۔

اچھا، ماتاؤں اور بہنوں ــــــ کھانا تقسیم ہو جانے کے بعد انھوں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ ہم آپ کو یہاں سے بھگانا چاہتے ہیں۔ آپ کی سیوا ہمارا فرض ہے۔ آپ کی جان و مال کی حفاظت

ہمارا دھرم، ہم اپنے دھرم کا پالن کرتے رہیں گے، وہ چلے گئے اور وہ دور ہوتی گاڑی کو دیکھتی رہیں۔

تو یہ ہیں ان جلے ہوئے مکانوں کے مکیں ـــ میں نے گہری نظروں سے ان کا جائزہ لیا۔ بچے کھانا کھا کر زمین پر لیٹ گئے تھے۔ اور عورتیں جیوں کی تیوں بیٹھی ہوئی تھیں۔

میں بوجھل قدموں سے آگے بڑھا کہ مجھے گھر جانا تھا۔ سڑکیں پوری طرح جوان ہو چکی تھیں مگر ایک بھی بڑے بالوں والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ سب کلین شیو تھے اور پہچان مشکل کر کون کیا ہے؟

اپنے گھر پہنچا تو دروازے پر بڑا سا بورڈ لٹک رہا تھا اور سفید کرتا، پیجامہ اور ٹوپی پہنے نوجوانوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی، کام تقسیم کیے جا رہے تھے۔ پیسہ بانٹا جا رہا تھا، ہدایتیں دی جا رہی تھیں۔

میرا کمرہ ان کا آفس تھا اور میرا دالان ان کی آرام گاہ، آنگن کو جھاڑو جھنکاڑ سے صاف کر دیا گیا تھا۔ اب نہ جنبیلی کا درخت تھا اور نہ مٹی کا کبوتر، اب وہاں بڑا سا چولھا تھا جس پر کھانا پک رہا تھا۔

میں نے دیواروں کو چھو کر دیکھا اور ان کے سرد لمس سے میرے اندر بادل گرجنے لگے، بجلی چمکنے لگی اور قریب تھا کہ آنکھیں ساون بھادوں بن جاتیں تب ہی ایک ہاتھ میرے شانے پر آیا۔

یہ دھرم شالہ نہیں بڈھے، آفس ہے، چلو باہر نکلو۔

میں نے اشکبار نظروں سے در و دیوار کو دیکھا، آنگن کو دیکھا، کمرے کو دیکھا اور باہر نکل آیا۔

کیا مجھے احتجاج کرنا چاہیے تھا ـــ دروازے پر کھڑے ہو کر میں نے سوچا، مگر کس سے احتجاج کروں، یہ سب تو کرائے کے ٹٹو ہیں، ان کو حرکت دینے والے ہاتھ کہیں اور ہیں، کیا وہ اس وقت میری فریاد سنیں گے؟ ثبوت مانگیں گے اور میرے پاس تو اپنا چہرہ بھی نہیں۔

میں بے ارادہ چلنے لگا، کوئی منزل نہیں تھی، کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ سڑکیں اور صرف سڑکیں، سورج سر پر آ گیا تھا مگر اس میں جلانے کی حدت نہیں تھی، میں کہاں جاؤں، کیا کروں؟ پھر میری نظر نوٹنکی والے پر پڑی تو میں اس کے پیچھے ہو لیا۔

وہ مختلف گلیاں عبور کرتا ہوا ایک مکان کے دروازے پر رک گیا۔ جہاں سارے عدار موجود تھے مگر ایک دوسرے سے برگشتہ . . . .

میں ان سب کو ایک میز پر بیٹھانا چاہتا ہوں مگر ٹوپی والے نے بے بسی سے نوٹنکی والے سے کہا: یہ بیٹھنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے۔

میں اپنی شرط پر بیٹھوں گا۔ مسخی بوڑھے نے اکھڑ آواز میں کہا، انھیں میری سربراہی تسلیم کر لینی چاہیے کہ میرے پاس تجربات ہیں، اگر نہیں تو پھر بیٹھنے سے کیا فائدہ؟

آپ سنیے تو. . . . نوٹنکی والے نے ہاتھ پکڑ لیا، کیا بہتر نہ ہوگا کہ ہم ایک جگہ بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے غور کر لیں کہ ہم انتہائی نازک دور سے گذر رہے ہیں۔ ہمارے ہاتھ خالی ہیں اور آندھی بہت تیز کہیں ہم فنا ہی نہ ہو جائیں۔

مجھے اس کی پرواہ نہیں، اس نے جھٹک کر ہاتھ چھڑا لیا مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ میں اپنے لوگوں کی مدد سے فتح کا جھنڈا گاڑ دوں گا۔ پھر ان سے مصالحت کیوں کروں؟

آپ ہی لوگ مان جائیے. . . ٹوپی والا دوسروں کو سمجھا رہا تھا، ہماری ضد ہمیں گمنامی کے غار میں گرا دے گی۔

ہمیں اس کا احساس ہے مگر بغیر باتیں کئے کسی کی سربراہی کیسے تسلیم کر لیں کہ ہم خود کو نااہل نہیں سمجھتے۔ پھر سربراہی کا مسئلہ ہی کیوں؟ کیا لائحۂ عمل مرتب کرنا ضروری نہیں ہے؟

لائحۂ عمل تو سب سے ضروری ہے کہ ملکہ کی موت نے ہمیں خالی ہاتھ کر دیا ہے، صرف ایک شے کہ حکومت خاندانی جاگیر نہیں کہ ورثے میں منتقل ہوتی رہے۔ سب مل کر سوچیں تو نئے راستے کھلیں گے اور ہم اس آندھی کو روک سکیں گے۔

آندھی — کیسی آندھی؟ وہ بگڑ گیا، کوئی آندھی نہیں ہے۔ تم لوگ آندھی کا ہوا کھڑا کر رہے ہو۔ مجھے سربراہ تسلیم کرلو پھر میں دکھادوں گا کہ کامیابی کیسے حاصل کی جاتی ہے۔

ہم تمھیں سربراہ تسلیم کرکے اپنی انفرادیت ختم نہیں کرسکتے۔ وہ بھی بگڑ گئے۔ بات ختم ہوگئی، وہ اپنے اپنے راستوں پر چلے گئے اور وہ دونوں بے بسی سے ہاتھ ملتے رہ گئے۔

کیا کیا جائے کہ انھیں سازشوں کا علم نہیں، اب وہی لوگ برسراقتدار ہیں جنھوں نے ہمارے مضبوط پیروں کے نیچے گڈھے کھودے تھے کیا انھیں چھوڑ دیں گے؟ ان کے لئے تو وہ تدبیریں ہوں گی کہ لوگ ان کے نام تک بھول جائیں گے۔ افسوس کہ سربراہی کے شوق نے ان کی عقل خبط کردی ہے۔

رات ہوئی تو میرے قدم پھر اپنے گھر کی طرف اٹھ گئے، بھیڑ چھٹ گئی تھی۔ کچھ لوگ دالان میں بستر لگا رہے تھے اور ان کے لئے کھانا پروسا جا رہا تھا۔

بیچارہ بھوکا معلوم ہوتا ہے۔ اسے بھی کھانا کھلادو۔ ایک رحم دل نے باورچی سے کہا تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے اور بڑے زوروں کی بھوک لگی ہوئی ہے۔ مدتوں بعد آج کھانا مل رہا تھا جس کا ذائقہ بھی میں بھول چکا تھا۔

اور ضمیر کی چیخ پر دھیان دیے بغیر میں مر بھکوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا پیٹ بھر کر کھانا کھایا، پانی پیا اور مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ ایک عجیب سی سنسناہٹ پورے بدن میں پھیلتی جارہی تھی پھر اندھیرا بڑھتا ہوا اندھیرا۔

صبح آنکھیں کھلیں تو دالان خالی تھا، سونے والے نہ جانے کہاں چلے گئے تھے میں نے پورے گھر کو غور سے گھور کر دیکھا یہی تو میری جنت ہے اپنے پاس سے بچھڑ جانے کا ثبوت، میں بہت دیر تک گھورتا رہا ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتا رہا۔ شاید گھر کی مرمت کی گئی ہے۔ جب میں گیا تھا تو چھپر کی بیچ کی گول میں گھن لگ گیا تھا اور بانس ٹوٹنے

کی وجہ سے اولتی جھولنے لگی تھی

نوجوانوں کی آمد شروع ہوئی تو میں باہر نکل آیا، پڑوسی اپنے کام میں مصروف تھے، کسی نے مجھے نہیں پہچانا، کسی نے میری طرف توجہ نہ دی مگر لوگ کچھ مطمئن نظر آ رہے تھے شاید انھوں نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا تھا شاید عادی ہوگئے تھے میں دیر تک انھیں دیکھتا رہا پھر سڑک پر نکل آیا۔

میرے قدم سبز پرچم والوں کی طرف اٹھ رہے تھے۔ دور سے کوڑے کا ڈھیر دیکھ کر میں نے سمجھ لیا کہ ان کی سرحد شروع ہوچکی ہے۔ چائے خانوں اور پان کی دوکانوں پر حسب معمول بھیڑ تھی اور گرماگرم بحث جاری تھی

دو آنکھوں سے دو رنگ نظر آنا اسی کو کہتے ہیں، پان کی پیک قریبی دیوار پر تھوکتے ہوئے ایک کہہ رہا تھا، ہمارے گھر بھی فسادیوں نے لوٹے اور اس کا ثبوت بھی مل گیا مگر کوئی کارروائی نہیں ہوئی جب کہ بڑے بالوں والوں کا لوٹا ہوا مال گھنٹوں میں سڑک پر واپس آگیا۔

اس دوہری پالیسی کو آپ کیا کہیں گے؟

وہ ان کی ماں کا زمانہ تھا، آپ ان کے عہد اور عمل کی باتیں کیجئے۔ دوسرے نے جواب دیا۔ انھوں نے جس طرح حالات کو کنٹرول کیا ہے اور غافلوں کو سزائیں دی ہیں اس سے امید ہوتی ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا اور ہمارے سروں پر مسلط سینتیس برسوں کی لعنت دور ہوجائے گی۔

لعنت دور ہوجائے گی؟ آپ بھی کمال کرتے ہیں، دیکھ نہیں رہے ہیں کہ مذہبیت کس طرح پارٹی پر حاوی ہوتی جارہی ہے۔

لعنت دور ہو نہ ہو ہم ضرور دور ہوجائیں گے، بڑے بالوں کے بعد ہمارا ہی نمبر ہے۔

ہم دوب کی طرح دب دب کر نکلتے رہتے ہیں۔ یہ مسئلہ نہ اٹھائیے کہ ہم اس کے عادی ہوگئے ہیں، خوشی اس بات کی ہے کہ ایک نوجوان ہمارا رہنما بنا ہے، اب بوڑھے کھوسٹ خبطیوں سے پیچھا

پھوٹتے تھے اور پھر اس کا کردار صاف ستھرا ہے، مایوسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مگر عبادت گاہ کے متولی تو کہہ رہے ہیں کہ.....

ان کا تو نام ہی نہ لیجئے دوسرے نے بات کاٹ دی، وہ تو انکی حمایت کر رہے ہیں جن کے عزائم اظہر من الشمس ہیں اور جن کی ہمدردی کی وجہ سے آپ ولی عہد پر مذہبیت کا الزام لگا رہے ہیں۔

ہر دوکان سیاست کا اکھاڑہ بنی ہوئی تھی۔ وہ ٹولیوں میں بٹے بحث میں ایسے الجھے ہوئے تھے جیسے یہ ان کا ذاتی مسئلہ ہو۔ اس کے برعکس سرخ جھنڈیوں والے چپ تھے اور گہری نظروں سے حالات کا جائزہ لے رہے تھے، بہت کم باتیں کرتے اور ہونٹ کھولتے تو ان کا موضوع ذات پات کی بنیاد پر ہوتا۔

ہنگامے دھیرے دھیرے جوانی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

دیواریں نعروں سے سیاہ ہو رہی تھیں، ریڈیو سے ملکہ کی آخری تقریر کا ٹیپ بج رہا تھا۔ ٹیلی ویژن آخری رسومات کی تصویر دکھا رہے تھے۔ اور رسم کا دن قریب آتا جا رہا تھا۔

میں روز رات کو اپنے گھر پہنچ جاتا۔ اب تو کھانا دینے والا بھی عادی ہو گیا تھا، مجھے دیکھتے ہی کھانا میرے سامنے رکھ دیتا اور میں کھانا کھا کر دالان میں سونے والوں کی باتیں سنا کرتا۔

کیسے کیسے پروگرام بن رہے تھے، کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کئے جا رہے تھے کیا کیا احکامات دئے جا رہے تھے۔

اور ایک رات جب صبح میں دیر تھی اچانک شور و غل کی آوازیں سن کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا۔

بہت سے لوگوں کے چیخنے چلانے اور بے تحاشہ دوڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ دوڑتے دوڑتے گرتے اور پھر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہو جاتے۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ سیاہ بادلوں جیسا دھواں بھاگنے والوں کا تعاقب کر رہا تھا اور وہ اس سے بچنے کے لئے جان چھوڑ کر بھاگنا چاہ رہے تھے مگر بھاگ نہیں پا رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے سڑکیں لاشوں سے پٹ گئیں، شور و غل کی آوازیں بڑھتی گئیں، افراتفری کا عالم، بے تحاشہ بھاگتے ہوئے لوگ، جائے پناہ ڈھونڈتی ہوئی آنکھیں۔

بھاگو گیس کھل گئی ہے ——— مگر بھاگ کر کہاں جاتے، موت نے چاروں طرف پہرے بٹھا دئے تھے۔

سورج نکلا تو اس نے شرم سے آنکھیں موند لیں کیسے دیکھتا کہ ہنستی بولتی بستی لاشوں کا گہوارہ بن گئی تھی، ہزاروں تڑپ رہے تھے۔ عزیزوں کی نظروں کے سامنے دم توڑ رہے تھے مگر وہ بے بس کہ ان کے لئے کیا کریں، خود اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ موت سانس کے ذریعہ روح قبض کرنے کھڑی تھی اور سانس لینا ضروری، وہ جو گھروں میں سوئے ہوئے خوش آیند خواب دیکھ رہے تھے وہ تو آنکھیں ہی نہ کھول سکے، خواب سے بے دار ہی نہ ہو سکے اور جس نے آنکھیں کھولیں اس نے سینہ پکڑ کر دعا کی۔

کاش ہماری آنکھیں نہ کھلتیں، ہم یہ منظر دیکھنے کے لئے کیوں زندہ ہیں۔

بستی کے سارے راستے شمشان گھاٹ اور قبرستان کی طرف مڑ گئے، زندہ بچے ہوئے لوگوں کے کندھوں پر ان کے عزیزوں کی لاشیں تھیں اور شمشان گھاٹ کی طرف بڑھتے ہوئے قدم، اجتماعی قبریں، اجتماعی چتائیں، جلتی ہوئی لاشیں، سڑتی ہوئی لاشیں، مہکتی ہوئی لاشیں، بے گور و کفن لاشیں، لاشیں اور لاشیں۔

ریڈیو چیخ رہے تھے، اخبار چیخ رہے تھے، لوگ چیخ رہے تھے، دنیا چیخ رہی تھی، انسانیت چیخ رہی تھی مگر موت فاتحانہ قہقہے لگا رہی تھی، بڑھ بڑھ کر پنجے مار رہی تھی، زخمی آنکھیں اور سینہ پکڑے چیخ رہے تھے، کراہ رہے تھے، بلبلا رہے تھے، سسک رہے تھے اور سسک سسک کر مر رہے تھے۔

ہفتوں خبروں کا بازار گرم رہا، لاشوں کا بازار گرم رہا، سارے

ہمارے کان اُس طرف مڑ گئے تھے، ساری آنکھیں وہیں پر جم گئی تھیں۔

پھر اشک شوئی کا سلسلہ شروع ہوا، تسلی دی جانے لگی، ہماری معاوضوں کے تصور سے بہلایا جانے لگا پھر خبریں کھلنے لگیں اور رسم کی تیاریاں زور پکڑتی گئیں، پھر تاریخ طے کی گئی۔ دیرینہ سانحوں پر رسم کی گہما گہمی غالب آگئی اور رسم کا دن آگیا۔

میں گلی گلی محلے محلے، سڑک سڑک اور بستی بستی گھوم رہا تھا جہاں امنگ اور ولولہ نہیں تھا، ہما ہمی نہیں تھی، آنکھوں میں وہم کے سائے تھے اور خوف کا پرندہ بہت نیچی اڑانیں بھر رہا تھا

پھر گولیاں چلیں، چاقو چلے، کنپٹیوں پر پستول کی نالیں رکھی گئیں، لاشیں گریں، کاغذات پھٹے اور بکس چھینے گئے۔

ایسا ہوتا تھا مگر اس طرح نہیں ہوتا تھا کہ رسم پر سے یقین ہی اٹھ جائے، لوگ سوچ رہے تھے، کیا واقعی ہم نے اپنے حقوق کا استعمال کیا؟

وہاں تو لمبے ہاتھوں کا راج تھا جن میں ہتھیار تھے۔

جب میں وہاں گیا تو معلوم ہوا کہ میں اپنے حقوق کا استعمال کر چکا ہوں۔

چلیے رسم تو پوری ہوئی اور ہم صلیب پر سے اتر آئے، کیا ہوا؟ اسے یاد رکھنا کیا ضروری ہے؟

ضروری کیوں نہیں کہ ہمیں بار بار اسی فریب کا شکار ہونا ہے۔

چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں اور کان نتائج کے منتظر تھے، اور جب نتائج آنے لگے تو لوگوں کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ آندھی اور ایسی تیز آندھی کہ سارے تناور درخت جڑ سے اکھڑ گئے، غداروں کے خیموں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

ایک طرف جشن تھا دوسری طرف اپنے فنا ہو جانے کا ماتم۔

بے ایمانی ہوئی ہے ـــ مرحوم ولی عہد کی پرچھائیں نے فریاد کی، میرے پاس ثبوت موجود ہیں۔

بے ایمانی ہوئی ہے ـــ غداروں نے غم و غصہ کا اظہار کیا۔

بے ایمانی ہوئی ہے ـــ بے ایمانی ہوئی ہے۔

مگر چیخیں صدا بہ صحرا ہو گئیں کیونکہ ہر طرف کھلاڑی اپنی شکست کے لئے اسی کو جواز بناتے ہیں۔

میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں، عہدے تقسیم ہو رہے ہیں، بلند و بانگ دعوے کئے جا رہے ہیں، مسائل کو اولیت دی جا رہی ہے، غداروں کا احترام کیا جا رہا ہے، لوسکھئے ہیرو بن گئے ہیں۔

میں سب کچھ سن رہا ہوں، چہ میگوئیاں، سرگوشیاں اندر ہی اندر جوالا مکھی پک رہا ہے، بدظنی جھنڈے گاڑ رہی ہے۔

میں سوچتا ہوں لوگوں کو بتاؤں کہ کیا ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔

مگر نہ جانے کیوں زیادہ جان لینے پر بولنے کو جی نہیں چاہتا۔

▲▲

خلیل مامون

(اپنے اور گدھوں کے نام)

میں تنہا نہیں ہوں،
گدھا ہوں۔
جھلملاتی ہوئی
[روح خالص کی شاداب]
روشن ضمیر
دھوپ یا چاندنی میں
کھردری، سمت، شعاعِ نمِ راہ کے بیچوں بیچ
آنکھ موندے
کان تک نہ ہلائے،
دھیان کی نیم روشن
سیڑھیوں پر کھڑا ہوں
دست رس میں کئی خواب
کئی رنگ ہیں
نور کے ہالیوں میں مقید
بے قرار
طائروں کی اڑان میں)
آنکھ میں

کئی صدیوں کی وسعت میں پھیلے ہوئے
اونچے اونچے مینارے ہیں
کان میں
گنگ بولی کے عرفان میں
گنگنائے ہوئے
کئی دم ساز نغموں کی گونج
خالی وادی کا سنگیت بنتی ہے
سرحدِ دل کے جلتے الاؤ میں
کئی انمول صدمے
پگھلتے ہیں

وادیاں
سونے چاندی کی نہروں سے بھر جاتی ہیں،
[وہ جو باقی نہیں ہیں — نہیں ہے
وہ جو باقی ہیں۔ باقی ہے
وہ جو باقی رہیں گے۔ رہے گا
(داستاں کچھ نہ کچھ تو کہے گا)
وہ جو باقی نہیں تھے

نہیں ہیں
نہ ہوگا
(کچھ تو ہوگا)]
وہ مٹی جو سب کچھ ہے،
کچھ بھی نہیں ہے
اتنا سب کچھ ہے ساتھ
دُگاڑیاں دائیں بائیں سے فراٹے
بھرتی گذر جاتی ہیں
کچھ پتہ بھی نہیں چلتا ،
کوئی دوست بھی
میری خاموشیوں کا دشمن نہیں ہے
ہر ملکیت
میرا پایا ہوا
سرمایۂ جاں فنا
میرے کھوئے ہوئے
افلاس کا
کاسہ جاں نزا
سب کچھ یہیں ہے
سلیب اوپر ہے
(آسمانوں کا یا پھر
خالی خلاؤں کا ہی سہی)
دور تک اپنے اجداد کے استخواں سے روشن
نیچے
زمیں ہے
یدھ کی رات کے کارزاروں پہ گرتے
ستاروں سے روشن ہے صبح ،
روشنی میں

نام کے سرد پرزے ہواؤں میں
تحلیل ہونے لگے ہیں
سفید آسمانوں کے جھنڈے پہ
کوئی علامت
کوئی نشاں
کوئی تحریر باقی نہیں ہے
ذہن و دل کوئی کاغذ نہیں
خلاؤں میں کوئی ہیولیٰ
کوئی تصویر باقی نہیں ہے
میرے آگے پیچھے
میرے اندر
سدا بھیڑ ہے
میرے سامنے کئی نادان بچوں کے معصوم چہروں
کی روشن ہنسی
حاملہ عورتوں کے
آرزومند
پھیلے ہوئے پیٹوں کے
انتظار میں
راستوں پر
اور گلیوں کے نکڑ پہ چھائی ہوئی ہے۔
اور کہیں
شوخ دوشیزاؤں کی آراستہ دہلیزوں کی
نیم مطہر، نیم عریاں لجیلی پکار،
سانکھیو گئی، سرد ٹھنڈے تودہ پہ چھائی ہوئی ہے
اور
زمانوں کی ٹھنڈی ہواؤں میں
کئی بوڑھیوں

کئی دادی اماؤں کی برگزیدہ دعائیں
لرزتی ہیں
کئی صوفی نشیوں
کئی نیک مردوں
کئی ارواح کی پھیریاں
جگمگاتی ہیں
میری راتوں میں
کئی شیطان روحوں، خبیثوں کے خوابیدہ حملے
ہل مل جاتی ہیں۔
نیند کی زرد افیوں، مرگ آسا خموشی
کالے کالے،
سنگلاخی چٹانوں نما سناٹوں کو توڑتے ہیں

میں روشن پہاڑوں سے
تاریک غاروں کو
جوڑنے والے
نیم تاریک
دھندلے
مان کے جھولتے، ہلکورے کھاتے
پل پر کھڑا
روشنی، دھند تاریکیوں سے
بیک وقت
صلح میں مبتلا ہوں

عزیز احمد کی تاریخی کہانیاں

میرزا حامد بیگ

عزیز احمد نے لگ بھگ بیالیس برس قبل اپنے مضمون "افسانہ" (مطبوعہ سویرا لاہور ۱۲) میں افسانے کی پرکھ کے ضمن میں جو سوالات اٹھائے تھے ان کا حتمی جواب شمس الرحمٰن فاروقی کی "افسانے کی حمایت میں" (مطبوعہ مئی ۱۹۸۲ء) تذبذب آمیز کوشش کے سوا ہمارے افسانوی ادب کی طویل تاریخ میں تاحال فراہم نہیں کیا۔ مثلاً ان کا ایک سوال کو لیجیے کہ افسانے کے کتنے اور کون کون سے عناصر ترکیبی کا تجزیہ کیوں کر ممکن ہے۔

اس ضمن میں وقار عظیم کی "داستان سے افسانے تک" سے گوپی چند نارنگ کے حالیہ مضمون "نیا افسانہ: علامت، تمثیل اور کہانی کا جوہر" (مطبوعہ: محراب لاہور ۱۹۸۶ء) تک ہمارے ناقدین نے یہ گرد اڑائی ہے کہ افسانوی ادب کا مطلع صاف ہونے میں نہیں آتا۔

عزیز احمد کا اٹھایا ہوا سوال تاحال جواب طلب ہے کہ افسانے کا پلاٹ، کردار، حکایت اور اظہار یہ سب یکساں اہم ہیں یا ان میں سے کوئی ایک آدھ؟

اس تقریبِ افسانے کی محبت سے معلوم ہوا کہ "اوراق" لاہور کے افسانہ نمبر (بابت جنوری، فروری ۱۹۷۷ء) میں "افسانہ، پس منظر، رواں پس منظر اور پیش منظر" "سیپ" کراچی (اکتوبر ۱۹۷۰ء) میں "افسانے کا منظر نامہ" کے عنوانات کے تحت یہ واویلا کیا تھا کہ ہمارے ماضی اور پیش منظر کا اردو افسانہ ہر دور کا ایک بہار کا اعتبار میں اپنی پہچان کھو رہا ہے۔ میں نے نام لے کر محمد حسن عسکری، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر احسن فاروقی، مظفر علی سید، سجاد باقر رضوی، انتظار حسین اور سلیم احمد کی توجہ اس فکر مندی کی طرف دلوائی کہ ان کی کوشش کی تھوڑی سی تحریک میں ایک طویل مدت تک سوائے ایک لمبی چپ کے مجھے کچھ بھی سننے یا پڑھنے کو نہ ملا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے صرف اتنا کیا کہ موقع کی مناسبت کو دیکھتے ہوئے:

(۱) اردو افسانہ، روایت سے انحراف اور مقلدین کے لیے لمحۂ فکریہ (مطبوعہ ادب لطیف ۱۹۸۱ء)

(۲) افسانہ: علامت، تمثیل اور کہانی کا جوہر (مطبوعہ محراب ۱۹۸۶ء) دو مضامین ایسے تحریر کر دیے کہ بات کہیں سے کہیں جا پڑی۔ نارنگ صاحب نے افسانہ نگاروں کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پر پانی پلوا دیا۔ گویا تخلیقی کام اور رطب و یابس میں کوئی خطِ امتیاز نہیں کھینچا جا سکتا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون "افسانہ: علامت، تمثیل اور کہانی کا جوہر" (مطبوعہ: محراب لاہور ۱۹۸۶ء) میں افسانے کے نئے منظر نامے سے متعلق بات کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن افسانے کے نئے منظر نامے سے متعلق لکھی گئی تنقید کی زمانی ترتیب وہ نہیں جو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مرتب کی ہے۔ اصل حقیقت اس سے ذرا مختلف ہے۔ اس فقیر کی کتاب "افسانے کا منظر نامہ" ۱۹۸۱ء میں نارنگ صاحب کی مرتب کردہ "اردو افسانہ۔ روایت اور مسائل" (مختلف ناقدین کے نئے پرانے مضامین کا مجموعہ) سے بہت پہلے شائع ہو چکی تھی۔ سچ پوچھیے تو یہ کتاب "افسانے کا منظر نامہ" کا مکمل متن تو اکتوبر ۱۹۷۸ء میں ہی سامنے آ گیا تھا جب افسانہ: پس منظر، رواں پس منظر اور پیش منظر" (مطبوعہ اوراق افسانہ نمبر ۱۹۷۷ء) کی دوسری قسط "افسانے کا منظر نامہ" "سیپ" کراچی شمارہ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی۔

صد افسوس کہ اس ذیل میں شمس الرحمٰن فاروقی نے "افسانے کی حمایت میں" کے نام سے جو کچھ شائع کروایا ہے وہ نئے افسانے پر ایک طنزِ ملیح کی سطح سے اوپر

نہ اٹھ سکا۔[1]

سوائے اس کے کہ یہ ایک صورت رہ جاتی ہے کہ فاروقی صاحب کے افسانوی امور سے متعلق مباحث سے اگلے قدم اور وارث علوی و فضیل جعفری جیسے نامہ وار دانشوروں کی اس قبیل سے متعلق آرا کے اختلافات کو سامنے رکھتے ہوئے اہم افسانہ نگاروں کی بازیافت کا کام کچھ اس طرح کیا جائے کہ افسانے کے پرانے اہم ناموں کے کام اور افسانے سے متعلق ان کی آرا کو آج کی نئی افسانوی صورت حالات کے مد مقابل لا کھڑا کیا جائے تاکہ یہ جاننے میں سہولت رہے کہ ہمارا بیتا ہوا کل کیا تھا اور آج ہم کہاں کھڑے ہیں۔

یوں ہم کل اور آج کے تقابلی جائزے کے بعد آنے والے کل کے لئے "اس بہتر کل" کو انتخاب کرنے میں کامیاب ہوں گے، جس کی ہم سب نے خواہش کی ہے۔

اس خصوص میں عزیز احمد کی تاریخی کہانیوں کے مجموعے "آب حیات" کا مطالعہ عام سا، مدد دکھائی دیتا ہے اس لئے بھی کہ عزیز احمد بنیادی طور پر ریالیت کے آدمی ہیں اور افسانے میں حقیقت واقعہ کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، جبکہ ۱۹۶۰ء کے بعد سامنے آنے والے افسانے میں حقیقت واقعہ کو شک کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ پریم چند اور منٹو نے وہ کچھ دکھایا جو درحقیقت موجود تھا جب کہ آج افسانہ نگار کا ہدف "موجود" سے پرے کا علاقہ ہے سو ۱۹۶۰ء کے بعد جب موجود کی جگہ ناموجود، شعور کی جگہ لاشعور، رومانیت اور مادیت کی جگہ تجریدیت یا خشک اور خارجیت کے مقابلے میں داخلی الجھیروں سے سرد آزمائی نے افسانے میں جگہ بنائی تو پریم چند اور بیدی کے تمام CAMP FOLLOWERS بشمول ترقی پسند تحریک کے جغادری افسانہ نگار نئے لکھنے والوں کے لئے سرتاسر منہا ہو گئے۔ عجیب قصہ ہے کہ عزیز احمد بھی ان بڑے ناموں سے ایک تھے۔

یہ اس کے باوجود ہوا کہ عزیز احمد رومانی، جذباتی اور جار سولا زدہ کو

---

[1] "پلاٹ کا قصہ"، "افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ"، "افسانے کی تنقید سے متعلق چند مباحث"، "افسانے کی حمایت میں (۱)، (۲)، (۳)" وغیرہ مضامین نئے افسانے پر طنز بلیغ بھی ہیں، نئے افسانے کی شعریات کو متعین کرنے کی سنجیدہ کوششیں بھی ہیں۔ مجھے امید اور توقع ہے کہ ان کی بنیاد پر نئے افسانے کی نئی اصل تنقید ممکن ہو سکے گی ع حالیا رقیم و تخم کاشتیم۔
(شمس الرحمٰن فاروقی)

نہیں لکھ رہے تھے۔ وہ تنگ مقصدیت سے بھی کوسوں دور تھے۔ پھر آخر ایسا کیوں ہوا؟ یہ سوال اہمیت کا حامل ہے۔ سو عزیز احمد کے نظریۂ فن سے شدید اختلاف کا اعلان کرتے ہوئے اس کے فن پاروں کی قدر و قیمت کا تعین از بس ضروری ہے۔

عزیز احمد اپنے مضمون "افسانہ اور افسانہ" (مطبوعہ: سویرا لاہور) میں بیانیہ کے زبردست حامی دکھائی دیتے ہیں، اور چونکہ بیانیہ کے لئے "حقیقت واقعہ" ضروری ہے اس لئے افسانے کی سب سے مضبوط بنیاد "واقعہ" کو قرار دیتے ہیں۔ یوں افسانے میں واقعیت کے عنصر پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(۱) واقعہ ہی وہ چیز ہے جو آزادیٔ بیان اور تفصیل بیان سے قصہ یا افسانہ بن جاتا ہے۔

(۲) ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ افسانے کا جوہر، اس کے بے پناہ امکانات، اس کی توانائی کا مرکز محض واقعہ ہے۔

(۳) واقعہ ہی وہ سرچشمہ ہے جس سے بیانات، محسوسات اور تجربوں کے بے شمار قمقمے جل اٹھتے ہیں اور زندگی اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔

(۴) افسانے کا اگر کوئی مقصد معین کیا جا سکتا ہے تو وہ محض نقالی نہیں، وہ زندگی کے ایک نقطۂ عکس، ایک جوہر، ایک واقعہ کا اقتباس ہے۔

(۵) افسانے کا مقصد قریب قریب وہی مقرر پاتا ہے جو تاریخ کا مقصد ہے، واقعات کی حقیقت کا اظہار۔

(۶) انگریزی کے دونوں الفاظ HISTORY اور اسٹوری STORY ہم اصل ہیں۔ دونوں لاطینی لفظ HISTORIA سے ماخوذ ہیں جس کی یونانی اصل کے معنی ہیں تفتیش یا اطلاع کے ذریعہ حصول علم۔

(۷) افسانے میں جو چیز اہم ہے، جو اس کی جان ہے اور جو کسی تکنیک کی پابند نہیں وہ واقعہ محض واقعہ ہے۔

اس کے بعد انھوں نے واقعہ کو جو کچھ سمجھا یا خیال کیا اس کی تفصیل رقم کردی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ عزیز احمد کا یہ مضمون ان کی تاریخی کہانیوں کو سمجھنے کی کنجی ہے اور چونکہ اس مضمون میں عزیز احمد نے واقعہ کو افسانے کے کردار کی اصل کسوٹی بھی قرار دیا ہے، اس لئے تکنیکی اعتبار سے ان کے افسانوں کی تحسین

جو داں کی اپنی فراہم کردہ تعریف کے حوالے سے ہی ممکن ہے۔ مثال کے طور پر "دن سینا اور صدیاں" میں مدن سینا کی EXTENSION میں ظہور پذیر ہونے والے نسوانی کرداروں اور اس کے ساتھ مرد کے تعلق کے ساتھ ساتھ تاریخ کے متنی والے جو واقعہ کی اصلیت کو کرت میں لانے کی خواہش کے سبب افسانویت کے مقابلے میں مجرد تاریخ یا دوسرے معنوں میں واقعیت کے زیادہ قریب چلے گئے۔

بہت ممکن ہے تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے کہانی کاروں کے نزدیک یہ ایک حامی ہو لیکن عزیز احمد جاں وہ کو اپنے افسانوں میں "کہانی" کو "پلاٹ" سے روکتے ہیں۔ ای۔ ایم فورسٹر جو جیز محض کہانی کو منظم اور مربوط پلاٹ میں ڈھالتی ہے وہ علیت ہے"۔ کہانی اور پلاٹ میں علیت کے سبب فرق ملاحظہ ہو۔

(۱) کہانی۔ "بادشاہ مر گیا اور پھر ملکہ مر گئی"۔

(۲) پلاٹ۔ "بادشاہ مر گیا اور اس کے صدمے سے ملکہ مر گئی"۔ یہ فرق علیت کے سبب ہے۔

عزیز احمد کو اس علیت سے چڑ ہے۔ بقول عزیز احمد: "کہانی جب پلاٹ بنتی ہے تو راستے ہی میں اپنا سب سے قیمتی زاد راہ، اپنا اصلی سرمایہ کھو آتی ہے۔ یہ سرمایہ" بیان" کے امکانات ہیں"۔

اور عزیز احمد" بیانیہ" کے آدمی ہیں۔ انھوں نے سان کے لئے ہمیشہ HISTORY اور STORY کو ہم اصل خیال کیا ہے۔ ان کے ناولٹ" خدنگ جستہ" اور" جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" کے ساتھ" آب حیات" کے مختصر اور طویل مختصر افسانے تاریخ سے جنم لیتے ہیں۔ لیکن عزیز احمد کے تاریخ سے متعلق ان فن پاروں کو سرکاری، درباری یا تبلیغی نوعیت کے کام سے الگ کر کے دیکھنا ہوگا۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ عزیز احمد تاریخ کا کیا مفہوم سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں؟

ان کی تاریخ سے متعلق تحریروں کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ عزیز احمد نے مندرجہ ذیل سوالات پر خصوصی توجہ صرف کی:

(۱) عزیز احمد تاریخ، واقعات ماضیہ کو محض روزنامچہ خیال نہیں کرتے

(۲) تاریخ کا تعلق فقط واقعات سے نہیں بلکہ تاریخ واقعات کی روشنی میں یہ دیکھتی ہے کہ انسان نے زمانۂ جاہلیت سے موجودہ عہد تک کس طرح ترقی کی؟

(۳) تاریخ میں مدون لاتعداد نسلوں کے اختلافات، عبرت اور کشمکش سے پیدا شدہ ہولناک بدی اور خیر کی پرورش ذہن میں کیا کیا سوال ابھارتی ہے؟

(۴) وہ کون سے عناصر ہیں جو واقعات پر کامل اختیار رکھتے ہیں، نیز کیا فطرت کی طاقتوں کا کھیل اور باہمی اثر واقعات پر قابض اور حاوی ہیں؟

(۵) کیا تاریخ میں ارتقا برقرار و قائم ہے؟ یا زندگی محض بھاں متی کا کھیل ہے؟

(۶) کیا زندگی کے ریلے کی کوئی ابتدا اور انتہا بھی ہے۔

تاریخ سے متعلق اس نوع کے سوالات ہمارے افسانوی ادب میں اس سے پہلے نہیں اٹھائے گئے۔ ہمارا تاریخ سے متعلق افسانوی ادب برصغیر میں لکھی جانے والی سرکاری درباری تاریخ سے قطعاً مختلف نہیں۔ جب جب افسانوی ادب میں تاریخ کو بنیاد بنایا گیا "نسیم حجازی ین" ابھر کر سامنے آ گیا۔ یعنی تاریخ سے متعلق لکھتے ہوئے اس بات کا خصوصی طور پر خیال رکھا گیا کہ مادی دھارے کے مقابلے میں محض ناموں کو بنیاد بنایا جائے تاکہ اس طبقے کی بڑائی ابھر کر ہو جس سے عوامی تحریکیں رد ہوئیں اور تعصب کی دیواریں مضبوط ہوئیں۔ عبدالحلیم شرر تا نسیم حجازی ایسی اسی تنگ اور محدود دنیا کے باسی دکھائی دیتے ہیں۔ یوں ہمارا افسانوی ادب اصل حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے سے قاصر رہا۔ جس کے نتیجے میں برصغیر کی تاریخ اور تاریخ سے متعلق ہمارے افسانوی ادب نے ایسی نسل کو پیدا کیا جس میں بنیاد پرستی، فاشزم اور مذہبی جنونیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور جو رواداری اور قوت برداشت سے یکسر عاری ہے۔

برصغیر کی تاریخ اور تاریخ سے متعلق ہمارے افسانوی ادب کے پیدا کردہ ان الجھاؤں کے سد باب کے طور پر عزیز احمد نے نہ صرف یہ کہ تاریخی ناولٹس اور افسانے لکھے بلکہ" مزار المانہ" قریباً ۱۹۶۰ء (مرتبش میوزیم نسخہ نمبر ۱۸۱ AD ۱۹۶) کا انگریزی میں خلاصہ بھی پیش کیا۔ الگ سے کئے گئے خالصتاً تاریخ سے متعلق کام کی فہرست بہت طویل ہے۔

بقول فاروق عثمان (دیباچہ خدنگ جستہ، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" مطبوعہ میری لائبریری ۱۹۸۵ء): "عزیز احمد کے نزدیک تاریخ ماضی کے واقعات کا

کوئی ایسا مجموعہ نہیں کہ جس کا مقصد مطالعہ عبرت حاصل کرنا یا صرف عروج و فتوحات کی کہانیاں سن کر سستا کر اپنے احساس تفاخر کو تسکین دینا تھا۔ وہ تاریخ کے بارے میں ایک مخصوص فلسفیانہ نقطۂ نظر رکھتے تھے۔

اس اعتبار سے یہ کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرنی چاہیے کہ قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا"، محمد احسن فاروقی کا "سنگم" اور اس نوع کی دیگر تخلیقات عزیز احمد کی پیدا کردہ روایت کی چیزیں ہیں اور عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" اور مابعد کر ادبی انعام یافتہ مسلمان رشدی کا ناول "مڈنائٹس چلڈرن" بھی اسی روایت کی عطا ہیں۔

تاریخ سے عزیز احمد کی دلچسپی کا اولیں ثبوت تاریخ اور تہذیب سے متعلق ان کی طبع زاد تصنیف "نسل اور سلطنت" مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۴۲ء سے ملتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے جستہ جستہ تاریخی افسانے اور ناولٹس لکھنے کے ساتھ ہیرلڈ لیم کی "چنگیز خان"، "امیر تیمور" اور "تاتاریوں کی یلغار" کو ترجمہ کیا۔ اور آتے آتے آخری دنوں میں باقاعدہ تاریخ اور تہذیب و ثقافت کو اپنا مستقل موضوع بنا لیا۔

ان کے تاریخ سے متعلق افسانوی ادب پر ر۔ی۔ پاپ اور ہیرلڈ لیم کے اثرات کی نشاندہی عام طور پر کی گئی ہے جبکہ عزیز احمد پر حل اور ہومر کے کھیلا جہانوں کے ساتھ ساتھ "الف لیلہ" اور سوم دیو بھٹ کی "کتھا سرت ساگر" سے بھی اتنے ہی متاثر تھے جتنے بوکاچیو، چاسر اور لافونتین متاثر تھے۔ یوں براہِ راست یہی عزیز کے تاریخی افسانوں میں "کتھا سرت ساگر" کی معرفت "تیج تنتر"، "مہابھارت" اور رگ وید کی کہانیاں بھی جھلک دکھاتی ہیں حتیٰ کہ عزیز احمد کے افسانوں میں حضرت عیسیٰ سے دو ہزار برس پیچھے تک کا نشان دیکھنے کو مل جاتا ہے۔

عزیز احمد نے تاریخ سے مغلوب ہونے کی بجائے سوم دیو بھٹ کی طرح خلاقانہ زقند بھر کے مختلف کرداروں کی تشکیل میں من پسند تبدیلیاں بھی کی ہیں اور تاریخ کی جانی بوجھی سچائیوں میں ایک انحنائی اور نزولی جہت پیدا کر دی ہے۔

تجدد پرستی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر شمیم حنفی نے اپنے مضمون "دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر" (مطبوعہ "محراب" لاہور سنہ ۱۹[illegible]ء) میں سوم دیو بھٹ اور انتظار حسین کا نام ایک ہی سانس میں لیا ہے۔ اس موقع پر یہ جانے کیوں وہ عزیز احمد کو فراموش کر گئے، جنھوں نے انتظار حسین کے "کتھا سرت ساگر" سے رجوع کرنے سے قریباً بیس برس قبل حوالش کو بھی درخور اعتنا سمجھا اور سوم دیو بھٹ کو بھی۔ اس کی ایک بہترین مثال افسانہ "مدن سینا اور صدیاں" ہے۔ بقول محمد حسن عسکری: "ان (عزیز احمد) کا خیال تھا کہ ماضی حال میں بھی زندہ رہتا ہے۔ صرف افراد کا ماضی نہیں بلکہ تہذیبوں اور نسلوں کا بھی۔" تاریخ کا یہ گہرا شعور عزیز احمد کی تخلیقات میں قرۃ العین حیدر، محمد احسن فاروقی اور انتظار حسین سے بہت پہلے اپنی واضح شناخت بنا گیا تھا۔

اس پس منظر میں آئیے اب تاریخ سے متعلق عزیز احمد کے تحت لکھے افسانوں پر ایک سرسری نظر ڈالتے چلیں:

افسانہ "شعلۂ نار الفت" عزیز احمد کے ادبیات عالم سے گہرے شغف کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ افسانہ فرانسیسکا اور پاؤلو کی ہتھوچھٹ اور بے مہار محبت کی کہانی ہے جو اطالیہ کے مشہور شاعر دانتے سے مستعار ہے لیکن اس کہانی کو افسانوی صورت عزیز احمد نے خود بخشی ہے، جیسے رامینی کی آبادی، فرانسیسکا کے شوہر یوحنا کا محل، اور اسے [illegible] کے [illegible] عزیز احمد کی اپنی منشا کے مطابق آگے بڑھتے ہیں، خصوصاً زہرہ کے مجسمے کا دست شفقت پھیرنا اور یوحنا کے دوست اور سیدی یا حبشی غلام کے کردار۔

دانتے کے ہاں یہ کہانی اس افسانوی ترتیب کے ساتھ نہیں ملتی بلکہ دانتے کے ہاں تو فرانسیسکا اور اس کے محبوب پاؤلو سے تعارف ہی جہنم کے دوسرے طبقے میں ہوتا ہے جہاں گناہگار عاشق اور ان کے محبوب آگ میں جل رہے ہیں۔

یاد رہے کہ "شعلۂ نار الفت" اول اول "نگار" نومبر ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا جب کہ عزیز احمد ۱۹۳۵ء تک یلدرم کی تحریک آزادیِ نسواں، زبان کی رنگینی اور شعریت سے متاثر رہے۔ ان کے اولین ناول "ہوس" تک یہ اثرات بہت واضح دکھائی دیتے ہیں۔ یلدرم کے عیس سے متعلق افسانوں کی گونج "شعلۂ نار الفت" میں صاف سنائی دیتی ہے۔ عزیز احمد کا یہ وہ زمانہ ہے جب وہ فرانسیسی رومان پسندوں، ہیولاک ایلیس (HAVELOCK ELLIS) اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس سے متعارف نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی یہاں ملارمے طرز نگارش میں عزیز احمد نے اپنے افسانوں "[illegible]" اور "ممو خشکا" کے انداز میں

حسن کے حریری پردوں کو اٹھایا ہے۔ اس کے باوجود محبت یہاں بھی حسن کے حوالوں سے پنپتی ہے۔

یہ افسانہ "مدن سینا اور صدیاں" سے کہیں صاف اور عزیز احمد کے مخصوص الجھاؤوں سے خالی ہے۔ کہانی روایتی انداز میں آگے بڑھتی اور منطقی انجام پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ دور ختم کے دوسرے طبقے میں دو ہزار برس قبل گزر جانے والی اسکندریہ (PTOLEMY) کی ملکہ قلوپطرا (CLEOPATRA) جس نے ۶۸ یا ۶۹ قبل مسیح مصر کے بادشاہ ٹالمی سیزدہم کے ہاں جنم لیا اور جس نے سیاسی قابلیت اور حسن کی بدولت دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ جولیس سیزر اور مارک انٹونی جیسے مقتدر جرنیل اس کی ایک مسکان پر قربان جاتے تھے، سے بھی متعارف ہوتے ہیں اور ہیلن آف ٹرائے سے بھی۔ لیکن کہانی کے تسلسل میں چونکہ ہم فرانسیسکا اور پاؤلو کا انجام جانتے ہیں۔ اس لئے ان عجیب و غریب بڑی شخصیات کا بھی انتہائی رواداری سے مشاہدہ کرتے ہیں۔

دانتے کی ہمراہی میں عالم بالا کی اس سیر میں روم کا ملک الشعراء ورجل ہمارا بھی راہنما ہے۔ ورجل، جس کا اصلی نام پبلیس ورجیلیس مارو تھا۔ ۱۵ اکتوبر ۷۰ قبل مسیح دریائے مینسو کے کنارے ایک مزرعہ میں پیدا ہوا۔ اس کے لڑکپن میں جولیس سیزر قتل ہوا اور اس کی جوانی اٹلی میں خانہ جنگی کا زمانہ تھا۔ اگرچہ ورجل سے بہت سی نظمیں منسوب ہیں لیکن اس کی اصل شہرت صرف تین نظموں پر مبنی ہے۔ یعنی قدرتی نظمیں۔ دہقانی نظمیں اور اینیئڈ۔

یہ حقیقت ہے کہ دانتے کے ہاں جذبۂ رحم جب پیدا ہوا ہے ورجل اسے سہارا دے کر جذبات کی رو میں بہہ جانے سے روکتا آیا ہے۔ عزیز احمد افسانے کے آخر میں دونوں عظیم شاعروں کے اس فکری رابطے کی نشاندہی بھی کرتے گئے ہیں۔

افسانہ "میرا دشمن میرا بھائی" پہلی بار "نقوش" لاہور کے شمارۂ اول میں شائع ہوا۔

یہ افسانہ ۱۹۴۷ء کے ہندو مسلم فسادات کے حوالے سے "الف لیلہ" کی ایک نئی کہانی ہے۔ اس میں ہندوستان کی آزادی کے محل ہنگام کو ایک واقعہ کے طور پر افسانے کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ عزیز احمد نے داستانوی حوالوں اور علامتوں کو ذریعۂ اظہار بنایا ہے اس لئے قدیم تاریخ اور داستانوں سے مطابقت رکھنے والے مناظر بھی ۱۹۴۷ء کے ہنگامے کے ساتھ جھلک دکھاتے ہیں۔ بظاہر ان حوالوں کا افسانے میں در آنا ایک بیچ در بیچ دکھائی دیتا ہے لیکن عزیز احمد نے اس افسانے کا اختتام اس چابک دستی سے کیا ہے کہ وردی پوش حوالوں کے افسر کا ایک ڈراؤنا خواب بن گیا اور چونکہ اس افسر نے سندباد جہازی کی سات مسافتوں کا احوال پڑھ رکھا ہے اس لئے یہ تمام کے تمام حوالے افسانے میں کھپ گئے۔

ایک عجیب بات ہے کہ اس افسانے میں خونریزی، گھٹن اور عصمت دری کا احساس اس طرح نہیں ہوتا جو سعادت حسن منٹو کے "سیاہ حاشیے" پڑھ کر ہم محسوس کرتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ اس افسانے میں بیان کردہ حوادث ایسی ہولناکیوں کی سطح پر "سیاہ حاشیے" سے کہیں زیادہ خوفناک ہے۔ اس کا مطلب ہے تکنیکی سطح پر اس افسانے کے ساتھ کوئی گھپلا ہو گیا۔

میری ناقص رائے میں اس افسانے کی تکنیک بھی "سیاہ حاشیے" کے تمام افسانچوں سے بہتر ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ تقسیم سے متعلق بہترین ادب کو شمار کرتے ہوئے ہم نے اس افسانے کو فراموش کیوں کر دیا؟

اس سوال پر بہت سر کھپائی کے بعد میں تو اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس افسانے کی تاثیر کو داستانوی حوالوں نے ضعف پہنچایا یعنی ہم نے اپنی آپ بیتی کے جرکوں کو بھی سندباد جہازی کی پیدا کردہ طلسماتی فضا میں گم کر دیا۔

آج علامتی نظام کا تربیت یافتہ کہانی کار اس افسانے میں برتے گئے۔ مندرجہ ذیل اشاروں کو "اشارہ" ہی کہتا ہے علامت یا استعارہ نہیں:

(۱) انیس سو چھیالیسویں سال کی ایک رات۔ (۲) شہد کی نہر (۳) تیل کے چشمے۔ (۴) سفید چیونٹیاں۔ (۵) درے کا مرکز (۶) عقاب اور رخ کے پیٹ میں بیٹھ کر اڑنا۔ (۷) دجلہ کے لب (۸) سوتے جاگتے کے قصے (۹) اژدہوں کی وادی وغیرہ۔

اس اعتراض کے جواب میں عزیز احمد کی طرف سے صرف ایک بات کی جا سکتی ہے کہ افسانے کا آغاز شہرزاد کی کہانی سے ہوتا ہے اور چونکہ شہرزاد کی الف لیلہ اور ۱۹۴۷ء تک کا زمانی بُعد اپنی جگہ ایک حقیقت ہے، اس لئے سعید عرفی دانشور کو "سفید چیونٹیاں" اور مشرق وسطیٰ کے تیل کے چشموں کو "شہد کی نہریں" وغیرہ کہا گیا۔

یہ سوال اب بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ افسانہ "میرا دشمن میرا بھائی" ہے تو

ہندوستان کی آزادی سے متعلق اور اس میں "داغ داغ اجالے" کی بات کی گئی ہے؛ پھر اس میں شہریار اور سند باد کے حوالے کیوں کر در آئے؟ پھر یہ کہ "الف لیلہ" اور افسانے کے مرکزی کردار کے حوالے کیوں کر در آئے؟ پھر یہ کہ "الف لیلہ" اور افسانے کے مرکزی کردار کے حوالے سے سند باد کا سہارا لیا ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے، آخر یہی دو داستانوی حوالے کیوں؟

عزیز احمد کے دفاع میں کہا جا سکتا ہے کہ،

(۱) الف لیلہ مشرق اور مغرب کے درمیان تہذیبی سطح پر ایک پل کی تعمیر کرتی ہے۔ اس عظیم عربی داستان کے محض اردو میں ترجموں کی تفصیل ملاحظہ ہو

حکایات الجلیلہ۔ مترجم: شمس الدین احمد ۱۸۳۶ء

الف لیلہ۔ مترجم: عبدالکریم ۱۸۴۲ء

الف لیلہ۔ مترجم: حسن علی خاں ۱۸۴۴ء

الف لیلہ۔ مترجم: حیدر علی فیض آبادی ۱۸۴۷ء

شبستان سرور۔ مترجم: رجب علی بیگ سرور ۱۸۶۳ء

الف لیلیٰ۔ (منظوم) مترجم اصغر علی نسیم، طوطا رام شایاں، شادی لال چمن۔

ہزار داستان۔ مترجم: طوطا رام شایاں ۱۸۶۸ء (چار جلدیں) نول کشور پریس لکھنؤ۔

ہزار داستان۔ مترجم۔ منشی حامد علی خاں حامد ۱۸۸۹ء

شبستان حیرت۔ مترجم مرزا حیرت دہلوی ۱۸۹۲ء

الف لیلہ رتن ناتھ۔ مترجم رتن ناتھ سرشار ۱۹۱ نولکشور لکھنؤ

انگریزی الف لیلہ مع ترجمہ اردو۔ مترجم نامعلوم رام نرائن پریس الہ آباد۔ ۱۹۱۰ء

الف لیلہ ہیا الڈز مترجم محمد امیر حسن ۱۹۱۵ء نولکشور لکھنؤ

الف لیلہ۔ مترجم ڈاکٹر ابوالحسن منصور احمد ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۶ء

گھٹیا درجے کے بازاری اس کے علاوہ ہیں۔

(۲) 'الف لیلہ' میں شہرزاد مے ایک ہزار ایک کہانیاں سناتے ہوئے جہاں یونان اور مصر کی قدیم داستانوں سے استفادہ کیا وہیں ان کہانیوں میں بابل، شام اور ایران کے علاوہ ہندوستان کے تہذیبی عناصر بھی ملتے ہیں عزیز احمد بھی ساری دنیا کے ادب کو ایک وحدت مانتے ہیں۔

۳۔ سند باد کے سفرنامے عزیز احمد کو اس لئے مرغوب ہیں کہ تہذیبی سطح پر مشرق اور مغرب کو قریب لاتے ہیں (یہاں تک کہ سند باد کے سفرناموں میں ہومر کی 'اوڈیسی' کا اثر بھی نمایاں ہے۔)

الف لیلہ کے قاری کی سطح پر ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ یہ داستان تو داستان محض ہے، حقیقت سے اسے کیا کام۔ لیکن داستان جہاں ماضی کو حال سے متعارف کراتی وہیں مستقبل کو حال اور حال کو ماضی بنتے ہوئے بھی دکھا رہی ہوتی ہے۔ عزیز احمد کے ان افسانوں میں اسی حوالے سے تمام زمانے ایک ہو گئے ہیں یعنی یہ سفر یک رخا نہیں رہا، کبھی تو ہم ماضی کی طرف نکل جاتے ہیں اور کبھی مستقبل کی سمت۔ برٹن نے موضوع کے اعتبار سے الف لیلہ کی کہانیوں کو تین الگ الگ خانوں میں بانٹا ہے۔ اول مافوق الفطرت کی کہانیاں، دوم پریوں اور جنوں کے قصے اور سوم تاریخی کہانیاں ـــــــ عزیز احمد نے اسی تیسری روایت سے شہرزاد کی زبانی ایک نئی کہانی کو خلق کیا ہے جو ۱۹۴۷ء کے فسادات کے حوالے سے ہی الف لیلہ کی تاریخی کہانیوں کے ذیل میں شمار کی جا سکتی ہے۔

اس افسانے میں شہرزاد کے کردار کی JUSTIFICATION یہ بنتی ہے کہ جس طرح الف لیلہ کی بنیادی کہانی کا آغاز سلطان شاہ زمان کی بے اطمینانی اور مایوسی سے ہوتا ہے اور روگشتی، بربادی اور ظلم تک نوبت جا پہنچتی ہے۔ ایسے میں وزیر زادی شہرزاد اسے ملک اور وسیع تر انسانی فلاح کی خاطر بادشاہ کو مطمئن کرنے کا بوجھ اپنے سر لیتی ہے، بالکل اسی طرح "میرا دشمن میرا بھائی"، کا شہرزاد بھی طلسمات میں گرفتار ہے۔ فرنگ کی ایک ساحرہ نے اس پر جادو کر دیا ہے اور عزیز احمد کی شہرزاد انسانیت کی فلاح کی خاطر یہ سب ایک بھیانک خواب کی صورت میں اس لئے دکھاتی ہے کہ اسے حقیقت کے روپ میں بدلتے نہیں دیکھنا چاہتی۔ جہاں تک عزیز احمد کے "میرا دشمن میرا بھائی"، کے مستقبل کی بات ہے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اصل الف لیلہ کے مقابلے میں ایڈگر ایلن پوکی "ایک ہزار دوسری رات"، جتنا بھی اور پڑھا جا سکے مگر بس، البتہ ایک بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی

ہے کہ "میرا دشمن میرا بھائی" میں الف لیلہ کا تڑکا کار۔ ایل شیونس کی "جدید الف لیلہ" سے بہتر دکھائی دیتا ہے۔

افسانہ "مدن سینا اور صدیاں" پہلی بار 'ادب لطیف' لاہور سالنامہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا۔ عزیز احمد کا یہ افسانہ کشمیری برہمن سوم دیو بھٹ کی "کتھا سرت ساگر" (زمانہ ترتیب، تقریباً ۱۰۶۳ تا ۱۰۸۱ء) سے ماخوذ ہے جب کہ عزیز احمد نے سوم دیو بھٹ کے طریقۂ کار کو اپناتے ہوئے زمانے اور تاریخ کی قید کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور مختلف کرداروں کے حوالے سے قدیم ماضی سے حال اور حال سے قدیم ماضی میں حلاقانہ رقص میں بھرتے ہوئے تمام زمانوں کو حال کے لمحے میں سانس لیتے ہوئے دکھایا ہے۔

سوم دیو بھٹ نے قصہ در قصہ ہزاروں کہانیوں کو جوڑ کر جس طرح ایک کہانی بنائی تھی عزیز احمد نے بھی راجہ بکرم اور بیتال کے حوالے سے ابتدا کرتے ہوئے مدن سینا کا قصہ "کتھا سرت ساگر" سے چیا اور ڈوری گس کا قصہ چارلس کے "فریکل" سے مستعار لیا، یوں مرکزی خیال کے ارتقاء کے دوران باقی تمام کہانیاں عزیز احمد کی طبع زاد کہانیاں ہیں۔

یہاں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ انتظار حسین نے اپنی مخصوص افتاد طبع کے تحت "کتھا سرت ساگر" میں سے تا حال اُن قصوں کو نہیں چیا، جو جنس کے شاداب خطوں میں سے ہو کر گزرتے تھے جب کہ عزیز احمد نے مدن سینا کے حوالے سے اس ضمن میں پہل کی۔ یوں عزیز احمد نے مدن سینا کو مرد کے معاشرے میں صدیوں کی ظلم سہتی ہوئی عورت کی علامت میں ڈھال دیا ہے۔ یہ CHASTITY BELT کے دور سے آج تک کی عورت کا تاریخی سفر ہے۔ عزیز احمد کی مدن سینا اس تسلسل میں کبھی یورپ میں اپنی جھلک دکھاتی ہے تو کبھی مشرق وسطیٰ میں۔ اس کے نام تبدیل ہو رہے ہیں، لینڈ اسکیپ بدل رہا ہے لیکن جینے کا حق یکساں نوعیت کا ہے۔

مدن سینا اس مظلوم عورت کی علامت ہے جو غلاموں کی مانند فروخت ہوئی۔ اس سے ادنیٰ کام لئے گئے، مرد نے اونٹ اور گھوڑے کی سواری کی اور اسے پیادہ پا چلایا گیا، حرم سرا کی چہار دیواری میں قید رہی۔ بعض راسخ الاعتقاد ہندوؤں کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ ان کے نزدیک دو باتیں جن کے وہ معتقد ہیں یعنی (۱) گئو ماتا کی عزت اور تکریم اور (۲) مستورات کی تحقیر و تذلیل۔ خود اسلام میں شوہر کا درجہ عورت کے لئے مجازی خدا کا ہے۔

اس افسانے میں عزیز احمد نے سوال اٹھایا ہے کہ قدرت نے عورت کو کیا درجہ عطا فرمایا؟ اور عورت کو پیدا کرنے سے صانع حقیقی کا کیا منشا و مقصد تھا؟

افسانے کے آخر میں دل اور جسم کی قسمت کے حوالے سے سوال اٹھاتے ہوئے عزیز احمد بس السطور میں یہ کہہ گئے ہیں کہ مرد و زن کا معاملہ واحد معاملہ ہے، اور دونوں کی ترقی و تنزل باہم پیوستہ ہیں۔ کرداری سطح پر نئی افسانوی صورت حال کے پیش نظر چند باتیں محل نظر ہیں:

(۱) مدن سینا، سمدر دت، دھرم دت اور ڈاکو کے قول کا پکا ہونا۔

(۲) شوہر کا مدن سینا کو کسی دوسرے کے پاس جانے دینا۔

(۳) مدن سینا کا ایک طرف تو اپنے شوہر کو بالم، ناتھ اور اپنی جان سے عزیز گردانا اور دوسری طرف دھرم دت جیسے عاشق سے نبھانا، جو محض جسمانی تلذذ چاہتا ہے۔

افسوس کہ ہمارا "جدید" اور "نیا" افسانہ نگار اس نوع کی کردار سازی کو فرسودگی خیال کرتا ہے اور افسانے میں تمثیل کی بازیافت کے حق میں نہیں جس کی لوک دانش کے اس عظیم ورثے کو ہم اراد ہیں۔ ناقد وارث علوی (مضمون: تیس نئے افسانہ نگار، مطبوعہ "جواز" مالی گاؤں جنوری تا مئی ۱۹۸۳ء) کلی محض FRAMIT-IVE سادگی اور سادہ لوحی شمار کرتا ہے۔ جب کہ عزیز احمد تمثیل پر فریفتہ ہیں۔ یہیں سے عزیز احمد کے کرداروں اور نئی کردار سازی کا فرق سامنے آتا ہے۔

تمثیل کے زیر اثر عزیز احمد ہاں عاشق اور محبوب پہلی یا حد دوسری ملاقات پر تن من ایک دوجے پر وارنے کو بے تاب دکھائی دیتے ہیں اور تنہائی کی پہلی ملاقات میں ہی کھل کھیلتے ہیں۔ ان افسانوں میں ہماری بیشتر داستانوں کے مرکزی کرداروں کی طرح عاشق کا کردار حد درجہ فعال اور محبوب انتہا درجے کا ٹھس اور غیر متحرک رہتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ عزیز احمد نے عاشق کے ایسے قصوں کو ہی آخر کیوں چنا، جن کا محور جنس ہے اور جن میں محبت بتدریج آگے بڑھنے والی محبت کی کیس ہسٹری سے یکسر خالی رہتا ہے، کیا یہ محض اتفاق ہے

کہ عزیز احمد نے جن مغربی یا مشرقی تمثیلی، اساطیری اور داستانوی کرداروں کو چنا، ان میں قدر مشترک تھی؟

بہت ممکن ہے کہ یہ باقاعدہ کیس ہسٹری والی کردار سازی کا ردعمل ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے جس شد و مد کے ساتھ اپنے "آج" فکشن میں ڈھالا، عزیز احمد اس کی پیدا کردہ یکسانیت کو تمثیل، داستان اور اساطیر کے حوالوں کے ساتھ توڑنا چاہ رہے ہوں۔ یہ بات اس لئے بھی درست دکھائی دیتی ہے کہ عزیز احمد آدرش حقیقت نگار'' اور "ترقی پسند" ہونے کے باوجود کمیونسٹ جیسی دستور کے پابند لکیر کے فقیر نہ تھے۔ اشتراکیت اور حقیقت پسندی کے متعلق ان کا ایک اپنا نظریہ تھا۔ بقول عزیز احمد

" اشتراکی ملک کا رہنے والا "نیا انسان" بھی جب عام معاشی مسئلے حل کر چکے گا تو وہ ایک باطنی، اندرونی خلا محسوس کرے گا، جس کے لئے وجدانی احساس کی ضرورت ہوگی۔

(ترقی پسند ادب سے اقتباس)

سو عزیز احمد اپنے افسانوں میں اسی وجدانی احساس کی بازیافت کے لئے کوشاں رہے۔

افسانہ زریں تاج جنگ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اور محض ایک رات کا قصہ ہے۔ ملک آذربائیجان میں ارشد ایک موٹر ڈرائیور شیخ احمد کے ساتھ سفر پر ہے کہ جیپ دغا دے جاتی ہے۔ ارشد کو اپنے دوست احمد کے ہاں دعوت پر پہنچنا ہے اس لئے ڈرائیور اور جیپ کو وہیں چھوڑ کر پیدل چل پڑتا ہے۔ اس سفر میں اس کے شعور کی رو گُل کھلاتی ہے، مختلف زمانوں کی تین حسین و جمیل عورتوں یعنی روسی نژاد عیسائی خاتون سیلا (تسبین) مہرالنساء (نور جہاں) اور زریں تاج (قرۃ العین طاہرہ) کو اس کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ یہ تینوں ایسی عورتیں ہیں جن کے حصول کی خاطر بادشاہ بے چین ہو گیا۔ یہ طلسم اس وقت اس وقت ٹوٹتا ہے جب صبح کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اور چاند کی چاندنی میں صبح کی ضو شامل ہو گئی۔

"زریں تاج" بھی "مدن سینا اور صدیاں" سلسلے کی چیز ہے۔ یہاں بھی عزیز احمد نے تاریخ سے اسی نوع کا کام لیا جو ہیرلڈ لیم سے مخصوص ہے۔ یہ دونوں کہانیاں ایک ہی تار میں پروئی ہوئی چیزیں ہیں جنھیں کہانی کہہ لیں یا کھری تاریخ کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہیرلڈ لیم کے "چنگیز خان" کو تاریخ کہہ لیں یا فکشن کچھ فرق نہیں پڑے۔

تاریخ اور فکشن کے ادغام کی ایک اور مثال افسانہ "روما الکبری کی ایک شام" ہے۔ آثار بتلاتے ہیں اس افسانے کا زمانۂ تحریر ۱۹۴۲ء کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ یہ افسانہ بھی شعور کی رو کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار عقیل ـــ جس کا تعلق ہندوستان سے ہے، روم (اطالیہ) میں مائیکل اینجلو کی سنگ تراشی کے شاہکاروں سے سجے سان پیترو کے کلیسا کی سیر کر رہا ہے۔ ان عظیم عمارات میں اقبال کے ایک مصرع،

ع نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

کی گونج بار بار سنائی دیتی ہے۔ بظاہر یہ ۳۰ ستمبر ۱۹۳۷ء کی ایک شام کی کہانی ہے مگر اپنے اندر اطالیہ کی صدیوں کی تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔ اس شام کافی گھر میں اطالوی پروفیسر کارل کانتی سے ملاقات کے بعد عقیل پروفیسر کے ہمراہ لے جاتی تو کے پہاڑی سلسلے تک جبل مدس کی نے نکلتا ہے۔ اس دوران میں دنیا جہان کے مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ کروچے کے نظریۂ فن سے ہٹلر کے نازی ازم تک آتے آتے مسولینی اور ہٹلر کی تاریخی ملاقات تک آنے ہیں اور عقیل کو اس کے شعور کی رو آسٹریا کے شہر وی آنا پہنچا دیتی ہے۔ ایسے میں قیصرِ روم اور مسولینی کے چہرے ملا آگ کی صورت میں ڈھل جاتے ہیں اور عقیل خیالوں ہی خیالوں میں دہلی کو لٹتے ہوئے دیکھتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار عقیل، عزیز احمد کی ہمنوائی میں فاشسٹ انقلاب کو رد کرتا اور جنگ کی ہولناکیوں کے مقابلے میں امن چاہتا ہے۔

عقیل کو شعور کی رو قدیم روم کے تاریک عہد (DARK AGES) ۹۰۰ء تا ۱۰۵۰ء تک پیچھے لے جاتی ہے۔ یہ زمانہ بربری حملہ آوروں کی روم پر یلغاروں کا زمانہ ہے لیکن عزیز احمد نے بوجوہ اسلامی فتوحات کی لپیٹ میں آئے ہوئے روم کو نہیں دکھایا۔ جب مسلمانوں نے مسیحیت کو معدوم کرنے کی مقدور بھر کوشش کی تھی نیز روم میں حکومت کی باگ ڈور کا پوپوں کے ہاتھ میں چلے جانا اور پاپائے روم کی ۱۰۵۰ء تا ۱۳۰۰ء تک اصلاحی کارگزاری، خصوصاً پاپائے روم ہلڈی برانڈ (گریگوری ہفتم) کا حوالہ جولین فرنیک (آرچ بشپ آف کنٹربری ۱۰۷۰ء) کا ہمعصر تھا اس کے زمانے میں شاندار کیتھیڈرل تعمیر ہوئے اور صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا۔

عزیز احمد کی تسور کی رو نے صلیبی جنگوں کو بھی نہیں لیا۔ بالکل اسی طرح عزیز احمد نے ایلسلم وخرالسیسی اسیسی اور مشہور شاعر دانتے کی روم کو دوبارہ زندگی بخشنے والی جدوجہد کو بھی یاد نہیں کیا۔

یہ باتیں میں نے محض تاریخ کی درستگی کے لئے رقم کردی ہیں۔ ان تمام تاریخی حوالوں کا ذکر افسانے میں اس لئے بھی ضروری نہیں تھا کہ عزیز احمد نے شعور کی رو کو محض روم کی تاریخ رقم کرنے کے لئے استعمال نہیں کیا، وہ تو محض مسولینی کے زمانے اور قدیم عہد سے مطابقت رکھنے والے واقعات چن رہے تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ خود عیسائیوں کے لئے باعث فخر کبھی نہیں رہی اور یہی سبب ہے کہ کلیسائے رومۃ الکبریٰ کی تاریخ لکھتے ہوئے خود عیسائی مصنفین بھی اس دور پر بات کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔

افسانہ "آب حیات" اول اول "سویرا" لاہور شمارہ نمبر ۱۰-۱۱ میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانے کا ابتدا، تو عزیز احمد نے توریت کی کتاب آفرینش سے کی ہے۔ جس میں صراحت کردی گئی کہ خدا نہیں چاہتا کہ انسان اس طرح ہو جائے کہ وہ نیک و بد کو خوب سمجھے لیکن اس حد تک نہیں کہ زندگی کے درخت کا پھل کھائے اور غیر فانی ہو جائے۔ سو خدا نے انسان کو باغِ عدن سے نکال کر باہر کیا۔

اب انسان کو ایک عظیم جوکھم کا سامنا تھا۔ اس کے سامنے وہ مٹی تھی جس سے اس کی بنیاد اٹھی تھی۔ توریت کے مطابق خدا کو یہی منظور تھا کہ انسان اس مٹی میں ہل چلائے، جس سے اس کا خمیر اٹھایا گیا تھا۔

اس کا ایک مطلب تو یہ ہوا کہ انسان انکشاف ذات کرے اور خود کو پہچانے لیکن جب کبھی انسان نے آگہی کی اس منزل تک رسائی حاصل کی کہ جہاں سے ابدیت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو باغ عدن کے مشرقی رخ پر سے چمکتی ہوئی تلواروں والے فرشتوں نے خدا کی منشا کے عین مطابق آگے بڑھ کر انسان کا رستہ روکا (توریت کتاب آفرینش) اور اسے باغ عدن تک جانا نصیب نہ ہوا۔

افسانہ "آب حیات" میں گل گامش، ناری سسس اور یوں اخناتون اور حسن و دل کے حوالے سے اسی عظیم انسانی رزمیہ کو بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں عزیز احمد، گل گامش کے حوالے سے قبل از تاریخ کے اس دور تک پیچھے نکل گئے ہیں جسے سورماؤں کا دور کہا جاتا ہے۔ انسانی حافظے میں سب سے قدیم یادیں اسی نیم اساطیری اور نیم تاریخی دور سے متعلق محفوظ ہیں، جب انسان کو اپنے ہم جنسوں میں خدائی صفات جاگتی دکھائی دیں اور وہ انسان اپنے ہی طرح کے خود شناس انسانوں کو اس کے کارناموں کے سبب دیوتا یا دیوتاؤں کا اوتار خیال کرنے لگا۔

ایسا ہی ایک خود شناس سورما گل گامش تھا جس کی زندگی کے عظیم رزمیہ سے "آب حیات" کا خمیر اٹھایا گیا ہے۔ گل گامش میں انسانوں اور دیوتاؤں کی ملی جلی صفات دکھائی دیتی ہیں۔ گل گامش تین ہزار سال قبل مسیح میں وادی دجلہ و فرات میں سومیر کی ریاست ارک کے ایک قصبے کلاب کا ایک ایسا ہی اوتار ہے جو محض دو تہائی دیوتا ہی بن سکا اور بالآخر سانپ (ابدیت) کے شجر شباب چرائے جانے کے بعد اسے بھی موت کے ہاتھوں شکست ہوئی۔

اساطیر میں سانپ کی علامت زمان و مکان کی گرفت سے آزاد ہے۔ یہی دشنو کے گلے کا ہار سا، اشوک کا چکر بنا۔ سانپ ہی حلقہ فونیشیا والوں کا پراسرار اللہ اور کیمیا والوں کا گولا ہے۔ سانپ سراسر ابدیت ہے۔ سانپ کی یہی ابدیت تھی جس نے گل گامش کو شجر شباب سے محروم کردیا۔ یہی سانپ تھا جس نے آدم و حوا کو بہکایا اور ایسی چال چلی کہ انسان حیات ابدی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔ اس میں خدا کی منشا شامل تھی، محض اس لئے کہ ابدیت یا دوامی شباب تو اسی کا حق ہے جو ابدی ہو۔ انسان تو فانی پیدا کیا گیا ہے۔

یہاں گل گامش کے تاریخی حوالوں کی درستی کے لئے عرض کرتا چلوں کہ داستان گل گامش کی ابتدائی لوحیں ایک انگریز ماہر آثار آسٹن لیرڈ نے ۱۸۴۱ء میں نینوا کی کھدائی سے حاصل کی تھیں۔ یہ لوحیں لندن میوزیم میں برسوں یونہی بیکار پڑی رہیں۔ یہاں تک ۱۸۷۲ء میں ماہر لسانیات جارج اسمتھ نے عکادی زبان سیکھ کر اس قدیم داستان سے دنیا کو روشناس کرایا۔ ۳ دسمبر ۱۸۷۲ء کو جارج نے "مجلس آثار انجیل" کے جلسے میں لندن میوزیم کی پڑھی جا سکنے والی ایک شکستہ لوح پر مقالہ پڑھا۔ اخبار "ڈیلی گراف" نے اس عظیم کارنامے پر ایک ہزار پونڈ

سفر خرچ دے کر خیمنو اروانہ کر دیا۔ حسن اتفاق کہ اس ٹوٹی ہوئی لوح کا دوسرا حصہ بھی جارج اسمتھ کو مل گیا اور گیا رہ مزید لوحیں دریافت ہونے پر یہ داستان مکمل ہو گئی۔

جارج اسمتھ نے گل گامش کا نام ازدوبار پڑھا اور خیال ظاہر کیا کہ یہی "انجیل" کا نمرود ہے۔ گل گامش کے دوست انکی دو کا نام ایابانی بتایا۔ جارج اسمتھ کے خیال میں انکی دو درحقیقت ایک جوتشی یا رمال تھا۔

اس قصے میں گل گامش کی فتوحات انکی دو اور بیبئے کا قصہ، انکی دو کی عورت (حرمیتو) سے ہمسایا کی ملاقات، گل گامش اور انکی دو کا خواب اور اس کا موت سے دوچار ہونا، حضرت خضرؑ (اُتناپشتیم) سے ملاقات کے لئے سفر، گل گامش اور خضرؑ کا حیات و ممات پر مکالمہ، سیلاب عظیم، گل گامش کی واپسی اور انکی دو کی موت پر ماتم سب کچھ شامل ہے۔

عزیز احمد نے اس داستان سے مناسب حال حصے "آب حیات" میں بیان کر دیئے ہیں۔ اس افسانے میں گل گامش کی ناکامی کے بعد یونانی شہزادے نارسیسس کی خود نگری بازگشت، حضرت یوسفؑ کے جمال کا قصہ، مصر میں رسوائی اور قید و بند کی صعوبتوں کے بعد مسیؑ کے درجے تک پہنچنے اور حضرت یعقوبؑ کے دوبارہ بینائی پانے کے ساتھ مصر کے فرعون احناتون کا لقائے دوام کی خاطر مردہ فراعین کو ممی کی صورت میں محفوظ کرنے کا تجربہ بیان ہوا ہے۔ اس افسانے کا آخری حصہ "قصہ حسن و دل" سے متعلق ہے۔

حضرت دل نے کسی مصاحب کی زبانی چشمۂ آب حیات (دہن) کا ذکر سنا اور اس کے حصول کی بے تابانہ خواہش کی۔ ملا وجہی نے "سب رس" میں اسی قصے کو تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ عقل بادشاہ کا بیٹا دل اور عشق بادشاہ کی بیٹی حسن خود حسن موہن جگ جیون ہے، اس کہانی کے مرکزی کردار ہیں۔ آب حیات (دہن) کی تلاش میں جاسوس (نظر) نے راہ طلب کے کئی ہفت خواں طے کئے تو دل اور حسن کے وصل کی صورت پیدا ہوئی۔

بظاہر یہ قصہ سادہ ہے لیکن اس تمثیل کے کرداروں کا غیر معمولی اوصاف کا حامل ہونا، تخت یا تختہ والا ہتھ چھٹ عشق جادو کی انگوٹھی بادشاہ کا غمزہ اور نظر بامی دو نوواردوں کے ملتے ہی تخت کو لات مار کر بلند مر

یں جانا، حضرت خضرؑ کی مدد اور دیگر مافوق الفطرت عناصر سب اس کے مزاج کو داستانوں اور سورماؤں کے عہد تک کھینچے جاتے ہیں۔

عزیز احمد نے انہی مافوق الفطرت عناصر اور آب حیات کی ظلمت کی مطابقت دیکھتے ہوئے حسن و دل کے قصے کو گل گامش کے سورمائی عہد سے آگے کا زمانہ بنا دیا ہے۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے "مقدمہ سب رس" کے بعد عزیز احمد ہی تھے جنہوں نے سب رس کے "مآخذ اور مماثلات" نامی مبسوط مقالہ رقم کیا تھا۔ افسانہ "آب حیات" میں گل گامش اور سب رس کے انہی مماثلات کو بنیاد بنایا ہے۔

ہیگل کا کہنا ہے کہ کائنات کے اس پراسرار نظام میں ارتقا کا عمل انہیں بنیادوں پر قائم ہے جن بنیادوں پر ذہن انسانی کا ارتقائی عمل۔ یہ بات عام مشاہدہ ہے کہ انسانی افکار کے ارتقا میں تضادات اور مفاہمت کا عمل بیک وقت جاری و ساری رہتا ہے۔ بقول ہیگل کسی تصور کو اسی وقت صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے جب اس تصور کے ساتھ اس کا متضاد تصور بھی متعلق ہو۔
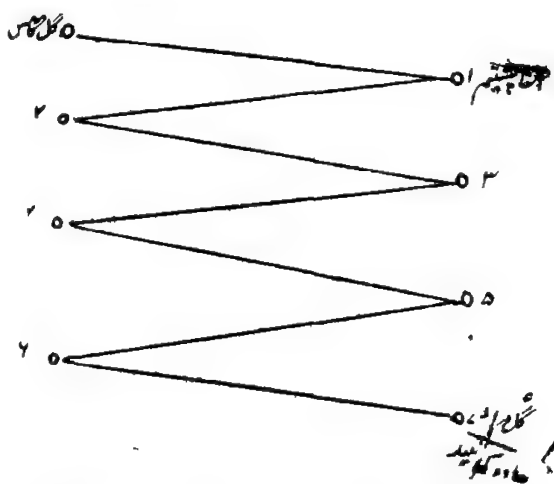
گل مراد حاصل کرنے کے لئے جادو کی نیند سونا ضروری تھا۔

گل گامش اس نیند سے خود نہیں جاگ سکتا تھا۔ اتناپشتم کی بیوی کو رحم آیا تو اس نے جگایا۔ یہاں تک کہ گل گامش نے اس سے ہمیشہ جوان رکھنے والا پودا بھی تحفے میں پایا:

WHEN ONE STARTS TO NOTHING TO ONE

HE COMES TO EVEN NUMBER.

NOTHING سے مراد ہر امید کا ختم ہو جانا ہے۔ ظاہر ہے گل گامش اس وقت کسی نہ کسی کی گود میں تو گرے گا ہی۔ یعنی نمبر ا تک آئے گا۔ نمبر ا تک آگئے اور صبر و ہمت کا دامن تھامے رکھا تو گل مراد ضرور ملے گا لیکن ابتدا کرنے کے لئے NOTHING ہو جانا پڑتا ہے۔ افسانہ "آب حیات" میں گل گامش فارسی سسی، حضرت یوسفؑ فرعون اخناتون اور حضرت دل کی بھی یہی کہانی ہے یہ انسانی مقدر ہے اور اس سے آگے چمکتی ہوئی تلواروں والے فرشتے انسان کا راستہ روکے کھڑے ہیں۔

اس افسانے پر بات ختم کرنے سے پہلے ایک الجھن کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا، جو "آستانِ پشیتم" کے حوالے سے عزیز احمد کے ذہن میں پیدا کر دی ہے۔ عزیز احمد نے آستانِ پشیتم کو حضرت خضرؑ بھی کہا ہے اور حضرت نوحؑ بھی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت خضرؑ ہی حضرت نوحؑ ہیں تو حضرت خضرؑ سے حضرت موسیٰؑ کی ملاقات کیا معنی رکھتی ہے، کیا گل گامش کا قصہ حضرت موسیٰؑ کا قصہ ہے، کیا ان کا زمانہ ایک ہے؟

جب کہ حضرت خضرؑ سے متعلق قرآن حکیم میں صرف ایک حوالہ ملتا ہے [illegible] والی کہانی [illegible] نام نہیں ہے۔ نام مفسرین نے ڈالا ہے۔

حضرت خضرؑ نے تین [illegible] کے بعد موسیٰؑ کو "بے صبر" کہا اور علم عطا کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ کو آخری جملہ یہ کہا تھا۔

"میرے تیرے درمیان فراق (جدائی)"

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ عزیز احمد نے ہمارے اجتماعی لاشعور کے سرد خانوں میں پڑے ہوئے کیسے کیسے نادر و نایاب انسانی تجربوں کی بازیافت کی ہے اور کس خوبصورتی سے اپنا رشتہ مشرقی کہانی کی معطر احساس کے ساتھ جوڑنے کی سعی کی ہے۔

ترقی پسند حقیقت نگاروں اور "جدید" لوگوں کے لئے یہ بات بڑی نہیں۔ اس لئے عزیز احمد کا نام افسانوی منظر نامے پر دھندلا رہا ہے۔ لیکن جب کبھی افسانے میں "افسانہ" نے بار پایا عزیز احمد رائیٹرز کے رائیٹر بن کر ابھریں گے۔

دیکھئے کب "جدید" اور "نئے" افسانہ نگار اپنی داسی اور کہانی میں پڑی ہوئی دراڑوں کو عزیز احمد کے متمول تجربات سے پاٹنے کی سعی کرتے ہیں۔

▲▲

انور شعور

مشاعرے میں ہمیں داد دے کے آتے ہیں
گھر آ کے ان میں سے اکثر پہ مسکراتے ہیں

نگاہ کوچہ کو جی بھر کے پھونک لینے دو
مرادفات لغت کچھ ہمیں بھی آتے ہیں

ہمارے منہ سے نکلتی ہے بات ذو معنی
خبر نہیں کہ ہنساتے ہیں یا رلاتے ہیں

شراب ظرف میں ہو تو کبھی نہیں چھپتی
وہ اور ہوتے ہیں بدنام جو چھپاتے ہیں

لپٹ آئیں نہ کیوں دوڑ دوڑ کر کتے
کبھی کبھی تو ہم اس راستے میں آتے ہیں

مزا بڑا ہے محبت میں شرک کا لیکن
میں کیا کروں کہ مجھے آپ یاد آتے ہیں

ادب ہی شوق، ادب ہی وسیلۂ روزی
یہ بات الگ ہے لٹاتے ہیں یا کماتے ہیں

کمال ظرف خود آنکھوں سے دیکھ لو گے شعور
جناب شیخ ابھی مے کدے سے آتے ہیں

کوئی شام، کوئی سحر جائے گا
جو پیدا ہوا ہے وہ مر جائے گا

زمین و مہ و انجم و کہکشاں
یہ شیرازہ اک دن بکھر جائے گا

وہ مہمان خانہ ہے دنیا کہ کوئی
نہ چاہے گا جانا مگر جائے گا

نہ معلوم جانا ہو پہلے کسے
بدر جائے گا یا پسر جائے گا

زمیں پر تو کچھ اور بل پڑ گئے
سنا تھا یہ نقشہ سدھر جائے گا

سروں سے گزر جائے گی ہاؤ ہو
جو سچ ہے وہ دل میں اتر جائے گا

انا الحق تو میں آج کہہ دوں مگر
مرا دل تو پھولوں سے بھر جائے گا

محبت کی بازی میں کیا ہار جیت
نہ جیتا جواری تو ہر جائے گا

اب ایسی بھی کیا فکر انجام کی
گزرنا ہے جو کچھ گزر جائے گا

کہیں محفل مے نہیں شام کو
شعور آج دفتر سے گھر جائے گا

ہزار بار بلانے پہ گو نہ آئے وہ
کبھی کبھی چلا آتا ہے بے بلائے وہ

صنم پرست نہ بن حسن سے مراد یہ ہے
کسی بھی شکل و شباہت میں آئے، بھائے وہ

کہاں یہ گھر کے مہینے کہاں یہ اس کی رات
اگرچہ ایک مسافر تھا میں، سرائے وہ

امیدوار ملاقات دل بھی رہتا ہے
نگاہ! ایک ترے ناز کیوں اٹھائے وہ

ہزار شہر بسا لو، خلا نہ پر ہوگا
اجڑ گئے ہیں گھر اپنے بسے بسائے وہ

مری نظر میں یہ جام و سبو نہیں جچتے
مجھے تو نین کٹورے سے مے پلائے وہ

توقعات سے بڑھ کر وہ خوب رو نکلا
مگر جو دل میں تھے نقش و نگار ہائے وہ

بہار میں در مے خانہ ناشگفتہ ہے
جسے غرض ہو، لہو سے طلب، کھلائے وہ

شعور! آج غزل ہو گئی ہے کچھ ایسی
کہ میں اسے نہ سناؤں، مجھے سنائے وہ

شمس الرحمٰن فاروقی

جوہر تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اگاتا ہے مجھے

وزن : فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن (فَعِلن)

شعر کے معنی میں کوئی باریکی نہیں۔ شعر اچھا ہے، لیکن غالب کے معیار کو دیکھتے ہوئے بہت بلند نہیں۔ تلوار کے جوہر سے وہ گول گول نشان مراد ہیں جو اعلیٰ درجے کے فولاد میں ہوتے ہیں۔ تلوار کی آب کی مناسبت سے اسے "چشمہ" یا "جدول" سے تشبیہ دیتے ہیں۔ چناں چہ میر کا مصرع ہے ؎

اس کی شمشیر کی جدول بھی بہا کیا کیا کی

تو اگر تلوار چشمہ ہے تو جوہر اس کا سبزہ ہوا۔ یعنی جوہر وہ سبزہ ہے جو تلوار کے چشمے کے کنارے اگ سکتا ہے۔ "سبزہ"، اپنی شکل کے اعتبار سے اور رنگ کے اعتبار سے زہر میں بجھی ہوئی تلوار سے مناسبت رکھتا ہے۔ غالب ہی کا شعر ہے ؎

برنگ سبزہ عزیزان بدزباں یک دست
ہزار تیغ بہ زہراب دادہ رکھتے ہیں

"زہراب" کے معنی ہیں "غم و غصہ"۔ لہٰذا شعر کے معنی ہوئے کہ جس طرح چشمۂ شمشیری کے کنارے جوہر اگ سکتا ہے، اسی طرح میں بھی وہ سبزہ ہوں جو یعنی زہر ملے ہوئے پانی (یعنی غم و غصہ) سے اگتا ہے۔ یعنی میرا وجود ہی غم و رنج کا مرہون منت ہے۔ غالب نے اس میں بھی ایک پہلو افتخار کا رکھا ہے کہ جس طرح جوہر تیغ کا وجود تیغ کی وجہ سے ہے، اسی طرح میرا وجود غم و رنج سے ہے، یعنی بہ قول طباطبائی "تلوار کا جوہر تلوار ہی میں ہوتا ہے کسی اور چشمے پر یہ سبزہ کہاں"۔

یہاں تک تو ٹھیک ہے، لیکن جھگڑا طباطبائی کے اس اشارے سے

بحر : رمل مثمن مخبون محذوف مقطوع

شروع ہوتا ہے کہ "مصنف مرحوم نے غفلت کی، کیوں کہ ایران میں زہراب اہل زبان پیشاب کو بھی کہتے ہیں، اس لفظ سے بچنا چاہیے تھا۔"

لفظ "زہراب" کے باعث جو پہلوے ذم بہ ظاہر اس شعر میں آگیا ہے اس کا دفاع مشکل معلوم ہوتا ہے۔ بے خود موہانی نے تسلیم کیا ہے کہ "زہراب کے معنی "پیشاب" بھی ہوتے ہیں، لیکن انھوں نے مومن، ناسخ، بہادر شاہ ظفر وغیرہ کے یہاں اس لفظ کے استعمال کی مثالیں پیش کی ہیں اور کہا ہے کہ اگر کسی لفظ کے کوئی قبیح معنی بھی ہوں اور عام معنی غیر قبیح ہوں تو ایسے لفظ کو فصحا نے ترک نہیں کیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے بعض بزرگان دین کے اسمائے گرامی اور حدیث کی بھی مثالیں دی ہیں۔

یہ سب باتیں درست، لیکن اعتراض اپنی جگہ پر رہتا ہے کہ شعر میں پہلوے ذم ہے۔ کیوں کہ پہلوے ذم کی تعریف ہی یہی ہے کہ ایسے لفظ کا استعمال جس کے کوئی قبیح معنی ہوں، کوئی قبیح اشارہ ہو اور اس کے باعث شعر کے اصل معنی پر ضرب پڑتی ہو۔

دراصل بے خود موہانی نے غالب کی وکالت میں ذہانت زیادہ صرف کی، علمیت اور منطق کم۔ کیوں کہ پہلوے ذم کا وجود اس وقت ثابت ہوتا جب دو شرطیں پوری ہوتیں۔ (۱) لفظ کے واقعی کوئی قبیح معنی ہیں اور (۲) شعر زیر بحث جس زمانے میں لکھا گیا اس وقت پہلوے ذم کا تصور موجود تھا۔ دوسری بات کو پہلے لیتے ہیں۔ پہلوے ذم کا تصور لکھنؤ میں انیسویں صدی کے اوائل میں وجود میں آیا۔ لکھنؤ کے قدیم اساتذہ مثلاً آتش و ناسخ، اور دہلی کے اساتذہ

کے یہاں یہ تصور نہیں ملتا۔ میر، سودا اور حتیٰ کہ میر درد کے یہاں ایسے
شعر مل جاتے ہیں جو ہمیں آج کے معیاروں سے پہلوئے ذم ہے۔ آبرو،
تاباں، ولی وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ فی الحال ناسخ کے چند شعر دیکھئے ؎

فصل گل ہے چار دن ایام توبہ ہیں مدام
در بھرا ہے کستر باب اجابت باز ہے

"باب اجابت باز ہے" کی داد کون دے اور اس کی فریاد کون کرے؟ ایک
شعر اور دیکھئے ؎

حاصل ہو غیر گوشۂ تجرید کیا کمال
سیپ قطرہ آب کا گوہر نہ ہو سکے

"سیپ"، "قطرہ"، "آب" ان کی معنویت محتاج بیان نہیں۔ ایک اور
شعر ملاحظہ ہو ؎

منعم کے تنگ میں بھی ہلائیں کبھی کبھی
تنہا برائے لذت دنیا زباں نہیں

"ہلائیں" کی بلاغت بھی واضح ہے۔ لیکن میں ان اشعار کو پہلوئے ذم کے
عیب سے متہم نہیں کرتا، کیوں کہ ناسخ کے زمانے میں یہ تصور تھا ہی نہیں۔ یہ بات
مستبعد ہے کہ اس عیب کا تصور موجود ہوتے ہوئے بھی ناسخ، آتش، مصحفی
وغیرہ کثرت سے ایسے اشعار کہتے جن پر پہلوئے ذم کا الزام وارد ہو سکتا۔
دہلی کے شاعروں کے یہاں بھی یہی صورت ہے۔ کسی بھی تذکرہ نگار کے یہاں یا
مصحفی و انشا کے معرکوں میں، یا کہیں اور بھی پہلوئے ذم کا ذکر نہیں ہے۔ اس
تصور کو میں اہل لکھنؤ کی خاص ایجاد سمجھتا ہوں، اور یہ انیسویں صدی کے
اواخر کی دریافت ہے۔ لہذا غالب، ناسخ یا کسی ایسے شاعر کو، جس کے زمانے
میں یا جس کی شعری تہذیب میں پہلوئے ذم کا تصور نہ ہو، اس پر پہلوئے
ذم کا الزام لگانا صحیح نہیں۔

اس دلیل کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ صاحب، ممکن ہے غالب کے
زمانے میں پہلوئے ذم کا تصور نہ رہا ہو، لیکن ہمارے زمانے میں تو ہے۔ لہذا آج
ہم جس شعر میں پہلوئے ذم دیکھیں گے، اس کو عیب دار ٹھہرائیں گے، چاہے
وہ شعر محمد قلی قطب شاہ کا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ جواب نہایت بودا ہے، کیوں کہ
اس میں جو منطق ہے اس کی رو سے حضرت آدم کے بیٹے بیٹیوں کو سخت گنہ گار
قرار دینا چاہئے کیوں کہ وہ لوگ سگے بھائی بہن میں نکاح روا رکھتے تھے۔ اس
زمانے میں یہ بات خلاف شرع نہ تھی، کیوں کہ ایسا نہ ہوتا تو نسل انسانی کس
طرح چلتی؟ لیکن آج کے زمانے کی شریعت کی رو سے سگے بھائی بہن میں نکاح
گناہ کبیرہ کی بدترین شکل ہے۔ تو آپ کیا حضرت آدم اور ان کے بیٹے بیٹیوں کو
نعوذ باللہ گنہ گار ٹھہرائیں گے؟

لیکن میں اس جواب پر زور دینے سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا
واقعی لفظ "زہراب" میں پہلوئے ذم ہے؟ اگر "زہراب" کے معنی "پیشاب" بھی ہیں،
اور یہ معنی غالب کے زمانے کی فارسی میں بھی تھے تو یقیناً اس میں پہلوئے ذم ہے۔
لیکن اگر کسی لفظ کے معنی شاعر کے زمانے میں قبیح نہ ہوں اور بعد میں قبیح ہو جائیں
(یا اس کے معنی میں ایک قبیح معنی کا اضافہ ہو جائے) تو اس شاعر کی حد تک اس لفظ
میں پہلوئے ذم نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر آج کے محاورے میں "رنڈی" کے معنی "طوائف"
ہیں۔ لیکن اٹھارویں صدی کی اردو میں "رنڈی" کے معنی محض "عورت" تھے (بلکہ بعد
تک اس کی مثالیں مل جاتی ہیں۔) لہذا اس زمانے کے شاعر کی حد تک لفظ "رنڈی"
میں پہلوئے ذم نہیں۔

"زہراب" کے بارے میں مولانا طباطبائی نے لکھا ہے کہ اس کو اہل زبان
"پیشاب" کے معنی میں بھی بولتے ہیں۔ بے خود موہانی نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے۔
لیکن حقیقت یہ ہے کہ "زہراب" بمعنی "پیشاب" جدید فارسی ہے۔ قدیم یا کلاسیکی
فارسی میں اس لفظ کے اس معنی کا پتہ نہیں۔ "برہان قاطع"، "بہار عجم"، "شمس اللغات"،
"اسٹائنگاس"، "چراغ ہدایت"، "مصطلحات شعراء"، "غیاث اللغات"، یہ سب "زہراب"
بمعنی "پیشاب" سے عاری ہیں۔ اسٹائنگاس نے اپنا لغت انیسویں صدی کے نصف
دوم میں مرتب کیا تھا اور اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نئے الفاظ یا پرانے الفاظ کے نئے
معنی درج کئے تھے۔ اگر "زہراب" بمعنی "پیشاب" اس وقت رائج ہو چکا ہوتا تو اغلب
ہے کہ وہ اسے درج کرتا۔ پہلے والوں کا معاملہ یہ ہے کہ کم سے کم "بہار عجم" اور "چراغ
ہدایت" نے اہل زبان کے محاورے اور استعمال پر مبنی کثرت سے الفاظ درج کئے
ہیں۔ خان آرزو نے تو "چراغ ہدایت" لکھی ہی اس لئے کہ اس میں وہ الفاظ اور
محاورے درج ہوں جو لغات میں نہیں ملتے لیکن اہل زبان میں رائج ہیں۔ ان تمام

لغت نگاروں کا "زہراب" بہ معنی "پیشاب" نہ درج کرنا اس بات کا تقریباً قطعی ثبوت ہے کہ غالب کے زمانے میں اس لفظ کے یہ معنی نہ تھے۔

"زہراب" بہ معنی "پیشاب" کا سب سے پہلا اندراج جس سے میں واقف ہوں وہ عندلیب شادانی اور شاداں بلگرامی کی مرتب کردہ "نقش بدیع" (مطبوعہ ۱۹۲۳ء) میں ہے۔ مرتبین نے اس لغت میں کوئی چھ ہزار لغات و محاورات ایسے جمع کئے ہیں جو بہ قول ان کے "مروجہ کتب لغت میں نہیں ملتے مگر ایران میں عام طور پر مستعمل ہیں"۔ اس لغت میں "زہراب" تو نہیں، لیکن "زہراب کردن" کا اندراج ہے:

> زہراب کردن = پیشاب کرنا۔ عوام اس کو ایک
> اچھا اور شائستہ لفظ سمجھ کر
> بولتے ہیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "زہراب کردن" بہ معنی "پیشاب کرنا" عوامی بولی ہے۔ حیّیم کی "فارسی انگلیسی" ڈکشنری (مطبوعہ تہران ۱۹۷۰) جس میں جدید فارسی یعنی آج روزمرہ بولی جانے والی فارسی کے الفاظ ہیں، اس میں "زہراب" کے معنی "URINE" دیئے ہیں۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ ایران کے "اہل زبان" تو نہیں، بلکہ عام لوگ، اور وہ بھی صرف جدید زمانے کے لوگ "زہراب" کو "پیشاب" کے معنی میں بولتے ہیں۔ بے چارے غالب کے عہد میں یہ معنی تھے ہی نہیں۔ (واضح رہے کہ یہ غزل نسخۂ بھوپال کی ہے، جو نومبر ۱۸۲۱ء میں مکمل ہو چکا تھا، اور طباطبائی کی شرح اس کے تقریباً اسی سال بعد کی ہے۔) لہٰذا غالب پر اس لفظ کے حوالے سے پہلوے ذم کے ارتکاب کا الزام رکھنا سراسر غلط اور زبردست ناانصافی ہے۔ ◢◢

کتابیں

عرفانِ جمیل ● علامہ جمیل مظہری ● اصغریہ پبلیکیشنز، دریاباد، الہ آباد ● پچیس روپے

مرثیے کے زوال کی وجہ عام طور پر یہ بیان کی جاتی ہے کہ انیس و دبیر (خاص کر انیس) نے اسے جس معراج کمال پر پہنچا دیا تھا، اس کے اوپر ترقی ممکن نہ تھی۔ لہٰذا زوال لازم تھا۔

اس بیان میں کئی طرح کے اور متعدد مغالطے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ اس بیان کا ماحصل اور لب لباب محض یہ ہے کہ ہمارے یہاں انیس سے بڑا مرثیہ نگار کوئی نہیں اور خاص کر جو مرثیہ نگار انیس کے بعد آئے وہ انیس سے کم تر تھے۔ پھر اس سے ثابت کیا ہوتا ہے؟ کچھ بھی نہیں، سوائے اس کے کہ مرثیے کا زوال اس وجہ سے ہوا کہ انیس ہمارے سب سے بڑے مرثیہ گو ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس بیان میں منطقی ربط کوئی نہیں، اور نہ اس سے مرثیے کے زوال کی کوئی وجہ ثابت ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ انیس و دبیر نے مرثیے کو جس انتہا تک پہنچا دیا تھا اس پر ترقی ممکن نہیں۔ ایسا بیان تو صرف کلام اللہ کی بلاغت کے بارے میں صحیح ہوگا، نہ کہ انسانوں کے کلام کے بارے میں۔ تیسری بات یہ کہ ہم میر و غالب کو سب سے بڑا غزل گو مانتے ہیں، لیکن نہ میر کے بعد غزل کا زوال ہوا (بلکہ غالب پیدا ہوئے جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ بعض حیثیتوں سے وہ میر سے برتر ہیں) اور نہ غالب کے بعد۔ غزل اب بھی پھل پھول رہی ہے، اور اگر آج غالب و میر کے رتبے کا غزل گو نہیں ہے تو اقبال جیسا غزل گو تو ہے۔ اور پھر درجہ دوم کے شعرا میں غالب کے بعد اصغر علی خاں نسیم ہیں، ضامن علی جلال ہیں، حالی، امیر مینائی اور داغ ہیں، عہد حاضر میں یگانہ و فانی ہیں۔ معاصر شعرا میں ناصر کاظمی اور ظفر اقبال ہیں۔ غرض کہ میر و غالب پر ترقی نہ ہونے کے باوجود غزل کا خزانہ خالی نہیں۔ چھٹی بات یہ کہ ادب کی تاریخ میں سطریت (LINEARITY) نہیں ہوتی جیسی کہ مثلاً سیلاب یا درجۂ حرارت میں ہوتی ہے، کہ سیلاب یا درجۂ حرارت اپنی مقررہ انتہا پر پہنچ کر تنزل پذیر ہو جاتے ہیں۔ ادب کی تاریخ میں مسلسل اتار چڑھاؤ بلکہ بہ یک وقت اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ جدید نظم ابھی تتلا کر بولنا سیکھ رہی تھی کہ اقبال سامنے آئے، اور تقریباً آن واحد میں جدید اردو نظم عالمی دیوزادوں کی ہم چشم و ہم زبان ہو گئی۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کو بالکل نیا موڑ دیا تو اس کے تقریباً ساتھ ہی ساتھ حلقۂ ارباب ذوق اور نئی نظم کی تحریک نے زور پکڑا۔ پانچویں بات یہ کہ مرثیے کا زوال اور مرثیے کی مقبولیت میں کمی، الگ الگ چیزیں ہیں۔

"عرفان جمیل" میں علامہ جمیل مظہری کے چھ مرثیے، سات قصیدے، غالب کے مشہور قصیدے "دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں" کی تضمین اور چند رباعیاں شامل ہیں۔ کتاب میں کئی طرح کے پیش لفظ اور تمہیدی عبارتیں بھی شامل ہیں، لیکن ان کے مصنفین نے قصائد پر زیادہ بحث نہیں کی ہے، شاید اس لئے کہ جمیل مظہری نے مرثیے میں بعض ندرتیں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور ایک طرح سے جوش ملیح آبادی کے طرز مرثیہ گوئی میں نیا رنگ بھرا ہے۔ نیر مسعود اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ جمیل مظہری نے "دور حاضر کے سیاق و سباق میں واقعۂ کربلا کی معنویت کو اپنے مرثیوں کا بنیادی موضوع بنایا... انھوں نے بڑی ریاضت کے ساتھ اپنے مرثیوں میں ایسی فضا خلق کی جو ایک طرف ایسی مرثیے کی فضا سے ہم آہنگ ہے، دوسری طرف اس میں دور جدید کا ذہن بھی جھلک رہا ہے۔" ڈاکٹر صفدر حسین مرحوم نے اپنے طویل دیباچے میں جمیل مظہری اور جوش کی مرثیہ نگاری کے مختلف پہلوؤں پر عمدہ اشارے کئے ہیں۔

مرثیے کے زوال کے پس منظر میں یہ بات تعجب خیز نہیں کہ عرفان جمیل کے تقریظ نگاروں نے اس کتاب میں شامل مرثیوں پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اگر جمیل مظہری نے مرثیے پر اپنی پوری اور مسلسل قوت صرف کی ہوتی تو مرثیے کے زوال کی بحث آج بے معنی ہوتی،

کیوں کہ ان میں اعلیٰ درجے کے مرثیہ نگار کے کئی اوصاف موجود تھے، اور ان کی مرکزی بصیرت میں اتنی قوت تھی کہ وہ مرثیے کو ایک نئی وحدت عطا کر سکتی تھی۔ انیس و دبیر اور ان کے اخلاف کے یہاں مرثیے کی وحدت اس کے رثائی اور ڈرامائی عنصر کی وجہ سے تھی۔ جمیل مظہری نے مرثیے کی وحدت کے لئے جذبات انگیز پیرائے کی جگہ فکر انگیز پیرایہ اختیار کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ رہتا ہے کہ وہ مرثیہ جس میں بکائیہ اور رزمیہ عناصر نہ ہوں، وہ مرثیہ ہے بھی کہ نہیں؟ ممکن ہے کہ جمیل مظہری اگر کثرت سے اور پوری توجہ کے ساتھ مرثیے کہتے تو آہستہ آہستہ ایک نئی طرح کا مرثیہ ارتقا پذیر ہونے لگتا۔ موجودہ صورت میں جوش و جمیل کے مراثی کو نئے مرثیے کا خاکہ کہا جا سکتا ہے اور خاکے کی حد تک جمیل مظہری کا پلہ جوش سے بھاری معلوم ہوتا ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ جوش نے مسدس کی ہیئت پر، جمیل مظہری کی سی سختی اور استقلال سے اصرار نہ کیا، اس لئے جوش کی مرثیہ گوئی نظم کے قریب محسوس ہوتی ہے۔

جمیل مظہری نے پہلا مرثیہ ۲۵ برس کی عمر میں لکھا اور پہلا قصیدہ ۴۲ برس کی عمر میں۔ کلام کی پختگی ایسی ہے کہ بڑے بڑے استادوں کے یہاں نہ ملے گی۔ قصیدہ کی ہیئت چوں کہ مسدس کے مقابلے میں "کم آزمائشی" ہے اس لئے جمیل مظہری کے یہاں بھی قصائد (خاص کر شروع کے قصائد) میں مسدس سے زیادہ دم خم ہے۔ مسدس میں چار اور پھر دو مصرعے جوڑنا ایسا جوکھم کا کام ہے کہ اقبال کے سوا عہد حاضر میں کسی سے پوری طرح نہ نبھ سکا ؂

بند پانی ہو گلے تیغ سے ریتے جائیں

جیسے بولتے ہوئے مصرعے کے بعد جمیل مظہری ؂

درس ایثار کا ہر حال میں دیتے جائیں

پر اکتفا کرتے ہیں لیکن جہاں فضائل کے بجائے افکار و تصورات کا ذکر آتا ہے، جمیل مظہری کا قلم جادو نگار ہونے لگتا ہے ؂

مذہب تیغ و گلو کی وہ مقدس تعلیم   چاہتی تھی عملاً دہر میں اپنی تعمیم
بس کہ تھا شرح طلب فلسفۂ ابراہیم   تھی مگر سنت حق منتظر ذبح عظیم

افسوس کہ یہاں بھی بیت مصرعے اس رتبے کے نہیں ہیں۔

غالب کے قصیدے پر ۲۰ سال کی عمر میں تضمین لکھنے والا شاعر اور غالب کے آہنگ کو پوری طرح برتنے والا شاعر قصیدے میں اقبال کی یاد دلاتا ہے ؂

تیری زباں کا ہر سخن معجزۂ کلام حق   تیری جبیں کی ہر شکن شان جلال داوری
سینۂ دانش و کرم مہبط نور یک قلم   جس سے فشارہ یم بہ یم قلزم علم حیدری

اصغریہ پبلیکیشنز نے "عرفان جمیل" شائع کر کے اردو ادب کی قابل قدر خدمت کی ہے۔

—شمس الرحمٰن فاروقی

شعلۂ نیم سوز • فضا ابن فیضی • فیضی پبلیکیشنز، مئو ناتھ بھنجن، یو۔پی • چالیس روپے

فضا ابن فیضی کی غزلیں پچھلے چند برسوں سے رسالوں اور اخباروں میں اس کثرت اور تسلسل سے شائع ہوئی ہیں کہ اکثر لوگ ان کی نظم اور رباعی کو بھول گئے ہیں حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ فضا ابن فیضی کی پر گوئی غزل کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی نمایاں ہوتی رہی ہے اور انھوں نے رباعیاں بھی بہت کہی ہیں۔ پر گو شاعر اگر کسی ایک صنف کی طرف متوجہ ہو جائے تو وہ اس خطرے میں ہمیشہ مبتلا رہتا ہے کہ دوسری اصناف میں اس کے کارنامے نظر انداز ہو جائیں گے۔ ایک اعتبار سے پر گوئی ہر صنف کے لئے نقصان دہ ہے، کیوں کہ اگر کسی شخص کی تحریر ہر رسالے، ہر اخبار، ہر انتخاب میں مسلسل نظر آئے تو لوگ اکتانے لگتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں بعض اچھے شعرا کے ساتھ یہ معاملہ ہوا، اور فضا ابن فیضی بھی اسی خطرے کی زد میں ہیں۔ "شعلۂ نیم سوز" ان کی نظموں کا مجموعہ ہے، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اہم نظموں کا مجموعہ ہے یا نظموں کا اہم مجموعہ ہے۔ لیکن غزلوں کی یلغار نے اس مجموعے کو ادبی منظر سے اوجھل کر دیا ہے، اور خود غزلوں کی یلغار نے فضا ابن فیضی کی غزل گوئی کے بارے میں بھی کوئی مستحسن نتیجہ نہیں برآمد کیا۔ مستقبل کا مورخ ان تخلیقات کے ساتھ کیا سلوک کرے گا، یہ تو مستقبل ہی جانے۔ لیکن معاصر قاری اور نقاد کی حیثیت سے

ہمارا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ ہم اپنے زمانے کے ایک معروف اور کثیر الابعاد (HIGHLY VISIBLE) شاعر کا محاکمہ کریں اور دیکھیں کہ اس کا کلام معاصر ادب کے جو کھٹے میں کہاں فٹ ہوتا ہے اور ادب کی پوری روایت میں اس کا مقام کیا ہے۔

"شعلۂ نیم سوز" کے مشمولات پر اظہار خیال کرنے سے پہلے اس کے عنوان پر اظہار خیال کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ فضا ابن فیضی نے اپنی نظموں کے مجموعے کو شعلۂ نیم سوز کیوں کہا ہے؟ کیا اس وجہ سے کہ وہ اپنی نظم کو اپنی غزل سے کم تر سمجھتے ہیں؟ یا اس لئے کہ وہ نظم کو نیم نصف غزل سے کم تر سمجھتے ہیں؟ یا اس لئے کہ ان کے خیال میں نظم کا اسلوب پورے التہاب اور شدت کے بجائے کچھ حزم، کچھ احتیاط، کچھ نیم گرمی کا تقاضا کرتا ہے؟ یا اس لئے کہ اس کتاب میں انھوں نے جس قسم کے تجربے کا اظہار کیا ہے وہ ان کے خیال میں ان داخلی قسم کے تجربات سے مختلف ہے جن کے اظہار میں پوری شخصیت کے لوراکاٹ احساسات صرف ہوتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ آخری بات ہی صحیح ہے، کیونکہ اس مجموعے میں زیادہ تر نظمیں شاعر کی سماجی اور عام دنیاوی شخصیت کا اظہار کرتی ہیں، اس پرائیویٹ اور اندرونی شخصیت کا نہیں جس کا اظہار عام طور پر غزل میں ہوتا ہے۔

جہاں تک میری ذاتی پسند ناپسند کا سوال ہے، میں یہ بات صفائی سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ نظم نگاری کا جو اسلوب اور نظم کا جو روپ اس مجموعے میں نظر آتا ہے، وہ مجھے پسند نہیں۔ میں نظم کو بھی غزل کی طرح بالواسطہ، تہ دار اور استعاراتی دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نظم اور غزل دونوں میں اظہار فکر سے زیادہ اظہار ذات، اظہار رائے سے زیادہ اظہار احساس کو پسند کرتا ہوں، لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ ہماری شاعری میں خطابیہ نظم (یعنی قصیدہ) اور بیانیاتی نظم (یعنی روزمرہ کی زندگی اور معاملات پر نظمیں ___ مثنوی در ہجو سرما، مسدس بر شہر کاما، بلی نامہ وغیرہ) کی بھی زبردست روایت ہے اور یہ روایت کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ معاصر شاعری کا رنگ بدل گیا ہے، اس لئے خطابیہ اور بیانیاتی نظم کو جدید رنگ کی نظم نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان نظموں کے حسن و قبح پر بحث نہیں ہونی چاہئے، یا نہیں ہو سکتی

یہ ضرور ہے کہ اس پر بحث خود ان کی ہی شعریات کی روشنی میں ہو تو بہتر ہے۔

رابرٹ ایڈمس نے اٹھارہویں صدی کے عظیم شاعر پوپ (POPE) کے بارے میں لکھا ہے کہ پوپ کے مداح چاہے کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرلیں، لیکن وہ جدید زمانے میں پوپ کی اہمیت اور معنویت کو نہیں ثابت کر سکتے۔ پروفیسر محمد صادق نے اپنی "تاریخ ادب اردو" (بہ زبان انگریزی) میں لکھا ہے کہ مصحفی، آتش اور ناسخ اور ان کے شاگردوں کے کلام کی آج کوئی اہمیت نہیں، وہ محض "راکھ کا ڈھیر" ہیں۔ میں ان دونوں رایوں کو غلط سمجھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی شاعر کی کسی زمانے کے لئے اہمیت اور معنویت دو طرح سے ہوتی ہے۔ اگر وہ شاعر اچھا ہے تو اس کی شاعری ہمیشہ اہم رہے گی۔ اور اگر وہ شاعر بھی اچھا ہے اور اس کے تجربات و تصورات اور ہمارے تجربات و تصورات میں آواز اور آواز بازگشت کا رشتہ ہے تو اس کی شاعری ہمارے لئے مخصوص دلچسپی اور دلکشی کی حامل ہو گی۔ پوپ، ناسخ، آتش وغیرہ پہلے زمرے میں ہیں اور میر و غالب دوسرے زمرے میں۔ لیکن کوئی بھی چیز جو روایت میں داخل ہو چکی، وہ معنویت سے بے بہرہ نہیں ہو سکتی۔ میں ہزار بار لکھ چکا ہوں کہ جدید شاعری اور اچھی شاعری ہم معنی اصطلاحات نہیں ہیں اور یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ جدید شاعری اور قدیم شاعری میں کوئی فرق نہیں کیونکہ ہیں دونوں شاعری ہی۔

لہٰذا اس واضح اعلان کے ساتھ، کہ میں فضا ابن فیضی کی نظموں کو جدید طرز احساس و اظہار کا آئینہ دار نہیں سمجھتا، اب میں ان نظموں کے بارے میں بعض تفصیلی باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ قصیدے کی روایت کے سب سے بڑے شاعر ہمارے یہاں اقبال ہیں۔ یعنی ذوق و سودا وغیرہ نے قصیدے لکھے ہیں، ان سے بحث نہیں۔ لیکن اس روایت کے شعرا میں اقبال سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ اقبال کی شاعری کے اور پہلو بھی ہیں، لیکن یہاں ان سے بھی غرض نہیں۔ ہمارے زمانے میں جوش اور معاصر عہد میں عبدالعزیز خالد قصیدے ہی کی روایت کے شاعر ہیں۔ عبدالعزیز خالد کو میں جوش سے بہتر سمجھتا ہوں۔ بہرحال اس طرح کی شاعری کے دو خاص شرائط ہیں۔ ایک کو ہم بلند آہنگی اور شکوہ الفاظ اور دوسری کو مخاطبت کہہ سکتے ہیں۔ یعنی اس شاعری میں کوئی نہ کوئی شخص یا شے براہ راست مخاطب کی جاتی ہے یا پھر شاعر اپنے طرز گفتگو سے واضح کر دیتا ہے کہ وہ اپنی بات

میں دوسروں کو بھی شریک کر رہا ہے۔ اس طرح کی شاعری میں فکر کی کارفرمائی ضروری نہیں، لیکن تخاطب کی منطق ضرور ہوتی ہے۔

فضا ابن فیضی قصیدے کی ہی روایت کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ "شعلۂ نیم سوز" کی نظموں میں جگہ جگہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اپنی بعض باتوں میں لوگوں کو (صرف قاری کو نہیں) شریک کرنا چاہتا ہے۔ نظم "دورِ کم آگہی" یوں شروع ہوتی ہے ؎

یہ صیدگاہ فکر و نظر مقتل سخن زخموں سے چور چور ہے پندارِ فن

اس کے آخری شعر حسب ذیل ہیں ؎

پوچھو نہ ہم سے ہمنفسو راہ و رسم شہر تحسین ناشناس کا پینا پڑا ہے زہر
فن کی ریاضتوں کا یہاں کچھ صلا نہیں پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
یہ راستوں کی دھوپ یہ جلتے ہوئے قدم اب سوچنا پڑا یہ اسے شوخیٔ قلم
عشووں میں آگہی کے گرفتار کیوں ہوئے ہم لوگ ایسے دور میں فن کار کیوں ہوئے

معاصر زمانے کی تنقید اور اس کی خرابیوں کا ذکر عمومی رنگ اور جوش ملیح آبادی کے انداز میں ہے ؎

رگ رگ سے آج پھوٹ پڑی ہے لہو کی سوت
یہ کارگاہِ زیست ہے دانشوروں کی موت

لہذا تخاطب بھی عام معاشرے سے ہے۔ جب شاعر عمومی انداز میں بات کرے، اور اس انداز کو اس لئے اختیار کرے کہ وہ ذاتی مشاہدے کو قارئین یا سامعین کے ایک مخصوص حلقے تک پہنچانا چاہتا ہے، تو خطاب کا رنگ لازمی ہے۔ خطابیہ شاعری اس زمانے میں عام طور پر ناپسند کی جاتی ہے، اور اس ناپسندیدگی کے وجوہ بہت مضبوط ہیں، لیکن خطابیہ شاعری پر تنقید اس کی اپنی شعریات کے حدود میں ہونا چاہیئے۔

فضا ابن فیضی ان نظموں میں ایک متفکر، تھوڑے بہت تلخ مزاج اور تھوڑے بہت مایوس مشاہدہ کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ مجھے اس بات پر کوئی حیرت نہیں کہ انھوں نے کتاب کے سرنامے پر غالب کے شعر درج کئے ہیں ؎

درجنوں بے کار ستواں زیستن آتش تیز است و داماں می زنم

اور ؎

شنیدہ کہ بہ آتش نہ سوخت ابراہیم
ببیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

اب یہ اور بات ہے کہ نظموں کا جو اسلوب انھوں نے اختیار کیا ہے اس میں ذاتی کرب و شور و غم عمومیاتی سانچوں میں ڈھل گیا ہے اور غالب جیسی شدت اور داخلی وسعت نہیں آ سکی ہے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے لکھا ہے کہ فضا ابن فیضی جو لفظ اور جو ترکیب استعمال کرتے ہیں، اسے اردو کا مزاج عطا کر دیتے ہیں۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ فضا ابن فیضی کی مضبوطی ان کی فارسیت ہے، کیوں کہ وہ قصیدے کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ روزمرہ اور زبان دہلی ان کی مضبوطی نہیں۔ فارسیت آمیز اسلوب ہمارے یہاں ہمیشہ سے نفیس اسلوب مانا گیا ہے اور فضا ابن فیضی اس اسلوب کے ماہر ہیں۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ ان کے کلام میں جہاں جہاں فارسیت اور "اردویں" کی کشاکش نظر آتی ہے وہاں شعری اظہار پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ مثلاً نظم "اس کا روپ" کے بعض مصرعے دیکھئے:

(۱) میں ہوں گل بانگ قلم شعلۂ ساز رگ جاں
(۲) میں ہوں تخئیل کے رخسار پہ بوسوں کا نشاں
(۳) میری سیرابی کا پیمانہ ہے یہ خشک لبی

ان کے مقابل میں اسی نظم کے یہ مصرعے دیکھئے، کس قدر رسست اور کم تر ہیں

(۱) مجھ کو پڑھنا کبھی چاہو جو کتابوں کی طرح
(۲) سے ہونٹوں پہ سجا لو مجھے گیتوں کی طرح
(۳) اور ملنا ہی ضروری ہو تو اے ہمنفسو

محمود الٰہی کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ فضا ابن فیضی نے بعض نظمیں ایسی بھی لکھی ہیں جنھیں وقتی اور ہنگامی کہا جا سکتا ہے، "مگر ان ہنگامی نظموں کو بھی انھوں نے جزو زندگی بنا کر پیش کیا ہے۔" اس ضمن میں انھوں نے "اردو زبان کی غریب الوطنی پر ایک نظم" کی مثال دی ہے۔ یا جشن آزادی ۱۹۷۲ کے موقعے پر نظم "تحریر و نو"

وہی جنوں وہی لعنت وہی دل آزاری
وہی زباں کا تعصب وہی دلوں کا فساد

۳ ۱۷/ اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۸۶ء

دہی مناصب و اعزاز و اقتدار کی بھوک

عضا ابن فیضی کی زبان عام طور پر سڈول اور نک سک سے درست ہوتی ہے۔ انھوں نے فارسی تراکیب میں جدت سے کام لیا ہے۔ "سنت گلزار"، "فروغ روے دانائی"، "سواد تیشہ و جام"، "جبرئیل شعور"، "تسلط یاقوت لبی"، "حریر نگہ زہرہ جمالاں"، "شوخی حوصلۂ خار اتراستاں"، "ارم طراز"، "دلد خیز"، "نبیذ سحر" جیسی تراکیب اور فقرے زبان پر ان کی دسترس اور فکر کی تازگی کا پتہ دیتے ہیں۔ اسی لئے جب بعض بعض جگہ خلاف محاورہ یا غلط استعمالات ان کے یہاں نظر آتے ہیں تو بہت کھٹکتے ہیں۔ مثلاً

جب بھی اس نے وادیٔ کشمیر چھوڑا رو پڑا (صفحہ ۱۴۴)

"کو" محذوف۔

کچھ چراغ اور بھی آفاق میں جل جائیں گے (صفحہ ۱۴۶)

"جل اٹھیں گے" کا محل ہے۔

ڈبو دے موج بلا آکے جب یہ کیا معلوم
سفینہ موج کو آواز دے کے سویا ہے
بتا سکے گا نہ تعبیر اس کی پیر فرنگ
وہ خواب لے کے تو آنکھوں میں اپنی سویا ہے (صفحہ ۱۶۲)

مصرع دوم و چہارم بہ ظاہر مردف ہیں، لیکن دونوں جگہ سویا ہے کی تکرار کے باعث قافیہ غائب ہو گیا، صرف ردیف رہ گئی، اور ردیف سے قافیہ محال ہے لہٰذا ایطائے جلی کا عیب پیدا ہو گیا۔

تو اگر ہو مضطرب کر زمین کی ہل جائے چول (صفحہ ۱۷۲)

کہ زمین کی چول ہل جانا مقتضائے مقام کے خلاف ہے۔

"شعلۂ نیم سوز" کی بہترین نظمیں وہ ہیں جن میں شاعر اپنے ماحول سے اس لئے ناآسودہ نظر آتا ہے کہ اس میں فن کی قدر نہیں، فن کار نہ اظہار اپنی وقعت کھو بیٹھا ہے اور اخلاقی قدریں روبہ زوال ہیں۔ ان نظموں کا زور، ان کی ترسیل میں الیاتی محرومی کی فراوانی اپنی مثال آپ ہیں۔

— شمس الرحمٰن فاروقی

الاخبار ([illegible]) ● مدیر زین العابدین ● ۱۴۰ ۔ نواب پور روڈ، ڈھاکہ، بنگلہ دیش ● بیس روپیہ

ان ممالک یا صوبوں سے اردو کے رسالے شائع ہوتے ہی ہیں جہاں سرکاری زبان اردو ہے لیکن ان صوبوں یا ممالک سے بھی کثرت سے اردو کے رسالے شائع ہوتے رہے ہیں جہاں سرکاری زبان اردو نہیں۔ قابل تعریف ہیں وہ لوگ جو ان صوبوں یا ان ممالک سے اردو کے رسالے شائع کر رہے ہیں جہاں مادری زبان اردو نہیں۔

بنگلہ دیش ان ہی ممالک میں ہے۔ یہاں سے اردو بولنے والے یا تو دوسرے ممالک جا بسے ہیں یا موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔ بچے کھچے لوگ شرنارتھیوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ لوگ بنگلہ دیش کے ۶۶ کیمپوں میں محصور ہیں۔ ان لوگوں کے لئے اردو کا رسالہ نکالنا کس قدر مشکل کام ہے۔ لیکن قابل مبارک باد ہیں جناب زین العابدین صاحب کہ انھوں نے "الاخبار" جیسا جریدہ نکالنا شروع کیا۔ اس جریدے کا اجرا کئی سال قبل ہو چکا تھا لیکن فوراً ہی وہ حالات کا شکار ہو گیا تھا۔ اب دوبارہ اس کی اشاعت شروع ہوئی ہے۔ بنگلہ دیش سے شائع ہونے والا یہ اردو کا غالباً پہلا سیاسی، ثقافتی، علمی اور ادبی جریدہ ہے۔

زیر تبصرہ شمارہ ۱۸×۲۲/۴ سائز میں ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس شمارے میں کچھ اہم خبریں، جگ بیتی، مذہب، کھیل کود، سیاحت اور فلم جیسے کالم کے علاوہ مضامین، افسانے، شاعری اور تبصرے بھی شامل ہیں۔ مقامی لکھنے والوں کے علاوہ پاکستانی شعرا اور مضمون نگاروں سے بھی تعاون حاصل کیا گیا ہے، جیسے احمد ندیم قاسمی اور پروین شاکر وغیرہ۔

کتابت، طباعت اور گٹ اپ عمدہ ہے۔

— سید ارشاد حیدر

کہتی ہے خلق خدا

• شب خون شمارہ ۱۳۹ میں نارنگ صاحب نے اپنی دانست میں اپنے مضمون میں نثری نظم کی وکالت کی۔ لسانی ٹکنکل معلومات کی بھرمار سے پڑھنے والوں کو مرعوب کرنے کی کوشش بھی کی ہے مگر افسوس نا انھوں نے دانستہ اردو نثری نظم کے اہم ناموں کو نظر انداز کیا ہے۔

نارنگ صاحب محقق ہیں مگر انھوں نے یہ زحمت گوارا نہیں کی کہ ماہنامہ نصرت لاہور کا ۱۹۶۲ء کا ایک شمارہ ڈھونڈھ نکالتے، اس میں میری ایک نثری نظم "گولائیوں" میں شائع ہوئی تھی۔ اسی طرح اسی زمانہ میں ملک حرصہ میں "سویرا" میں میری نظم شائع ہوئی تھی۔ پھر "سات رنگ" کراچی میں پھر "تلاش" دہلی میں جب کہ اعجاز احمد کی نثری نظمیں (جو نمائندہ نہیں) بہت بعد میں شائع ہوئیں۔

پھر ایک چیز ہوتی ہے "انفرادی اسلوب کی طاقت۔ جی ہاں! میں نے انفرادی اسلوب کی طاقت کے اعتبار سے ۶۲ ۱۹۶۱ سے ۱۹۷ کی مسلسل نمائندہ نثری نظمیں لکھیں۔ اور یہ نثری نظمیں کئی رسائل میں شائع ہوئیں مثلاً "لیٹنڈا" "عکس" جیسی نما سادہ نثری نظم ساتویں دہائی میں شب خون میں شائع ہوئی جب میں ایسی نثری نظمیں لکھ رہا تھا ـــــ تو اس وقت میرے سوا اور کون لکھ رہا تھا؟ ذرا نارنگ صاحب دریافت تو کریں۔

قمر جمیل اور کشور ناہید نے تو بہت بعد کے حالات میں نثری نظم کے کیس کو نہیں اچھالا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اگر غور کیا جائے تو بعد کے حالات میں جن شاعروں نے نمائندہ نثری نظمیں لکھی ہیں، ان میں سارہ شگفتہ (مرحومہ) اور ذیشان ساحل کے علاوہ کوئی اور نام قابل ذکر نہیں۔ افسوس کہ نارنگ صاحب نے ان مذکورہ ناموں کو بھی انتہائی غیر اہم انداز سے کئی ناموں کے ساتھ بریکٹ کر دیا ہے۔ بہر حال کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے میرا نام ساتویں دہائی کے بعد کے نثری نظم کے شاعروں کے ناموں کے بعد کئی اور ناموں کے درمیان بریکٹ کیا ہے۔ معلوم نہیں انھیں میرا نام کیسے یاد رہا " جب کہ ماہنامہ "شاعر" بمبئی کے ایک شمارہ میں کہانی کے متعلق مضمون میں تو انھوں نے میرا نام سرے سے درج ہی نہیں کیا۔ ان کو غالباً اندازہ نہیں کہ اردو نظم اور اردو کہانی میں ایک مرکز کی حیثیت سے میرا کنٹری بیوشن ہے۔ اسے آسانی سے کوئی نظر انداز کر کے گزر نہیں سکتا۔ ایک بات اور بھی ہے کہ مجھ میں تنقیدی مضامین لکھنے کی بھی صلاحیت موجود ہے اور اس معاملہ میں میرا قلم بہت طاقتور ہے۔ بلکہ ابھی میں زندہ ہوں ابھی میں اپنے خلاف ہونے والی ادبی حق تلفی کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔

کراچی — احمد ہمیش

• احمد ہمیش کی شکایت سر آنکھوں پر۔ اس شکایت کے پیچھے جو نفسیات ہے وہ خاصی دلچسپ ہے، یعنی میں بہت اہم شاعر ہوں، فلاں نقاد نے مجھے نظر انداز کر کے انصاف کا خون کیا ہے۔ برا ہو اس تنقید کا جو بھولے بھالے فن کاروں کو طرح طرح کی الجھنوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ میں احمد ہمیش کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اگر تخلیق میں جان ہے تو نقاد لاکھ برا چاہے تو وہ تخلیق کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور اگر تخلیق بے جان ہے، نقاد لاکھ بھلا چاہے، وہ اس میں جان نہیں ڈال سکتا۔ احمد ہمیش اہم فن کار ہیں تو مستقبل کا مورخ ان کی طرف توجہ کرے گا نہیں کرے گا تو اپنا ہی نقصان کرے گا۔ میری کوتاہی یہ ہے کہ جس مضمون کا انھوں نے ذکر فرمایا ہے اس میں نہ میں مورخ ہوں نہ محقق۔ یہ اعجاز انھوں نے خاکسار کو خواہ مخواہ عطا فرمایا ہے۔ شکایت ان کو مجھ سے نہیں، مجھ کو ان سے ہونا چاہیئے کیونکہ مضمون کو غور سے پڑھنا تو درکنار، انھوں نے اس کے عنوان پر بھی توجہ کرنا پسند نہیں فرمایا۔ عام رویہ یہ ہے کہ لوگ محدب شیشہ لے کر تنقیدی مضامین میں اپنا نام ڈھونڈتے ہیں اور اگر نام نظر نہ آئے تو مضمون نگار اور ایڈیٹر کو کوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ احمد ہمیش صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ اس مضمون میں میرا مسئلہ نثری نظم کے تاریخی ارتقا کو پیش کرنا ہے، نہ انفرادی شعرا کی کارگذاریوں کا تعین کرنا۔ اگر وہ ایسا سمجھتے ہیں یہ ان کی خاصی ہے۔ مضمون کا عنوان تھا "نثری نظم کی شناخت" یعنی نثری نظم کی پہچان کیا ہے، اور اگر ہے تو اس کی ہیئتی تعریف کن بنیادوں پر کی جا سکتی ہے

علاوہ میرے حقیر خیال میں یہ تعریف لسانی بنیادوں ہی پر ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے میں غلط ہوں۔ احمد ہمیش صاحب کو چاہئے کہ میرے معروضات کو غلط ثابت کریں۔ اگر ان کی بات صحیح ہوگی تو میں شکریے کے ساتھ تسلیم کروں گا۔ لیکن علمی مسائل میں محض جذباتیت سے کام نہیں چلتا۔ اگر کسی کو لسانی، ہیئتی اور صوتی الجھن ہوتی ہے تو ایسے لوگوں کی ذہنی صحت کے پیش نظر میں مضمون ہی میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ اپنی طبع نازک پر زور نہ ڈالیں۔ کیا ضروری ہے کہ ہر شخص ہر بات کو سمجھے۔ وہ اپنی تخلیق میں لگے رہیں، ہم اپنے فضول کاموں میں لگے رہیں گے۔

احمد ہمیش صاحب کی یہ غلط فہمی بھی دور ہونا چاہئے کہ میرے مضمون میں نثری نظم کے شاعروں کے نام تاریخی ترتیب سے آئے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ ترتیب ان کے ذہن میں ہوگی میرے ذہن میں نہیں، کیونکہ میرا یہ مسئلہ ہی نہیں ہے۔ شاید میں نے ان کی نظموں کو اقتباس نہیں کیا، لیکن اس کی وجہ ہرگز نہیں کہ ان کی یا کسی ایسے شاعر کی جس کا کلام مقتبس نہیں ہوا، شاعری بے اہم ہے۔ بلکہ میں نے تو نثری نظم کے صرف چار سے بحث کرتے ہوئے صرف ان شاعروں کی نظموں کا تجزیہ کیا ہے جو ماسبق شاعری میں اپنی حیثیت مستحکم کر چکے ہیں، اور اس کے باوصف انھوں نے شعری اظہار کے لئے نثری نظم کو بھی اختیار کیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں احمد ہمیش جیسے شاعر کو یہ اصرار نہ ہونا چاہئے کہ اس کا شمار ایسے شاعروں کے ساتھ کیا جائے۔

نئی دہلی — گوپی چند نارنگ

● شب خون نمبر ۱۴۰ میں پھر ایک بار غالب کا دقیق ترین شعر پیش کیا گیا ہے۔

نہ جانے کیوں کہ مٹے داغ طعن بد عہدی
تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے"

اس شعر کو نقل کرنے میں شاید آپ کے کاتب نے "مٹے" کے بجائے "مٹے" لکھ دیا ہے۔ خیر اس کی تصحیح کرنا کوئی مشکل مسئلہ نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ زیر نظر جو "نسخۂ حمیدیہ" (دیوان غالب جدید) ہے، اس کے صفحہ ۱۹۱ پر پانچ شعر کی اس غزل میں چوتھا شعر یوں درج ہے:

" نہ جانوں کیوں کہ مٹے داغ طعن بد عہدی — تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے"

یعنی بجائے "نہ جانے" کے "نہ جانوں" درج ہے۔

مذکورہ لاینحل شعر کی میں نے بھی ساری شرحیں پڑھیں اور آپ کی طرح میں بھی کسی کی شرح سے مطمئن نہ ہو سکا۔ اس لئے میں نے بھی ایک حقیر کوشش کی ہے، ممکن ہے کہ آپ کو اور قارئین "شب خون" کو پسند آئے۔

اس شعر میں ایک ایسے "نفسیاتی مجرم" کے ذہن کی عکاسی کی گئی ہے، جس کا جرم اس کے دل پر داغ بن کر نقش ہو گیا ہے، اور کسی پہلو بھی اس مجرم "بد عہد" کو "اطمینان قلب" حاصل نہیں ہوتا! — اس پس منظر میں شعر کی تشریح یوں کی جا سکتی ہے:

(کوئی شخص بھی اس بات کو) نہ جانے (ہے، یعنی جاننے سے قاصر ہے) کیونکہ (تیرا وہ) داغ (ندامت، جو) "طعن بد عہدی" (کے سبب تیری ذات کا حصہ بن گیا ہے) مٹے (گا) کیونکہ، تجھے (یعنی تیرے لئے تو اب یہ حال ہے) کہ (وہ) آئینہ بھی (جس میں تو اپنی صورت دیکھا کرتا ہے) "ورطۂ ملامت" (بن گیا) ہے۔"

خلاصہ یہ کہ ۔۔ "وہ مجرم بد عہد" جو اپنے جرم پر اس قدر شرمندہ ہے کہ جب بھی وہ کسی آئینہ کے روبرو ہوتا ہے، تو خود اس کا ضمیر اس کو ملامت کرنے لگتا ہے، تب وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ گویا، وہ آئینہ ایک "بھنور" ہے اور اس میں ڈوب رہا ہے۔"

(غالب نے یہاں یہ شاعری کی ہے کہ "ورطۂ ملامت" کا استعارہ اس "داغ" کے لئے پیش کیا ہے، جس کا عکس بظاہر اس آئینے میں موجود نہیں ہے)

انسانی ذات کے اس "نفسیاتی" فلسفے کو "شعر و ادب" کی محفل سے نکال کر "الٰہیاتِ اسلامیہ" کی روشنی میں بھی سمجھا جا سکتا ہے، جو ماننے والوں کے لئے حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔"

قرآن مجید میں اس نفسیاتی مسئلہ کو سمجھانے کے لئے یہ تین اصطلاحیں

"نفس امّارہ" ، "نفس لوّامہ" اور "نفس مطمئنّہ"
پیش کی گئی ہیں۔"

(حوالے نمبر ا سورہ یوسف ۵۳/۱۲) نمبر ۲ القیٰمۃ ۲/۷۵)
نمبر ۳ الفجر ۲۷/۸۹)

نفس امّارہ : انسان کا وہ "جذبۂ محرکہ" ہے جو شدت کے ساتھ، کسی "ناعاقبت اندیش "عمل کے لئے اکساتا رہتا ہے۔" اور

نفس لوّامہ : نفس لوّامہ انسان کے اندرون میں، اس "جذبۂ ملامت" کا نام ہے۔ جو اُسے ہر بُرے عمل سے روکنے اور باز رہنے کی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے۔ تاکہ انسان ایسے ناعاقبت اندیش عمل کے نتائج وعواقب سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ کر "اطمینان قلب حاصل کرسکے۔

نفس مطمئنّہ : اور اسی اطمینان قلب کو قرآن مجید میں "نفس مطمئنّہ" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔"

غالب نے اس شعر میں 'ایک لفظ "ملامت" استعمال کرکے ہماری توجہ اس جانب مبذول کروادی کہ :- ایک وہ شخص جس نے اپنے "نفس امّارہ" کے اکسانے میں آکر بدعہدی "کا گناہ کر بیٹھا ہے۔" اگر وہ اپنے ملامت کرنے والے "نفس لوّامہ" کا حکم مان لیتا! تو نہ اس سے وہ "گناہ بدعہدی" سرزد ہوتا! اور نہ ہر لمحہ اس کو "عذاب ندامت" سہنا پڑتا، بلکہ اس کے برخلاف اس کو "نفس مطمئنّہ" اور "قلب سلیم" حاصل ہوجاتا۔! کیوں کہ اس نے بروقت، اپنے قوت فیصلے کو صحیح سمت عطا کردی تھی!!

ستار صدیقی حیدرآباد

● "اتھل پانیوں کے سودائی" میں کتابت کی غلطیاں بہت رہ گئی ہیں۔ جملے کے جملے غائب ہوگئے ہیں۔ اب سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں ہے[1]۔

شب خون کے تازہ شمارے میں زیب غوری کے لئے ایک گوشہ مختص کرکے آپ نے ہر طرح بہت اچھا کیا۔ میں نے اس سلسلہ میں حیدرآباد کے ماہنامہ شگوفہ میں مختصراً لکھا بھی ہے۔ شاذ اور رعنیات احمد ندیم کے لئے بھی۔ کاش یہ سب کچھ شب خون میں لیا جا ... ۔

مجھے حیرت ہوئی کہ شب خون میں گدی کے انتقال کی خبر تک نہیں چھپی ہے۔ گدی میری نسل کے ان افسانہ نگاروں میں تھا جس کی اہمیت سے انکار ممکن ہی نہیں۔ ادھر حال ہی میں اس کی آخری کہانی میں نے شب خون ہی میں پڑھی تھی۔ ۲۵ جنوری ۸۶ء کو اس کا انتقال ہوا اور اس کے بعد شب خون کے دو شمارے نکلے۔ اس کے تعلق سے کہیں کوئی خبر تک نہیں ہے۔ کیا ہم سارے ادیب اور شاعر ادھر میں اسی طرح مرتے رہیں گے ؟ کیا آپ کا نقصان نہیں ہے ؟ جس شخص نے میری سوی منیر کے انتقال پر مجھے تعزیتی ٹیلی گرام کیا تھا وہ گدی کی موت سے کس طرح بے خبر رہ سکتا ہے۔ گدی کا حق شب خون ہی پر نہیں شمس الرحمٰن فاروقی پر بھی تھا۔ میرے اس دکھ درد کو محسوس کیجئے بھائی جو بلاشبہ آپ کا بھی دکھ ہے[2]۔

اقبال متین

● افسانے تمام اچھے اپنی اپنی جگہ ہیں۔ اس بار سید ارشاد حیدر نے حوار پر بے حد عمدہ تبصرہ کیا ہے۔ ویسے ان کے تبصرے بڑی معنویت رکھتے ہیں۔ لیکن اس مرتبہ حوار والا تبصرہ تو بے حد طویل ہے۔ وارث علوی صاحب کے پچھلے مضمون کا انھوں نے خوب جواب دیا ہے۔

مظہر الزماں خاں

● رسالہ حوار پر سید ارشاد حیدر کا تبصرہ پڑھا اس سے قبل بھی ان کے تبصرے پڑھتا رہا ہوں اور یقیناً ان کے تبصرے عمدہ ہوتے ہیں۔ اور یقیناً فاروقی صاحب کی تحریریں پر مغز اور وارث علوی کی تحریریں بے مغز ہوتی ہیں لیکن اس بے مغز اور پرمغز کی بحث سے ہٹ کر حوار میں بہت سی ایسی تحریریں تھیں جن پر گفتگو کی جاسکتی تھی۔

---

[1] املا کے لئے معذرت کے ساتھ ہم نے اقبال متین صاحب سے درخواست کی ہے کہ وہ ان کی نشان دہی کردیں تاکہ تصحیح شائع کی جاسکے۔ (شب خون)

[2] گدی مرحوم کے انتقال کا مجھے اس قدر رنج ہے کہ الفاظ میں نہیں بیان کرسکتا۔ شب خون کی اشاعت میں بے قاعدگی کے باعث ان کی خبر بہت دیر میں شائع ہوسکی، یعنی شمارہ ۱۴۲/۱۴۱ میں گدی کے فن پر ایک مضمون بھی شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ (شمس الرحمٰن فاروقی)

رسالے کا افسانوی حصہ بہت خوبصورت ہے، اگر زیب غوری پر ایک آدھ مضمون ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔

مہتاب حیدر نقوی
علی گڑھ

● اب کی آپ نے افسانوی تخلیقات زیادہ پیش کی ہیں۔ وقیع مقالوں کی عدم موجودگی کھٹکتی ہے۔ تفہیم غالب کے عنوان سے غالب کا جو شعر آپ نے پیش کیا ہے اس میں 'دیئے' کی جگہ 'مٹے' ہونا چاہئے اور بلاشبہ تشریح بھی دل کو بہت لگتی نہیں۔ ہماری رائے میں شعر تشریح طلب کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے معشوق کو بدعہدی کا طعنہ دیا تھا۔ (کبھی ایک بار یا دو بار) یہ طعنہ دینے کا داغ میرے دامن پر لگ گیا ہے۔ اب یہ داغ کیسے مٹے گا۔ کیوں کہ تمہارے (معشوق) نزدیک تو آئینہ بھی (جو حقیقت میں اور صاف گو ہے) درخور ملامت ہے۔ آپ کی تشریح میں وہ بات نہیں جو غالب کہنا چاہتے ہیں۔ انھیں دراصل اپنے دامن پر لگے داغِ طعن بدعہدی کو مٹانے کی فکر ہے۔

محمد منصور عالم
گیا

● اس شمارے میں زیب غوری مرحوم کے لئے ایک گوشہ آپ نے رکھا، ایسا ہونا چاہئے تھا۔ وہ بہت اچھے شاعر بھی تھے اور انسان بھی۔ کراچی میں ان سے ملاقاتیں رہی تھیں، انتقال سے چار روز قبل بھی کافی دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہی تھیں، کون جانتا تھا کہ وہ پاکستان آسودۂ خاک ہونے کے لئے گئے تھے۔

اختر لکھنوی
کراچی

▲▲

● شب خون کے تازہ شمارے ۱۴۰ اور ۱۴۱ میں یک وقت کئی خوب صورت اور معیاری افسانے زیر مطالعہ آئے۔ سریندر پرکاش کا افسانہ "خواب صورت" بے حد متاثر کن ہے۔ انھوں نے عقیدوں کی شکست و ریخت، روحانیت سے بے تعلقی اور آج کی نئی نسل پر غلبۂ جنس کو پیش کیا ہے۔ جتندر بلّو کا افسانہ "بے پر کا پرندہ" آج کی امریکی اور یورپین پالیسی پر گہرا طنز ہے۔ مظہر الزماں خاں کا افسانہ "زمین" اس دھرتی پر پھیلے ہوئے کرب کا علامتی اظہار ہے۔ ہرچرن چاولہ کی کہانی "آتے جاتے موسموں کا سچ" میں کوئی نیا تجربہ پیش نہیں کیا گیا ہے بس استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔

م۔ق۔ خان کا افسانہ "حق وفاداری" بھی پسند آیا۔

زیب غوری مرحوم پر فاروقی صاحب کا مرثیہ بطرز غزل بھی پسند آیا۔ لیکن صرف مرحوم پر مرثیہ لکھ دینے سے کام نہیں چلے گا بلکہ فاروقی صاحب کو چاہئے کہ مرحوم کے فن اور شخصیت پر ایک زبردست مقالہ لکھ کر خراج عقیدت پیش کریں تاکہ مرحوم کے شخصی اور فنی پہلوؤں پر روشنی پڑ سکے۔

شمارہ ۱۴۱ میں احمد ہمیش کا افسانہ "پاگل کتے کی تلاش" آج کے حالات کا نوحہ ہے۔ رشید امجد، فاروق راہب اور محمد شاہد کے افسانے خاص طور پر اچھے لگے۔

قیصر ارحن پوری
سہسرام

● شب خون کا تازہ شمارہ ۱۴۱ ملا۔ شب خون کو خوب صورت اور بہتر رسالے کے لئے RENOVATION کے طور پر جو اقدامات کئے گئے ہیں وہ بروقت اور مستحسن ہیں۔

فاروق شفق
کلکتہ

● گذشتہ سات سال سے میں 'شب خون' کا مطالعہ کر رہا ہوں میرے لئے یہ جریدہ ایک استاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت میں اضافہ مطلق بار خاطر نہیں۔

غیاث احمد گدی جدید اردو افسانے کی آبرو تھے۔ خدا ان کی روح کو دائمی سکون عطا فرمائے۔ آمین۔ موصوف نے افسانے بہت کم لکھے تھے۔ تاہم جتنے بھی لکھے نصف صدی پر حاوی ہیں۔ "دھوپ" علامتی اور بے ماجرا کہانی ہے۔ کہانی جیسے جیسے نقطۂ عروج کی جانب بڑھتی ہے۔ ماحول کی دہشت ناکیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں مگر کہانی میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جو بے پناہ سکون کا احساس دلاتا ہے۔ کہانی کا فنکارانہ اختتام غیاث احمد گدی کے فن پر دال ہے۔

شمیم عالم مصحفی
بھاگل پور

● اس مرتبہ سرورق آپ نے بالکل ہی سادہ کر دیا کچھ نہ کچھ پرکاری بھی ضرور تھی۔ اس مرتبہ شب خون میں شعری حصہ غائب ہے جس سے یاران طریقت جزبز ہوئے ہیں۔ مجھے تو اچھا لگا کیوں کہ خاص موقعے پر کبھی کبھی رسالہ مرتب کیا جانا چاہئے۔

نامی انصاری
کانپور

یقین و اعتماد اور کامیابی کا ایک سال

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی رہنمائی اور وزیر اعلیٰ شری ویر بہادر سنگھ کی قیادت میں اتر پردیش پہلی بار ۲۰ نکاتی پروگرام پر عملدرآمد میں ملک میں سر فہرست رہا۔ یہ کامیابی کام کے نئے ماحول کا نتیجہ تھی۔

ہماری اہم کامیابیاں ایک نظر میں

زرعی پیداوار ✱ پچھلی خریف میں ایک کروڑ چھ لاکھ میٹرک ٹن کے نشانہ کے مقابلے میں ایک کروڑ ۱۳ لاکھ میٹرک ٹن کی پیداوار کا نیا ریکارڈ۔

✱ گیہوں کی ایک کروڑ ۶۵ لاکھ میٹرک ٹن کی پیداوار کا بھی ایک نیا ریکارڈ۔

دیہی ترقی دیہی بے زمین روزگار گارنٹی پروگرام کے تحت ۲۶۷،۴۰ لاکھ کام کے دنوں کے بقدر روزگار کا بندوبست۔

✱ محکمہ دیہی ترقی کے ذریعہ مارچ ۱۹۸۶ء تک مجموعی طور سے ۱۱۴۳۳۷ مکانات کی تعمیر مکمل۔ سال رواں میں مزید ۲۸۷۵۶ مکانات تعمیر کرنے کا نشانہ۔

صنعت ✱ سال ۸۶-۸۵ء میں ۱۶ ہزار نئے چھوٹے صنعتی وا‌حدوں کا قیام جب کہ ۲۴ ہزار واحدے پہلے سے قائم۔

خاندانی بہبود ✱ سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۴۱،۵ لاکھ نسبندیوں کا نیا ریکارڈ۔ یہ کامیابی پہلی بار مقررہ نشانے سے زیادہ رہی۔ سال ۸۷-۱۹۸۶ء میں ۶،۵۰ لاکھ نسبندی کرنے اور ۷،۵۰ لاکھ لوپ لگانے کا نشانہ۔

اقلیتوں کو تحفظ ✱ اقلیتوں کے مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن کے ذریعہ بنکوں سے تقریباً ۷ لاکھ روپئے کے قرض کا بندوبست

جنگل کاری ✱ وزیر اعظم کے مشورہ پر "ویسٹ لینڈ بورڈ" کا ریاست میں قیام۔

✱ گذشتہ سال (۸۶ - ۱۹۸۵ء) میں ۳۲،۵۰ کروڑ پودوں کے نشانہ کے مقابلہ میں ۳۸،۳۵ کروڑ پودے لگائے گئے۔ آئندہ سال ۸۷-۱۹۸۶ء میں ۴۵ کروڑ نئے پودے لگانے کا نشانہ۔

عوام کی توقعات کے عین مطابق نظم و نسق

✱ ڈویژنل افسروں کو زیادہ اختیارات۔

✱ عوام کی شکایتیں جلد دور کرنے کے لئے "احمد نگر" طریقۂ حکمرانی کا آغاز۔

ترقی کے میدان میں زیادہ بلندیاں حاصل کرنے کا عزم مصمم۔

نئے ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت غریبی ختم کرنے کا پختہ عہد۔

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

اخبار و اذکار

● اطہر علی فاروقی کی موت غیر متوقع نہ تھی۔ عمر رسیدہ [illegible] سے بیمار، بلکہ صاحب فراش۔ لیکن پھر بھی جب [illegible] فاروقی صاحب ہم میں نہیں تو دھکا سا لگا۔ پرانے وقتوں کے بڑے نفیس بزرگ تھے۔ کم گو، کم آمیز، بے آزار اور بے ریا۔ ان کی ساری زندگی ادب اور ادب کے طالب علموں کی خدمت میں گذری۔ "اتر پردیش کے لوک گیت" ان کا لازوال کارنامہ ہے۔ مرثیے کی تاریخ پر بھی انھوں نے قابل قدر کام کیا تھا۔ ڈرامے اور افسانے لکھے تھے، رسالہ نکالا۔ "شعلۂ خون" کے زمانۂ نوخیزی میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ خدا ان کے درجات بلند کرے۔ بڑی خوبیوں کے شخص تھے۔

● شری کانت ورما کی موت بھی غیر متوقع نہ تھی، لیکن انھوں نے جس پامردی سے موت کا مقابلہ کیا اس کے باعث ان کی موت میں ایک دیومالائی انداز سا پیدا ہو گیا ہے۔ شری کانت ورما کی زندگی کے آخری دس سال سیاست اور ادب کے درمیان عجیب بے اطمینانی میں گذر رہے تھے اور ان کی سیاسی سرگرمیوں نے انھیں ادیبوں سے ذرا الگ تھلگ ہی کر دیا تھا۔ لیکن وہ اول و آخر ادیب تھے۔ ہندی افسانہ، تنقید اور شاعری کو انھوں نے مالا مال کیا۔ ان کا آخری مجموعۂ کلام 'مگدھ' اردو میں بھی شائع ہوا اور ارباب نظر کی توجہ کا مرکز بنا۔ خدا ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

● گذشتہ دنوں مغرب کے کئی بڑے ادیب دنیا میں نہیں رہے۔ ان میں ژاں ژنے (فرانسیسی)، اور جورج لوئی بورہیس (فرانسیسی) علی الخصوص قابل ذکر ہیں۔ ادھر بنگال میں امیہ چکرورتی کا انتقال ہو گیا۔ ہم ان سب کے لئے سوگوار ہیں۔

● سبط حسن نے ادب کے میدان میں تو نہیں، لیکن ترقی پسند تحریک کی تاریخ و ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ وہ ترقی پسند مکتب فکر کے نمایاں دانش ور تھے۔ ان کا اچانک انتقال، اور وہ بھی ایسے وقت جب وہ پاکستان سے ہندوستان آئے ہوئے تھے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے جشن طلائی میں شرکت کر کے وطن واپس جا [illegible] تھے، ایک دردناک سانحہ ہے۔ خدا ان کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

● دیویندر اسر کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ حال ہی [illegible] چھپا ہے۔

● شمس الرحمٰن فاروقی کی نئی کتاب "اثبات و نفی" شائع ہو [illegible] انھوں نے گذشتہ دنوں "فیسٹیول آف انڈیا" کے تحت منعقد ہونے [illegible] "فیسٹیول آف انڈین پوئٹری" میں (اردو شاعر کی حیثیت سے) شرکت [illegible] سے امریکہ کا کامیاب سفر کیا۔ ہندوستان کے دوسرے شعرا جو ان کے [illegible] حسب ذیل ہیں۔ —

اشوک باجپئی اور [illegible] (ہندی)، سنیل گنگو[illegible] ارون کولٹکر (مراٹھی، انگریزی) اور گوپال کرشن آڈیگا (کنڑ)

● وزیر آغا کا شعری مجموعہ "گھاس میں تتلیاں" چھپ کر منظر [illegible] پر آ چکا ہے۔